وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

حصہ ہفتم

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

مجاز بیعت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی دامت برکاتہم العالی

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ ۝٣ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ ۝٤﴾ [النجم]

گلدستۂ احادیث (حصّہ ہفتم)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اور اشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاء اللہ اس گلدستے سے زندگی کے بے آب و گیاہ میدان میں علم و عمل اور رشد و ہدایت کے خوشگوار اور سدا بہار پھول کھل اٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

خلیفہ

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی

تفصیلات

بلاترمیم طباعت ونشرواشاعت کی عام اجازت ہے۔

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصۂ ہفتم)

مؤلف : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ العالی
استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

معاون : مفتی محمد سالم شاہ بھائی بڑودوی

کمپوزر : مولوی رشید احمد آچھودی (فون:09428689113)

طبع اوّل : ۱۴۴۵ھ مطابق: ۲۰۲۳ء

تعدادِ صفحات : ۷۹۳

ملنے کے پتے

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی (09825315073)

(۲) کتب خانہ نعیمیہ نزد قاضی مسجد، دیوبند (09897949325)

(۳) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین ..... صفحہ

- عرضِ مؤلف ۲۱
- تاثّرات از: حضرت مفتی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی مدظلہ العالی ۲۷
- مقدمہ از: حضرت اقدس، امیر شریعت قاری رشید احمد صاحب اجمیری دامت برکاتہم ۳۱
- تقریظ از: برکۃ العصر، محسن ملّت حضرت اقدس مفتی احمد بن یعقوب دیولوی مدظلہ ۳۴
- تقریظ از: حضرت قاری محمد تقی صاحب دامت برکاتہم (اُجین، ایم پی) ۳۶
- سپاس نامہ از: خانقاہِ شیخ زکریا جامعہ عربیہ سراج العلوم بھیرو گڈھ (اُجین، ایم پی) ۳۸
- تقریظ از: حضرت اقدس داعیِ کبیر مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری مدظلہ العالی ۴۰
- تقریظ از: حضرت مولانا محمد قاسم علی صاحب کاوی دامت برکاتہم العالیہ ۴۱
- (۱) شیطان دشمن انسان ۴۳
- (۲) اتباعِ نفس کی مذمت اور اصلاحِ نفس کی فضیلت ۶۹
- (۳) بسم اللہ کے فضائل ۸۴
- (۴) عمل قلیل پر اجرِ عظیم ۹۹
- (۵) اعتدال کی اہمیت اور بے اعتدالی کی نحوست ۱۲۳
- (۶) صحت و عافیت کی اہمیت ۱۳۹
- (۷) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی ۱۵۰
- (۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ۱۸۲
- (۹) کاشت کاری کی اہمیت ۲۱۶
- (۱۰) مٹّی کے مطلوبہ اَوصافِ اَربعہ ۲۲۸
- (۱۱) خواب کی حقیقت اور اَقسام واَحکام ۲۴۲
- (۱۲) جمہوری نظامِ حکومت کی خوبیاں اور خامیاں ۲۵۵
- (۱۳) جمہوری حکومت میں ووٹ کی اہمیت اور حیثیت ۲۷۰
- (۱۴) بہترین لیڈر کی خوبیاں ۲۸۰

(۱۵) مقاصدِ بعثت ۲۸۹
(۱۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علمی سفر نامہ ۳۱۵
(۱۷) جہالت، غربت اور غفلت کا شرعی حل ۳۳۷
(۱۸) ارتداد کی مذمت اور اس کے اَسباب وعلاج ۳۵۵
(۱۹) نیک وبد کی پہچان اور ان کا نفع ونقصان ۳۷۲
(۲۰) روح کے احوال اور حقائق ۳۸۹
(۲۱) قبر وبرزخ کے احوال وحقائق ۴۰۸
(۲۲) قیامت وآخرت کے اَحوال وحقائق ۴۲۴
(۲۳) اُمّت مسلمہ کے وہ خوش نصیب جو بلا حساب وعذاب جنّت میں جائیں گے ۴۸۵
(۲۴) قرآنِ کریم ناقابل ترمیم ہے ۴۹۹
(۲۵) صراطِ مستقیم ۵۱۲
(۲۶) علماء کا مقام اور اُن کی ذمّے داریاں ۵۳۲
(۲۷) خود پسندی کی مذمت ۵۴۴
(۲۸) مال ومرتبے کی حرص وہوس ہلاکت کا سبب ہے ۵۶۰
(۲۹) شہوت پرستی کی تباہی ۵۷۸
(۳۰) خواتین کے لیے شرعی احکام، حقوق اور اختیارات ۵۸۹
(۳۱) شانِ رِسالت میں گستاخی اور اُمّت مسلمہ کی ذمّے داری ۶۰۵
(۳۲) سیرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ۶۲۰
(۳۳) سیرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ۶۴۶
(۳۴) سیرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ ۶۷۰
(۳۵) سیرتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۶۹۳
(۳۶) اہل بیت کی عظمت اور حقوق ۷۱۸
(۳۷) اولاد کے انتقال پر صبر کا اَجر ۷۳۱
(۳۸) اللہ کے راستے کی حقیقت وفضیلت ۷۴۵
(۳۹) اصلاحِ معاشرہ کا شرعی طریقہ ۷۵۷
(۴۰) بڑھاپا باعث شقاوت یا سعادت؟ ۷۷۴

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین ..... صفحہ

- عرضِ مؤلف ۲۱
- تاثّرات از: حضرت مفتی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی مدظلہ العالی ۲۷
- مقدمہ از: حضرت اقدس، امیر شریعت قاری رشید احمد صاحب اجمیری دامت برکاتہم . ۳۱
- تقریظ از: برکۃ العصر، محسن ملّت حضرت اقدس مفتی احمد بن یعقوب دیولوی مدظلہ ۳۴
- تقریظ از: حضرت قاری محمد تقی صاحب دامت برکاتہم (اُجین، ایم پی) ۳۶
- سپاس نامہ از: خانقاہِ شیخ زکریا جامعہ عربیہ سراج العلوم بھیروگڈھ (اُجین، ایم پی) ۳۸
- تقریظ از: حضرت اقدس داعیِ کبیر مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری مدظلہ العالی ۴۰
- تقریظ از: حضرت مولانا محمد قاسم علی صاحب کاوی دامت برکاتہم العالیہ ۴۱

(۱) شیطان دشمنِ انسان

- شیطان کا تعارف ۴۳
- شیطان کے کفر کا سبب ۴۴
- شیطان کا انجامِ بد ۴۵
- شیطان کا انسان سے اظہارِ دشمنی ۴۶
- شیطان سے دشمنی کا فرمانِ شاہی ۴۸
- وساوسِ شیطانی ۴۹
- مقاصدِ شیطانی ۵۰
- شیطان کے نقصان سے بچنے کے نسخے ۵۶
- پہلا نسخہ تقویٰ ۵۶
- ایک نصیحت آموز واقعہ ۵۷
- دوسرا نسخہ ذکر اللہ ۶۰
- تیسرا نسخہ تلاوتِ کلام اللہ ۶۲

چوتھا نسخہ اللہ تعالیٰ کی پناہ بہ شکل دعا ۶۵

(۲) اتباعِ نفس کی مذمّت اور اصلاحِ نفس کی فضیلت

نفس کی حقیقت اور اس کے حقوق ۶۹
نفسانی خواہشات کی دو قسمیں ۷۰
نفس کے متعلق دو بنیادی احکام ۷۲
اتباعِ نفس ہلاکت کا سبب ۷۴
اصلاحِ نفس کے چار طریقے ۷۶
اصلاح کے بعد نفس اَمّارہ ''لوّامہ'' بن جاتا ہے ۷۹
نفس لوّامہ ترقی کر کے ''مطمئنہ'' بن جاتا ہے ۸۱
نفس کی اصلاح سببِ فلاح ۸۲

(۳) بسم اللہ کے فضائل

''بسم اللہ'' کی عظمت ۸۵
ہر مناسب کام ''بسم اللہ'' سے شروع کرنا انبیاء کی سنّت ہے ۸۶
''بسم اللہ'' کی برکات و فوائد ۸۸
''بسم اللہ'' کے مختلف مواقع مع فضائل ۹۰
عہدِ نبوی کا ایک واقعہ ۹۲
اِزدواجی تعلق کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت ۹۳
وضو اور غسل کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت ۹۴
سوار ہونے کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت ۹۴
صبح و شام تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا حفاظت کا سبب ہے ۹۶

(۴) عمل قلیل پر اجرِ عظیم

تمہید ۱۰۰
ایک نیکی کی قیمت ۱۰۱

آخرت میں نیکی کی قیمت ۱۰۲
عمل قلیل پر اجرِ عظیم ربِ کریم کے فضل عظیم کی دلیل ۱۰۳
عبادات میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں ۱۰۵
معاشرت میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں ۱۰۹
معاملات میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں ۱۱۳
اَخلاقیات میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں ۱۱۶
مؤمن مخلص کا اجر ختم نہ ہوگا ۱۱۸
مؤمن کے لیے بڑھاپا بھی باعث مغفرت ہے ۱۱۹
مؤمن کا اجر دائمی ہے ۱۲۱

(۵) اعتدال کی اہمیت اور بے اعتدالی کی نحوست

اعتدال کی حقیقت ۱۲۴
اعتدال کا حکم اور بے اعتدالی کی ممانعت ۱۲۴
اعتدال کی فضیلت اور بے اعتدالی کی مذمت ۱۲۵
عبادات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب ۱۲۷
معاملات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب ۱۳۲
خلاصہ ۱۳۷

(۶) صحت وعافیت کی اہمیت

تمہید ۱۳۹
صحت وعافیت کی حقیقت ۱۴۰
صحت وعافیت عظیم الشان نعمت ودولت ہے ۱۴۱
اللہ پاک سے صحت وعافیت کی طلب بہترین دعا ہے ۱۴۲
ایک واقعہ اور صحت وعافیت کی جامع ترین دعا ۱۴۳
صحت وعافیت کی حفاظت ۱۴۵

قیامت کے دِن صحت کے متعلّق سوال ۱۴۸

(۷) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عائلی زندگی

تمہید ۱۵۰
عائلی زندگی کی تباہی کی بنیادی وجہ ۱۵۱
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹے کی حیثیت سے ۱۵۲
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھائی کی حیثیت سے ۱۵۵
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شوہر کی حیثیت سے ۱۵۹
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باپ کی حیثیت سے ۱۶۹
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داماد کی حیثیت سے ۱۷۶
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خسر کی حیثیت سے ۱۷۸

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف

تمہید ۱۸۲
صبر وحلم ۱۸۴
عفو ورحم ۱۸۸
جود وکرم ۱۹۴
حیا وشرم ۱۹۹
ہمت وشجاعت ۲۰۲
مخلوق کی خدمت ۲۰۸
خلاصہ ۲۱۳

(۹) کاشت کاری کی اہمیت

کاشت کاری زمین کی آبادکاری کا ذریعہ ۲۱۶
کاشت کاری کی قدر ومنزلت ۲۱۷

کاشت کاری کی تعریف وترغیب ۲۱۹
کاشت کاری کی برکات ۲۲۰
کاشت کاری معاشی وملکی ترقّی کا ذریعہ ۲۲۳
کاشت کاری کے اَحکامِ شرعیہ ۲۲۴
دُنیا آخرت کی کھیتی ہے ۲۲۶

(۱۰) مٹّی کے مطلوبہ اَوصافِ اَربعہ

مٹّی اِنسان کی اصل ۲۲۹
مٹّی اِنسان کی ابتدا وانتہا ۲۳۰
مٹّی کے اَثرات انسان کے اَلوان واَوصاف پر ۲۳۱
مٹّی کے چار بہترین اَوصاف ۲۳۱
مٹّی کا پہلا وصف جذب وقبول کی صلاحیت ۲۳۲
ایک عبرت انگیز واقعہ ۲۳۴
مٹّی کا دوسرا وصف اُگانے کی صلاحیت ۲۳۵
مٹّی کا تیسرا وصف چھپانے کی صلاحیت ۲۳۷
ایک نصیحت آموز واقعہ ۲۳۸
مٹّی کا چوتھا وصف تواضع کی صلاحیت ۲۳۹
ایک ہدایت آموز واقعہ ۲۴۰

(۱۱) خواب کی حقیقت اور اَقسام واَحکام

خواب کی حقیقت ۲۴۳
خواب کے متعلق ایک علمی لطیفہ ۲۴۴
خواب کی حیثیت ۲۴۴
خواب کی تین قسمیں ۲۴۵
خواب کی پہلی قسم اور اس کا حکم ۲۴۵

ایک واقعہ ۲۴۷
خواب کی دوسری قسم اور اس کا حکم ۲۴۷
خواب کی تیسری قسم اور اس کا حکم ۲۴۹
مؤمن کا ہر خواب اچھا ہوتا ہے ۲۵۱
ایک عبرت ناک واقعہ ۲۵۲
خواب حبیب ولبیب ہی کے سامنے بیان کریں ۲۵۳

(۱۲) جمہوری نظامِ حکومت کی خوبیاں اور خامیاں

ہندوستان جنّت نشان ۲۵۷
عروج کے بعد دو مرتبہ بنی اسرائیل کو زوال ہوا ۲۵۷
بنی اسرائیل کی تاریخ اُمّت محمدیہ پر دہرائی گئی ۲۵۹
ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے ۲۵۹
ملک میں جمہوری دستور کا نفاذ ۲۶۱
جمہوری نظامِ حکومت کی خوبیاں ۲۶۲
جمہوری نظامِ حکومت کی خامیاں ۲۶۵

(۱۳) جمہوری حکومت میں ووٹ کی اہمیت اور حیثیت

جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے تمہارے حُکّام وعُمّال ہوں گے ۲۷۱
موجودہ صورتِ حال کے دو حل ۲۷۲
کامیاب انتخاب اور صالح انقلاب کے لیے دو کام ضروری ہیں ۲۷۴
ووٹ کی حیثیت مسلم جمہوری ملک میں ۲۷۵
ووٹ کی حیثیت غیر مسلم جمہوری ملک میں ۲۷۷

(۱۴) بہترین لیڈر کی خوبیاں

ہمارا لیڈر کیسا ہونا چاہیے؟ ۲۸۱

بہترین لیڈر کی چھ خوبیاں ۲۸۱
(۱) حسنِ کارکردگی ۲۸۲
(۲) خدمت گزاری ۲۸۳
(۳) بہادری ۲۸۴
(۴) سادگی ۲۸۵
(۵) تحمل مزاجی اور (۶) دور اندیشی ۲۸۶

(۱۵) مقاصدِ بعثت

دُعائے خلیل علیہ السلام اور اس کی قبولیت ۲۹۰
مقاصدِ بعثت تین ہیں ۲۹۱
حضور ﷺ کے معلّم اللہ تعالیٰ ہیں اور اُمت کے معلّم حضور ﷺ ہیں ۲۹۲
مقاصد بعثت کی ادائیگی کا حکم ۲۹۳
پہلا مقصد قرآنِ کریم کی تلاوت ۲۹۴
حضور ﷺ کی تلاوت ۲۹۵
حضور ﷺ کی تلاوت سے ہدایت پانے والوں کے واقعات ۲۹۷
دوسرا مقصد تزکیہ وتربیت ۳۰۱
حضور ﷺ کا اندازِ تربیت ۳۰۲
تیسرا مقصد تعلیم کتاب وحکمت ۳۰۷
حضور ﷺ کا طریقۂ تعلیم ۳۰۷
خلاصہ ۳۱۴

(۱۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علمی سفرنامہ

علم کا سچا طالب کبھی سیر نہیں ہوتا ۳۱۵
احتیاط فی الکلام کی تعلیم ۳۱۷
حصولِ علم کی طلب ۳۱۸

مجمع البحرین ۳۱۹
ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کی تعلیم ۳۲۰
حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ۳۲۲
حضرت خضر علیہ السلام کی معیت ۳۲۳
معلم کا متعلّم سے مناسب شرائط پر پہلے سے قول وقرار لینا جائز ہے ۳۲۴
پہلا واقعہ ۳۲۶
دوسرا واقعہ ۳۲۸
تیسرا واقعہ ۳۲۹
پہلے واقعے کی حکمت وحقیقت ۳۳۱
دوسرے واقعے کی حکمت وحقیقت ۳۳۲
تیسرے واقعے کی حکمت وحقیقت ۳۳۳
خلاصہ ۳۳۵

(۱۷) جہالت، غربت اور غفلت کا شرعی حل

ملک وملّت کی بہتری کے تین بنیادی اصول ۳۳۸
جہالت کا حل تعلیمی ترقّی میں ہے ۳۳۹
تعلیم کی ترغیب ۳۴۰
تعلیمی میدان میں ترقّی کے لیے توجّہ، ترغیب اور تنظیم ضروری ہے ۳۴۲
غربت کا حل معاشی نظام کی مضبوطی میں ہے ۳۴۳
کسب معاش کی ترغیب وفضائل ۳۴۳
معاشی ترقّی کے ذرائع ۳۴۵
ایک عبرت آموز واقعہ ۳۴۷
حصولِ عدل وامن کے لیے جابجا دارالقضاء، محکمۂ شرعیہ یا دارالصلح قائم کریں ۳۴۹
خیر القرون میں دارالقضاء کا قیام ۳۵۰
قیامِ دارالقضاء یا محکمۂ شرعیہ یا دارالصلح وقت کا تقاضا ۳۵۲

ترقّی کی چار بنیادیں ۳۵۳

(۱۸) ارتداد کی مذمّت اور اس کے اَسباب وعلاج

ہر مؤمن بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور ولی ہے ۳۵۶
اللہ پاک بے نیاز ہے ۳۵۷
کسی کے ارتداد سے نہ اسلام ختم ہوگا نہ مسلمان ۳۵۹
ارتداد کی حقیقت اور قسمیں ۳۶۰
ارتداد کے نقصانات ۳۶۲
ارتداد کے چند بنیادی اَسباب ۳۶۳
ایک فکر انگیز واقعہ ۳۶۵
ارتداد کا علاج ۳۶۵
ایک عبرت ناک واقعہ ۳۶۸

(۱۹) نیک وبد کی پہچان اور ان کا نفع ونقصان

اَبرار کی پہچان ۳۷۳
فجار کی پہچان ۳۷۶
اَبرار کا دُنیوی نفع ۳۷۷
فجار کا دُنیوی نقصان ۳۷۸
اَبرار کا اُخروی نفع ۳۷۹
موت کے وقت مؤمنین کو پانچ طرح کی خوش خبری دی جاتی ہے ۳۸۲
فجار کا اُخروی نقصان ۳۸۴
موت کے بعد فجار کے احوال ۳۸۷

(۲۰) روح کے احوال اور حقائق

جسم میں روح اصل ہے ۳۹۲

حقیقتِ روح کی جستجو ۳۹۳
جسم میں روح کب اور کہاں ڈالی جاتی ہے؟ ۳۹۵
روح کے چار ٹھکانے ہیں ۳۹۷
دُنیا میں حالات سے جسم متاثّر ہوتا ہے اور عالم برزخ میں روح ۳۹۹
روحِ مؤمن کا اکرام ۴۰۰
عالم برزخ میں اَرواح آپس میں ملاقات اور مذاکرہ کرتی ہیں ۴۰۳
مرنے والے صالحین کے ذریعے مرحومین کو سلام بھیجنا ۴۰۴
خلاصہ ۴۰۶

(۲۱) قبر و برزخ کے احوال و حقائق

تمہید ۴۰۹
برزخ و قبر کی زندگی اور حقائق ۴۱۰
برزخ و قبر میں روح اور جسم کا تعلق اور حقائق ۴۱۰
برزخ و قبر میں ثواب اور حقائق ۴۱۱
برزخ و قبر میں عذاب اور حقائق ۴۱۷
احوالِ برزخ و قبر کو ہم سے پوشیدہ رکھنے کا راز ۴۲۰
جا! گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت ۴۲۲

(۲۲) قیامت و آخرت کے اَحوال و حقائق

دنیا و آخرت کی حقیقت ۴۲۵
آخرت کی زندگی یا تو بہترین ہے یا بدترین ہے ۴۲۷
مؤمنین کے لیے قبر سے اُٹھنے کے اَحوال و حقائق ۴۲۷
کفّار کے لیے قبر سے اُٹھنے کے احوال و حقائق ۴۳۲
محشر کے احوال و حقائق مؤمنین و کفّار کے لیے ۴۳۵
حوضِ کوثر کے اَحوال و حقائق ۴۴۶

شفاعت کے اَحوال وحقائق ۴۴۹
عدالت الٰہی کے اَحوال وحقائق ۴۵۲
تقسیم نامۂ اعمال کے احوال وحقائق ۴۵۵
حساب وکتاب اور سوال وجواب کے احوال وحقائق ۴۶۱
مؤمنین وکافرین کے حساب وکتاب اور سوال وجواب کا فرق ۴۶۷
میزان کے اَحوال وحقائق ۴۷۰
پل صراط کے احوال وحقائق ۴۷۵
قنطرہ اور دخولِ جنّت کے احوال وحقائق ۴۸۱

(۲۳) اُمّتِ مسلمہ کے وہ خوش نصیب جو بلاحساب جنّت میں جائیں گے

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اُمّت ۴۸۶
اُمّت مسلمہ کی تین قسمیں ۴۸۷
اُمّت مسلمہ کی تینوں قسموں کی تفصیلات ۴۸۸
اُمّت مسلمہ میں ظالم، مقتصد اور سابق کون ہیں؟ ۴۸۹
اُمّت مسلمہ کے لیے جنّت کی بشارت ۴۹۲
اُمّت مسلمہ کے جنتیوں کی تین قسمیں ۴۹۳
اُمّت مسلمہ کے لیے ربّ العالمین کا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وعدہ ۴۹۵
بلاحساب جنّت میں جانے والوں کے اَوصاف ۴۹۷

(۲۴) قرآنِ کریم نا قابل ترمیم ہے

قرآنِ کریم کیا ہے؟ ۵۰۰
قرآنِ کریم نا قابل ترمیم کیوں؟ ۵۰۲
پہلی وجہ ۵۰۲
ایک واقعہ ۵۰۴
دوسری وجہ ۵۰۵

تیسری وجہ ۵۰۷
قرآنِ کریم میں مجرمین کے لیے یا تو فضل کا حکم ہے یا عدل کا ۵۰۸

(۲۵) صراطِ مستقیم

صراطِ مستقیم کی اہمیت ۵۱۳
صراطِ مستقیم کی حقیقت ۵۱۴
صراطِ مستقیم سب سے بڑی نعمت ۵۱۵
صراطِ مستقیم کے پانچ اَوصاف ۵۱۵
صراطِ مستقیم پر ایک علمی نکتہ ۵۱۷
صراطِ مستقیم کی دُعا ۵۱۷
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ ۵۱۹
صراطِ مستقیم کی طلب میں مانگی ہوئی دُعا قبول ہوتی ہے ۵۲۶
صراطِ مستقیم ملنے کی علامت ۵۲۸
کچھ یادگار مبارک لمحات ۵۳۰

(۲۶) علمائے کرام کا مقام اور اُن کی ذمّے داریاں

اہلِ ایمان اور علماء کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ۵۳۳
انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اونچا مقام علماء کا ہے ۵۳۳
ایک سبق آموز حکایت ۵۳۴
جتنا بڑا مقام اُتنی بڑی ذمّے داری ۵۳۶
علمائے کرام کی تین ذمّے داریاں ۵۳۷
علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کے لیے زینت بنیں ۵۳۷
علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کے لیے حفاظت کا ذریعہ بنیں ۵۳۹
تنظیمِ طالبان کی ابتدا کا واقعہ ۵۴۰
علمائے کرام اُمّت کے لیے دین کی ہدایت کا ذریعہ بنیں ۵۴۱

(۲۷) خود پسندی کی مذمت

تمہید ۵۴۴
خود پسندی کی حقیقت ۵۴۵
خود پسندی کی ممانعت ۵۴۶
خود پسندی ربِ کریم کی ناراضی اور گمراہی کا سبب ہے ۵۴۷
ایک نصیحت آموز واقعہ ۵۴۹
خود پسندی، ریا کاری و بڑائی کا سبب ۵۵۰
خود پسندی کمالِ بندگی کے خلاف ہے ۵۵۳
معصوم و مغفور ہونے کے باوجود حضور ﷺ استغفار کی کثرت کیوں فرماتے تھے؟ ۵۵۴
اعمالِ صالحہ کے بعد اہتمامِ استغفار ۵۵۷

(۲۸) مال و مرتبے کی حرص و ہوس ہلاکت کا سبب ہے

حرص و ہوس دینی اُمور میں محمود تو دُنیوی اُمور میں مذموم ہے ۵۶۰
مال و مرتبے کی حرص و ہوس سے ہونے والی ہلاکت کی مثال ۵۶۲
حرصِ مال کی پہلی قسم: بخل میں مبتلا ہونا ۵۶۳
حرصِ مال کی دوسری قسم ''شُح'' میں مبتلا ہونا ۵۶۴
ایک سبق آموز واقعہ ۵۶۶
مرتبے کی حرص و ہوس مال سے زیادہ مہلک ہے ۵۶۹
مرتبے کی حرص قارون کی ہلاکت کا سبب بنی ۵۷۰
مرتبے و منصب کے طالب و حریص کو منصب نہ دینا ۵۷۱
بغیر طلب کے ملنے والے مرتبے پر اللہ کی مدد ۵۷۲
مرتبے کے حریص کے لیے وعید ۵۷۳
مال و مرتبے والوں کے لیے پانچ قرآنی نصیحتیں ۵۷۴

(۲۹) شہوت پرستی کی تباہی

شہوت کی غلامی تباہی کی نشانی ۵۷۹
شہوت پرستوں کا انجامِ بد ۵۷۹
شہوت پرستی بنی اسرائیل کی بربادی کا سبب بنی ۵۸۱
شہوت پرستی سے ہلاکت کا عبرت ناک واقعہ ۵۸۱
ضبطِ شہوت کی فضیلت ۵۸۵
ضبطِ شہوت کے طریقے ۵۸۶

(۳۰) خواتین کے لیے شرعی احکام، حقوق واختیارات

کسی بھی نظام کے استحکام کے لیے عدل ضروری ہے، برابری نہیں ۵۹۰
اسلام مرد وعورت میں مساوات کا نہیں، عدل کا قائل ہے ۵۹۱
اسلام عورت کے لیے زحمت نہیں، رحمت ہے ۵۹۳
اسلام میں عورت کے حقوق ۵۹۵
اسلام میں عورت کے اختیارات ۵۹۹
حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ۶۰۰
حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ۶۰۲

(۳۱) شانِ رسالت میں گستاخی اور اُمّتِ مسلمہ کی ذمّے داری

ربّ العالمین کے خزانے کا سب سے قیمتی ہیرا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۶۰۶
آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت میں سب سے موخر ہیں لیکن خلقت میں سب سے مقدّم ہیں ۶۰۷
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر کرنے والے خود اصحابِ قدر ہو گئے
اور ناقدری وگستاخی کرنے والے نسیاً منسیا ہو گئے ۶۰۸
انبیاء ورُسل علیہم السلام کی ناقدری وگستاخی کا سلسلہ شیطان سے شروع ہوا ۶۰۹
شانِ رسالت میں گستاخانہ جسارت کے مقاصد ۶۱۳

توہینِ رسالت کی سزا ۶۱۵
اُمّتِ مسلمہ کی ذمّے داری ۶۱۷

(۳۲) سیرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

شانِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ۶۲۱
حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے گولڈ میڈلز ۶۲۲
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیّد الانبیاء تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سیّد الصحابہ ہیں ۶۲۴
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات ۶۲۸
قبولِ اسلام کے بعد کے حالات ۶۳۳
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عاشق اکبر تھے ۶۳۹
خلافت کے بعد کے حالات ۶۴۲

(۳۳) سیرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سیّد المحدّثین ہیں ۶۴۶
موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ ۶۴۷
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات ۶۵۱
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات ۶۵۳
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی اسلام پر استقامت ۶۵۷
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی ہجرت اور فضیلت ۶۵۸
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت ۶۶۱
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی سادگی اور شانِ بے نیازی ۶۶۳
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبّت ۶۶۶
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت ۶۶۸

(۳۴) سیرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عظمتِ شان ۶۷۰
عثمانی غنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات ۶۷۲
عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات ۶۷۶
حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا جذبۂ جود وسخا ۶۷۹
عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا تقویٰ اور خوفِ خدا ۶۸۳
عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت ۶۸۴
عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت ۶۸۸
عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۶۸۹

(۳۵) سیرتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

دوطرح کے مسلمانوں کے لیے خوش خبری ۶۹۳
علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات ۶۹۵
علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات ۶۹۸
علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہجرتِ مدینہ ۷۰۱
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سخاوت ۷۰۶
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت ۷۱۰
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور خانہ جنگیاں ۷۱۲
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۷۱۵

(۳۶) اہلِ بیت کی عظمت اور اُن کے حقوق

اہل بیت کون؟ ۷۱۹
اہل بیت کا اوّلین مصداق ازواجِ مطہرات ہیں ۷۲۰

اہل بیت میں حضور ﷺ کی آل اور اقارب بھی داخل ہیں ۷۲۲
اہل بیت کی عظمت وفضیلت ۷۲۳
دولت دنیا سے منہ موڑا ۷۲۵
اہل بیت کا پہلا حق: محبت ۷۲۶
اہل بیت کا دوسرا حق: اطاعت ۷۲۹
اہل بیت کے حقوق میں کوتاہی تباہی ہے ۷۲۹

(۳۷) اولاد کے انتقال پر صبر کا اَجر

بیوی کھیتی ہے تو بچے پھل ۷۳۲
جس مسلمان کے تین بچے انتقال کر جائیں وہ جنّت میں جائے گا ۷۳۳
جس کے دو بچے انتقال کر جائیں وہ بھی جنّت میں جائے گا ۷۳۴
جس کا ایک بچہ انتقال کر جائے وہ بھی جنّت میں جائے گا ۷۳۷
ناتمام بچہ بھی والدین کو جنّت میں لے جائے گا ۷۴۰
اولاد کے انتقال پر صبر جمیل کا عظیم مثالی واقعہ ۷۴۱
اہل جنّت کے خدّام ۷۴۳

(۳۸) اللہ کے راستے کی حقیقت وفضیلت

اللہ کے راستے کے فضائل ۷۴۵
اصلاً ''اللہ کے راستے'' سے مُراد جہاد ہے ۷۴۸
ضمناً اللہ کے راستے میں دین کے تمام احکام داخل ہیں ۷۴۹
علم ومعرفت کی طلب بھی اللہ کا راستہ ہے ۷۵۰
نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی اللہ کا راستہ ہے ۷۵۱
مالِ حلال حاصل کرنا بھی اللہ کا راستہ ہے ۷۵۴

اللہ کے راستے میں تنگی نہیں ۷۵۵

(۳۹) اِصلاحِ معاشرہ کا شرعی طریقہ

اصلاحِ معاشرہ کی حقیقت ۷۵۷
اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت وضرورت ۷۵۸
اصلاحِ معاشرہ کا پہلا قدم خود کی اصلاح ہے ۷۶۰
اصلاحِ معاشرہ کا دوسرا قدم اہل خانہ کی اصلاح ہے ۷۶۳
اصلاحِ معاشرہ کا تیسرا قدم مخلصانہ کوشش ہے ۷۶۵
معاشرہ کیسے خوش گوار بنتا ہے؟ ۷۶۷

(۴۰) بڑھاپا باعثِ شقاوت یا سعادت

دنیوی زندگی کے چار مراحل ۷۷۴
بچپن اور بڑھاپا دونوں کمزوری کے زمانے ۷۷۵
بڑھاپے کا علاج ممکن نہیں ۷۷۷
بڑھاپے کو چھپانا ممکن نہیں ۷۷۸
انتہائی بڑھاپے کی عمر ۷۷۹
غافل انسان کے لیے بڑھاپا بُرا پا ہوتا ہے ۷۸۱
نیک مسلمان اور صاحب قرآن کے لیے بڑھاپا خیر وبرکت ہے ۷۸۳
بوڑھے نیک مسلمان کے فضائل ۷۸۴
ایک نصیحت آموز واقعہ ۷۸۸

عرضِ مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدُ للهِ الَّذِيْ امْتَنَّ عَلَى العِبَادِ بِبعثةِ الأَنبياءِ والرُّسُلِ أُولي الرشدِ والهُدىٰ، وجَعَلَ مِن أَهل العلم يدعون من ضلّ إلى الهُدىٰ، ويصبرون عَلَى الأَذىٰ، ويُبصِّرُونَ بكتاب الله أَهلَ العَمىٰ، وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلىٰ مَن بَشَّرَ العُلمَاءَ بأَنهم ورثةُ الأَنبياء، وعلىٰ اٰله وصحبه أَعلامِ الهُدىٰ وقَادةِ التقىٰ. أَما بعد.

شرعی امور کی دو قسمیں (۱) مقید (۲) مطلق:

اللہ ربّ العزت نے اپنے وفادار (مکلّف) بندوں کو فلاحِ دارین سے مالا مال کرنے کے لیے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو جامع اور کامل شریعت عطا فرمائی؛ بنیادی طور پر اس کے امور واحکام کی دو قسمیں ہیں: (۱) مقید (۲) مطلق۔

مقید سے مُراد شریعت مطہرہ کے وہ امور واحکام ہیں جن کی ادائیگی کا قرآن وسنّت میں حکم بھی دیا اور ادائیگی کا مخصوص ومتعین طریقہ بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بتادیا کہ ان امور واحکام کو بالکل اُسی ہیئت وکیفیت کے ساتھ ادا کیا جائے جس طرح صاحب شریعت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً، فعلاً وعملاً منقول ومنصوص (ثابت) ہیں۔ ان میں کسی کو اپنی طرف سے کسی بھی قسم کی کمی زیادتی کی اجازت نہیں، جیسے: نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ امور واحکام۔

دوسری قسم کے امور واحکام وہ ہیں جن کا قرآن وسنّت میں حکم تو ہے؛ لیکن ان کی

ادائیگی کا کوئی مقرّرہ وقت اور مخصوص و متعین طریقہ من جانب اللہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں۔ حق تعالیٰ نے خاص حکمت اور بندوں کی سہولت کے پیشِ نظر مطلقاً ان احکام پر عمل کرنے کا حکم دے کر یہ اختیار بھی دیا کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کی ادائیگی کے لیے کسی بھی مناسب و مفید طریقے پر عمل کرنے سے وہ حکم ادا ہو جائے گا۔ جیسے: ذکر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ، تعمیر مساجد، تعلیم و تزکیہ اور تذکیر و تبلیغ وغیرہ امور و احکام وہ ہیں جو منصوص (صراحۃً ثابت) تو ہیں؛ لیکن ان کی ادائیگی کا مخصوص و متعین طریقہ منصوص (صراحۃً ثابت) نہیں۔ قرآن و سنّت میں ان کے جو دلائل منقول ہیں وہ بھی مطلق ہیں، کسی مخصوص و متعین طریقے پر موقوف و منحصر نہیں۔ ایسے امور و احکام کو اصطلاحِ شرع میں مطلق کہتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا حکم امورِ مطلقہ میں سے ہے:

اِن ہی امور و احکام میں دعوت و تبلیغ بھی ہے، اس کا حکم تو منصوص ہے؛ البتہ طریقہ منصوص نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنّت میں اس کا حکم تو دیا گیا، فرمایا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ﴾ [النحل : ۱۲۵] اور

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ [المائدۃ : ٦٧]

نیز حدیث پاک میں ہے:

"فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ : ص۴۳۲ / باب خطبة یوم النحر)

لیکن یہ تبلیغ کب اور کتنے وقت کی جائے؟ کہاں اور کس طرح کی جائے؟ اس کا کوئی مخصوص اور متعین طریقہ قرآن و سنّت سے منقول نہیں۔

علّامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَالتَّبْلِيغُ كَمَا لَا يَتَقَيَّدُ بِكَيْفِيَّةٍ مَعْلُومَةٍ". (الاعتصام : ۱ / ۱۸۷)

المختصر دعوت وتبلیغ کا حکم بھی امورِ مطلقہ میں سے ہے؛ لہٰذا جس زمانے وعلاقے میں اس کے لیے جو طریقہ مناسب ومفید ہو حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے اخلاصِ نیت کے ساتھ اسے اختیار کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ طریقہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خفیہ ہو یا علانیہ، تحریری ہو یا تقریری؛ کیوں کہ تعلیم وتزکیہ اور تذکیر وتبلیغ وغیرہ امور ایسے ہیں جن کا حصول کسی ایک ہی طریقے پر منحصر اور موقوف نہیں ہے، اس لیے ان کی ادائیگی کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا تذکرہ کیا تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دعوت وتبلیغ کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝﴾ [نوح : ۵]

''الٰہ العالمین! میں نے رات دِن اپنی قوم کو دعوت دی۔''

﴿ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝﴾ [نوح : ۹]

''پھر میں نے انھیں علانیہ (بھی) سمجھایا اور انھیں خفیہ طور پر (بھی) سمجھایا۔''

(کبھی جلوت میں، کبھی خلوت میں) معلوم ہوا کہ دعوت وتبلیغ کے لیے ان تمام طریقوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعوت وتبلیغ کے مختلف طریقے منقول ہیں:

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی دعوت وتبلیغ کے مختلف طریقے منقول ہیں۔ ابتدائے اسلام میں تقریباً تین سال تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انفرادی طور پر اسلام کی دعوت دی، اس کے بعد جب حکم ہوا کہ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ [الحجر:۹۴] تب آپ نے علانیہ اور اجتماعی طور پر دین کی دعوت دینا شروع کردیا، پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ کی دعوتی تحریک میں تقریر و

تحریر کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ احادیث طیبہ کے تمام ہی گلدستوں (کتابوں) میں موجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور دعوتی خطوط اس کا واضح ثبوت ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت وتبلیغ کے لیے کوئی ایک ہی طریقہ نہ اختیار فرمایا ہے اور نہ مخصوص کیا ہے۔

امر مطلق کو خود ساختہ طریقے میں مقید کر لینا ممنوع ہے:

صاحبو! شریعت مطہرہ کا منشا اور عبدیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو حکم جس طرح منصوص (ومنقول) ہو اُسے اسی حد میں رہتے ہوئے ادا کیا جائے، ہمارے فقہائے مجتہدین اور علمائے محققین کے یہاں قرآن وسنّت سے یہ قاعدہ اور اصول مستنبط کیا گیا کہ

"المُطلقُ يَجرِي عَلىٰ إِطلاقِه". (المبسوط للسرخسي / كتاب الوكالة / باب من الوكالة للبيع والشراء)

(امر) مطلق اپنے اطلاق پر ہی جاری رہے گا۔ کسی بھی امر مطلق کو خود ساختہ طریقے سے مقید ومخصوص کر لینا شرعاً ممنوع ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع پر اس کی ممانعت منقول ہے، مثلاً دیکھیے کہ قیام اللیل امر مطلق ہے، اس کی بڑی فضیلت بھی ہے، اب اگر کوئی شخص اپنی طرف سے قیام اللیل کے لیے شب جمعہ کو مخصوص کر لے تو حدیث شریف میں اس سے منع فرمایا گیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلَا تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ، إِلَّا أَنْ يَكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ".

(رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح: ص۱۷۹/ باب صيام التطوع)

اسی طرح فرض نماز مسجد میں ادا کرنا امر مطلق ہے، اس کی بڑی فضیلت ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص اپنے لیے مسجد میں کسی جگہ کو اس طرح متعین کر لے کہ اپنے علاوہ کسی کو وہاں نماز

پڑھنے نہ دے تو اس سے بھی منع فرمایا ہے:

"وَأَنْ يُوَطِّنَ الرَّجُلُ الْمَكَانَ فِي الْمَسْجِدِ كَمَا يُوَطِّنُ الْبَعِيرُ".

(أبوداود، والنسائي والدارمي، مشكوٰة المصابيح : ص٨٤ / باب السجود وفضله)

(مسجد میں اونٹ کی طرح کوئی شخص اپنی جگہ متعین نہ کر لے۔ مسجد اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہے؛ لہٰذا جو نمازی پہلے آ گیا وہی اپنی جگہ کا حقدار ہے)

نیز نماز میں قراءتِ قرآن کے لیے امر مطلق یہ ہے کہ

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمل : ٢٠]

جتنا بآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ کسی مخصوص مقدار اور سورت کی تعیین نہیں ہے۔ اس جامع آیت سے بہت سے فقہی مسائل مستنبط ہوئے؛ جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ منجملہ ان میں ایک یہ کہ کوئی شخص کسی خاص نماز میں مخصوص سورت کو اس طرح متعین کر لے جس سے اس کے لزوم کا ایہام ہو (لازم ہونے کا گمان ہونے لگے) فقہا نے اسے مکروہ و ممنوع قرار دیا ہے:

"وَلَا يَتَعَيَّنُ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ لِصَلَاةٍ عَلٰى طَرِيقِ الْفَرْضِيَّةِ".

(الشامي : ١ / ٥٤٤)

دیتے ہیں اپنی عقل سے حکمِ خدا میں دخل:

قرآن و سنّت کے اِن حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص بھی یہی ہے کہ شریعت مطہرہ کے امورِ مطلقہ کے لیے (جن میں دعوت و تبلیغ بھی ہے) کسی خود ساختہ طریقے ہی کو متعین کر لینا اور کیا عوام کیا خواص، کیا مرد کیا عورت، ہر فردِ اُمّت کے لیے اِسی کو لازم سمجھنا اور قرآن و سنّت میں مذکور دعوت و تبلیغ کے مطلق دلائل و فضائل کو اِسی خود ساختہ طریقے میں منحصر کر دینا اور پوری قوت کے ساتھ یہ بات چلانا کہ دعوت و تبلیغ کا مطلب تبلیغی جماعت کا مروّجہ (خود ساختہ) طریقہ ہی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات منشائے شریعت و تقاضائے عبدیت

کے خلاف، غلط، غلو، شریعت میں دخل اندازی وزیادتی اور بدعت ہے۔ جس طرح امورِ مطلقہ میں ایصالِ ثواب اور محفل میلاد کے لیے کسی ایک ہی طریقے کو متعین کر لینا بدعت ہے اسی طرح دعوت وتبلیغ کے لیے بھی کسی ایک ہی طریقے کو متعین کر لینا بدعت ہے۔ آج برّصغیر کا ایک بڑا طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں مبتلا ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ

اچھائی کر رہے ہیں بُرائی کے ساتھ ساتھ　　کھلا رہے ہیں زہر دوائی کے ساتھ ساتھ
دیتے ہیں اپنی عقل سے حکمِ خدا میں رائے　　رہزن ہیں دین کے رہنمائی کے ساتھ ساتھ

اللّٰھُم إنا نعوذ بك مِن الفِتَنِ ما ظهر منها ومابطن.

''گلدستۂ احادیث'' اصلاحی مضامین کا دعوتی وتبلیغی سلسلہ ہے:

الحمدللہ جو علمائے حقّانی و ربّانی اِن حقائق سے واقف و باخبر ہیں؛ انھوں نے ہر زمانے وعلاقے میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق حدودِ شرع میں رہ کر دعوت وتبلیغ کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ان مخلصین کی صف میں شامل ہونے کی غرض سے اِس عاجز نے بھی چند سال قبل **''گلدستۂ احادیث''** کی شکل میں اصلاحی مضامین کا دعوتی وتبلیغی سلسلہ شروع کیا، جس کی اب ساتویں جلد منظرِ عام پر آنا چاہتی ہے، ربّ کریم سے عاجزانہ التجا ہے کہ اسے شرفِ قبولیت سے نواز کر ہمارے لیے ذریعۂ نجات اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

ابوخلیق محمد شفیق بڑودوی غفرلہٗ
۴ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ
مطابق: ۲۰ اکتوبر ۲۰۲۳ء قبل الجمعہ
دارالارشاد، بزمِ صدیقی، بڑودا

تاثّرات

از

حضرت مفتی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی مدظلہ العالی

(خلیفہ ومجاز شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہ واستاذِ تفسیر وحدیث جامعہ عربیہ آنند، گجرات)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم. أما بعد.

اشتغال بالحدیث ایسی عظیم نعمت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسے سعادت مندوں کے لیے خاص دعا ہے:

"نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي، فَوَعَاهَا، وَحَفِظَهَا، وَبَلَّغَهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ". (سنن الترمذي / الرقم : ٢٦٥٨)

میری احادیث کو کما حقہ سن کر اسے محفوظ کر کے لوگوں تک پہنچانے والے محدثین کو اللہ ربّ العزت دنیا وآخرت میں خوش وخرّم رکھے۔

اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ہر دور میں باتوفیق علمائے محدثین نے مختلف انداز میں احادیث نبویہ کی خدمات کو انجام دیا ہے، کسی محدث نے جمع احادیث کا کام کیا، کسی نے رجالِ احادیث پر، کسی نے مخصوص مضامین پر تو کسی نے احادیث کی شرح کر کے۔

اِن ہی باتوفیق علمائے محدثین میں ایک مشہور ومعروف نام مخدوم گرامی حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب شاہ بھائی بڑودوی مدظلہ کا ہے، جنھوں نے کئی ضخیم جلدوں میں **"گلدستۂ احادیث"** لکھی ہے، جن میں مؤلف موصوف نے وقت اور حالات کے مطابق احادیث کو جمع کر کے اہل سنّت والجماعت واکابر دیوبند کے منہج کے

مطابق اُن احادیث کی تشریح فرمائی ہے اور ساتھ ہی قابل اعتماد حضرات علماء و مشائخ کے ملفوظات و تحقیقات کو نقل کر کے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں اور طالبین حدیث کے لیے آپ نے ایک بہترین ذخیرہ جمع فرما دیا ہے، سنّت نبوی کے مطابق زندگی گزارنے والوں کے لیے یہ ایک بہترین سرمایہ ہے اور آج کے بگڑے ہوئے معاشرے اور ماحول میں سنّت نبوی کی طرف رہنمائی کرنے والی اہم کتاب ہے۔

مؤلف کتاب مخدوم مفتی محمد شفیق شاہ بھائی مدّظلہ علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، آپ کے گھرانے کو علمی سیادت کا درجہ حاصل رہا ہے، آپ کے جدّ امجد دادا حضرت حافظ نور محمد عرف نواستاذ نے نصف صدی سے زائد عرصے تک مانڈوی راجپورہ مسجد بڑودا میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیے، آج بھی اُس امامت کے منصب کو حضرت مفتی صاحب کے چچا حافظ ابراہیم صاحب مدّظلہ نے سنبھال رکھا ہے۔ اسی طرح آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا صدیق صاحب مرحوم بھی ایک ممتاز عالم دین اور علومِ اسلامیہ کے کہنہ مشق مدرّس تھے، تقریباً نصف صدی تک دار العلوم بڑودا میں درجۂ عُلیا کے کامیاب مدرّس رہے۔

خود مؤلف موصوف مفتی محمد شفیق صاحب مدّظلہ کی ذات بھی مجمع کمالات ہے۔ ہمارے دیار میں عام طور پر اَرواحِ مُردوں پر لکھنے کا ہے؛ حالانکہ آپ جیسے زندہ باکمال حضرات کی قدر و قیمت سے عوام الناس کو متعارف کرانا زیادہ مفید ہے؛ اس لیے کہ زندہ لوگوں سے استفادے اور فیض یاب ہونے کی راہ کھلی ہوتی ہے، تاکہ زندہ باکمال حضرات سے متعارف ہو کر ان کی ذات کو مغتنمات میں سے سمجھ کر ان سے زیادہ سے زیادہ استفادے کے لیے ہم کوشاں رہیں، ان کی قدر کرنے کی ہمیں مزید توفیق ہو۔

حضرت اقدس مفتی محمد شفیق صاحب مدّظلہ کی فقہی مہارت و بصیرت بھی مسلّم ہے، آپ ''ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیت علمائے ہند'' اور ''مجمع الفقہ الاسلامی للہند'' (اسلامک

فقہ اکیڈمی انڈیا) کے اہم رکن ہیں، دونوں اداروں کے فقہی سمیناروں میں آپ کے پُرمغز مقالات بڑی دل چسپی سے سنے جاتے ہیں اور بڑی وقعت و اعتقاد کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں؛ حالانکہ ان سمیناروں میں صرف چنیدہ علمائے کرام ہی شرکت کرتے ہیں۔

مخدومِ گرامی حضرت مفتی محمد شفیق صاحب کو علومِ ظاہرہ میں بلند مقام کے ساتھ ساتھ علومِ باطنیہ تزکیہ و احسان سے بھی حظ وافر ملا ہے، آپ نے مخدومِ زمانہ، شیخ طریقت، پیر و مُرشد حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادی مدّظلہ العالی کے زیر نگرانی معرفت و سلوک کے منازل طے کر کے آپ کی طرف سے اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، اب پیر و مُرشد حضرت شیخ الٰہ آبادی مدّظلہ کے ایما پر کئی سالوں سے جامعہ سراج العلوم اجین میں آپ کا رمضان المبارک میں خانقاہی سلسلہ جاری ہے، جہاں کافی تعداد میں طالبین و مسترشدین جمع ہوتے ہیں اور کسب فیض کے ذریعے اپنے نفس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ خدا کرے آپ کا روحانی فیض برابر جاری رہے۔

ملّی تنظیموں میں آپ ''جمعیت علمائے ہند'' سے وابستہ ہیں اور اس کے تعمیری منصوبوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں، جمعیت کے پلیٹ فارم سے آپ دینی، تعلیمی اور سماجی خدمات بھی انجام دیتے ہیں اور جمعیت علمائے ہند کے اہم شعبے ''اصلاحِ معاشرہ کمیٹی'' گجرات کے کنوینر کے عہدے پر فائز ہیں۔

اسی طرح شہر بڑودا ''چاند کمیٹی'' کے صدر بھی آپ ہی ہیں۔ اللہ ربّ العزت نے حضرت مفتی محمد شفیق صاحب کو بیان و تقریر کا شاندار ملکہ عطا فرمایا ہے، دور دراز سے بھی آپ کو بیان و خطاب کے لیے مدعو کیا جاتا ہے، آپ کا بیان محض عامیانہ نہیں ہوتا؛ بلکہ علمی انداز میں آپ دِل کے نہاں خانوں میں چھپے اُمّت کے غم کو الفاظ کے سہارے لوگوں کی سماعتوں کے حوالے کرتے ہیں، آپ کا وعظ دِلوں پر دستک دیتا ہے اور ایمانی حرارت تیز کرتا ہے، احقر بالمشافہہ کئی بار آپ کا بیان سن چکا ہے؛ اس لیے

احقر کہہ سکتا ہے کہ واقعی آپ ایک ماہر اور کہنہ مشق خطیب کی طرح اصولِ خطابت اور فن خطابت کی باریکیوں سے باخبر ہیں۔

آپ اپنی بات سامعین کے دِلوں میں اُتارنے کا اچھا ہنر جانتے ہیں، آپ اپنے مخصوص اندازِ بیان، دلنشین اشعار اور شیریں گفتار کی وجہ سے عوام کے دِلوں پر چھا جاتے ہیں۔ جب آپ بولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ منھ سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ کاش! آپ کے تمام بیانات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے تو بعد والوں کے لیے ایک مستند علمی ذخیرہ ہو جائے، علمی دنیا میں قابل قدر اضافہ ہو اور نوآموز طلبۂ مدارس اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکیں۔

آپ کا فیض بفضلہٖ تعالیٰ دیارِ ہند کے علاوہ بیرونِ ہند میں بھی جاری ہے، افریقہ کے تنزانیہ، دارالسلام میں آپ ایک عربی مدرسے کے ذمّے دار ہیں، وہاں آپ کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ان تمام کمالات کے باوجود آپ انتہائی متواضع اور اخلاص کے پیکر مجسم ہیں، اُمّت مسلمہ کو مستقبل میں آپ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

اِن چند سطروں میں حضرت مفتی صاحب کی خوبیوں کا احاطہ ممکن ہے نہ مقصود؛ بلکہ صرف چند باتیں ہیں جو برجستہ قلم کی زبان پر آ گئی ہیں۔ اللہ ربّ العزت حضرت مفتی صاحب کی علمی، دینی، ملّی کاوِشوں کو شرفِ قبولیت سے نوازیں اور صحت و عافیت کے ساتھ آپ کا سایہ تادیر اُمّت پر قائم رکھیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

حررہ

مجاہد الاسلام قاسمی غفرلہٗ

۹ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ

مطابق: ۲۴ اکتوبر ۲۰۲۳ء

مقدّمہ

از

حضرت اَقدس، امیر شریعت قاری رشید احمد صاحب اَجمیری دامت برکاتہم

(شیخ الحدیث دارالعلوم اَشرفیہ راندیر وخلیفہ حضرت اَقدس مولانا اسماعیل واڈی صاحب نقشبندی مدظلہ العالی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَمُسَلِّمًا... أَمَّا بَعْد.

قرآنِ پاک مینارِ نور اور شمع ہدایت ہے، جو آقائے نام دار، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری کتاب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا شارح اور مبین بنا کر مبعوث فرمایا، ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ [النحل : ٤٤]

''اور ہم نے آپ کی طرف ''ذکر'' یعنی قرآنِ حکیم نازل کیا، تاکہ آپ اس کی تبیین لوگوں کے سامنے فرمائیں۔''

بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر کا یہ مشن رہا کہ آپ قرآنِ پاک کے اغلاق اور اِجمال کو اپنے قول وعمل اور تقریر سے اُمّت کے سامنے واضح فرماتے رہے، جیسا کہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال، قرآن کے اقوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں۔ اس سے یہ بات عیاں ہوئی کہ قرآنِ پاک کا بیان احادیث مبارکہ ہیں، احادیث مبارکہ کے مطالعے سے یہ بات آشکارہ ہوتی ہے کہ ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بہت سی گتھیاں سلجھتی ہوئی

نظر آتی ہیں۔

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

اسی لیے قرآنِ پاک میں اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم دیا گیا، تاکہ زندگی سوفی صد دین متین پر آجائے اور منشائے ربانی پر پوری طرح عمل ہو سکے۔

بس اسی مقصد سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی طرح احادیث مبارکہ کی حفاظت کا بھی وعدہ فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝﴾ [الحجر: ۹]

علماء فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی حفاظت کے وعدے میں احادیث مبارکہ کی حفاظت کی بھی گارنٹی ہے، کیوں کہ احادیث مبارکہ قرآنِ پاک کا بیان ہیں، اسی لیے کسی نے کہا ہے:

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنّت کے راستے　　اللہ سے ملاتے ہیں سنّت کے راستے

یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآنِ پاک کی حفاظت کا اہتمام ہوا اسی طرح ہر دور میں احادیث پاک کی حفاظت کا شیوہ علماء اور محدثین کے یہاں رہا، پھر ضعیف اور موضوع احادیث کو الگ کیا گیا اور اُمّت کے سامنے صحیح احادیث مبارکہ لانے کے لیے محدثین عظام نے بڑی کڑی کاوشیں کیں جو اہل علم سے مخفی نہیں، ایک ایک حدیث کی صحت وقوت معلوم کرنے کے لیے لمبے لمبے اَسفار کیے گئے، مہینوں تک جدّ وجہد کی گئی، تاکہ صحیح احادیث کا ذخیرہ اُمّت کے سامنے آسکے اور ان ہی کوششوں کے نتیجے میں آج اُمّت کے پاس احادیث کے گنجینے ہیں، پھر علمائے کرام ان احادیث صحیحہ کی روشنی میں رہبریٔ اُمّت کے لیے ارشاداتِ قرآنِ پاک کی تشریحات پیش کرتے ہیں۔

حضرت قطب الاقطاب مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر بخاری میں احادیث مبارکہ کا شغل رکھنے والوں کے فضائل میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِيْ، قَالُوْا : مَنْ خُلَفَاؤُكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:"اَلَّذِيْنَ يَرْوُوْنَ أَحَادِيْثِيْ."

(نصب الراية للزيلعي / باب صفة الصلوٰة)

ترجمہ : اے اللہ! میرے خلفاء پر رحم فرما! آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کے خلفاء کون ہیں؟ فرمایا: جو لوگ میری احادیث روایت کرتے ہیں۔

کتنی بڑی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی اور احادیث مبارکہ سے مزاولت رکھنے والوں کے لیے کس قدر عمدہ بشارت ملی۔ پھر جو بندہ احادیث پاک پڑھتا ہے اُسے کثرت سے سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنے کا اور دربار کی حاضری کا شرف حاصل ہوتا ہے، اسی لیے محدثین کرام اربعینات بھی لکھتے رہے ہیں۔

اُمّت کی اصلاح کا یہ بہترین ذریعہ، ذخیرہ اور سرمایہ ہے، اسی عمل مبارک کو جاری رکھنے کی غرض سے حضرت مفتی محمد شفیق صاحب مدظلہ نے **"گلدستۂ احادیث"** کا چھ جلدوں میں ذخیرہ جمع کر کے مختلف عناوین سے احادیث پاک اور ان کی شرح و وضاحت فرمائی ہے، اس حسین گلدستے میں اب جلد نمبر: (۷) کا اِضافہ ہو رہا ہے، اس کے عناوین بھی دیکھے، اُمید ہے کہ یہ بھی سابقہ جلدوں کی طرح اُمّت کے خواص و عوام تمام افراد کے لیے نافع اور سودمند ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ موصوف کی کدوکاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور لوگوں کو اس سے نفع پہنچائے، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے لیے دارین کی سعادت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

مؤرخہ: ۱۹/محرم الحرام/ ۱۴۴۳ھ
مطابق: ۲۹/اگست/ ۲۰۲۱ء

رشید احمد اجمیری
(راندیر)

تقریظ

از

برکۃ العصر، محسن ملّت حضرت اقدس مفتی احمد بن یعقوب دیولوی دامت برکاتہم

(مدیر جامعہ علوم القرآن جمبوسر، وخلیفہ حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحَمدُ للهِ رَبِّ العَالمين، وَالصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ عَلىٰ سَيِّدِ الأَنبيَاءِ وَالمُرسلين.

وعظ، نصیحت، بیان اور تقریر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے فرائض میں اہم فریضہ ہے، تمام انبیاء نے اپنی قوم میں موجود مختلف برائیوں کے خاتمے کے لیے خطاب وتقریر کے ذریعے راہ نمائی فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوتِ دین کی ابتدا ہی خطاب وتقریر کے ذریعے فرمائی تھی، جس کا سلسلہ حجۃ الوداع اور اس کے بعد تک جاری رہا، جس کے پیش نظر علمائے اُمّت کی اہم ذمّے داری تقریر وخطاب کے ذریعے عوام کی راہ نمائی اور تربیت کرنا ہے؛ بلکہ عوام میں دینی بیداری پیدا کرنے کا مؤثّر ترین ذریعہ خطابت وتقریر ہے۔ اور ہر دور میں علمائے اُمّت نے کتابت وخطابت سے اُمّت کی راہ نمائی فرمائی ہے، فی زمانا سوشل میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی کثرت کے سبب ہر شخص مختلف پلیٹ فارم سے اپنی باتیں عوام تک پہنچانے میں مصروفِ عمل ہے، جس کے سبب علومِ قرآن وحدیث سے واقف باصلاحیت علمائے کرام کی ذمّے داری دوگنی ہوجاتی ہے کہ اُمّت کو صحیح دینی معلومات سے آگاہ کرنے، صحیح وسقیم میں فرق کرنے اور اُمّت کو صحیح راہ پر گامزن کرنے کے لیے آسان اور سلیس زبان میں خطاب وتقریر کے ذریعے اُمّت کی تربیت اور راہ نمائی کی ذمّے داری ادا کریں، ان ہی عظیم مقاصد کی تکمیل میں علمائے کرام کا بڑا گروہ سرگرداں وکوشاں ہے۔

اُمّت کی راہ نمائی میں متفکر اور اُمّت کے خیر خواہ علمائے کرام کی فہرست میں ایک نام گرامی قدر مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی (دامت فیوضہم فی العالم) کا ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے سامعین کے دلوں کو سرکرنے والی شیریں بیانی کے ساتھ ساتھ بہترین تالیفی صلاحیت سے بھی نوازا ہے، آپ مختلف مجالس میں بیان اور اصلاحی مواعظ کے ذریعے جو اُمّت کی راہ نمائی فرماتے ہیں اسی مواد کو جمع فرما کر تالیف سے مزین فرماتے ہیں، جس کی چھ جلدیں **"گلدستۂ احادیث"** کے نام سے منظر عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اور اسی سلسلے کی ساتویں کڑی بھی مسودے کی شکل میں موجود ہے، جو عن قریب منظر عام پر آکر عوام وخواص کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

مذکور الصدر کتاب کا طائرانہ نظر سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے دورِ حاضر کے مسائل کے پیش نظر بڑی عرق ریزی سے مختلف کتب سے مواد کو یکجا فرما کر اُمّت کے سامنے پیش کیا ہے، دراصل **"گلدستۂ احادیث"** معتبر ومستند کتب حدیث وتفسیر کا بہترین مجموعہ ہے، جس کو بہتریں اسلوب میں تیار کیا گیا ہے، جس سے علمائے کرام استفادہ کرتے ہوئے اپنے علاقوں میں موعظت وبیان کی اہم دینی ذمّے داری کو بہ حسن وخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیق صاحب کی یہ کاوشیں رائیگاں نہیں ہوں گی؛ بلکہ ان صداؤں کو سننے والا اور اس مجموعے کا مطالعہ کرنے والا بڑا طبقہ لبیک کہنے پر فخر محسوس کرے گا اور ان کے لیے دنیا وآخرت کی خیر کا ذریعہ بنے گا۔ ان شاء اللہ۔

"گلدستۂ احادیث" کی ساتویں جلد کی طباعت کے خوش کن موقع پر گرامی قدر مولانا مفتی محمد شفیق صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی جمیع کاوشوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے، بیش از بیش لوگوں کو اس سے استفادہ کی توفیق ارزانی فرمائے، مزید تالیفی تصنیفی خدمات کی انجام دہی کی راہوں کو ہموار فرمائے۔ آمین۔

(حضرت مولانا مفتی) احمد بن یعقوب دیولوی
خادم: جامعہ علوم القرآن، جمبوسر
۱۱ر شوّال المکرّم ر ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۲ر مئی ر ۲۰۲۳ء

تقریظ

از

حضرت اقدس، سراپا تقویٰ، اسم بامسمیٰ قاری محمد تقی مدظلہ العالی

(بانی ومہتمم جامعہ عربیہ سراج العلوم، بھیرو گڈھ، ناگدہ، اُجین، ایم۔پی۔)

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، أَمَّا بَعْد.

ہر زمانے میں ملّت اسلامیہ کی رہبری کے لیے اور اُمّت کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے اُمّت مسلمہ کا بہترین، گراں قدر سرمایہ اہل اللہ ومشائخ عظام وعظ ونصیحت، بیانات، اصلاحی مجالس، بیعت وارشاد اور تصنیف وتالیف کے ذریعے خلوص وللّٰہیت پر مبنی عظیم ترین خدماتِ جلیلہ کرتے چلے آرہے ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مستقبل میں بھی اِن خدمات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ جاری رکھیں گے۔ آمین۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی رفیق محترم جناب حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی (مَتَّعَنَا اللهُ بِطُوْلِ حَيَاتِهٖ وَنَفَعَ بِهِ الْمُسْلِمِيْنَ) مجازِ بیعت عارف باللہ، شیخ طریقت حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی زید مجدہم ہیں، جو درس و تدریس کی خدمات کے ساتھ تصنیف وتالیف کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔

درحقیقت حضرت مفتی صاحب کے بیانات سے اُمّت مسلمہ کو تحریری شکل میں فیض یاب کرنے کے لیے آپ کے بیانات کو **"گلدستۂ احادیث"** کے نام سے چھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے، عن قریب ان شاء اللہ ساتویں جلد بھی منظر عام پر ہوگی،

مفتی صاحب قابل مبارک باد ہیں۔ ناکارہ بارگاہِ خداوندی میں عرض رَساں ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی تمام دینی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرما کر ملّت اسلامیہ کے لیے **''گلدستۂ احادیث''** کو نافع بنائے اور حضرت مفتی صاحب کی عمر، ایمان اور اعمالِ صالحہ میں برکت عطا فرمائے اور مقاصد حسنہ کی بعافیت تکمیل فرمائے۔ آمین۔

یہ ناکارہ تو اِن الفاظ کے لکھنے کا اہل ہی نہیں ہے، تاہم حضرت مفتی صاحب کے حسن ظن اور اِصرار پر یہ چند سطور سپردِ قلم کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ناکارہ کی نجات و مغفرت کا ذریعہ بنا دے، اس لیے کہ **''گلدستۂ احادیث''** پر ملک کے مشاہیر اکابر علماء و مشائخ نے حضرت مفتی صاحب کی دینی خدمات کی قدر کرتے ہوئے اپنے قلبی تاثّرات و تائیدات کا اِظہار فرمایا ہے اور اس مجموعے کی اِفادیت و اہمیت کو سراہا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی خدمات، آپ کے بارے میں اہل اللہ و مشائخ کے تاثّرات، تائیدات اور دُعائیہ کلمات کو شرفِ قبول بخش کر نجات و مغفرت کا ذریعہ بنا دے۔ آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

طالبِ دُعا
محمد تقی عفی عنہٗ
(خادم: جامعہ و خانقاہ شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ قدسیہ)
جامعہ اسلامیہ عربیہ سراج العلوم
بھیرو گڈھ، ناگدہ، اُنہیل روڈ اُجین، ایم۔ پی۔
۱۰ر محرم الحرام ر ۱۴۴۳ھ، یوم جمعہ
مطابق: ۲۰ر اگست ر ۲۰۲۱ء

سپاس نامہ

از

خانقاہِ شیخ زکریا جامعہ عربیہ سراج العلوم بھیروگڈھ، ناگدہ، انہیل روڈ، اُجین

اَلحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالمِینَ، وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِ المُرسَلِینَ، وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِینَ.

آج ہم سب خدّامِ خانقاہِ شیخ زکریا مسرور وشادماں ہیں کہ باری تعالیٰ نے جہاں ہماری تقصیرات سے عفوودرگذر کرتے ہوئے ہمیں اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے وہیں ہمیں بابرکت و بُلند حوصلہ اور اُمّت مسلمہ کے تئیں اپنے قلب میں سوز و گداز رکھنے والی عظیم ترین شخصیات بھی عطا کی ہیں، جنھوں نے اپنے تمام لیل ونہار ملک وملّت کے لیے قربان کر کے اُمّت مسلمہ کی صحیح رہنمائی فرمائی، جس کے نتیجے میں ہزاروں گم گشتۂ راہ انسانوں کو احکامِ خداوندی پر عمل پیرا ہونا اور نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنا نصیب ہورہا ہے، من جملہ ان ہی شخصیات کے جیّد عالم دین، استاذِ حدیث دارالعلوم بڑودا وخلیفۂ شیخ العرب والعجم شیخ المشائخ عارف باللہ شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب الٰہ آبادی زید مجدہ، حضرت مولانا محمد صدیق صاحب بڑودوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید جانشین مبلغ اسلام وعالم متبحر حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب مدّظلہ العالی کی ذاتِ گرامی میں وہ صفاتِ حسنہ اکمل واتم طریقے پر موجود ہیں، جو آپ کے والد محترم میں پائی جاتی تھیں۔

آپ کی ذاتِ گرامی علم وعمل، حلم وقناعت، وعظ وخطابت، فقاہت ووضاحت، سیادت وقیادت کا بہترین گلدستہ ہے، اور مفتی صاحب کئی کتابوں کے مصنّف بھی ہیں۔

نیز آپ کو علومِ ظاہری میں کمال کے ساتھ ساتھ علومِ باطنی میں بھی مہارت وحذاقت حاصل ہے۔ حضرت مفتی صاحب چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ چاروں سلسلوں سے فیض یاب ہیں، اور مرکز رشد وہدایت، برکت العصر شیخ الزمان حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم العالیہ کے خلیفہ بھی ہیں۔

بندہ حضرت والا کا شکر گزار ہے کہ بندے کی حقیر دعوت کو شرفِ قبولیت عنایت فرماتے ہوئے ہر سال ماہِ رمضان المبارک میں خانقاہِ شیخ زکریا جامعہ عربیہ سراج العلوم میں اپنی گوناگوں مشغولیات ومصروفیات کے باوجود اپنی تشریف آوری سے سرزمین شہر اجین کو سعادت بخشتے ہیں اور حضرت مفتی صاحب کے ارشاداتِ عالیہ وغالیہ سے ہمارے پژمردہ دلوں کو ایمانی جلا نصیب ہورہی ہے۔ بندہ اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے موصوف کی خدمت عالیہ میں یہ حقیر سا سپاس نامہ پیش کررہا ہے، بندہ صمیم قلب سے بارگاہِ ربّ العزت میں دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو اپنی شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے سایۂ عاطفت کو صحت وقوت اور عافیت وسلامتی کے ساتھ ہمارے سروں پر اور اُمّت مسلمہ پر تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم.

العارض

خادمِ ملّت ورئیس الجامعہ

محمد تقی بن مولانا حافظ محمد شفیع صاحب خورجویؒ

خلیفۂ حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی

وپیر حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلویؒ

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ

مطابق: ۲۱ اپریل ۲۰۲۳ء

تقریظ

از

حضرت اقدس، داعیٔ کبیر مولانا محمد یونس صاحب پالن پوری مدّظلہ العالی

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم، أَمَّا بَعْدُ.

ہر زمانے میں علماء اور مشائخ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق دین کو پانی پہنچانے کی کوشش اور محنت کی ہے۔ اُن ہی کاموں میں سے ایک کام اصلاحی مواعظ کے ذریعے اُمّت کو صراطِ مستقیم دِکھانا اور دوسرا کام ان ہی مواعظ اور اہم قیمتی باتوں کو سپردِ قرطاس کرکے اُمّت کے لیے ایک لمبے زمانے تک محفوظ کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ بہترین بدلہ عنایت فرمائے حضرت مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی کو کہ اُنھوں نے یہ دونوں کام کیے اور کرتے رہتے ہیں، الگ الگ مواقع میں اصلاحی مجالس کرتے رہتے ہیں، پھر وہی باتیں کتابی شکل میں بھی شائع کرتے ہیں، چنانچہ ان کے یہ اِصلاحی مواعظ ''**گلدستۂ احادیث**'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کی اس کاوِش کو قبول فرمائے اور اُنھیں اِخلاص کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات نصیب فرمائے۔ آمین۔

محمد یونس پالن پوری

واردحال: بمبئی

۱۶/ربیع الاول/۱۴۴۳ھ، بروز: سنیچر

مطابق: ۲۳/اکتوبر/۲۰۲۱ء

تقریظ

از

حضرت مولانا محمد قاسم علی صاحب کاوی دامت برکاتہم العالیہ

(امام وخطیب: مسجد زکریا ڈیوزبری، یوکے، سابق استاذ دارالعلوم کنتھاریہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کی کامیابی کے لیے اپنے محبوب سرکارِ دو عالم ﷺ کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا اور ایک عالمگیر کتاب بھیجی، جس میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر:۷]

تاکہ لوگ قرآنِ کریم اور سیرتِ سرورِ کائنات کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی گزاریں۔

یقیناً حضور ﷺ نے کلامِ الٰہی ہو بہو اُمّت تک پہنچایا، مزید احسان یہ فرمایا کہ اس کی تشریح بھی مختلف حالات و واقعات میں عین وحی کے مطابق فرمائی، جو احادیث کی شکل میں اُمّت کے آنے والے طبقے تک پہنچی، ہر دور کے علمائے کرام نے قرآنِ کریم کی تفسیر و تفہیم پر جہاں محنت کی، وہیں ذخیرۂ حدیث شریف کی تشریح کا بھی اہتمام فرمایا۔

ماشاءاللہ ''**گلدستۂ احادیث**'' نامی کتاب بھی حدیث پر ہوئے اس علمی

کام کا تسلسل ہے، جناب مفتی محمد شفیق صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے اس کتاب میں بہت ہی شاندار طریقے سے بالترتیب احادیث کو نقل کیا ہے اور اس کے ساتھ جو بہترین انداز میں تشریح فرمائی ہے وہ انتہائی قابلِ تعریف ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام فہم ہے، اس کتاب کا قاری ہر ورق میں علم وفن کے کئی ایک لازوال خزانے پائے گا۔ میں نے چیدہ چیدہ مقامات کا مطالعہ کیا اور اس سے میرے اندر ایک نہایت شاندار تاثّر پیدا ہوا۔

میں مفتی محمد شفیق صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی اس علمی کاوش پر انھیں سراہتا ہوں، نیز ان کی خدمت میں تحفۂ تہنیت وتبریک پیش کرتا ہوں، نیز دعا کرتا ہوں کہ ان کی یہ علمی خدمت ان کے لیے توشۂ آخرت بنے اور اُمّت کے لیے ایک بیش بہا نعمت۔

محمد قاسم پٹیل کاوی

(امام وخطیب مسجد زکریا، ڈیوز بری، یوکے)

۶ ربیع الاوّل ۱۴۴۵ھ

مطابق: ۲۱ ستمبر ۲۰۲۳ء

(۱)

شیطان دُشمن انسان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۱۸ / كتاب الإيمان / باب في الوسوسة)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان (کے دل و دماغ میں فاسد خیالات اور وسوسے ڈالنے کی غرض سے اللہ پاک کی دی ہوئی طاقت و مہلت کے سبب اُس) کی رگوں میں اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح خون رگوں میں گردش کرتا اور دوڑتا ہے۔

شیطان کا تعارف:

اللہ ربّ العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو خاک سے پیدا فرمایا: ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ [آل عمران : ۵۹] تو ابلیس کو آگ سے پیدا فرمایا: ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ [الرحمن: ۱۵] انسانوں میں سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں، تو جنات و شیاطین میں سے سب سے پہلا جن و شیطان ابلیس ہے۔

(مستفاد از: انوار البیان: ۷/ ۲۶۳)

اس کا اصل نام تو عزازیل ہے، لیکن جب اس نے حکم الٰہی کا انکار کیا اور راندۂ درگاہ کیا گیا تب سے اسے ابلیس اور شیطان کہا جانے لگا، جو اس کا وصفی نام ہے۔ ابلیس کا مطلب ہے اللہ پاک کی رحمت سے انتہائی مایوس ہونے والا۔ اور شیطان کے معنیٰ ہیں انتہائی سرکش، شریر اور بدمعاش۔ اس کی سرکشی و بدبختی کا اظہار تب ہوا جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر تعظیماً انھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس کے علاوہ سبھی نے سجدہ کیا۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ؕ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة : ٣٤]

شیطان کے کفر کا سبب:

حکم الٰہی کو بغیر چون و چرا مان لینا ایمان ہے، نہ ماننا جرم ہے اور انکار کرنا کفر ہے۔ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد اور تکبّر کی وجہ سے حکم الٰہی کا انکار کر دیا، جو اس کے کفر کا سبب بن گیا، اس حقیقت کو واضح اور ظاہر کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے جاننے کے باوجود اس سے سوال فرمایا:

﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ﴾ [الأعراف : ١٢]

''میرے حکم کے باوجود تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہ کیا؟''

جواباً اس نے کہا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف:١٢]

''میں آدم سے بہتر ہوں، (کیوں کہ) تو نے مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا۔'' یعنی اس نے بزعمِ خود آگ کو خاک کے مقابلے میں افضل و بہتر سمجھا اور اسی بنیاد پر اس نے خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے افضل سمجھ کر حسد اور تکبّر کرتے

ہوئے حکم الٰہی کے باوجود ان کو تعظیماً سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ آگ بھی اللہ پاک ہی کی مخلوق ہے، جس طرح خاک اللہ پاک کی مخلوق ہے، اور حق تعالیٰ نے ہر ایک میں مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں، کسی میں کم تو کسی میں زیادہ، آگ میں اگر صلاح و نفع ہے تو فساد و نقصان زیادہ ہے، جب کہ خاک میں فساد و نقصان کم اور صلاح و نفع زیادہ ہے، آگ سے انسان اپنی بعض ضرورتیں پوری کر سکتا ہے تو حق تعالیٰ نے خاک میں انسان کی ضرورت و زینت کی اکثر چیزیں پیدا فرمائی ہیں، پھر آگ میں ترفّع (بلندی) ہے تو خاک میں تواضع، ان کے علاوہ اور بھی وجوہات ہیں جن سے خاک کو آگ پر فضیلت حاصل ہے، لہٰذا اگر فضیلت کا یہی معیار ہے تو شیطان کا خیال: "أنا خير منه" غلط ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی اصل بندگی ہے، حکم الٰہی پر اعتراض کرنا اور انکار کرنا سرکشی اور بدبختی ہے۔

شیطان کا انجام بد:

شیطان اسی سرکشی اور بدبختی کی وجہ سے اپنے انجامِ بد کو پہنچا کہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ اور لعنت کے قید خانے میں گرفتار کر لیا گیا، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تکبّر عزازیل را خوار کرد　　بہ زندانِ لعنت گرفتار کرد

جس وقت شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد اور تکبّر کی وجہ سے حکم الٰہی کے باوجود سجدۂ تعظیمی کا انکار کر دیا تب حق تعالیٰ نے اس کو عالم بالا سے گیٹ آؤٹ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ﴾ [الأعراف : ١٣]

''اُتر جا یہاں سے، یہاں رہتے ہوئے تکبّر کرنے کا تجھے کوئی حق نہیں، چل نکل، تو ذلیلوں میں سے ہے۔''

حکم الٰہی کے مقابلے میں تکبّر کرنے والوں کا حق تعالیٰ کے یہاں یہی انجام ہے، اللہ پاک کے یہاں یہ لوگ تعظیم کے نہیں، تذلیل کے مستحق ہیں، ایسے متکبّرین کے لیے حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اعلان فرمادیا کہ جس طرح سوئی کے ناکے میں اونٹ داخل نہیں ہوسکتا اسی طرح متکبر ہماری جنّت میں نہیں جاسکتا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ۝﴾ [الأعراف: ۴۰]

الغرض ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد اور تکبّر کی وجہ سے حکم الٰہی کا انکار کیا، جس کے سبب وہ سب سے بڑا کافر اور شیطان بن کر ہمیشہ کے لیے رحمت الٰہی سے دور و مردود ہوکر دنیا میں ہدایت سے اور آخرت میں جنّت سے محروم ہوگیا۔

شیطان کا انسان سے اظہارِ دشمنی:

شیطان کو یہ بدگمانی تھی کہ اس کی ملعونیت اور مردودیت کا بنیادی سبب حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اس لیے جب ربّ العالمین نے اپنے حکم کے خلاف بغاوت و سرکشی کے سبب شیطان کو عالم بالا اور جنّت سے نکل جانے کا حکم دیا:

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ۝﴾ [ص: ۷۷]

تب شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم سے اظہارِ دشمنی کرتے ہوئے ربّ العالمین ہی کو چیلنج کردیا:

﴿أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَٰمَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٦٢﴾﴾ [الإسراء : ٦٢]

اگر تو مجھے آدم اور اس کی اولاد کو گمراہ کرنے کی قدرت اور قیامت تک مہلت دے دے تو میں ان کے اکثر لوگوں کو اپنا غلام، فرماں بردار اور تابع دار بنا کر یہ ثابت کر دوں گا کہ انسان کو تو نے خلافت ارضی اور افضلیت کا جو شرف بخشا ہے فی الواقع وہ اس کا اہل نہیں ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حق تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے احوالِ واقعی سے واقف ہیں، اور انھیں دُنیوی زندگی میں امتحانات کے مراحل سے گزار کر ان کی افضلیت کو ظاہر کر دینا چاہتے تھے؛ اس لیے شیطانی چیلنج کا جواب بڑی شانِ بے نیازی سے دیتے ہوئے فرمایا:

﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾﴾ [الإسراء : ٦٣]

''فرمایا: جا! تجھے (بنی نوع انسان کو بہکانے کے لیے وسوسے کی حد تک قدرت بھی دی اور قیامت کے نفخۂ اولیٰ تک کی مہلت بھی دی، اس سے فائدہ اٹھا کر تو میرے بندوں کو جس طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں سے آکر بہکا سکتا ہو بہکا لے، اپنا سارا زور صرف کر لے، جو کر سکتا ہو کر لے، میرے مخلص بندے مکمّل اور دائمی طور پر تیرے بہکاوے میں آنے والے نہیں، جو غیر مخلص بندے اپنے ارادے واختیار سے خود ہی تیرے بہکاوے اور قابو میں آ گئے پھر وہ میرے عذاب سے بچنے والے نہیں) اور جو تیرے تابع دار بن جائیں گے انھیں بھی اور تجھے بھی پوری پوری سزا دینے کے لیے جہنّم کافی ہے۔''

شیطان سے دشمنی کا فرمانِ شاہی:

حق تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے اپنے اس فیصلے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا؛ بلکہ انسان کو اس کے حقیقی دشمن کی پہچان کرائی، تاکہ اس سے بچیں، کہ دیکھو! تمھارے نظر آنے والے حقیقی و یقینی دُشمن کفّار ہیں۔

﴿إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا﴾

اور نظر نہ آنے والا دُشمن شیطان ہے، شیطان تمھارے باپ کا بھی اور تمھارا بھی قدیم و ابدی دشمن ہے، اس لیے اس کی باتوں، بہکاؤں اور وسوسوں میں مت آجانا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم وحوّا علیہما السلام کو خصوصیت کے ساتھ اس سے باخبر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ﴾ [طٰہٰ : ۱۱۷]

''اے آدم! یہ (شیطان) تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے۔''

اس کے علاوہ تمام بنی نوعِ انسان کو بھی اس حقیقت سے باخبر کیا کہ شیطان دُشمن انسان ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ [یوسف : ۵]

نیز فرمایا کہ ایسا خطرناک دشمن ہے کہ وہ تمھیں دیکھ سکتا ہے؛ لیکن عموماً تم اسے نہیں دیکھ سکتے:

﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الأعراف : ۲۷]

اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم شیطان کو اپنا دشمن بنالو:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ [فاطر : ۶]

شیطان سے دشمنی کا مطلب اور اس سے اظہارِ دشمنی کا طریقہ یہ ہے کہ شیطان

تمھیں بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے تمھارے دل میں جب بُرے خیالات اور وساوس ڈالے تو اُن پر عمل نہ کرنا، اس کی باتوں اور بہکاوؤں میں آکر اس کی تابع داری مت کرلینا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ [البقرۃ:۲۰۸]

ورنہ شیطان اپنے مقصد اور مشن میں کامیاب ہوگا اور تم دارین میں ناکام ہو جاؤ گے اور بالآخر شیطان کے ساتھ جہنّم میں ڈال دیے جاؤ گے، جہاں تمھارا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

وساوسِ شیطانی:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شیطان انٹرنیشنل ٹیچر بھی ہے اور چیٹر بھی، کسے کس راہ سے بھٹکانا ہے وہ اسے اچھّی طرح معلوم ہے، اس لیے وہ اپنے مقصد اور مشن کی تکمیل کے لیے مسلسل اور مکمّل کوشش کرتا رہتا ہے، نہ تھکتا ہے اور نہ ہار قبول کرتا ہے، اس حقیقت کو حدیث مذکور میں اس طرح بیان کیا گیا:

"إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ."

شیطان اللہ پاک کی دی ہوئی قدرت اور مہلت کے سبب انسان کو بہکانے کے لیے اس کے دل و دماغ میں فاسد خیالات اور وساوس ڈالنے کی غرض سے اس طرح گردِش کرتا ہے جس طرح خون رگوں میں گردِش کرتا ہے، انسان کے دل میں خیر کے خیالات بھی آتے ہیں اور شر کے بھی، خیر و بھلائی کے خیالات کو الہامِ ربّانی کہتے ہیں، (اس کا حکم یہ ہے کہ نبی کے لیے تو الہامِ ربّانی حجت ہے، جب کہ غیر نبی کے لیے حجت نہیں؛ البتہ اگر شریعت کے مطابق ہے تو اطمینانِ قلب کا سبب ہے) اس کے برخلاف شر و بُرائی کے خیالات کو وساوسِ شیطانی کہتے ہیں، شیطان کو اس سے زیادہ کی قدرت

نہیں، وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے دل میں وسوسے تو ڈال سکتا ہے؛ لیکن ہاتھ پکڑ کر کسی کو گمراہی و بُرائی کے راستے پر نہیں ڈال سکتا، اگر انسان شیطانی وساوِس پر دھیان نہ دے تو کچھ نقصان نہیں ہوسکتا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِيْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا، مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهٖ، أَوْ تَتَكَلَّمْ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۱۸)

''اللہ تعالیٰ نے میری اُمّت (اجابت) سے ان وسوسوں کو معاف کردیا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، جب تک کہ وہ ان وساوِس پر عمل نہ کریں، یا زبان پر نہ لائیں۔'' کیوں کہ وساوِسِ شیطانی غیر اختیاری ہوتے ہیں، البتہ ان پر عمل کرنا اختیاری چیز ہے، اللہ پاک کے یہاں اختیاری باتوں پر پکڑ ہے، غیر اختیاری پر نہیں، البتہ شیطان عموماً انسان کو وساوِس کے ذریعے بآسانی گمراہ کرلیتا ہے، اس کی خاص تکنیک ہے، جس سے وہ انسانوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنساتا ہے، اسی کے ذریعے اس نے حضرت آدم وحوّا علیہما السلام کو بہکایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ [الأعراف : ۲۰]

اس لیے اس کے وساوِس سے بھی پناہ مانگنے کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝﴾ [الناس : ٤]

''الٰہ العالمین! میں وسوسہ ڈالنے اور پیچھے ہٹ جانے والے شیطان کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔''

مقاصدِ شیطانی:

یہ اس لیے لازم اور ضروری ہے کہ شیطان کے بنیادی مقاصد میں انتہائی اہم

مقصد یہ ہے کہ انسان کو کسی بھی طرح اللہ پاک کی قربت، رحمت اور جنّت سے دور کر کے جہنّم میں دھکیل دے، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝٦﴾ [فاطر: ٦]

''وہ اپنے گروہ کو اسی لیے دعوت دیتا، بہکاتا اور وساوِس میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ سبھی جہنّم رسید ہوں۔''

اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ مختلف حربے استعمال کرتا ہے، کوشش کرتا ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

چنانچہ علّامہ بدرالدین محمد بن عبداللہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ''آکام الجان فی احکام المرجان'' (صفحہ: ۱۲۶ تا ۱۲۷) میں فرماتے ہیں کہ شیطان انسان کو نقصان پہنچانے کے لیے کم از کم چھ طرح کے حربے استعمال کرتا ہے:

(۱) سب سے پہلے وہ انسان کو کفر و شرک میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۲) اس میں کامیابی نہ ملے تو پھر بدعات میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳) اس میں بھی کامیابی نہ ملے تو کبائر (مثلاً قتل، زنا، غیبت اور جھوٹ وغیرہ) میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۴) اس میں بھی کامیابی نہ ملے تو صغائر میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۵) اس میں بھی کامیابی نہ ملے تو فضولیات میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۶) اس میں بھی کامیابی نہ ملے تو غیر اولیٰ اور کم نفع والے کاموں میں مشغول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب جہاں تک تعلق ہے کفر و شرک کا تو حقیقت یہی ہے کہ شیطان کی بنیادی کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ اپنے حقیقی خالق و مالک سے ہٹ کر غیر اللہ کی پرستش میں

لگ جائیں، توحید کو چھوڑ کر شرک میں مبتلا ہو جائیں اور جہنّمی بن جائیں، چنانچہ شیطان نے ابتدا ہی سے لوگوں کو بڑی عیاری و مکّاری سے غیر محسوس طریقے پر شرک میں مبتلا کر دیا، قرآن پاک کا فرمان ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت دراصل شیطان ہی کی عبادت ہے، جس کا انجام ہلاکت اور جہنّم ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ﴾ [النساء:۱۱۷]

''جو اللہ کو چھوڑ کر عورتوں کو پکارتے ہیں (یعنی اُن بتوں کو پکارتے ہیں جن کے نام زنانہ تھے، جیسے: لات، عزّیٰ، منات، نائلہ وغیرہ) دراصل وہ سرکش شیطان ہی کو پکارتے ہیں۔''

ایسے ہی لوگوں سے قیامت کے دن کہا جائے گا:

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴾ [یٰس: ۶۰]

''اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے (عہد الست میں) قول و قرار نہیں لیا تھا (اور دنیا میں میرے پیغمبروں کے ذریعے نہیں بتایا تھا) کہ شیطان کی عبادت (مکمّل اطاعت) نہ کرنا، کیوں کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔''

لیکن تم نے رحمٰن کی اطاعت کے بجائے شیطان کی مکمّل اطاعت کر کے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا کر دیا، اب اس کی سزا بھگتو۔ نعوذ بالله من ذلك.

جو لوگ دنیا میں بفضلہٖ تعالیٰ شیطان کی پہلی بڑی چال اور کوشش سے محفوظ رہتے ہیں ان کے متعلّق شیطان کی دوسری بڑی چال اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ پاک کی عبادت و اطاعت کرنے والوں کی اطاعت و عبادت بے اثر ہو جائے اور اس کا اجر ضائع ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شیطان وساوِس کے ذریعے انسان کی

اطاعت وعبادت کو بدعت کی نذر کر دیتا ہے، یا پھر عبادت گزار کو ریا کاری یا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے عُجب وخود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ وہ خرابیاں ہیں جن سے اعمال وعبادات بے اثر ہو جاتے ہیں اور اجر ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اُس فرمانِ الٰہی سے جو اگر چہ کفّار ومشرکین (اور ایک قول کے مطابق اہل بدعت) کے متعلّق ہے لیکن ہمیں بھی ڈرنے کی ضرورت ہے، جس میں فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝﴾ (الکھف : ۱۰۳)

''محبوبم! کہہ دیجیے کہ اگر (تم کہو تو) ہم تمھیں بتائیں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں۔''

﴿الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝﴾ [الکھف : ۱۰۴]

''وہ ہیں جن کی دُنیوی زندگی کی تمام تر کوششیں بیکار ہو گئیں اور وہ تو اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔'' (نعوذ باللہ)

شیطان اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے تیسری بڑی کوشش یہ کرتا ہے کہ وساوِس کے ذریعے بُرائیوں کو انسان کے سامنے مزین کر کے پیش کرتا ہے، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝﴾ [العنکبوت : ۳۸]

''شیطان نے انھیں ان کی بداعمالیاں مزین وآراستہ کر کے دکھائیں اور انھیں (حق کی) راہ سے پھیر دیا تھا حالانکہ وہ بینا ودانا تھے۔''

قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر اس کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۖ﴾ [الأنفال : ٤٨]

''اور جب (بدر کے لیے مکہ مکرّمہ سے روانہ ہوئے، مشرکین مکہ اپنے حریف سے خوف زدہ ہوئے، اس وقت انھیں اپنے پیچھے گھر والوں کے لیے قبیلہ بکر کے حملے کا بھی اندیشہ تھا، تب شیطان نے وسوسے کے ذریعے یا قبیلہ بکر کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں آکر انھیں اعمالِ کفر، دین حق کی عداوت اور رسولِ حق کی مخالفت پر اُبھارتے ہوئے کہا کہ تم اِتنا بڑا لشکر ہو کہ) تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا (پہلے تعریف کے انداز میں انھیں تکبّر میں مبتلا کیا، پھر قبیلہ بکر کی طرف سے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا) میں خود بھی تمھارا حمایتی ہوں۔'' (لہٰذا گھبراؤ نہیں اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھو، تم بڑے ضروری اور نیک کام کی طرف بڑھ رہے ہو، مسلمانوں کو مٹانے کا آج بہترین موقع ہے، کیوں کہ ان کی تعداد کم ہے اور تمھاری تعداد زیادہ، وہ اقلیت میں ہیں، تم اکثریت میں، اس لیے آگے بڑھو اور ان کا خاتمہ کردو)۔

شیطان کا تو مقصد اور مشن ہی یہ ہے کہ انسان بُرائی اور فحاشی میں آگے بڑھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾﴾

[البقرة : ١٦٩]

''بے شک وہ تمھیں بُرائی، بے حیائی اور اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جن کا تمھیں علم نہیں۔''

دوسرے مقام پر فرمایا کہ وہ تمھیں کھلی بُرائیوں کا حکم دیتا ہے:

﴿وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۖ﴾ [البقرة : ٢٦٨]

اگر اس وقت بندہ ارتکابِ معاصی سے شرماتا یا گھبراتا ہے تب شیطان اس بُرائی کو مزین کر کے اور کبھی نام بدل کر تو کبھی بھلائی کی شکل میں پیش کرتا ہے، جیسے شجرۂ ممنوعہ کے متعلّق حضرت آدم علیہ السلام کو کہا تھا:

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲۰]

''پس شیطان نے انھیں (ایک) خیال دِلا دیا، وہ کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمھیں دائمی زندگی بسر کرنے کا درخت بتا دوں اور (ایسی ملکوتی) بادشاہت (کا راز) بھی جسے نہ زوال آئے گا نہ فنا ہوگی۔''

آج بھی شیطان شراب، جوا، سود اور رِشوت وغیرہ نام بدل کر ان میں مبتلا کرا دیتا ہے، یا رحمت الٰہی کی اُمید دِلا کر توبہ سے روکتا ہے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ شیطان کے خیر میں بھی شر کا پہلو ہوتا ہے، جیسے شیطان کا تہجد کے لیے بیدار کرنے والا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔

شیطان انسان کو اللہ تعالیٰ کی قربت، رحمت اور جنّت سے محروم کرنے کے لیے چوتھی بڑی کوشش یہ کرتا ہے کہ بندوں کو قطع رحمی، اختلافِ باہمی اور بغض وعداوت میں مبتلا کر دیتا ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ﴾ [المائدۃ:۹۱]

''شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان عداوت اور کینہ ڈلوا دے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے اہل خانہ سے ایک طویل جدائی کے بعد ملاپ پر فرمایا تھا:

﴿وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ﴾ [یوسف : ۱۰۰]

حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب میاں بیوی میں شدید اختلاف اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے تو شیطان کا مقصد مکمّل ہوجاتا ہے، اس لیے وہ اپنے ساتھی کو شاباشی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "نِعْمَ أَنْتَ" تم نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ (مسلم، مشکوٰۃ:۱۸)

ان حقائق سے اندازہ لگائیں کہ شیطان انسان کا کتنا خطرناک دشمن ہے اور اس سے بچنا کس قدر ضروری ہے۔

شیطان کے نقصان سے بچنے کے نسخے:

صاحبو! اگر شیطان کو ربّ العالمین نے اپنی خاص حکمت کے تحت وساوس ڈالنے کی قدرت دی ہے تو انسان کو بھی بالکل محروم، عاجز اور بے بس نہیں بنایا، انسان کے لیے شیطان کے نقصان سے بچنے کے نسخے بھی قرآن میں بیان فرمائے ہیں، جن پر عمل کر کے انسان بآسانی شیطان کے نقصان سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

کتاب وسنّت میں بنیادی طور پر شیطان کے نقصان سے بچنے کے لیے چار نسخے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا نسخہ تقویٰ:

جن میں پہلا نسخہ ہے تقویٰ۔ اس کا مطلب ہے اللہ پاک سے ڈرنا اور اللہ پاک کی رضا کی خاطر کفر وشرک اور معاصی سے حتی الامکان بچنا، تقویٰ کے یوں تو بہت سے فوائد ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان شیطان کے نقصان سے بڑی حد تک بچتا ہے، کیوں کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے شیطان اس بندے سے ڈرتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے گناہ سے بچتا ہے شیطان اس سے بچتا ہے، متقیوں کے

آگے تمام شیطانی وساوِس وتدابیر تقریباً فیل ہوجاتی ہیں، وہ اگر کبھی شیطان کے بہکانے اور ورغلانے سے کوئی گناہ کر بھی لیتے ہیں تو تقویٰ کی برکت سے اللہ پاک انھیں فوراً توبہ کی طرف متوجہ فرمادیتے ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں یوں بیان فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝﴾ [الأعراف : ۲۰۱]

''بالیقین جو متقی ہیں جب (عارضی طور پر) کوئی خطرہ اور وسوسہ انھیں شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ فوراً سنبھل کر اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں، یکا یک اُن کی (بصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں۔''

اُن کی بصیرت انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے پر آمادہ کردیتی ہے، ان کا تقویٰ انھیں متوجہ کیے بغیر رہنے نہیں دیتا۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلے میں حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں عمرو بن جامع کے حالات کے تحت نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک نوجوان نہایت متقی اور پرہیزگار تھا، جو اکثر مسجد میں رہا کرتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس سے بہت خوش تھے، اپنے دن بھر کے معمولات مکمل کرکے وہ رات کو اپنے بوڑھے والد کے پاس لوٹ جاتا، اس کے راستے میں ایک عورت کا گھر تھا، جو اس نوجوان پر فریفتہ اور فدا ہوگئی تھی، روزانہ وہ اس نوجوان کا انتظار کرتی اور اسے مسلسل بہکاتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے ایک رات وہ نوجوان بھی بہک گیا اور گناہ کے لیے تیار ہوگیا۔

یہ حقیقت ہے کہ عورت کسی بھی مرد کی فطری کمزوری ہوسکتی ہے، شیطان اس

سے بہ خوبی واقف ہے، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات شیطان انسان کو بہکانے کے لیے عورت کو آلۂ کار بناتا ہے، اس کے تصوّرات اور خیالات میں نہایت مزین اور خوب صورت بنا کر عورت کو پیش کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت شیطان کا وہ تیر ہے جو عموماً خطا نہیں کرتا، حدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ: "الخَمْرُ جِمَاعُ الإِثْمِ، وَالنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ، وَحُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ." (رواه رزين والبيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة المصابيح : ص٤٤٤/ كتاب الرقاق)

''شراب گناہوں کا مجموعہ ہے، (بہت سے گناہوں کا ذریعہ ہے) عورتیں شیطان کا جال ہیں، (جس میں وہ بآسانی اچھے اچھوں کو پھنسا دیتا ہے) اور دنیا کی (ایسی) محبّت (جو اللہ تعالیٰ اور خود کے انجام سے غفلت کا سبب بنے) ہر گناہ کی جڑ ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت کی ممانعت ہے، نیز عورت کے لیے بے پردہ اور بن سنور کے گھر سے نکلنے کی بھی شرعاً پابندی ہے، تاکہ شیطان ایسی عورتوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر لوگوں کو گمراہ نہ کرے۔

الغرض! وہ عبادت گزار پرہیز گار نوجوان اس عورت کے بہکاوے میں آکر گناہ کے لیے آمادہ ہوگیا اور اس عورت کے پیچھے اس کے گھر میں چلا گیا، اللہ کی شان کہ عین اسی وقت اسے یاد آگیا قرآن، ارتکابِ معصیت سے پہلے ہی اس کی زبان پر کلامِ الٰہی کی یہ آیت جاری ہوگئی جس میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ [الأعراف : ۲۰۱]

''بے شک جو لوگ متقی ہیں جب شیطان کی طرف سے انھیں کوئی بُرا خیال آتا ہے تو وہ (اپنے مولیٰ کو) یاد کرنے لگتے ہیں، پھر اسی وقت ان (کے دل) کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔'' (جس سے انھیں گناہ کا انجام اور نقصان نظر آنے لگتا ہے، اس طرح وہ لوگ گناہ سے یا تو بچ جاتے ہیں یا گناہ کرلیا تو اس پر باقی نہیں رہتے، توبہ، تلافی اور معافی کا اہتمام کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا دھیان اور قرآن یاد آتے ہی وہ نوجوان فوراً بے ہوش ہوکر گر گیا، بہت دیر کے بعد ہوش آیا، لیکن دوبارہ پھر اللہ تعالیٰ کا دھیان اور قرآن یاد آیا تو خوفِ الٰہی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ اس کی جان نکل گئی، رات ہی میں اسے قریبی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس واقعے کی خبر ملی تو آپ رضی اللہ عنہ بہت متاثر ہوئے، صبح اپنے رُفقاء کے ساتھ اس کی قبر پر تشریف لائے اور دُعا کے بعد فرمایا: اے نوجوان! حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ [الرحمن : ٤٦]

''جو بندہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اس کے لیے دو جنّتیں ہیں۔'' (ایک جنّت سونے کی، دوسری چاندی کی، ایک میں وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہے گا اور دوسری میں اپنے مہمانوں کو رکھے گا)۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو قبر سے آواز آئی کہ حق تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ میرے ساتھ پورا کردیا۔ سبحان اللہ۔ (کنز العمال: ۲/۵۱۶، تفسیر ابن کثیر)

یہ ہے تقویٰ کا نفع، اس سے انسان شیطان کے نقصان وخسران سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے، جس قدر تقویٰ ہوگا اسی کے مطابق شیطان سے حفاظت ہوگی، متقی

اپنے مولیٰ سے قریب اور شیطان سے دور ہوتا ہے، اس لیے اس کا اہتمام لازم ہے۔

دوسرا نسخہ ذکر اللہ:

شیطان کے خسران ونقصان سے بچنے کے لیے دوسرا نسخہ ہے ذکر اللہ، یعنی اللہ پاک کو دِل وزبان سے یاد کرنا، کتاب وسنّت میں ذکر اللہ کے یوں تو بہت سے فوائد وفضائل منقول ہیں، ان میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب اور شیطان سے دور اور اس کے نقصان سے محفوظ ہوجاتا ہے، قرآنِ کریم میں شیطان کا ایک صفتی نام "خناس" بھی ذکر ہوا ہے:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝﴾ [الناس: ٤]

جس کے معنیٰ ہیں کھسک جانے والا۔ شیطان کا حال یہ ہے کہ جب بندہ ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے تو شیطان اس سے کھسک جاتا ہے اور دور ہوجاتا ہے، اس کی تائید اس حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ، فَإِذَا ذَكَرَ اللهَ خَنَسَ، وَإِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ." (رواه البخاري تعليقا، مشكوٰة المصابيح : ص۱۹۹/ باب ذكر الله عزّ وجلّ والتقرب إليه)

''شیطان (اللہ ربّ العزت کی جانب سے دیے گئے اختیار کے سبب انسان کو گمراہ کرنے اور خسران ونقصان میں مبتلا کرنے کے لیے) بنی نوعِ آدم کے دل سے چپکا رہتا ہے (ان کے دلوں کی طرف برابر نگاہ جمائے بیٹھا رہتا ہے اور انسان کو اپنے قبضے وکنٹرول میں کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے؛ لیکن) جب بندہ ذکر اللہ اور دِل وزبان سے اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور جیسے

ہی بندہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے شیطان اپنے مشن کی تکمیل میں مشغول ہوجاتا ہے۔''

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ گھر میں داخل ہوتے وقت، کھاتے پیتے اور سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان اس بندے سے اور اس کے گھر سے مایوس ہوجاتا ہے؛ لیکن جب بندہ ان مواقع میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان اپنے مقصد و مشن کی تکمیل کے لیے ان پر مسلط ہوجاتا ہے۔

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : "إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ فَذَكَرَ اللهَ عِنْدَ دُخُوْلِهِ وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: لاَ مَبِيْتَ لَكُمْ وَلَا عَشَاءَ، وَإِذَا دَخَلَ، فَلَمْ يَذْكُرِ اللهَ عِنْدَ دُخُوْلِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ، وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ وَالعَشَاءَ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ۳۶۳ / كتاب الأطعمة)

معلوم ہوا کہ بندہ جب تک ذکر اللہ میں رہتا ہے شیطان کے شر و نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اور جب بندہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہوجاتا ہے تو بہ طورِ سزا من جانب اللہ شیطان اس پر مسلط ہوجاتا ہے، اسی کو قرآنِ پاک میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جن پر شیطان کا تسلط ہوجاتا ہے وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتے ہیں۔

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ [المجادلة : ۱۹]

''ان پر شیطان نے غلبہ حاصل کرلیا اور انھیں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ [الزخرف:۳۶]

''اور جو بندہ رحمٰن کے ذکر سے غفلت کرے ہم اس پر شیطان مقرر کردیتے ہیں، تو وہ اس کا ساتھی ہوجاتا ہے۔''

جو ہر وقت اس کے ساتھ رہ کر نیکیوں سے روکتا اور بُرائیوں پر آمادہ کرتا ہے، حتیٰ کہ آخرت میں بھی جب یہ شخص قبر سے اُٹھے گا تو شیطان اس کے ساتھ ہوگا اور دونوں کو ساتھ ہی جہنّم میں داخل کر دیا جائے گا۔ (قرطبی، معارف القرآن)

شیطان کی جانب سے ہونے والے اس خسران ونقصان سے بچنے کے لیے کثرت سے ذکر اللہ کا اہتمام کرنا چاہیے، یہ شیطان کے لیے آسمانی وایمانی کوڑا ہے، جہاں بندہ ذکر کرتا ہے شیطان کو کوڑا پڑتا ہے اور وہ بھاگتا ہے۔

تیسرا نسخہ تلاوتِ کلام اللہ:

شیطان کی جانب سے ہونے والے خسران ونقصان سے بچنے کے لیے تیسرا نسخہ ہے تلاوتِ کلام اللہ، اگرچہ ذکر اللہ کے عموم میں تلاوتِ کلام اللہ بھی داخل ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام کرنا جہاں اور بہت سے فضائل کا ذریعہ ہے وہاں شیطان سے حفاظت کا بھی بہترین سبب ہے، چنانچہ قرآنِ کریم کی مختلف سورتوں اور آیتوں کی تلاوت کو شیطان کے نقصان سے حفاظت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کے متعلّق حدیث پاک میں ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔

"إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِيْ يُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ص۱۸٤/ كتاب فضائل القرآن)

اسی طرح آیت الکرسی کے فضائل میں منقول ہے کہ اس کا پڑھنے والا شیطان کے نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اس کے متعلّق حدیث پاک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ منقول ہے، آپ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے صدقے کی نگرانی سپرد فرمائی، اس رات کو ایک شخص آکر دونوں ہاتھ بھر کر غلّہ لینے لگا، تو میں نے

اُسے پکڑ لیا، وہ معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا: میں ایک محتاج اور عیال دار آدمی ہوں، ضرورت نے مجھے مجبور کیا، معاف کر دیجیے، آپ رضی اللہ عنہ نے رحم کھا کر اسے معاف کر دیا، صبح جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری ہوئی تو فرمایا: ابو ہریرہ! تمھارے گذشتہ رات کے قیدی کا کیا ہوا؟ (کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعے کی خبر دی تھی، سن کر) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! اس کا دردِ دل سن کر مجھے رحم آ گیا اور میں نے معاف کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے اپنے حالات کے اظہار میں تم سے جھوٹ کہا، اس سے بچ کر رہنا، وہ پھر آئے گا، تو واقعی دوسری رات پھر وہ آیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر یقین کامل تھا، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ اس کی تاک ہی میں تھے، جیسے ہی وہ غلّہ چرانے لگا آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً اُسے پکڑ لیا، مگر پھر وہ رونے دھونے لگا اور معافی مانگنے لگا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پھر رحم آ گیا اور معاف کر کے چھوڑ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح پھر رات والا معاملہ دریافت کیا اور فرمایا: وہ پھر آئے گا، اس سے ہوشیار رہیے، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق تیسری رات بھی آیا، تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر پکڑ لیا، کہ اب تو بچنے والا نہیں، اس نے کہا: بات سنو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے چھوڑ دو، میں اس کے عوض تمھیں چند کلمات ایسے سکھاتا ہوں جن کا اہتمام کرنے سے حق تعالیٰ تمھیں نفع پہنچائیں گے اور نقصان سے بچائیں گے، آپ رضی اللہ عنہ نے خوش ہوتے ہوئے فرمایا: جلدی بتا، وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا: جب تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، اس کی برکت سے من جانب اللہ ایک فرشتہ رات بھر تمھاری نگرانی کے لیے مقرّر ہو جائے گا اور تم شیاطین الجن والانس کے تمام ظاہری و باطنی، دینی و دُنیوی چھوٹے بڑے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رہو گے۔ صبح حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وظیفے کی افادیت کی تصدیق فرمائی اور فرمایا: ابوہریرہ! تمھیں معلوم بھی ہے کہ ان تینوں راتوں میں تمھارا واسطہ کس سے پڑا تھا؟ جب آپ رضی اللہ عنہ نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ذٰلِكَ شَيْطَانٌ". (بخاری، مشکوٰۃ:۱۸۵)

وہ تو شیطان تھا (جو ہے تو جھوٹا مگر بات سچّی بتا گیا، کیوں کہ جھوٹے بھی کبھی کبھی سچّی بات کر دیا کرتے ہیں)۔

ایک دوسری ضعیف حدیث میں ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أَعْوَادِ هٰذَا الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ: "مَنْ قَرَأَ اٰيَةَ الْكُرْسِيِّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ إِلَّا الْمَوْتُ، وَمَنْ قَرَأَهَا حِيْنَ يَأْخُذُ مَضْجَعَهٗ أَمَنَهُ اللهُ تَعَالٰى عَلٰى دَارِهٖ وَدَارِ جَارِهٖ وَأَهْلِ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهٗ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان وقال: إسناده ضعيف، مشكوٰة: ص۸۹/ باب الذكر بعد الصلوات)

جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے تو اسے جنّت میں جانے سے موت کے علاوہ اور کوئی چیز روک نہیں سکتی، اور جو شخص آیت الکرسی کو اپنی خواب گاہ (بیڈروم) میں جاتے وقت یعنی سونے سے پہلے پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے مکان میں اور اس کے ہم سایہ میں (یعنی جو مکانات اس کے مکان سے ملے ہوئے ہوں) اور اس کے اِردگرد کے مکانات میں (جو اگرچہ اس کے مکان سے متصل نہ ہوں) شیطان وغیرہ سے امن دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ

"الشَّيَاطِيْنُ نَوْعَانِ: شَيْطَانُ الْجَانِّ يَخَافُ اٰيَةَ الْكُرْسِيِّ، وَشَيْطَانُ الْإِنْسِ يَخَافُ فُقْدَانَ الْكُرْسِيِّ."

''شیطان کی دو قسمیں ہیں: (۱) شیطان الجن (۲) شیطان الانس۔ شیاطین الجن آیت الکرسی سے ڈرتے ہیں، تو شیاطین الانس کرسی کے جانے سے ڈرتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جب قرآن پاک کی ایک ہی سورت بلکہ اس کی ایک آیت بھی شیطان کے نقصان سے حفاظت کا سبب ہے تو مکمّل قرآنِ کریم کی تلاوت مع رعایت حقوق بدرجۂ اولیٰ شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہوگی۔

چوتھا نسخہ اللہ تعالیٰ کی پناہ بہ شکل دعا:

شیطان کے نقصان سے بچنے کے لیے چوتھا نسخہ ہے اللہ ربّ العزت کی پناہ میں آنا، جس کا بہترین طریقہ دُعا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ کے سامنے تو شیطان کی ہر چال اور تدبیر یقیناً بے اثر اور کمزور ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء : ۷۶]

وساوسِ شیطانی اور مکر شیطانی بہت ہی کمزور ہیں، اُن سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، بس اتنا کرو کہ جب شیطان تمھیں گمراہ کرنے کے لیے وساوس میں مبتلا کرے تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو، اس سے تم شیطان کے نقصان سے محفوظ رہو گے۔ حدیث میں ہے:

"فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ وَلْيَنْتَهِ." (متفق عليه، مشكوٰة : ص۱۸)

''اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو اور وساوس کو بالکل نظر انداز کردو۔''

بعض علماء نے فرمایا کہ اس موقع پر معوذتین پڑھ کر یہ تصوّر کرے کہ اب میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ گیا ہوں، اب وہ خود شیطان کے شر و نقصان سے میری حفاظت فرمائے گا، پھر ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

اس کے علاوہ بھی حدیث میں پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف دعائیں

منقول ہیں، جن کا اہتمام کرنے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے اور شیطان کے شرور وفتن اور نقصان سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ مثلاً مسجد مؤمن کے لیے شیطان کے نقصان سے حفاظت کا مضبوط ومحفوظ قلعہ ہے، حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھ لیتا ہے (تو وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے) شیطان اس کے متعلق کہتا ہے کہ یہ شخص آج کے دِن مجھ سے محفوظ ہوگیا، وہ دعا یہ ہے:

"أَعُوْذُ بِاللهِ العَظِيْمِ، وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ، وَسُلْطَانِهِ القَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ." (رواه أبوداود، مشكوٰة: ٧٢، باب المساجد ومواضع الصلوٰة)

''میں اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں شیطان مردود سے، (میرا رب) بہت ہی عظیم ہے، اس کی ذات نہایت کریم ہے، اس کی قدرت قدیم ہے۔''

اسی طرح مسجد سے نکلتے وقت اگر یہ دعا پڑھ لے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے اور شیطان سے بلکہ شیطانی لشکر اور ان کے شرور وفتن اور نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ إِبْلِيْسَ وَجُنُوْدِهِ." (كنز العمال)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان اور اس کے لشکر سے۔''

علاوہ ازیں زندگی بھر ایک اور دُعا کا اہتمام بالخصوص موت کے وقت شیطان کے شرّ وفساد سے حفاظت کا ذریعہ ہے، وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَدْمِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ التَّرَدِّيْ، وَمِنَ الْغَرَقِ وَالحَرَقِ وَالهَرَمِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ يَتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطَانُ عِنْدَ المَوْتِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَمُوْتَ فِيْ سَبِيْلِكَ مُدْبِرًا، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَمُوْتَ لَدِيْغًا." (رواه أبوداود والنسائي، مشكوٰة المصابيح: ص۲۱۷)

''اے اللہ! میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں مکان گرنے سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں کسی بلندی سے گرنے سے، ڈوبنے سے، جلنے سے، زیادہ بڑھاپے سے اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ موت کے وقت شیطان مجھے حواس باختہ کر دے (یعنی وسوسوں میں مبتلا کر کے میرے دین کو تباہ کر دے) اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ (جہاد کے وقت) تیری راہ میں پشت پھیر کر مروں اور اس بات سے پناہ میں آتا ہوں کہ سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے جانور کے کاٹنے سے مروں۔''

ان شاء اللہ ان مسنون دعاؤں کے اہتمام سے بندہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ کر شیطان کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔ دعا ہے کہ

یا الٰہی! مجھ کو تو شیطان سے بچا — تجھ سے تیرا فضل میں ہوں مانگتا
کل شیاطین اور ان کے تابعین — سب تیرے بس میں ہیں ربّ العالمین
تو نگہباں ہو میرا اور دے پناہ — کل خلائق کی بدی سے اے الٰہ!
یا الٰہی! تو نے دی جس کو پناہ — سب پہ وہ غالب ہوا بے اشتباہ
موت کی سختی میں اور سکرات میں — جب لگا رہتا ہے شیطان گھات میں
ہو الٰہی! تو مددگار و معین — مجھ پہ غالب ہو نہ جائے وہ لعین

آمین یاربّ العالمین۔

مؤرخہ: ۱۹ رشوال ۱۴۴۱ھ
مطابق: ۱۲ رجون ۲۰۲۰ء
بروز جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ٢١٠)

☆.....☆.....☆

(۲)

اتباعِ نفس کی مذمّت اور اصلاحِ نفس کی فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ."

(شرح السنة، مشكوٰة المصابيح: ص۳۰/ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواہش (نفس) اس دین (اسلام) کے تابع نہ ہوجائے جس کو میں لے کر آیا۔

(جب تک ایک مسلمان اپنی ہوا کو ہدیٰ یعنی طبیعت کو شریعت کے تابع نہ کر دے وہ کامل الایمان مسلمان نہیں بن سکتا)۔

نفس کی حقیقت اور اس کے حقوق:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر نفس کا تذکرہ فرمایا ہے، ایک جگہ تو اس کی اہمیت بتانے کے لیے قسم بھی کھائی ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا﴾

[الشمس: ۷] معلوم ہوا کہ نفس بھی نہایت اہم چیز ہے، لہٰذا نفس کی حقیقت اور اس کے حقوق سے غفلت کسی صورت میں مناسب نہیں۔

سوال یہ ہے کہ نفس کی حقیقت اور اس کے حقوق کیا ہیں؟ تو قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق ''نفس'' سے مراد یا تو انسان کی ذات ہے، یا انسانی فطرت وطبیعت، یا پھر وجودِ انسانی کا وہ خاص اندرونی حصّہ مراد ہے جس میں مختلف خیالات، جذبات اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور انسان ان کے مطابق عمل پر آمادہ ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ ''نفس'' انسان کی اس اندرونی کیفیت کا نام ہے جس میں خواہشات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں۔'' (آسان ترجمہ قرآن: ۱۸۴۳)

جہاں تک تعلق ہے نفس کے حقوق کا تو نفس کے ہر جائز اور ضروری تقاضے کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے پورا کیا جائے اور غیر شرعی تقاضوں کی تکمیل واتباع سے بچا جائے۔ حدیث پاک: "وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ" (بخاری: ۱/ ۲۶۴) کا یہی مطلب ہے۔

نفسانی خواہشات کی دو قسمیں:

یوں تو انسان کے نفس میں ہر طرح کے جائز، ناجائز، صحیح، غلط، نفع بخش، نقصان دہ، ضروری، غیر ضروری، نیکی اور بدی کے تقاضے، خیالات اور جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، جس طرح نیشنل ہائی وے پر ہر طرح کی چھوٹی، بڑی، نئی، پرانی، سرکاری اور غیر سرکاری گاڑیاں چلتی رہتی ہیں، اسی طرح انسان کا نفس بھی نیشنل ہائی وے کے مانند ہے، اس میں بھی مختلف اور متضاد قسم کے تقاضے، خیالات اور جذبات اُبھرتے رہتے ہیں، البتہ بنیادی طور پر ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) نفس کے خیالات، جذبات اور خواہشات یا تو خلافِ شرع اور گناہ والے ہیں (۲) یا پھر شریعت کے

مطابق جائز، ضروری اور نیکی والے ہیں، جن کی اجازت ہے، اس مضمون کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ [الشمس : ۸]

نفس انسانی میں فجور اور بُرائی کے خیالات وجذبات بھی اُبھرتے ہیں، تقویٰ اور بھلائی کے بھی، نفس انسانی میں حیوانی خواہشات بھی پیدا ہوتی ہیں اور روحانی بھی، قرآنِ کریم کا یہ کمال ہے کہ نفس میں پیدا ہونے والے خیالات وجذبات اور خواہشات میں فسق وفجور کے خیالات کو پہلے بیان کیا، تقویٰ اور نیکی کے خیالات کو بعد میں، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ نفس میں نیکی کے خیالات کم اور بدی کے خیالات، جذبات اور خواہشات بہت پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے نفس کی جو تین صفات بیان فرمائیں ان میں ایک نفس اَمّارہ، دوسری نفس لوّامہ اور تیسری نفس مطمئنہ ہے، نفس اَمّارہ کا مطلب بہت زیادہ بُرائی کا حکم کرنے والا، فرمایا:

﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ [یوسف : ۵۳]

واقعہ یہ ہے کہ اصلاً ابتداءً اصلاح سے پہلے ہر ایک کا نفس ہر وقت ہر جگہ انسان کو بُرائی کا ہی حکم دیتا ہے، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ''نفس'' نام ہے مرغوباتِ طبعیہ غیر شرعیہ کا۔ یعنی طبیعت کی وہ مرغوب، محبوب اور پسندیدہ باتیں اور تقاضے جن کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، جیسے نفس بار بار کسی بُری خواہش مثلاً بدنظری یا کسی اور بُرائی کا تقاضا کرتا ہے، طبیعت اس کی طرف مائل بھی ہو رہی ہے؛ لیکن شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، تو یہی ہوائے نفس ہے جس کا اتباع ممنوع ہے، لیکن اگر نفس کی چاہت شریعت کے مطابق ہو تو اس کی تکمیل کی اجازت ہے۔

نفس کے متعلّق دو بنیادی احکام:

قرآنِ کریم میں ربّ العالمین نے نفس کے متعلّق بنیادی طور پر دو احکام دیے ہیں: (۱) اتباعِ نفس سے بچو، کیوں کہ اتباع تو امام کا کیا جاتا ہے، اور نفس اس قابل نہیں کہ اسے امام بنایا جائے، اسے تو غلام بناؤ، ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت آسان ہوگا جب نفس کے متعلّق دوسرے حکم پر عمل کروگے، اور وہ حکم یہ ہے کہ (۲) اصلاحِ نفس کا اہتمام کرو، جیسے ربّ العالمین نے شیطان کے اتباع سے منع فرمایا کہ

﴿لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ [البقرة : ۲۰۸]

اسی طرح نفس کے اتباع سے بھی منع فرمایا کہ

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾ [النساء : ۱۳۵]

کیوں کہ جس طرح شیطان دشمن انسان ہے اسی طرح نفس بھی دشمن انسان ہے، جو ہر وقت، ہر جگہ ہر ایک کے ساتھ رہتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی وضاحت فرمانے کے لیے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ سوال فرمایا کہ

"مَا تَقُوْلُوْنَ فِيْ صَاحِبٍ لَكُمْ، إِنْ أَنْتُمْ أَكْرَمْتُمُوْهُ وَأَطْعَمْتُمُوْهُ وَكَسَوْتُمُوْهُ أَفْضَىٰ بِكُمْ إِلَىٰ شَرِّ غَايَةٍ؟"

''ایسے رفیق اور ساتھی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو اور اس کی (Respect) کرو، اس کا اتباع کرو، اسے اپنا غلام بنانے کے بجائے امام بنالو، اسے کھلاؤ پلاؤ اور کپڑا پہناؤ (اس کی ہر خواہش پوری کرو) تو وہ تمھیں ہلاکت میں مبتلا کردے؟''

"وَإِنْ أَهَنْتُمُوْهُ وَأَعْرَيْتُمُوْهُ وَأَجَعْتُمُوْهُ، أَفْضَىٰ بِكُمْ إِلَىٰ خَيْرِ غَايَةٍ."

''اس کے برعکس اگر تم اپنے اس رفیق اور ساتھی کے ساتھ تذلیل، تحقیر اور توہین کا معاملہ کرو، اس کا (Insult) کرو، اسے بھوکا ننگا رکھو، تو وہ تمھارے ساتھ بھلائی کرے۔''

"قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! هٰذَا شَرُّ صَاحِبٍ فِيْ الْأَرْضِ."

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال پر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس سے زیادہ بے وقوف اور بُرا ساتھی روئے زمین پر اور کون ہوسکتا ہے!

"قَالَ: فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ، إِنَّهَا لَنَفْوُسُكُمْ الَّتِيْ بَيْنَ جُنُوْبِكُمْ."
(تفسير القرطبي، معارف القرآن: ٥ / ٨٦)

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تمھارا نفس جو تمھارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔''

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ أَعْدَىٰ عَدُوِّكَ فِيْ جَنْبَيْكَ." (مرقاة: ٣ / ٣٧٢، باب التطوع)

''تمھارا سب سے بڑا دشمن تمھارے پہلو میں (یعنی نفس) ہے، لہٰذا اس پر کبھی بھروسہ مت کرلینا، اس کی ہر بات مان نہ لینا، ہر خواہش پوری مت کرنا، بقولِ حضرت حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

بھروسہ کچھ نہیں اس نفس اتارہ کا اے زاہد!
فرشتہ بھی یہ ہوجائے تو اس سے بدگماں رہنا

نیز کسی نے کہا ہے:

کر نفس کا مقابلہ بار بار تو — سو بار بھی ہار کر ہمت نہ ہار تو
اس کو پچھاڑ کر بھی نہ پچھڑا ہوا سمجھ تو — ہر وقت اس کی برائی سے ہوشیار رہ تو

اس کا تقاضا یہ ہے کہ نفس کی ہر خواہش وحکم کو شریعت کی میزان میں تولنا چاہیے، اگر ہوی ہدیٰ کے مطابق ہے یعنی نفس کی خواہش شریعت کے خلاف نہیں ہے تو اس کے پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ نیک نیتی کے ساتھ اس کی تکمیل اجر وثواب کا سبب بھی ہے، جیسے شرعی حدود میں رہتے ہوئے زوجین کا اپنی جنسی شہوت کا پورا کرنا۔ (مسلم، مشکوٰۃ:۱۶۸)

لیکن اگر نفس کی خواہش شریعت کے خلاف اور گناہ پر مبنی ہے تو اس کا اتباع مت کرنا۔ فرمایا: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى﴾ [النساء: ۱۳۵]

اتباعِ نفس ہلاکت کا سبب:

کیوں کہ نفس کی وہ خواہش جو خلافِ شرع اور گناہ پر مبنی ہو اس کا اتباع ہلاکت کا سبب ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [ص: ۲۶]

اتباعِ ہدیٰ کا اہتمام کرو اور اتباعِ ہویٰ سے اجتناب کرو؛ کیوں کہ نفس کی وہ خواہش جو ہدیٰ (شریعت) کے خلاف ہو اس کا اتباع کرنا اور اس پر عمل کرنا تمھیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے، راہِ راست سے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکا دے گا، یہی تو سب سے بڑی اور حقیقی ہلاکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں رحمت عالم ﷺ نے ہلاکت میں مبتلا کرنے والی جن تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا ان میں بخیلی اور خود پسندی سے پہلے اتباعِ ہویٰ کو بیان فرمایا:

"وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة المصابيح: ص٤٣٤/ باب الغضب والكبر)

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَتَخَوَّفُ عَلٰى أُمَّتِي الْهَوٰى، وَطُولُ الْأَمَلِ، فَأَمَّا الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَأَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ، وَهٰذِهِ الدُّنْيَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ، وَهٰذِهِ الْآخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ، وَلِكُلٍّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بَنُونَ، فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَا تَكُونُوا مِنْ بَنِي الدُّنْيَا فَافْعَلُوا، فَإِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِي دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ، وَأَنْتُمْ غَدًا فِي دَارِ الْحِسَابِ وَلَا عَمَلَ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ص٤٤٤/ كتاب الرقاق)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اپنی اُمّت کے بارے میں دو چیزوں کا ڈر ہے: (کہ کہیں میری اُمّت ان دو بُرائیوں میں مبتلا نہ ہوجائے کہ وہ دونوں ہلاکت کے سبب ہیں) (۱) اتباعِ نفس (اتارہ) (۲) لمبی آرزوئیں۔ خواہش نفس (اَمّارہ) تو انسان کو حق سے روک دیتی ہے، اور درازیٔ آرزو وعمر انسان کے لیے تاخیرِ عمل اور فکر آخرت سے غفلت کا سبب بن جاتی ہے۔ یاد رکھو! یہ دُنیا (اپنی ابتدا سے انتہا کی طرف) سفر کررہی ہے، اور یہ آخرت (بھی) اُدھر سے سفر کرکے آنے والی ہے (تم ہر آنے والے دِن دُنیا سے دور اور آخرت وموت سے قریب ہورہے ہو) اور دُنیا و آخرت ہر ایک کے اپنے بیٹے (چاہنے والے) ہیں، تم سے ہوسکے تو تم دُنیا کے بیٹے نہ بنو، آخرت کے بیٹے (چاہنے والے) بنو، کیوں کہ تم آج دُنیا میں ہو، جو دارالعمل ہے، یہاں کوئی حساب نہیں، جب کہ تم کل آخرت میں ہوں گے، جہاں صرف حساب ہوگا، عمل کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔

دانائے روم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے فرمایا تھا کہ

با ہوا و آرزو کم باش دوست　　چو یضلک عن سبیل اللہ اوست

صاحبو! واقعی اتباعِ ہدیٰ سے انسان ذلّت کی پستیوں سے نکل کر عزّت کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے، جب کہ اتباعِ ہویٰ سے انسان کی بنی بنائی عزّت بعض اوقات خاک میں مل جاتی ہے۔

آپ دیکھیے کہ عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا امیر تھی، اتباعِ ہویٰ کی نحوست سے اسیر بن گئی، جب کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام اسیر تھے، لیکن اتباعِ ہدیٰ کی برکت سے امیر اور عزیزِ مصر بن گئے۔

نیز یہ بھی غور کیا جائے کہ اگر ساری دنیا کو شیطان گمراہ کرتا ہے تو خود شیطان کو کس نے گمراہ اور ہلاک کیا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ شیطان کی گمراہی اور ہلاکت کا سبب اس کا نفس بنا، اتباعِ نفس کے سبب شیطان ہلاک ہوا۔

اسی طرح قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کے ایک عابد، زاہد اور مستجاب الدعوات شخص (جس کا نام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول بلعم بن باعوراء ہے اُس) کی ہلاکت کا سبب بھی اتباعِ نفس ہی کو بیان کیا ہے:

﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾ [الأعراف: ١٧٦]

اتباعِ نفس کی وجہ سے وہ کتّے کی طرح ذلیل ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہلاکت سے بچانے کے لیے یہ حکم فرمایا کہ اپنے آپ کو اتباعِ نفس سے بچاؤ اور اصلاحِ نفس کا اہتمام کرو۔

اصلاحِ نفس کے چار طریقے:

اس کے لیے سب سے پہلے ربّ العالمین سے اس کے رحم و کرم اور رحمت و حفاظت کا سوال کریں، خوب گڑگڑا کر دُعا مانگیں، کیوں کہ قرآنِ کریم نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے جہاں نفس کی جبلّت و فطرت کو بیان کیا کہ وہ ابتداءً اصلاح سے قبل

ہر ایک کو ہر وقت بُرائی پر اُبھارتا رہتا ہے: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ وہاں یہ بھی فرمادیا کہ ﴿إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ﴾ نفس کی شرارت سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جس پر ربِ رحم فرمائے، جو رب کے سایۂ رحمت میں آجائے گا وہ نفس کی شرارت سے محفوظ رہے گا، لہٰذا ربّ العالمین سے اس کے رحم و رحمت اور نفس کی شرارت سے حفاظت کے لیے خوب گڑگڑا کر دُعا کی جائے۔ اس سلسلے میں کتاب وسنّت کی دُعاؤں کا اہتمام بھی نہایت اہم اور مفید ہے، منجملہ ان کے ایک دعا قرآنِ کریم میں یہ ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰﴾ [الکھف:۱۰]

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی خصوصی رحمت سے مالا مال فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے کامیابی مہیّا فرما۔''

دوسری دُعا قرآنِ کریم میں یہ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸﴾ [آل عمران : ۸]

''اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد گمراہی سے بچا لیجیے اور ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیے اور ہمیں اپنی خصوصی رحمت سے نواز دیجیے، یقیناً آپ ہی بڑی عطا دینے والے ہیں۔''

اسی طرح حدیث پاک کی دُعاؤں میں ایک دُعا بہت اہم ہے:

"اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ، فَلَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَأَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ." (رواه أبوداود، مشكوٰة المصابيح : ص۲۱۵/ كتاب الدعوات في الأوقات)

''اے اللہ! میں تیری ہی رحمت کا اُمیدوار ہوں، تو مجھے ایک لمحے کے لیے بھی

میرے نفس کے سپرد اور حوالے مت فرما اور میرے تمام کاموں کو درست فرما، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔"

اخلاصِ نیت اور اظہارِ عجز کے ساتھ دُعاؤں کا اہتمام اصلاحِ نفس کا سبب ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

نفس کی تربیت کے بارے میں علّامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا شعر مشہور ہے:

وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰى حُبِّ الرَّضَاعِ، وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمْ

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچّے کی طرح ہوتا ہے، جسے آپ یوں ہی چھوڑ دیں گے تو وہ بڑی عمر تک بھی ماں کا دودھ پینا ہی پسند کرے گا۔ اور اگر آپ چھڑا دیں گے تو چھوڑ دے گا۔

جیسے بچّے کو کبھی ڈرا دھمکا کر تو کبھی بہلا کر سمجھا لیا جاتا ہے، یہی معاملہ نفس کے ساتھ اُس وقت ہمیں بھی کرنا ہے جب وہ خلافِ شرع گناہ کی ضد اور تقاضا کرے۔

اصلاحِ نفس کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ کبھی نفس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور دارین کی ہلاکتوں سے ڈرائیں، خلافِ شرع خواہش کے وقت نفس سے کہیں کہ اگر میں نے تیری بات مان لی اور میرے رب کی نافرمانی کی، خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے مرضیاتِ ربانی کو چھوڑ دیا تو یہ چیز ہلاکت کا سبب ہے، جس سے مجھے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے، اس آیت مبارکہ کا سہارا لے کر نفس کو ڈرائیں:

﴿إِنِّيٓ أَخَافُ إِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّي عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٖ ١٥﴾ [یونس : ۱۵]

اصلاحِ نفس کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت نفس خلافِ شرع گناہ کی خواہش اور تقاضا کرے تو اسے اللہ تعالیٰ کے انعامات سے للچائیں، نفس سے کہیں کہ ربّ العالمین نے خلافِ شرع خواہش نفس سے بچنے پر اس جنّت کا وعدہ فرمایا ہے

جہاں دائمی طور پر ہر خواہش پوری کی جائے گی۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ [النازعات : ٤٠ - ٤١]

اس آیت کا سہارا لے کر نفس کو للچائیں۔

علاوہ ازیں اصلاحِ نفس کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ بزرگوں سے اصلاحی تعلق قائم کریں اور کتاب وسنّت کی روشنی میں ان کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کریں۔ قرآنِ کریم میں اس کا بھی حکم موجود ہے:

﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ﴾ [لقمان : ١٥]

''اور جو میری راہ پر چلتے ہیں (اتباعِ ہویٰ کے بجائے اتباعِ ہدیٰ کا اہتمام کرتے ہیں) تم ان کی پیروی کرو۔''

اس کی برکت سے ان شاء اللہ تم بھی اتباعِ نفس وہوا سے محفوظ رہو گے۔

اصلاح کے بعد نفس اَمّارہ ''لوّامہ'' بن جاتا ہے:

الغرض! اصلاحِ نفس کے لیے اہتمام دُعا، نفس کو عذابِ الٰہی سے ڈرانا، انعاماتِ الٰہیہ سے للچانا اور بزرگوں سے اصلاحی تعلق قائم کرتے ہوئے اخلاص کے ساتھ ان کی ہدایات پر عمل کرنا اصلاحِ نفس کا ذریعہ بنے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاص کے ساتھ اصلاحِ نفس کی کوشش کی جائے تو وہ ضرور نفع بخش ثابت ہوتی ہے، جس کا اشارہ اس آیتِ قرآنیہ میں ملتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ﴾ [العنکبوت : ٦٩]

اصلاحِ نفس کے بعد یہ نفس ''امّارہ'' نہیں بلکہ ''لوّامہ'' بن جائے گا۔ نفس ''لوّامہ'' کا مطلب عاجز کے خیالِ ناقص میں یہ ہے کہ جو اندر سے انسان کو امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دے اور اس سے غفلت پر ملامت کرتا رہے۔ اس نفس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ربّ العالمین نے قرآنِ کریم میں قسم کھائی ہے:

﴿وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢﴾ [القيامة : ٢]

''ملامت کرنے والے نفس کی قسم۔''

مطلب یہ ہے کہ اصلاح کے بعد جب نفس ''اَمّارہ'' سے ''لوّامہ'' بن جاتا ہے اور اسی کو ہم عرفِ عام میں ''ضمیر'' بھی کہتے ہیں وہ زندہ اور بیدار ہو جاتا ہے، پھر بندے کو اس کا نفس نیکی بدی کے ہر عمل پر ملامت کرتا رہتا ہے، نیکی اور بھلائی پر تو اس طرح ملامت کرتا ہے کہ مزید کیوں نہیں کی؟ اور بُرائی ہو جائے تو اس پر بھی ملامت کرتا ہے کہ اس سے باز کیوں نہیں رہا؟ دنیا میں کسی کا نفس اصلاح کے بعد ''اَمّارہ'' سے ''لوّامہ'' بن جائے اور وہ بندہ نفس کی ملامت پر توجّہ بھی دے تو توفیقِ الٰہی سے اس کا نقد نفع یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کے لیے زیادہ سے زیادہ نیک عمل کرنا اور گناہوں سے سچّی پکّی توبہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

یاد رکھو! دنیا میں اگر کسی نے اصلاحِ نفس کے بعد اپنے نفس کو ''اَمّارہ'' سے ''لوّامہ'' نہ بنایا تو کل قیامت کے دِن تو ہر ایک کا نفس ''لوّامہ'' بن ہی جائے گا، ہر بندے کو اس کا نفس ملامت کرے گا، نیک بندوں کو مزید نیک اعمال نہ کرنے پر اور بُروں کو بُرائیوں سے باز نہ رہنے اور توبہ نہ کرنے پر، ظاہر ہے کہ اس وقت کی ملامت تو کسی کے لیے نافع نہ ہوگی، اس لیے دانائی یہی ہے کہ آج اپنے نفس کی اصلاح کی فکر کریں، اسے ''اَمّارہ'' سے ''لوّامہ'' بنانے کی تدابیر اور طریقے اختیار کریں، مسلسل فکر اور کوشش کریں۔

نفس لوّامہ ترقّی کر کے ''مطمئنہ'' بن جاتا ہے:

یقین جانیے کہ حق تعالیٰ اصلاحِ نفس کی سلسلے میں ہونے والی مخلصانہ کوششوں کو ضائع نہیں ہونے دیں گے، ان کوششوں کو قبول فرما کر مزید ترقیات سے مالامال فرمائیں گے۔ ہمارے علماء وصلحاء فرماتے ہیں کہ اصلاحِ نفس کے بعد نفس اَمّارہ ''لوّامہ'' بن جاتا ہے، پھر نفس لوّامہ ترقّی کر کے نفس ''مطمئنہ'' بن جاتا ہے، پھر اسے نیکی سے طبعی طور پر اطمینان ورغبت اور بدی سے بے چینی ونفرت پیدا ہوجاتی ہے، جب تک توبہ نہ کر لے بندے کو اطمینان نہیں ہوتا، یعنی اس کی فطرت وطبیعت شریعت کے تابع بن جاتی ہے، جو حدیث پاک کے مطابق کسی بھی مؤمن کے کمالِ ایمان کی نشانی ہے۔

اگرچہ نفس اَمّارہ کو حسن تدبیر کے ذریعہ ''لوّامہ'' بنا دینا بھی اس کی اصلاح ہی ہے، لیکن نفس کی مکمّل اصلاح یہ ہے کہ حسن تدبیر اور جہد مسلسل کے ذریعے اُسے مطمئنہ بنا دیا جائے۔ اور جب کسی کا نفس بفضلہٖ تعالیٰ مطمئنہ بن جاتا ہے تو حدیث پاک کی ایک دُعا سے اس کی تین صفات وعلامات معلوم ہوتی ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا کامل ومکمّل یقین (۲) رضا بالقضا، یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلوں پر راضی رہنا، نعمتوں میں شکر کے ذریعے اور مصیبتوں میں صبر کے ذریعے۔ (۳) عطائے الٰہی پر قناعت اختیار کرنا۔ یعنی حق وحلال کی محنت اور جائز کوشش کے بعد جو چیز مل جائے اسے اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھ کر قبول کر لینا اور مزید کی ہوس ولالچ نہ کرنا۔ اس کے لیے ایک دُعا ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً، تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ، وَتَرْضَىٰ بِقَضَائِكَ، وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ." (رواه الحافظ ابن عساكر وأخرجه ابن كثير)

''اے اللہ! میں آپ سے نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں، جو آپ کی ملاقات کا یقین رکھتا ہو، آپ کے فیصلے پر راضی ہو اور آپ کی عطا پر قناعت کرے۔''

صاحبو! نفس مطمئنہ کی اہمیت کا اندازہ ایک تو اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو اس دُعا کی تلقین فرمائی، جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل فرمایا۔ ہمیں بھی اس دُعا کا اہتمام اور اس کے حصول کے لیے جہد مسلسل کرنے کی ضرورت ہے۔ رزقنا اللہ بمنّہ وفضلہٖ آمین.

دوسرے اس کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس مؤمن بندے نے اپنے نفس کی اصلاح کی مخلصانہ مسلسل کوشش کر کے اسے مطمئنہ بنالیا، قرآنِ کریم میں اس کے لیے حسن خاتمہ کا اشارہ ملتا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ [الفجر : ۲۷ إلیٰ ۳۰]

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بشارت موت کے وقت اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت ہر اس مؤمن بندے کو دی جائے گی جس نے اپنے نفس کی کامل اور مکمّل اصلاح کر کے اُسے مطمئنہ بنالیا ہو۔

نفس کی اصلاح سببِ فلاح:

ظاہر ہے کہ یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے، اس لیے قرآنِ کریم میں ربّ العالمین نے سات قسمیں کھا کر اس حقیقت کو آشکارا اور واضح فرمایا کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، نفس کی مکمّل اصلاح کر لی وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو اس سے غافل رہا وہ ناکام ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ [الشمس : ۹ - ۱۰]

دوسری جگہ ربّ العالمین نے حقیقی کامیابی کے لیے جن تین اعمال کا تذکرہ فرمایا ان میں پہلا عمل نفس کی اصلاح، دوسرا عمل اہتمامِ ذکر اللہ اور تیسرا عمل اقامت

صلاۃ بیان فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ [الأعلیٰ: ١٤-١٥]

لہٰذا اتباعِ نفس سے اجتناب کرتے ہوئے اصلاحِ نفس کا اہتمام لازم ہے، اس کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عافیت کے ساتھ ہم سب کے ظاہر وباطن کی کامل اور مکمّل اصلاح فرما کر دارین کی فلاح عطا فرمائیں۔ آمین۔

آج ربِ کریم نے اپنے فضل وکرم سے اس عاجز کو ایک بڑے قرض سے سبک دوش فرما کر تحت الاسباب معاشی آسانی کا انتظام فرمادیا۔ فلك الحمد يا ربي ولك الشكر.

اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا، وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا، وَأَعْطِنَا وَلَا تُحْرِمْنَا، وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا، وَأَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا۔ آمين يا رب العالمين.

یومِ عرفہ/۱۴۴۱ھ

مطابق: ۳۱/جولائی/۲۰۲۰ء

قبل الجمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع: ٢١٠)

(۳)

بسم اللہ کے فضائل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبَانَ بْنِ عُثْمَان رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ يَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُوْلُ فِيْ صَبَاحِ كُلِّ يَوْمٍ وَمَسَاءِ كُلِّ لَيْلَةٍ: "بِسْمِ اللهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ، وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ"، ثلَاثَ مَرَّاتٍ فَيَضُرُّهٗ شَيْءٌ، فَكَانَ أَبَانُ قَدْ أَصَابَهٗ طَرَفُ فَالِجٍ، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَيْهِ، فَقَالَ لَهٗ أَبَانُ : مَا تَنْظُرُ إِلَيَّ؟ أَمَا إِنَّ الْحَدِيْثَ كَمَا حَدَّثْتُكَ، وَلٰكِنِّيْ لَمْ أَقُلْهُ يَوْمَئِذٍ، لِيُمْضِيَ اللهُ عَلَيَّ قَدَرَهٗ." (رواه الترمذي وابن ماجه وأبوداود، مشكوٰة المصابيح : ص۲۰۹/ باب ما يقول عند الصباح والمساء والمنام)

ترجمہ: حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد گرامی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو بندہ روزانہ صبح وشام تین مرتبہ یہ (دُعا) پڑھے: "بِسْمِ اللهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ". اسے نہ کوئی چیز نقصان پہنچائے گی (نہ وہ

آفات و امراض میں مبتلا ہوگا، اتفاق کی بات یہ ہے کہ جس وقت راویٔ حدیث (حضرت ابان رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان کر رہے تھے اس وقت وہ فالج زدہ تھے، (جس کی وجہ سے سامعین میں سے کسی کو شک ہوا کہ جب اس دُعا کی اِتنی یقینی تاثیر ہے تو پھر حضرت ابان کو فالج کیوں ہوا؟) چنانچہ وہ شخص آپ کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا (جس کو حضرت ابان رضی اللہ عنہ نے فراست ایمانی سے محسوس کرلیا) تو فرمایا کہ حدیث تو اسی طرح ہے جو میں نے بیان کی (یعنی بالکل صحیح ہے) البتہ جس دِن میں اس مرض میں مبتلا ہوا اس دِن میں نے یہ دُعا نہیں پڑھی تھی (بھول گیا تھا یا کہیے کہ مجھے بھلا دیا گیا) تاکہ حق تعالیٰ نے میرے مقدر میں جو لکھا تھا وہ پورا ہو۔"

"بسم اللہ" کی عظمت:

اللہ ربّ العزت نے اپنے کلامِ پاک کی ابتدا "بسم اللہ" یعنی اپنے نام سے فرمائی۔ روایت میں ہے کہ قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور سب سے پہلی سورت "اِقْرَأْ بِسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" ہے:

عَنْ عِكْرَمَةَ والحَسَنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّهُمَا قَالَا: "أَوَّلُ مَا نَزَلَ "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"، وَأَوَّلُ سُوْرَةٍ: "اِقْرَأْ." (ابن جریر، معارف القرآن: ۸ / ۷۷۹)

قرآنِ کریم کی پہلی آیت بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے شروع فرمائی اور پہلی سورت میں پہلا حکم بھی اپنے نام سے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا فرمایا، اس کے علاوہ بھی قرآنِ کریم میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے اُمّت کو اس کی ترغیب دی گئی کہ ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ [المزمل: ۸] "اپنے رب کا مقدّس نام لیتے رہیے"۔ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام اِتنی عظمت والا ہے کہ سارے عالم کا نظام اسی سے قائم ودائم ہے، جب تک کسی ایک بھی مؤمن

مخلص کی زبان پر اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام جاری رہے گا تب تک یہ سارا نظامِ کائنات جاری وباقی رہے گا۔

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى أَحَدٍ يَقُوْلُ : اَللّٰهُ، اَللّٰهُ." (مسلم، مشكوٰة المصابيح : ص۴۸۰/ باب لا تقوم الساعة إلا على أشرار الناس)

اس سے اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام کی عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

صاحبو! یہ تو اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہے کہ اس نے اپنے نہایت مہتم بالشان اور عظمت والے نام کو ہماری زبان پر بڑی آسانی سے جاری فرمادیا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ہزار مرتبہ بھی اپنے ناپاک منھ کو مشک وگلاب سے دھولیں تب بھی اس کا پاک نام لینا بے اَدبی سے خالی نہیں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے اَدبی است

اس نعمت الٰہی کا حق اور شکر یہ ہے کہ ہم بہ کثرت اس کا مقدّس نام لیتے رہیں؛ بلکہ ہر مباح، جائز اور قابل ذکر کام کی ابتدا اس کے نام سے کریں۔

ہر مناسب کام "بسم اللہ" سے شروع کرنا انبیاء کی سنّت ہے:

کتاب وسنّت سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ "بسم اللہ" سے ہر مباح، جائز اور مناسب کام شروع کرنا حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدّس سنّت ہے۔

(۱) چنانچہ قرآنِ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ذکر کیا کہ طوفان کے وقت جب کشتی میں سوار ہونے کا وقت آیا تو آپ کو یقین تھا کہ طوفان اگرچہ بہت خطرناک ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لے کر کشتی میں سوار ہو گئے تو بڑے سے بڑا طوفان بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، آپ نے اپنے متبعین سے اس موقع پر فرمایا جسے قرآنِ کریم نے نقل کیا:

﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [هود : ٤١]

(اس کشتی میں) ''اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سوار ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے اس کا چلنا بھی ہے اور رُکنا بھی، بلاشبہ میرا رب بڑا ہی غفور ورحیم ہے۔''

آپ نے اس اہم اور یادگار سفر کو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے شروع کیا، پھر جو ہوا اسے عاجز نے مرحوم راحتؔ اندوروی کے شعر میں ترمیم کر کے کہا کہ

بسم اللہ کی برکت نے کشتی کا نصیب چمکدار کر دیا
اِس پار کے تھپیڑوں نے اُس پار کر دیا

(۲) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلّق قرآنِ کریم نے نقل کیا ہے کہ جب آپ نے ملکۂ سبا بلقیس کے نام ایک تاریخی اور شاہی خط جاری کیا تو اس کی ابتدا ''بسم اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے فرمائی:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ [النمل : ٣٠]

(۳) نیز حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے باب میں اسرائیلی روایت سے ایک مشہور واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے دُنیا میں سب سے پہلے مہمان نوازی کی رسم جاری فرمائی اور آپ کا معمول تھا کہ آپ کبھی مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ ایک مرتبہ جب کوئی مہمان نہ آیا تو آپ کھانے کے وقت تلاش میں نکل گئے، ایک اجنبی بوڑھا ملا تو اسے دعوت دے کر دسترخوان پر لے آئے اور اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لے کر کھانا شروع کرنے کا حکم دیا، اس اجنبی نے کہا کہ میں نہ اللہ کو جانتا ہوں نہ مانتا ہوں، لہٰذا اس کا نام نہیں لے سکتا، یہ سن کر آپ ناراض ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لیے بغیر کھانا کھلانے سے انکار کر دیا، وہ مایوس ہو کر چلا گیا، اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ

السلام وحی لے کر تشریف لائے اور فرمانِ الٰہی سنایا کہ اس بوڑھے کو ساری زندگی اس کے کفر کے باوجود ہم نے کھلایا اور تم نے آج ایک لقمہ دینے سے بخل کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام گھبرائے، فوراً اس بوڑھے کو بلایا اور معذرت پیش کرنے لگے، بوڑھے نے کہا کہ پہلے آپ یہ بتایئے کہ مجھے اپنے دسترخوان سے اُٹھایا کیوں؟ اور بلایا کیوں؟ تب آپ نے پورا واقعہ اور پس منظر کہہ سنایا، اس پر وہ بوڑھا اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا، کہنے لگا: جو رب اس قدر کریم اور مہربان ہو میں اس پر کیوں کر ایمان نہ لاؤں؟ (تفسیر قرطبی، معارف القرآن: ۴/ ۶۴۷)

''بسم اللہ'' کی برکات وفوائد:

ان حقائق سے واضح ہوا کہ ہر مباح، جائز اور قابل ذکر ومناسب کام کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے کرنا انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدّس سنّت ہے، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیم وہدایت بھی ہمیں یہی ہے کہ ہر مباح وجائز اور قابل ذکر ومناسب فعل وعمل کے وقت اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے، جیسے گھر میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، کھانا پکاتے اور کھاتے وقت، پانی پیتے پلاتے وقت، پڑھتے پڑھاتے وقت، خط یا تحریر لکھتے وقت، ازدواجی تعلق کے وقت، وضو اور غسل کے وقت، سواری پر سوار ہوتے وقت، ہر صبح اور شام کے وقت وغیرہ، مطلب یہ ہے کہ دن رات کے اوقات ولمحات میں جب کبھی کوئی قابل ذکر ومناسب کام کریں تو پہلے اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لیں اور بسم اللہ سے اس کام کی ابتدا کریں۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم وہدایت اور مستحب حکم وعمل بظاہر تو نہایت مختصر اور آسان ہے، جس میں کسی کے لیے نہ کوئی حرج ہے نہ خرچ ہے؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی

توفیق عطا فرمادیں تو اس کی بڑی برکتیں اور فوائد ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس عمل کی برکت سے ہر ہر کام اور قدم قدم پر بندے کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجاتا ہے، اس بہانے سے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور رِشتہ مضبوط ہوجاتا ہے، یقین جانیں کہ تعلق مع اللہ کا آسان ترین اور بہترین ذریعہ یہ ہے کہ بندہ اپنے ہر مناسب کام کو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے شروع کرے۔ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے شروع کیا جاتا ہے اس میں از اوّل تا آخر برکت ڈال دی جاتی ہے۔ اور جس کام کو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام کے بغیر کیا جاتا ہے وہ نامکمّل رہتا ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ".

(كنز العمال : ١ / ٥٥٥)

نیز ہر کام کو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام سے شروع کرنا اللہ تعالیٰ سے وفاداری اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے، کیوں کہ بندہ ہر کام کی ابتدا ''بسم اللہ'' سے کر کے زبانِ حال سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے نام کے بغیر میرا کوئی چھوٹا بڑا دینی، دُنیوی، مباح، جائز اور قابل ذکر و مناسب کام مکمّل اور بابرکت نہیں ہوسکتا، میرا کوئی بھی کام اپنے کمال سے نہیں، اللہ تعالیٰ کے نام، حکم اور اس کے کرم سے ہوگا، اس لیے میں ہر کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں، اور بلا شبہ جب بندہ یہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو پھر ربّ العالمین بھی بندہ نوازی میں کمی نہیں فرماتا، ''بسم اللہ'' کی برکت سے اسے بہت سے فوائد و فضائل عطا فرماتا ہے۔

”بسم اللہ“ کے مختلف مواقع مع فضائل:

چنانچہ احادیث طیبہ میں ہے کہ مختلف مواقع پر اہتمامِ بسم اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک معمول رہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ترغیب اور فضائل بھی منقول ہیں، مثلاً گھر میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت ”بسم اللہ“ کا اہتمام کرنا خیر و برکت اور ہدایت وحفاظت کا سبب ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ مَالِكِ الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا وَلِجَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ فَلْيَقُلْ: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللهِ وَلَجْنَا، وَعَلَى اللهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا"، ثُمَّ لِيُسَلِّمْ عَلٰى أَهْلِهِ." (رواه أبوداود، مشكوٰة: ص۲۱۵/ باب الدعوات في الأوقات)

جب کوئی شخص گھر میں داخل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ دعا پڑھے: اَللّٰهُمَّ ...الخ، یعنی اے اللہ! میں تجھ سے گھر میں داخل ہونے اور گھر سے باہر نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں، اللہ کے نام سے ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں اور ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا جو ہمارا رب ہے، اس کے بعد وہ اپنے گھر والوں کو سلام کرے۔ (اس سے خیر و برکت نصیب ہوگی)۔

اسی طرح گھر سے نکلنے کے متعلّق حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا خَرَجَ الرَّجُلُ مِنْ بَيْتِهٖ فَقَالَ: "بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ"، يُقَالُ لَهٗ حِيْنَئِذٍ: هُدِيْتَ وَكُفِيْتَ وَوُقِيْتَ، فَيَتَنَحّٰى عَنْهُ الشَّيْطَانُ، وَيَقُوْلُ شَيْطَانٌ آخَرُ: كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هُدِيَ

وَكُفِيَ وَوُقِيَ." (رواه أبوداود والترمذي، مشكوٰة المصابيح : ص۲۱۵)

جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ دُعا پڑھتا ہے: بسم اللہ.....الخ، یعنی میں اللہ کا نام لے کر نکلتا ہوں اور میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، گناہوں سے بچنے کی طاقت اور عبادت کرنے کی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، تو اس وقت اس سے (من جانب اللہ فرشتے کے ذریعے) کہا جاتا ہے کہ تجھے ہدایت دی گئی (تمام اہم امور و معاملات میں) اور تجھے (اللہ پاک کے علاوہ سے) مستغنی کر دیا گیا اور تو تمام شرور و فتن سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ (یہ سن کر) شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرا شیطان اس سے کہتا ہے کہ تو اس شخص پر کیسے قابو پا سکتا ہے جو ہدایت، کفایت اور حفاظت سے مالا مال کیا گیا۔ گویا گھر سے ''بسم اللہ'' پڑھ کر نکلنا روحانی اسلحے سے لیس ہو کر نکلنا ہے۔

اسی طرح کھانا پکاتے وقت اور کھاتے وقت بھی ''بسم اللہ'' کا اہتمام کیا جائے، اگر ہماری خواتین باوضو ہو کر ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا پکانے کا اہتمام کریں تو ان شاء اللہ اس کھانے میں من جانب اللہ لذت و برکت ڈال دی جائے گی۔ حدیث پاک میں کھاتے وقت ''بسم اللہ'' کی ترغیب آئی ہے، حتیٰ کہ بچّوں کی تربیت کی گئی کہ ''بسم اللہ'' بول کر کھانا شروع کریں۔

حدیث پاک میں مروی ہے کہ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما جو حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے سابق شوہر کے بیٹے تھے، جب حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت میں آ گئے، فرماتے ہیں کہ اس دوران کہ میں ایک دِن کھانا کھا رہا تھا تو میرا ہاتھ کھانے کی پلیٹ میں دیگر بچّوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، جیسا کہ بچّوں کی عادت ہوتی ہے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تربیت فرماتے

ہوئے تین مختصر آداب سکھائے: "بِسْمِ اللّٰهِ" پہلا ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کھانا کھاؤ۔ "وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ" دوسرا ادب یہ ہے کہ اپنے داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ "وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ". اور تیسرا ادب یہ ہے کہ اپنے سامنے (اور پاس) سے کھاؤ۔

(متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۳۶۳/ كتاب الأطعمة)

نیز روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو کھانا ''بسم اللہ'' سے شروع کیا جاتا ہے اس میں برکت ہوتی ہے اور شیطان کی شرکت سے حفاظت ہوتی ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ کھانے کی ابتدا میں ''بسم اللہ'' بھول جائے تو اخیر تک جب یاد آجائے پھر ''بسم اللہ'' اس طرح پڑھ لیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ." (سنن الترمذي، مشكوٰة: ص۳۶۵)

بسم اللہ کے بغیر کھانا بے برکت ہوتا ہے، کیوں کہ حدیث کے مطابق اس کھانے میں شیطان شرکت کر لیتا ہے۔

عہدِ نبوی کا ایک واقعہ:

اس سلسلے میں ایک واقعہ منقول ہے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (کسی دعوت کے موقع پر تھے) کھانا لایا گیا، ہم نے اس کھانے میں کھلی برکت محسوس کی؛ لیکن کھانے کے اخیر میں محسوس ہوا کہ برکت نہ رہی، کھانے کے شروع میں بہت زیادہ برکت کا احساس ہوا، اخیر میں بہت شدّت سے بے برکتی کا احساس ہوا، ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کر کے سبب دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّا ذَكَرْنَا اسْمَ اللّٰهِ حِيْنَ أَكَلْنَا، ثُمَّ قَعَدَ مَنْ أَكَلَ، وَلَمْ يُسَمِّ اللّٰهَ، فَأَكَلَ مَعَهُ الشَّيْطَانُ." (رواه في شرح السنة، مشكوٰة : ص۳۶۵)

''درحقیقت کھانے کے شروع میں ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھا، کھانے کی برکت اسی کا اثر اور نتیجہ تھا؛ لیکن بعد میں ایک ایسا شخص شریک ہوگیا جس نے ''بسم اللہ'' پڑھے بغیر کھانا شروع کردیا، جس کی وجہ سے شیطان اس میں شریک ہوگیا اور برکت ختم ہوگئی۔''

اُمّت کی ہدایت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے اس کا مشاہدہ کرادیا؛ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ کسی کھانے میں متعدد لوگ شریک ہوں تو ان میں سے ایک شخص قدرے آواز سے ''بسم اللہ'' پڑھ لے، تاکہ اسے سن کر دوسروں کو بھی یاد آجائے اور وہ بھی پڑھ لیں، جس سے کھانے میں برکت اور شیطان کی شرکت سے حفاظت ہوجائے۔

اِزدواجی تعلق کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت:

اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ جب زوجین ازدواجی تعلق کے وقت اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لیتے ہیں اور (کشف عورت یعنی بالکل برہنہ ہونے سے پہلے) مسنون دعا کا اہتمام کرتے ہیں تو حق تعالیٰ زوجین ہی کی نہیں؛ بلکہ اس تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کی بھی شیطان کی شرارت سے حفاظت فرماتے ہیں، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی کہ

"لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: "بِسْمِ اللهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا." (متفق عليه، مشكوٰة: ص۲۱۲، كتاب الدعوات في الأوقات)

''جب تم میں سے کوئی (زوج) صحبت کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھ لے: ہم اللہ تعالیٰ کے نام سے اس تعلق کو قائم کرتے ہیں، اے اللہ! ہمیں اور اس تعلق کے نتیجے

میں پیدا ہونے والی اولاد کو بھی شیطان کی شرارت واثرات سے محفوظ فرما۔'' تو ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

وضو اور غسل کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت:

اسی کے ساتھ جب بندہ وضو اور غسل کے وقت ''بسم اللہ'' کا اہتمام کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی برکت سے جسم کے ظاہر کو گندگی سے اور باطن کو گناہوں سے پاک فرما دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا:

"مَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللهِ، فَإِنَّهُ يُطَهِّرُ جَسَدَهُ كُلَّهُ." (رواه الدارقطني، مشكوٰة المصابيح : ص٤٧/ باب سنن الوضوء)

مطلب یہ ہے کہ جس نے وضو کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا، یعنی ''بسم اللہ'' پڑھی، تو یہ اس کے لیے گندگی سے پاکی اور گناہوں سے معافی کا سبب ہے۔ یہی حکم غسل کا بھی ہے، کیوں کہ وہ مکمّل طہارت ہے۔

سوار ہونے کے موقع پر ''بسم اللہ'' کی فضیلت:

نیز جب بندہ سواری پر سوار ہوتے وقت ''بسم اللہ'' اور مسنون دعا کا اہتمام کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی برکت سے خطرات سے حفاظت اور گناہوں سے نفرت پیدا فرما دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سواری پیش کی گئی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے سوار ہوتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھی، پھر سوار ہو کر ''الحمد للہ'' پڑھی، اس کے بعد یہ دعا پڑھی:

"سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا، وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ، وَإِنَّا إِلٰى

رَبَّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ."

''پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کیا، ہمیں تو اس کی طاقت حاصل نہ تھی اور بلاشبہ ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

اس کے بعد تین مرتبہ ''الحمدللہ'' اور تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر یہ دعا پڑھی:

"سُبْحَانَكَ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ."

''اے اللہ! تو پاک ہے، بے شک میں نے ہی اپنے نفس پر ظلم کیا، تو مجھے بخش دے، تیرے علاوہ گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں۔''

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنسے، کسی نے وجہ دریافت کی تو فرمایا: میں نے (کسی موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سوار ہونے کے بعد ہنسے، تو اگرچہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم تو نہیں؛ لیکن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں یہ عمل کیا) اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا:

"إِنَّ رَبَّكَ لَيَعْجَبُ مِنْ عَبْدِهٖ إِذَا قَالَ: "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ،" يَقُوْلُ اللّٰهُ: "يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ غَيْرِيْ." (رواه أحمد، والترمذي وأبوداود، مشكوٰة:٢١٤)

''جب بندہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے رب! میرے گناہوں کو بخش دے، تو پروردگار اپنے بندے سے راضی اور خوش ہوجاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔''

معلوم ہوا کہ سواری پر سوار ہونے کے وقت ''بسم اللہ'' کے ساتھ ان دعاؤں کا اہتمام گناہوں سے مغفرت کا سبب ہے۔ دوسری روایت میں ہے:

عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَمَانٌ لِأُمَّتِيْ مِنَ الْغَرَقِ إِذَا رَكِبُوْا فِيْ السَّفِيْنَةِ أَنْ يَقُوْلُوْا: "بِسْمِ اللهِ مَجْرِهَا وَمُرْسَاهَا إِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَحِيْمٌ." (عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول إذا ركب السفينة)

''میری اُمّت کشتی میں سوار ہوتے وقت یہ دعا پڑھے گی: بسم اللہ.....الخ، تو اس کی برکت سے حق تعالیٰ اسے ڈوبنے سے محفوظ رکھیں گے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سواری پر سوار ہونا گناہوں سے مغفرت اور خطرات سے حفاظت کا سبب ہے۔

صبح وشام تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا حفاظت کا سبب ہے:

علاوہ ازیں حدیث مذکور میں ہے کہ صبح وشام روزانہ تین مرتبہ یقین اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام اس طرح لینا تمام زمینی وآسمانی اور سلطانی آفات و امراض سے حفاظت کا سبب ہے:

"بِسْمِ اللهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ، وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ."

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وصلحائے اُمّت کو اس پر یقین کامل تھا، اس لیے وہ ان دُعاؤں کا بہت اہتمام فرماتے تھے، تو واقعی حق تعالیٰ نے اس کی برکت سے ان کی مختلف مواقع میں حفاظت بھی فرمائی، جیسا کہ واقعات میں منقول ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فارس کے مجوسیوں نے کہا کہ آپ اسلام کی حقّانیت کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ﴾ اور ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ تو آپ ہمیں اس پر کوئی کرامتی نشانی بتادیں، تاکہ ہم بھی اسلام قبول کر لیں، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک ہے، تم زہر قاتل لاؤ، جب وہ لے کر

آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے بسم اللہ پڑھ کر پی لیا (چوں کہ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل اخلاص و یقین سے بھرپور تھا؛ اس لیے) آپ رضی اللہ عنہ پر اس زہر کا ذرّہ برابر اثر نہ ہوا، اس سے متاثّر ہو کر وہ مسلمان ہو گئے۔ (تفسیر کبیر: ۱/ ۱۷۲، توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۱/ ۸۴)

اسی طرح حضرت ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کی باندی دشمنی میں ایک عرصے تک ان کو کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملا کر دیتی رہی؛ مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، تو وہ مجبور ہو کر خود ہی ساری حقیقت بیان کر کے وجہ دریافت کرنے لگی، تب آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ کہنے لگی کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہو، اس لیے میں آپ سے جلدی الگ ہونا چاہتی تھی۔

یہ سن کر آپ نے کوئی انتقام لینے کے بجائے ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۳٤) پر عمل کرتے ہوئے اسے آزاد کر دیا۔ اور زہر کے بے اثر ہونے کی وجہ ارشاد فرمائی کہ میں اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لیے بغیر کوئی چیز کھاتا یا پیتا نہیں ہوں (نہ کوئی قابل ذکر کام کرتا ہوں) یہ اسی کا اثر ہے۔ (قلیوبی: ۵۳، مستفاد از: خطباتِ منور: ۲/ ۱۹۲)

حق تعالیٰ اپنی ذاتِ عالی سے سب کچھ ہونے اور اس کی مرضی و حکم کے بغیر اس کے غیر سے کچھ نہ ہونے کا یقین کامل ہمیں عطا فرما کر ہر مباح و جائز اور قابل ذکر مناسب کام کے وقت اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مقدّس نام لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

۲۳/ ذی الحجہ/ ۱۴۴۱ھ
مطابق: ۱۴/ اگست/ ۲۰۲۰ء
قبل الجمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۴)

عمل قلیل پر اجرِ عظیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللهَ كَتَبَ الحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ، فَلَمْ يَعْمَلْهَا، كَتَبَهَا اللهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا، كَتَبَهَا اللهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ، وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ، فَلَمْ يَعْمَلْهَا، كَتَبَهَا اللهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا، فَعَمِلَهَا، كَتَبَهَا اللهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۲۰۷/ باب سعة رحمة الله)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ نے نیکیاں اور بُرائیاں لکھیں۔ (یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ لوحِ محفوظ میں نیکیوں اور بُرائیوں کے متعلّق یہ تفصیل لکھ دیں کہ) جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے، پھر وہ اس پر عمل نہ کر سکے (یعنی ارادے کے باوجود کسی عذر کی بنا پر اس نیکی کو کرنے پر قادر نہ ہو سکے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس اس ارادے ہی کو ایک پوری نیکی

لکھ لیتا ہے۔ اور جو شخص نیکی کا ارادہ کرے، پھر اس پر عمل بھی کرے تو حق تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس (کم از کم) دس گُنا سے سات سو گُنا تک بلکہ (اخلاص کے بقدر) اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھ لیتا ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس بندۂ مؤمن کے لیے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے بحساب اخلاص و ادائیگیٔ شرائط و آداب اس سے بھی زیادہ اجر و ثواب لکھتا ہے) اور جو شخص کسی بُرائی کا ارادہ کرتا ہے، پھر (اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے) اس بُرائی سے باز رہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے۔ اور اگر اس نے بُرائی کا ارادہ کر کے اس کا ارتکاب بھی کر لیا (اس بُرائی میں مبتلا ہو گیا) تو اس کے لیے ایک ہی بُرائی لکھتا ہے۔

تمہید:

اللہ ربّ العالمین پر مکمّل ایمان لانے کے بعد اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا کوئی کام یا کلام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے ''عمل صالح'' کہلاتا ہے، بندۂ مؤمن اگر اخلاصِ نیت، احسانی کیفیت اور اتباعِ سنّت کا لحاظ کرتے ہوئے عمل صالح کا اہتمام کرے، پھر شرکِ جلی، شرکِ خفی (ریاکاری) اور بعض خاص معاصی کے ارتکاب سے اس عمل کو ضائع نہ کر دے تو اس کا وہ عمل صالح خواہ مختصر اور معمولی ہی کیوں نہ ہو؛ مگر حق تعالیٰ قیامت میں اپنے فضل و کرم سے اس پر اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ [الشوریٰ:۲۳]

''اور جو شخص نیکی کرے گا ہم اس کے لیے اس (نیکی) کے حسن میں اضافہ کر دیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا قدردان ہے۔''

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ نیکی کرنے والے کو دوبارہ نیکی کی توفیق عطا

فرمائیں گے۔(ابن کثیر)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ادائے نیکی میں جو کمی وکوتاہی ہوئی ہم اُسے حسن وخوبی میں بدل دیں گے، کیوں کہ ہم غفور بھی ہیں شکور بھی۔ (یعنی خطاؤں کو معاف کرنے والے اور نیکیوں کی قدر کرنے والے)۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں کریں گے، بلکہ جس قدر اجر اس نیکی کا حق ہے ہم اخلاص کے سبب اس سے کہیں زیادہ دیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتاب وسنّت میں اس مضمون کو سمجھانے کے لیے متعدد مثالیں بیان کر کے بندوں کو اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی گئی، تاکہ بندے اِس دارالعمل میں اعمالِ صالحہ کا اہتمام کر کے دارین میں ربِ کریم کے فضلِ عظیم کے مستحق بن جائیں۔

ایک نیکی کی قیمت:

اس سلسلے میں عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کو اس کی اچھّی اور سچّی طلب پر من جانب اللہ توفیقِ عمل مل جائے، پھر وہ اخلاصِ نیت، احسانی کیفیت اور اتباعِ سنّت کا لحاظ کرتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے، اس کے بعد شرکِ جلی و شرکِ خفی (ریاکاری) ایذا رسانی اور بعض مخصوص کبائر کے ارتکاب کے ذریعے اپنے اعمالِ صالحہ کو ضائع نہ کردے تو اس بندے کے عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کا عطا ہونا ربِ کریم کے فضلِ عظیم کی دلیل ہے۔

اگر بندۂ مؤمن کے عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کے بجائے اجرِ قلیل بلکہ ایک نیکی بھی مل جائے تو رب کی رحمت کی قسم! یہ بھی ربِ کریم کے فضلِ عظیم کی دلیل ہے، کیوں کہ نیکی دراصل آخرت کی کرنسی ہے، دنیا میں مال کا چلن ہے، تو آخرت وقیامت میں نیک

اعمال کا چلن ہوگا، یہاں بظاہر مال کام آتا ہے۔﴿جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ [النساء:۵] تو وہاں نیک اعمال سے کام بنے گا، حتیٰ کہ ایک نیکی بھی نجات کا ذریعہ بن جائے گی، اس لیے نیکی کی قیمت قیامت میں معلوم ہوگی جب اس پر جنّت وجہنّم کا فیصلہ ہوگا۔

آخرت میں نیکی کی قیمت:

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الآخرۃ'' میں ایک روایت بلا سند کے نقل فرمائی ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا، صورتِ حال یہ ہوگی کہ اس کے میزانِ عمل کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے اور اسے صرف ایک نیکی کی ضرورت ہوگی۔

"فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَحْمَةً مِنْهُ : "اِذْهَبْ فِي النَّاسِ، فَالْتَمِسْ مَنْ يُعْطِيْكَ حَسَنَةً، أُدْخِلْكَ بِهَا الْجَنَّةَ."

حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کے اظہار کے لیے اس سے فرمائیں گے کہ لوگوں کے پاس جاؤ! اور تلاش کر کے لوگوں کے پاس سے ایک نیکی لے آؤ، تا کہ میں تمھیں جنّت میں داخل کردوں۔ اب وہ (بندۂ مؤمن) لوگوں میں ایک نیکی تلاش کرتا پھرے گا؛ لیکن کوئی بھی اسے نیکی دینے کے لیے تیار نہ ہوگا، ہر ایک سے نیکی کا سوال کرنے پر یہی جواب ملے گا کہ

"خِفْتُ أَنْ يَخِفَّ مِيْزَانِيْ، فَأَنَا أَحْوَجُ مِنْكَ إِلَيْهَا، فَيَيْأَسُ."

مجھے خود اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں میری نیکیوں کا پلڑا ہلکا نہ ہوجائے (لہٰذا جس طرح تو نیکی کا محتاج ہے اسی طرح بلکہ) میں تجھ سے بھی زیادہ نیکیوں کا محتاج ہوں، اس لیے میں تجھے اپنی نیکی نہیں دے سکتا، وہ شخص مایوس ہوجائے گا، عین اسی وقت اچانک ایک بندہ اس سے پوچھے گا: کیوں جی! کیا تلاش کر رہے ہو؟ "فَيَقُوْلُ:

حَسَنَةً وَاحِدَةً." وہ کہے گا کہ ایک نیکی درکار ہے، جس کی تلاش میں مختلف لوگوں کے پاس گیا، درخواست کی کہ مجھے ایک نیکی دے دی جائے؛ لیکن اپنی ہزاروں، لاکھوں بلکہ بے حساب و بے شمار نیکیوں میں سے بھی کسی نے ایک نیکی نہیں دی، ہر ایک نے نیکی دینے میں بخل سے کام لیا، کیا اپنے کیا پرائے، جب یہ بندہ اپنا دُکھڑا سنائے گا تو وہ شخص کہے گا کہ بھائی! میرے نامۂ اعمال میں کل ملا کر ایک ہی نیکی ہے، جب ایک نیکی کی کمی تیرے لیے جنّت سے رُکاوٹ بن سکتی ہے تو میری ایک نیکی مجھے کیوں کر جنّت میں داخل کرا سکتی ہے؟ ہم دونوں جہنّم میں جائیں اس سے اچھّا ہے کہ میری ایک نیکی تو لے لے اور جنّت کا مستحق بن جا، وہ بندہ نیکی لے کر خوشی خوشی دربارِ الٰہی میں حاضر ہوگا، تو ربّ العالمین جاننے کے باوجود اپنے فضلِ عظیم کے اظہار کے لیے دریافت فرمائے گا کہ یہ نیکی کہاں سے لے آئے ہو؟ وہ عرض کرے گا کہ فلاں بندے نے دی، پھر اس نیکی ہبہ کرنے والے کو بلا کر کہا جائے گا: "كَرَمِيْ أَوْسَعُ مِنْ كَرَمِكَ." کریموں کا کریم اور سخیوں کا سخی تو میں ہوں، میرا جود و کرم تجھ سے بہت زیادہ ہے۔ "خُذْ بِيَدِ أَخِيْكَ، وَانْطَلِقَا إِلَى الجَنَّةِ." اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ اور دونوں جنّت میں چلے جاؤ۔

(الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الآخرۃ)

حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے کو اپنے مواعظ میں بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ ''رحمت خدا بہانہ می جوید، بہانمی جوید''۔

عملِ قلیل پر اجرِ عظیم ربِ کریم کے فضلِ عظیم کی دلیل:

ایک نیکی کی کیا قیمت ہے؟ اس کا صحیح اندازہ تو قیامت ہی میں ہوگا؛ لیکن صاحبو! وہاں نیکیوں کا اَجر تو ہوگا، عمل کا موقع نہیں ہوگا، آج اگر چہ کسی بھی نیکی کا (پورا) اجر دنیا میں تو نہیں مل سکتا؛ لیکن عمل کا موقع ہر ایک کے لیے ہے، اگر ہم اس سے فائدہ

اٹھا کر اعمالِ صالحہ کا اخلاصِ نیت، احسانی کیفیت اور اتباعِ سنّت کے ساتھ اہتمام کرتے ہوئے اعمالِ صالحہ کے اَجر وثواب کو ضائع کرنے والی بُرائیوں (جیسے شرکِ جلی وخفی اور بعض معاصی) سے اجتناب کریں تو یقیناً ربِ کریم ہمارے عمل قلیل پر بھی اجر عظیم عطا فرمائیں گے، اور یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے، اتنا ہی نہیں؛ بلکہ بندہ اگر نیک عمل کا سچا و پکّا مخلصانہ ارادہ بھی کرلے، پھر کسی وجہ سے وہ اس پر عمل نہ بھی کرسکے تو حق تعالیٰ مخلص بندے کے ارادۂ عمل صالح پر ایک نیکی عطا فرماتے ہیں۔ اور اگر عمل صالح کا اہتمام کرلے تو اخلاص کے مطابق اس عمل صالح پر دس سے سات سو گُنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اَجر وثواب عطا فرمائیں گے، جس کا تذکرہ حدیث پاک میں ہوا۔ اور اسی کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام : ١٦٠)

''جو بندہ ایک نیکی لے کر قیامت کے دِن ہمارے پاس آئے گا ہم اپنے فضل سے اس کا اَجر دس گُنا بڑھا کر عطا فرمائیں گے۔''

حضرات مفسرین کے بقول یہ ایک نیکی کا دس گُنا اَجر تو کم از کم ہے، ورنہ قرآنِ کریم کی دیگر آیات واحادیث مبارکہ میں بعض ایسے اعمال بھی ملتے ہیں جن کا اجر دس گُنا نہیں؛ بلکہ کئی سو گُنا حتیٰ کہ کئی ہزار گُنا بھی بیان ہوا ہے، مثلاً اپنے مالِ حلال سے اخلاص کے ساتھ مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کا کم از کم اَجر وثواب قرآنِ کریم نے سات سو گُنا بلکہ اللہ تعالیٰ جس مخلص کے لیے چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ اَجر عطا فرماتے ہیں، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

عَلِيْمٌ﴾ (البقرة : ۲۶۱)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں (مراد صدقات، خیرات اور نفقات ہیں) اخلاص کے ساتھ مالِ حلال خرچ کرنے کا کم از کم اَجر سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ بیان ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ابتداءً کم از کم سات سو گنا ہے، پھر جس قدر اخلاص بڑھے گا اجر بھی بڑھے گا، وہ بڑے وسیع خزانے والا ہے۔

اسی طرح قرآنِ کریم میں صبر اور عفو پر بے حساب اَجر وثواب کا اعلان ہوا:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر : ۱۰)

مصیبتوں میں صبر کرنا (خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں پیش آئے یا اجتناب عن المعاصی میں) بے حساب اجر وثواب کا سبب ہے۔ نیز عفو کے متعلق ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الشوریٰ : ۴۰)

اگر کسی مظلوم نے انتقام پر قدرت کے باوجود اپنے قصوروار کو معاف کر دیا (بشرطیکہ اس معافی سے ظالم کے ظلم وتکبّر میں اضافے کا اندیشہ نہ ہو) تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی کے ذمّے ہے۔ ربِ کریم نے معافی کے اجرِ عظیم کی مقدار کو بیان نہیں فرمایا، کیوں کہ وہ بے حساب و بے شمار ہے۔ واللہ اعلم۔

عبادات میں عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں:

اس کے علاوہ بھی احادیث طیبہ میں مختلف چھوٹے چھوٹے اعمال پر بڑے بڑے اجر وثواب کی بشارتیں دی گئی ہیں، خواہ ان اعمال کا تعلق عبادات سے ہو، معاشرت سے ہو، معاملات سے ہو یا اخلاقیات سے ہو۔ یہاں بفضلہٖ تعالیٰ اسلام کے ان تمام شعبوں کے عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

(۱) عبادات میں یوں تو بہت سے اعمال ہیں، ان میں ایک چھوٹا سا عمل وضو

بھی ہے، جو بالواسطہ عبادت ہے۔ احادیث طیبہ میں منقول ہے کہ جو بندہ اخلاصِ نیت اور اتباعِ سنّت کے مطابق وضو کرے، وضو کے بعد مسنون دعا پڑھے، پھر حسب موقع دو رکعات تحیۃ الوضو پڑھ لے تو اس عمل قلیل پر اجر عظیم کو متعدد احادیث میں بیان فرمایا، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ تین اعمال ایسے ہیں جن سے حق تعالیٰ (صغیرہ) گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں اور جنّت میں درجات بلند فرماتے ہیں:

(۱) مشقت کے باوجود سنّت کی رعایت کے ساتھ مکمّل وضو کرنا۔

(۲) مسجد کی طرف بہ کثرت قدموں کا بڑھانا، اُٹھانا، رکھنا۔ (یعنی مسجد گھر سے دور ہو، پھر بھی مسجد جانے کا اہتمام کرنا یا مسجد میں بار بار آنا جانا۔)

(۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ (خواہ مسجد میں رہ کر انتظار ہو یا دُکان ومکان وغیرہ میں)۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا يَمْحُو اللهُ بِهِ الْخَطَايَا وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوْا: بَلٰى، يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: إِسْبَاغُ الوُضُوْءِ بِالْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الخُطَا إِلَى المَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ." (رواه مسلم، مشكوٰة: ص۳۸، كتاب الطهارة)

دوسری ایک حدیث میں ہے کہ جو بندہ اچھّی طرح آداب واخلاص کے ساتھ سنّت کے مطابق وضو کرکے کلمۂ شہادت:

"أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ."

پڑھے۔ اور وضو کے بعد یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ."

اس کے لیے جنّت کے آٹھوں دروازے قیامت میں کھول دیے جائیں گے، تاکہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے، حالانکہ دخولِ جنّت کے لیے تو ایک دروازے کا کھل جانا بھی رب کریم کے فضل عظیم کی دلیل ہے، تاہم اس بندے کے لیے اکراماً تمام دروازے کھول دیے جائیں گے۔ (مسلم، ترمذی، مشکوٰۃ:۳۹، کتاب الطہارۃ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جو بندہ اخلاصِ نیت اور اتباعِ سنّت کے ساتھ وضو کر کے خشوع وخضوع کے ساتھ حسب موقع دو رکعات تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد پڑھے اس کے لیے جنّت واجب ہو جاتی ہے۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ، فَيُحْسِنُ وُضُوْئَهُ، ثُمَّ يَقُوْمُ، فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلاً عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ، إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ."

(رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٩)

(۲) اسی طرح بازار جہاں عموماً احکامِ شریعت اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت بلکہ معصیت کا ماحول قابل لاحول ہوتا ہے وہاں اگر کوئی مؤمن مخلص ذکر قلیل وعمل قلیل کا اہتمام کر لے تو حق تعالیٰ اپنے فضل سے اسے اجر عظیم عطا فرماتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ جو بندہ بازار میں ایک مرتبہ کلمہ توحید کو ان الفاظ و کلمات کے ساتھ پڑھے:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ، وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ."

تو حق تعالیٰ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھتے ہیں اور دس لاکھ بُرائیاں (چھوٹے گناہ) معاف فرماتے ہیں، جنّت میں دس لاکھ درجات بلند فرماتے ہیں اور

جنّت میں ایک محل تعمیر کراتے ہیں۔

"كَتَبَ اللهُ لَهٗ أَلْفَ أَلْفِ حَسَنَةٍ، وَمَحَىٰ عَنْهُ أَلْفَ أَلْفِ سَيِّئَةٍ، وَرَفَعَ لَهٗ أَلْفَ أَلْفِ دَرَجَةٍ، وَبَنَىٰ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ." (رواه الترمذي وقال: هٰذا حديث غريب، و ابن ماجه، مشكوٰة : ٢١٤، باب الدعوات في الأوقات)

اس لیے ہمیں بازار میں بھی بہ کثرت ذکر اللہ اور بالخصوص اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے، یہ عمل بہت ہی مختصر ہے؛ لیکن اس کا اجر نہایت ہی عظیم ہے۔

(۳) نیز حدیث شریف میں ہے کہ جو مؤمن مخلص دورِ فتن میں راہِ سنّت پر چلے اور دوسروں کو بھی اپنے قول و عمل سے اس کی ترغیب دے تو خواہ اس سنّت کا تعلق کسی بھی شعبۂ زندگی سے ہو حق تعالیٰ فسادِ اُمّت کے وقت اتباعِ سنّت کا اہتمام کرنے والے کو سو شہیدوں کے برابر اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ، فَلَهٗ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ص۳۰)

چاہیے کہ ہم کوشش کریں، اپنے اندر اس کی سچّی طلب پیدا کریں، پھر اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا کے لیے عمل کی توفیق مانگیں اور حسب موقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں زندہ اور جاری کریں، ان شاء اللہ ہر ہر سنّت پر حق تعالیٰ ہمیں اجرِ عظیم سے نوازیں گے۔

(۴) حتیٰ کہ جب کوئی صاحب ایمان آیت سجدہ پڑھنے یا سننے کے بعد سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو اس عملِ قلیل پر وہ جنّت کا حق دار بن جاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ: "إِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ السَّجْدَةَ، فَسَجَدَ، اِعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِيْ، يَقُوْلُ: يَا وَيْلَتِيْ! أُمِرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُوْدِ، فَسَجَدَ، فَلَهُ الْجَنَّةُ، وَأُمِرْتُ بِالسُّجُوْدِ فَأَبَيْتُ، فَلِيَ النَّارُ". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح: ص۸۴)

جب ابن آدم سجدے کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا ایک طرف ہوجاتا ہے اور حسرت سے کہتا ہے کہ ابن آدم کو سجدے کا حکم ملا، تو وہ سجدہ کر کے جنّت کا حقدار بن گیا، اور مجھے سجدے کا حکم ملا تو میں نے سجدے سے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں میں دوزخ کا حقدار بن گیا۔

(۵) اسی طرح تلبیہ اور تکبیر تشریق پڑھنے پر جنّت کی بشارت دی گئی، حدیث پاک میں ہے کہ تلبیہ پڑھنے والا جب تلبیہ پڑھتا ہے تو اسے خوش خبری سُنائی جاتی ہے، اسی طرح تکبیر کہنے والا جب تکبیر کہتا ہے تو اُسے بھی خوش خبری سُنائی جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول! کیا جنّت کی خوش خبری سُنائی جاتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ (المعجم الأوسط للطبراني، الرقم: ۷۷۷۹)

(۲) معاشرت میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں:

جہاں تک تعلق ہے معاشرت سے متعلّق اعمال کا، تو ان میں بھی عمل قلیل پر اجر عظیم کے وعدے ہیں۔

(۱) مثلاً آپسی رِشتوں میں سب سے مقدّس اور اہم رِشتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد والدین کا ہے، اُن کی عزّت، عظمت، خدمت اور اطاعت کے تو بڑے فضائل ہیں ہی، ان کی طرف محبّت بھری ایک نظر سے نیک اولاد کے دیکھنے پر حق تعالیٰ ایک مقبول حج کا ثواب عطا فرماتے ہیں، حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ: "مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ إِلَىٰ وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ إِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهُ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً...الخ". (رواه البيهقي، مشكوٰة : ٤٢١)

اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے والدین میں سے جو بھی زندہ ہیں ان کی قدر کریں اور انھیں محبّت و رحمت اور عظمت کی نظر سے دیکھیں، ان کے حقوق ادا کریں اور ہر حال میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا اہتمام کریں۔

(۲) والدین کے علاوہ دیگر رشتے داروں میں بھائی بہنوں اور بیوی بچّوں کے ساتھ حسن سلوک پر بھی بڑی بشارتیں وارد ہوئی ہیں، مثلاً ایک حدیث میں بہنوں اور بیٹیوں کے متعلّق ہے کہ جس کی تین بہنیں یا تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی شروع سے اچھّی طرح تربیت کرے، پھر (بر وقت مناسب رشتہ تلاش کر کے شادی کر دے، تا کہ) وہ مستغنی ہو جائیں تو اِس صلہ رحمی کے عمل پر اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت واجب فرما دیں گے۔ "أَوْجَبَ اللهُ لَهُ الجَنَّةَ."

کسی صحابی نے اس بشارت کو سن کر عرض کیا: حضور! کیا دو بیٹیوں اور بہنوں کی اچھّی پرورش و تربیت پر بھی یہ اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ راویٔ حدیث فرماتے ہیں کہ اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایک بیٹی اور بہن کے متعلّق بھی یہ سوال کرتے تو حضور ﷺ یہی جواب مرحمت فرماتے۔ (رواہ فی شرح السنۃ، مشکوٰۃ: ۴۲۳)

(۳) اسی طرح معاشرے میں موجود کسی بھی یتیم کے ساتھ ادنیٰ درجے کا حسن سلوک بھی مغفرت کا سبب ہے، حدیث پاک میں وارد ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے معاشرے کے کسی یتیم کے سر پر شفقت و محبّت سے صرف ہاتھ پھیرے تو اس یتیم کے سر پر جتنے بال ہیں ہر بال کے عوض اُسے ایک نیکی دی جاتی ہے۔

"كَانَ لَهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهُ حَسَنَاتٌ." (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٤٢٣)

(۴) رشتے داروں کے علاوہ عام مسلمانوں سے اچھی طرح ملنے جلنے پر بھی بڑی بشارتیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ دو مسلمان جب آپسی ملاقات کے وقت سلام ومصافحہ کرتے ہیں تو یہ عمل قلیل ان کی مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ، فَيَتَصَافَحَانِ، إِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَتَفَرَّقَا." (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٤٠١)

(۵) معاشرے کا کوئی فرد اگر بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت اور بیمار پرسی پر بھی بڑی بشارتیں وارد ہوئی ہیں۔ عیادت عام حالت میں سنّت ہے، خاص حالت میں جب کہ بیماری سخت ہو اور کوئی تیمارداری اور خدمت کرنے والا نہ ہو تو اس وقت واجب علی الکفایہ ہے۔ (توضیحات شرح مشکوٰۃ: ۲۱۶/۳)

ایک حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان کی عیادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے جنّت میں جا کر اس کے پھولوں اور نعمتوں سے مستفید ہونا، جتنی دیر بندہ مریض کی عیادت کرتا ہے اتنی دیر گویا وہ جنّت میں ہوتا ہے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا عَادَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ١٣٣، باب عيادة المريض)

ایک روایت میں ہے کہ صبح میں اگر کوئی شخص کسی کی عیادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے شام تک اس عیادت کرنے والے کے لیے رحمت ومغفرت کی دعائیں

کرتے ہیں۔ اور اگر شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک دعائیں کرتے ہیں۔ اور فرمایا: "وَكَانَ لَهُ خَرِيْفٌ فِي الجَنَّةِ." (ترمذی، ابوداود، مشکوٰۃ:۱۳۵) عیادت کرنے والے کے لیے جنّت میں ایک باغ مقرّر کر دیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جس نے باوضو ہو کر کسی مریض کی عیادت کی تو اس کو دوزخ سے ساٹھ سال تیز رفتار مسافت کے بقدر دور اور محفوظ رکھا جاتا ہے۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ تَوَضَّأَ، فَأَحْسَنَ الوُضُوْءَ، وَعَادَ أَخَاهُ المُسْلِمَ مُحْتَسِبًا، بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِيْرَةَ سِتِّيْنَ خَرِيْفًا." (رواه أبوداود، مشكوٰة : ص۱۳۵)

معلوم ہوا کہ عیادت باوضو کرنا بہتر ہے۔ نیز جب عام مسلمان کی عیادت و بیمار پرسی کے یہ فضائل ہیں تو اگر خود کسی کے والدین، بیوی، شوہر وغیرہ اقرباء میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو ان کی عیادت و خدمت کی کس قدر فضیلت ہوگی، نیز جس بیمار کی عیادت کے سبب یہ فضائل حاصل ہو رہے ہیں خود اس بیمار کو بیماری پر صبر کا کس قدر اجر و ثواب ملے گا، غور کیا جائے اور حسب موقع عمل بھی کیا جائے۔

(۶) پھر جب معاشرے کے کسی فرد کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شرکت بھی پہاڑ کے مانند اجرِ عظیم کا سبب ہے، جیسا کہ حدیث (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۴۴) میں ہے۔

(۷) پھر اتنا ہی نہیں کہ صرف شرکت کرنے والوں کو ثواب ملتا ہے؛ بلکہ ان کی وجہ سے مرنے والے (گنہگار مسلمان) کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جس مسلمان کے جنازے میں چالیس (موحد) آدمی (مراد بہ کثرت لوگ) شریک ہو جائیں تو حق تعالیٰ میّت کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرماتے ہیں۔ (یعنی میّت کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ توضیحات: ۳/۳۲۷)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سنا:

"مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ، فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهٖ أَرْبَعُوْنَ رَجُلًا، لَا يُشْرِكُوْنَ بِاللهِ شَيْئًا، إِلَّا شَفَّعَهُمُ اللهُ فِيْهِ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ١٤٥، باب المشي بالجنازة والصلوٰة عليها)

معاملات میں عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں:

رہی بات معاملات سے متعلق اعمال کی، تو واقعہ یہ ہے کہ معاملات میں بھی عمل قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں کتاب وسنّت میں پیش فرما کر بندوں کو ترغیب دی گئی، مثلاً آپسی معاملات اور لین دین میں نرمی وآسانی سے پیش آنا اور ہمدردی کا اظہار کرنا خوش اخلاقی تو ہے ہی، علاوہ ازیں یہ عمل اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور مغفرت کا سبب بھی ہے۔

(۱) حدیث پاک میں ہے کہ اُمم سابقہ میں ایک شخص تھا، "إِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ قَبْلَكُمْ"، جب اس کی موت کا وقت آیا تو بہ حکم الٰہی موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا، "أَتَاهُ الْمَلَكُ يَقْبِضُ رُوْحَهٗ." (ملک الموت کے آنے کا مرحلہ ہر مرنے والے کے ساتھ پیش آتا ہے۔)

اس مضمون کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴾ (السجدة : ١١)

''آپ کہہ دیجیے کہ وہ ملک الموت تمھاری جانوں کو قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

یہ مرحلہ ہر ایک کو پیش آتا ہے؛ لیکن مؤمن مخلص اور کافر میں فرق یہ ہوگا کہ

مؤمن مخلص کے لیے وہ وقت ان شاء اللہ العزیز مصائب کے ختم کا ہوگا، جب کہ کافر کے لیے مصائب وعذاب کی ابتدا کا ہوگا۔ (العیاذ باللہ العظیم)۔

الغرض ملک الموت نے روح قبض کرتے وقت اُمم سابقہ کے اُس مؤمن سے بہ حکم الٰہی پوچھا کہ کیا تم نے کوئی نیک عمل بھی کیا ہے؟ "هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ؟" اس (مرنے والے) نے جواب دیا: یوں تو کوئی خاص عمل صالح یاد نہیں آرہا ہے، "قَالَ: مَا أَعْلَمُ." اس سے پھر کہا گیا کہ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، "قِيلَ: أُنْظُرْ" اس نے کہا: مجھے قطعی طور پر تو کوئی خاص عمل صالح یاد نہیں آرہا ہے، البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں اور مجھے یہ بات برابر معلوم ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ معاملات اور لین دین میں نرمی، خوش اخلاقی، ہمدردی اور احسان مندی کا مظاہرہ کرتا تھا، اس طرح کہ جب قیمت کا تقاضا کرتا تو نرمی سے پیش آتا، یعنی پیمنٹ لیتے وقت سختی کرنے کے بجائے نرمی سے پیش آتا، اس میں کبھی کسی غنی اور مال دار سے لینا ہوتو اسے مہلت دیتا اور محتاج ومفلس کو (یا تو مکمّل یا کچھ حصّہ) معاف کردیتا۔

"قَالَ: مَا أَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ أَنِّيْ كُنْتُ أُبَايِعُ النَّاسَ فِيْ الدُّنْيَا، وَأُجَازِيْهِمْ، فَأُنْظِرُ الْمُوْسِرَ، وَأَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ."

حدیث پاک میں ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عمل قلیل کی برکت سے اس کی مغفرت کا فیصلہ فرما کر اسے جنّت میں داخل فرمادیا۔ "فَأَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ص۴۲۳، باب المساهلة في المعاملة)

حق تعالیٰ کو معاملات میں تنگ دستوں کے ساتھ نرمی وآسانی برتنا، انھیں مہلت اور موقع دینا بلکہ انھیں معاف کردینا بہت پسند ہے، اسی لیے قرآنِ کریم میں اس کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرة : ۲۸۰)

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت اور موقع دینا چاہیے اور اگر صدقہ ہی کر دو (یعنی معاف کر دو) تو یہ تمھارے لیے (انجام اور اُخروی اعتبار سے) بہت ہی بہتر ہے اگر تمھیں علم ہو۔''

(۲) حدیث پاک میں اس کے مختلف فضائل منقول ہیں، مثلاً ایک روایت میں ہے کہ ''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ حق تعالیٰ قیامت کی سختی سے اس کی حفاظت فرمائیں، تو اسے چاہیے کہ وہ مفلس و تنگ دست سے قرض وصول کرنے میں تاخیر کرے، یا اس کو (پورا پورا قرض یا جس قدر ممکن و آسان ہو) معاف کر دے۔''

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ يَسُرُّهُ أَنْ يُنْجِيَهُ اللهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ القِيَامَةِ فَلْيُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ، أَوْ يَضَعْ عَنْهُ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۵۱، باب الإفلاس والإنظار)

(۳) ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت و موقع دے یا معاف کر دے (مکمل طور پر یا جس قدر مناسب و ممکن ہو) تو حق تعالیٰ اس عملِ قلیل پر اسے قیامت کے دن اپنے عرش کا سایہ عطا فرمائے گا، جب اس سایے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔

عَنْ أَبِي اليُسْرِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ عَنْهُ، أَظَلَّهُ اللهُ فِيْ ظِلِّهِ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ۲۵۱)

(۴) ایک اور روایت میں تو ہے کہ جب کسی تنگ دست کے لیے قرض کی

ادائیگی کا وقت آجائے، پھر اگر اسے مہلت دے دے تو مہلت دینے والے کو ہر دن کے بدلے میں قرض کی مقدار صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

(ابن ماجہ، مسند احمد، مظاہر حق جدید: ۳/ ۱۴۴)

(۵) ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی دُنیوی سختی و تنگی کو دور کرے گا تو (تو خواہ وہ تنگی معمولی ہی کیوں نہ ہو؛ مگر اس کے اس عمل قلیل پر ربِ کریم اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے، اس طرح کہ) قیامت کی تنگی و سختی کو حق تعالیٰ اس سے دور فرما دیں گے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی بشری کمزوری کی پردہ پوشی کرے گا (بشرطیکہ وہ شخص جرائم کا عادی نہ ہو اور اس کا وہ جرم متعدی نہ ہو، اس کا نقصان اس کی ذات تک ہی محدود ہو، تو کسی کے پوشیدہ عیب کو اس کی عزّت بچانے کی غرض سے چھپالیا، اس پر پردہ ڈال دیا) تو حق تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ القِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللهُ عَلَيْهِ فِيْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ فِيْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ." (رواه مسلم، مشكوٰة: ۳۲، كتاب العلم)

اَخلاقیات میں عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں:

اخلاقی اعمال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی عملِ قلیل پر اجرِ عظیم کی مثالیں موجود ہیں۔

(۱) مثلاً اگر ہم اپنے اخلاق، اپنی عادات اور دوسروں کے ساتھ رویے کو دُرست اور اچھا بنالیں، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی ذات سے جان بوجھ کر بلا کسی خاص وجہ کے کسی کو نقصان نہ پہنچائیں، تو یہ عمل بھی اللہ پاک کی رضا اور قرب و مغفرت

کا سبب ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اپنی جانب سے لوگوں کو نقصان سے محفوظ رکھنا اور بچانا وہ عمل ہے کہ حق تعالیٰ اس پر صدقے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

"قَالَ: فَيُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ، فَإِنَّهُ لَهُ صَدَقَةٌ." (متفق عليه، مشكوٰة:١٦٧)

(۲) اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں اور ہماری ذات سے کسی کو نفع پہنچ جائے تو لوگوں کے نفع کے معمولی کاموں پر بھی جنّت کی بشارت آئی ہے۔ جیسے حدیث پاک میں ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنّت میں ایک (مسلمان) بندے کو سیر و تفریح کرتے ہوئے دیکھا؛ اس وجہ سے کہ اس نے راستے میں سے ایک ایسے درخت کو کاٹ دیا تھا جو راستے کے بیچ میں تھا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَقَدْ رَأَيْتُ رَجُلًا يَتَقَلَّبُ فِيْ الجَنَّةِ فِيْ شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِيْقِ، كَانَتْ تُؤْذِي النَّاسَ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ١٦٨، باب فضل الصدقة)

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا، یا کھیت میں فصل اُگائی (تو یہ کام نوعِ انسانی وحیوانی کی نفع رسانی کے لیے بھی ہوتے ہیں، اس لیے) کسی انسان یا چرند و پرند نے اس میں سے کچھ کھالیا (خواہ مالک کی مرضی ہو یا نہ ہو) مگر حق تعالیٰ (اس نقصان پر) مالک کو صدقے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ مِنْهُ إِنْسَانٌ أَوْ طَيْرٌ أَوْ بَهِيْمَةٌ، إِلَّا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةً." (متفق عليه، مشكوٰة : ١٦٨)

(۴) ایک اور حدیث میں ہے کہ جو مسلمان کسی (ضرورت مند) برہنہ مسلمان

کو (نیک نیتی اور رضائے الٰہی کی خاطر) کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنّت کے سبز (ریشمی) کپڑوں سے پہنائیں گے۔ اور جو مسلمان کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا حق تعالیٰ اسے جنّت کے میوے کھلائے گا۔ اور جو مسلمان کسی پیاسے مسلمان کی پیاس بجھائے گا، حق تعالیٰ اسے مہر بند (جنّت کی) شراب سے سیراب کرے گا۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرْيٍ، كَسَاهُ اللهُ مِنْ خُضْرِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ، أَطْعَمَهُ اللهُ مِنْ ثِمَارِ الجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَإٍ، سَقَاهُ اللهُ مِنَ الرَّحِيْقِ المَخْتُوْمِ." (رواه أبوداود والترمذي، مشكوٰة:١٦٩)

(۵) حتیٰ کہ ایک حدیث میں تو کتّے کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر بدکار عورت کی مغفرت کا ذکر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بدکار عورت کی مغفرت اس لیے کردی گئی کہ ایک مرتبہ اس کا گزر ایک ایسے کتّے کے پاس سے ہوا جو کنویں کے قریب کھڑا پیاس کی وجہ سے اپنی زبان نکال کر ہانپ رہا تھا، پیاس کی شدّت سے ہلاک ہوسکتا تھا، عین اسی وقت اُس بدکار عورت نے اپنا چرمی موزہ اُتار کر اسے اپنی اوڑھنی سے باندھ کر کتّے کے لیے پانی نکالا اور اسے پلایا۔ اس عملِ قلیل پر ربِ کریم نے اُس بدکار عورت کی مغفرت فرما دی۔ "فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ١٦٨)

مؤمن مخلص کا اجر ختم نہ ہوگا:

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی ربِ کریم اپنے وفادار بندوں کو ان کے عملِ قلیل پر بھی اجرِ عظیم عطا فرماتے ہیں؛ بلکہ قرآنِ کریم نے تو یہ اعلان کردیا کہ

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝٨﴾ (فصلت:۸)

''بلاشبہ جو بندے ایمان لائے اور جنھوں نے اعمالِ صالحہ کا (اخلاصِ نیت، احسانی کیفیت اور اتباعِ سنّت کا لحاظ کرتے ہوئے) اہتمام کیا (پھر شرکِ جلی وخفی اور ارتکابِ معاصی کے ذریعے ان اعمال کے اَجر وثواب کو ضائع نہیں کیا) تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔''

اس کے دو مطلب حضرات مفسرین نے بیان فرمائے ہیں:

(۱) مؤمن مخلص جن اعمالِ صالحہ (نافلہ) کا عادی تھا، ان اعمال کو کسی واقعی شرعی عذر مثلاً بیماری اور سفر وغیرہ کی وجہ سے نہ کر سکا، تو اس کے اجر کا سلسلہ حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے جاری رکھیں گے۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر میں جاتا ہے (جس کی وجہ سے وہ اپنے اعمالِ صالحہ نافلہ کا اہتمام نہیں کر پاتا، تب بھی من جانب اللہ) اس کے نامۂ اعمال میں (سابقہ اعمالِ صالحہ نافلہ کے برابر) ان اعمال کا اجر وثواب لکھا جاتا ہے جو وہ حالت اقامت وصحت میں کیا کرتا تھا۔ یہ ہے "لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" کی مثال۔

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ، أَوْ سَافَرَ، كُتِبَ لَهُ بِمِثْلِ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيْمًا صَحِيْحًا." (رواه البخاري، مشكوٰة : ۱۳۵، باب عيادة المريض وثواب المرض)

مؤمن کے لیے بڑھاپا بھی باعث مغفرت ہے:

اس سلسلے میں مسند احمد کی ایک ضعیف روایت مزید تسلّی کا سبب ہوگی جس میں فرمایا گیا:

"إِذَا بَلَغَ الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، أَمَنَهُ اللهُ مِنْ أَنْوَاعِ الْبَلَايَا،

مِنَ الْجُنُونِ، وَالْبَرَصِ، وَالْجُذَامِ".

''جب مسلمان (ایمان و اہتمامِ اعمال کے ساتھ) چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو حق تعالیٰ اُسے جنون، برص اور جذام سے امن نصیب فرماتے ہیں۔''

"وَإِذَا بَلَغَ الْخَمْسِينَ لَيَّنَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ حِسَابَهُ".

''پچاس سال کی عمر میں اس کا حساب آسان فرما دیتے ہیں۔''

"وَإِذَا بَلَغَ السِّتِّينَ، رَزَقَهُ اللهُ إِنَابَةً يُحِبُّهُ عَلَيْهَا".

''ساٹھ سال کی عمر میں اُسے اللہ تعالیٰ اپنی پسند کے مطابق انابت الی اللہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔''

"وَإِذَا بَلَغَ السَّبْعِينَ، أَحَبَّهُ اللهُ وَأَحَبَّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ".

''ستّر سال کی عمر میں حق تعالیٰ اپنی بارگاہ میں اور آسمان والوں میں اُسے محبوبیت عطا فرماتے ہیں۔''

"وَإِذَا بَلَغَ الثَّمَانِينَ، تَقَبَّلَ اللهُ مِنْهُ حَسَنَاتِهِ وَمَحَا عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ".

''اسّی سال کی عمر میں اس کی نیکیاں لکھی اور قبول کی جاتی ہیں اور گناہ مٹائے اور معاف کیے جاتے ہیں۔''

"وَإِذَا بَلَغَ التِّسْعِينَ، غَفَرَ اللهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، وَسُمِّيَ "أَسِيرَ اللهِ فِي الْأَرْضِ" وَشُفِّعَ فِي أَهْلِهِ". (مسند أحمد / مسند عبد الله بن عمر رضي الله عنهما)

''اور نوے سال کی عمر میں اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس کا نام ''زمین میں اللہ تعالیٰ کا قیدی'' رکھا جاتا ہے اور اس کے اہل و عیال کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔''

یہ بھی "لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" کی بہترین مثال ہے۔

مؤمن کا اجر دائمی ہے:

دوسرا مطلب حضرات مفسرین نے یہ بیان فرمایا کہ آخرت میں عمل قلیل پر ربِ کریم اپنے فضل وکرم سے جو اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے وہ دائمی ہوگا، اس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی شُبہ نہیں ہوسکتا۔

صاحبو! ربِ کریم کے اس فضلِ عظیم کے ہوتے ہوئے اب تو وہی شخص محروم رہ سکتا ہے جس نے خود ہی محروم رہنے کا ارادہ کرلیا ہو، ورنہ ذرا ہمت سے کام لیں، اپنے اندر سچّی اور اچھّی طلب پیدا کر کے اللہ تعالیٰ سے توفیقِ عمل مانگیں، پھر اخلاصِ نیت، احسانی کیفیت اور اتباعِ سنّت کا لحاظ کرتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کریں، اس کے بعد شرکِ جلی وخفی اور ارتکابِ معاصی سے اسے ضائع نہ کریں تو ربِ کریم کی رحمت کی قسم! ربِ کریم عملِ قلیل پر بھی اجرِ عظیم عطا فرماتے ہیں، ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سب سے بہتر مقام بھی دارین میں عطا فرماتے ہیں، جس کا اعلان قرآنِ کریم میں اس طرح فرمایا کہ

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝﴾ (البینۃ:۷)

حق تعالیٰ ہمیں بھی خیر البریہ میں داخل فرمادیں۔ آمین۔ بالخصوص ہمارے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد صدیق شاہ بھائی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو ایک طویل عرصے تک صاحبِ فراش رہے اور معذوری کی حالت میں مبتلا رہ کر مؤرّخہ: ۶ رمحرم الحرام ۱۴۴۲ھ مطابق: ۲۶ راگست ۲۰۲۰ء بروز بدھ بوقت عصر انتقال فرما گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی صرف ہم اہلِ خانہ ہی پر نہیں؛ بلکہ علماء وطلبہ کے ایک بڑے طبقے پر بہت بھاری ہے۔

علماء کی ہیں آنکھیں نم، مغموم ہیں طلبہ بھی　　دل پہ ہے بہت بھاری تیرا یوں چلے جانا

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اؤْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهٖ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهٗ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهٖ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا، كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهٖ، وَأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهٖ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهٖ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ، يَا غَفَّارُ يَا رَحْمٰنُ!

یومِ عاشوراء/ ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۳۰/اگست/ ۲۰۲۰ء

بروز اتوار، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۵)

اعتدال کی اہمیت اور بے اعتدالی کی نحوست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خُذُوْا مِنَ الأَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ، فَإِنَّ اللهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا."

(متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ۱۱۰، باب القصد في العمل)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جس قدر (بآسانی دائمی طور پر نفلی عبادات و) اعمال کا اہتمام کر سکتے ہو کرو؛ اس لیے کہ (اہتمامِ اعمال میں) تم تو تھک سکتے ہو؛ لیکن (جزائے اعمال میں) اللہ پاک کو تھکا نہیں سکتے۔ (لہٰذا بقدرِ استطاعت اخلاص و استقامت کے ساتھ اعمال کا اہتمام کرو، یہ بات اللہ پاک کو پسند ہے، ایسا نہ ہو کہ جوشِ عبادت میں آج تو سو رکعات پڑھ ڈالیں اور کل دو رکعات بھی نہ پڑھو، یہ اللہ پاک کو پسند نہیں، لہٰذا عبادات میں بھی اعتدال ملحوظ رکھو اور بے اعتدالی سے محفوظ رہو)۔

اعتدال کی حقیقت:

اللہ ربّ العالمین نے کتاب اللہ اور رجال اللہ کے ذریعے اپنے بندوں کو ان ہی اعمال و احکام کا مکلّف بنایا جن میں واقعی بندوں کا نفع ہے۔ اور جن میں نقصان ہے ان سے منع فرما دیا۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ احکامِ الٰہیہ میں سے ایک اہم حکم یہ ہے کہ بندے تمام ہی دینی و دنیوی امور و معاملات میں اعتدال کی روِش اپنائیں اور بے اعتدالی سے بچیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام ہی دینی و دنیوی امور و معاملات میں میانہ روی اختیار کریں، درمیانی چال چلیں، یا پھر دینی و دُنیوی امور و معاملات میں جس کی جو حدود شریعت مطہرہ نے متعین فرمائی ہیں ان حدود سے نہ گزریں اور نہ اُتریں؛ بلکہ حدود میں رہیں۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں اعتدال کی چال چلنے کو قرآنِ کریم نے ''صراطِ مستقیم'' سے تعبیر فرمایا۔ اور واقعی اعتدال کی راہ ہی ''صراطِ مستقیم'' ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک کے انعام یافتہ بندوں نے ہمیشہ اعتدال ہی کی راہ اپنائی، جس کی وجہ سے وہ راہ یاب اور کام یاب ہوئے۔ اس کے برخلاف "المغضوب علیهم والضالین" نے بے اعتدالی، غلو اور اِفراط (زیادتی) تفریط (کمی) والی راہ اختیار کی، جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوئے۔

اعتدال کا حکم اور بے اعتدالی کی ممانعت:

حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دینی، دُنیوی اور اُخروی اعتبار سے گمراہی و تباہی سے بچانے اور خوش حالی و کام یابی سے مالا مال کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے احکام عطا فرمائے وہیں ایک بنیادی حکم یہ بھی دیا کہ میرے بندو! دینی و دُنیوی تمام امور و معاملات میں اعتدال کی چال چلو، فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ (النمل : ۹۰)

حضرات مفسرین کے بقول یہاں ''عدل'' کا مطلب انصاف بھی ہے اور ''اعتدال'' بھی ہے، کیوں کہ لفظ ''اعتدال'' عدل ہی سے بنا ہے، بلکہ عدل کی روح در اصل اعتدال ہی ہے، اعتدال کے بغیر عدل کے تقاضے کسی بھی صورت میں پورے نہیں ہو سکتے، قرآن کی نظر میں اعتدال کی چال چلنے والے عادل ہیں اور بے اعتدالی کی راہ اختیار کرنے والے ظالم ہیں، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرة : ۲۲۹)

اس لیے قرآنِ کریم نے عدل کے ذریعے اعتدال کی چال چلنے کا حکم فرمایا اور آیت کریمہ کے اخیر میں ﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ کے ذریعے بے اعتدالی سے منع فرما دیا۔ نیز اس پر قائم رہنے والوں کو "أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ" کہہ کر ان کی تعریف فرمائی: ﴿مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ﴾ (المائدة : ٦٦)

اعتدال کی فضیلت اور بے اعتدالی کی مذمّت:

اب جو بھی خوش نصیب بندہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دینی و دُنیوی اعتبار سے تمام امور و معاملات میں اعتدال کی چال چلے گا یقیناً وہ دُنیوی اعتبار سے خوش حال اور اُخروی اعتبار سے کامیاب ہوگا، قرآنِ کریم نے حضرت لقمان رحمۃ اللہ علیہ کی نصائح میں بھی اسے ذکر کیا ہے:

﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ (لقمان : ۱۹)

حضرات مفسرین کے بقول اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ صرف چال ہی میں اعتدال نہ ہو؛ بلکہ تمام دینی، دُنیوی اور اُخروی امور و معاملات میں ہر حال میں اعتدال ملحوظ رکھا جائے۔ کامیاب اور خوش حال زندگی کا یہ بنیادی اصول ہے، اسی کو

حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

"وَالقَصْدُ فِيْ الغِنىٰ وَالفَقْرِ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة:٤٣٢)

مالداری ہو یا غریبی، خوشی ہو یا غمی، تندرستی ہو یا بیماری، بہر حال اعتدال کی چال چلنا دُنیوی خوش حالی اور اُخروی کامیابی کا سبب ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں اُمّت محمدیہ کے تین طبقات بیان فرمائے گئے اُن میں ﴿مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ﴾ (الفاطر: ۳۲) کے تحت فرمایا کہ جو اعتدال کی چال چلنے والے تھے آخرت میں ان کا حساب آسان ہوگا اور وہ فلاح یاب ہوں گے۔

(ابن کثیر، مستفاد از: معارف القرآن: ۷/ ۳۴۵)

اس کے برعکس بے اعتدالی ہر لحاظ سے تباہی و بربادی کا ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کائناتِ ربانی میں ضروریاتِ انسانی کی جتنی چیزیں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت وعنایت سے پیدا فرمائیں بلاشبہ وہ سب ہی حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ نعمت اسی وقت ہے جب اعتدال کے ساتھ میسّر ہو، اگر حدّ اعتدال سے بڑھ جائے یا کم ہو جائے تو وہ بجائے نعمت کے زحمت بن جاتی ہے، پھر وہ انعامِ الٰہی کے بجائے عذابِ الٰہی بن جاتی ہے۔

(۱) مثلاً پانی کو لے لیجیے! اللہ پاک کی کتنی بڑی نعمت اور ہماری کتنی اہم ضرورت ہے، قرآنِ کریم نے اسے بقائے حیات کا بنیادی سبب اور زندگی کا سرچشمہ قرار دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝٣٠﴾ (الأنبياء : ۳۰)

لیکن کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ یہی پانی کبھی بتقاضائے حکمت الٰہی حدّ اعتدال سے بڑھ کر سیلاب وطوفان کی شکل اختیار کر لے تو شہروں اور بستیوں کو سمندروں میں

بدل کر ویران اور قبرستان بنا دیتا ہے۔

(۲) اسی طرح ہوا بھی اللہ پاک کی عظیم نعمت اور ہماری بنیادی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم بظاہر زندہ نہیں رہ سکتے؛ لیکن یہی ہوا اگر حدّ اعتدال سے گزر کر بتقاضائے حکمت الٰہی آندھی کی صورت اختیار کر لے تو ہر طرف تباہی مچا دیتی ہے۔

(۳) نیز آگ بھی اللہ پاک کی نعمت اس اعتبار سے ہے کہ اسی سے ہم عموماً عمدہ اور لذیذ کھانے پکاتے ہیں اور دیگر بہت سی ضرورتیں پوری کرتے ہیں؛ لیکن اگر یہی آگ بہ سبب حکمت ربّانی آتش فشاں بن جائے تو قیامت کا منظر یاد آجاتا ہے۔

صاحبو! ان تمام حقائق سے یہی واضح ہوتا ہے کہ کائناتِ ربّانی میں موجود ضروریاتِ انسانی کی اشیاء بھی اسی وقت نعمت وضرورت ہیں جب وہ حدّ اعتدال میں ہوں، ورنہ زحمت ومصیبت ہیں۔ جس طرح بے اعتدالی کائناتِ ربّانی میں تباہی کا سبب ہے، اسی طرح بے اعتدالی حیاتِ انسانی اور اعمالِ انسانی میں بھی تباہی کا سبب ہے۔

عبادات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب:

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دین ودنیا کے تمام ہی امور ومعاملات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے دور رہنے کی ترغیب وتاکید فرمائی ہے۔

مثلاً دیکھیں! دینی امور ومعاملات میں نماز، روزہ، دُعا اور تلاوت وغیرہ اہم عبادات ہیں، جن میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب و تاکید آئی ہے، حدیث مذکور میں نہایت جامعیت کے ساتھ فرمادیا کہ

"خُذُوْا مِنَ الأَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ، فَإِنَّ اللهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا."

مسلمانو! کلمہ خوانو! اللہ تعالیٰ کے وفادارو! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانو!

عبادات و اعمال میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کرو اور بے اعتدالی سے بچو۔ عبادات میں اعتدال یہ ہے کہ نفل اعمال و عبادات میں جس قدر بآسانی دائمی طور پر تم اہتمام کرسکو کرو، اس کے برخلاف نفل عبادات و اعمال میں ایسی راہ اختیار کرنا جو تمھیں تھکا دے بے اعتدالی ہے، اس سے تم خود تو تھک سکتے ہو؛ لیکن اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں سکتے۔ نفل عبادات و اعمال میں تمھاری بے اعتدالی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کو پسند نہیں، اس لیے بھی ممنوع ہے۔

(۱) چنانچہ روایتوں میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ (آیت پردہ کے نزول سے قبل) تین جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم (جن میں حضرت علی، حضرت عثمان بن مظعون اور غالباً حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم تھے) نے ازواجِ مطہرات سے حضور ﷺ کی عبادات کے متعلق معلومات حاصل کیں (اور بزعم خود اسے کم سمجھ کر) کہنے لگے کہ

"أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ وَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ."

حضور ﷺ کہاں اور ہم کہاں، ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''، آپ ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں، اس لیے آپ ﷺ کو عبادات میں نہ کثرت کی ضرورت ہے نہ محنت کی، جب کہ ہمیں اس کی ضرورت ہے، یہ سوچ کر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے ارادہ کرلیا کہ "أُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا" میں ساری رات اللہ تعالیٰ کے حضور قیام کروں گا، کبھی آرام نہیں کروں گا۔ دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ "أَصُوْمُ النَّهَارَ، وَلَا أُفْطِرُ" میں ہمیشہ دِن میں روزہ رکھوں گا اور کبھی افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: "أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ، فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا". میں کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا، تاکہ ہمیشہ اللہ پاک کی عبادت کے لیے فارغ رہ سکوں۔ ان کی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

"وَاللهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلهِ، وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۲۷ / باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

اللہ پاک کی قسم! میں تم سے بھی زیادہ اللہ پاک سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں (معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت اظہارِ حقیقت کے پیش نظر اپنے وصف واقعی کو بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم) لیکن میرا حال یہ ہے کہ روزہ رکھتا بھی ہوں اور کبھی نہیں بھی رکھتا، رات میں نماز کا قیام بھی کرتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، اسی طرح نکاح کے ذریعے اہل خانہ سے تعلق بھی رکھتا ہوں (اور تعلق مع اللہ کا اہتمام بھی کرتا ہوں، یہی اعتدال والا میرا طریقہ ہے۔) اب جو بھی میرے اس طریقے سے ہٹے گا میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاکیزہ طریقۂ اعتدال یہ ہے کہ دینی تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے اور دُنیوی، جسمانی اور گھریلو تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے، جس طرح دنیا داری میں مشغول ہوکر دینی تقاضوں کو نظر انداز کرنا گمراہی و بے اعتدالی ہے، اسی طرح دینی تقاضوں میں مشغول ہوکر دُنیوی، جسمانی اور گھریلو تقاضوں کو نظر انداز کرنا بھی بے اعتدالی و گمراہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس لیے بھی منع فرما دیا کہ نفل عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) کی وجہ سے اُنھوں نے اللہ پاک کے حلال اور جائز کردہ اعمال و انعام جیسے کھانا پینا، آرام کرنا اور نکاح کرنا وغیرہ کو از خود اپنے لیے حرام کرلیا، تو

یہ چیز اللہ پاک کو پسند نہیں، اس لیے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (المائدة : ٨٧)

''اے ایمان والو! اللہ پاک نے جو پاکیزہ (غذا وغیرہ) تمھارے لیے حلال کی ہے ان کو (قولاً، عملاً اور عقیدۃً) حرام مت کرو اور حدّ اعتدال (میں رہو، اس) سے آگے نہ بڑھو، بلاشبہ اللہ پاک کو بے اعتدالی کرنے والے پسند نہیں۔''

(۲) اسی طرح دُعا بھی عبادت ہے۔

"الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ." (رواه الترمذي، مشكوٰة : ١٩٤)

اس میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب و تاکید آئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (الأعراف:٥٥)

دُعا میں اعتدال یہ ہے کہ دل جمعی، آہ وزاری اور (عام حالات میں) آہستہ سے مانگی جائے، اس کے برعکس دعاؤں میں بلاوجہ چیخنا چلّانا، یا آمرانہ وحاکمانہ انداز اختیار کرنا، اسی طرح گناہ، ناجائز اور ناممکن چیزیں طلب کرنا، جیسے کوئی بوڑھا کہے کہ یا اللہ! مجھے جوان بنادے، وغیرہ، یہ سب بے اعتدالی ہے، جو ممنوع ہے۔

اس سلسلے میں ایک روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو اس طرح دعا مانگتے ہوئے سنا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْقَصْرَ الْأَبْيَضَ عَنْ يَمِيْنِ الْجَنَّةِ إِذَا دَخَلْتُهَا."

''اے اللہ! جب میں جنّت میں داخل ہوں تو وہاں مجھے دائیں جانب سفید محل دیا جائے۔''

یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: بیٹا! اللہ پاک سے بس جنّت کا سوال کرو اور جہنّم سے پناہ مانگو۔ (دُعا میں بھی غلو اور بے اعتدالی کی راہ اختیار نہ کرو) پھر فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ پیشین گوئی فرماتے ہوئے سنا ہے:

"سَيَكُوْنُ فِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ فِي الطُّهُوْرِ وَالدُّعَاءِ." (رواه أبوداود: ۱/ ۱۳، كتاب الطهارة، باب الإسراف في الوضوء)

''عن قریب اس اُمّت میں (بھی) ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت (وضو اور غسل میں) اور دُعا میں بے اعتدالی کی راہ اختیار کریں گے۔'' (جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہیں)۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوتِ قرآن میں بھی حدّ اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے باز رہنے کی ترغیب دی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزر ہوا تو دونوں کو نماز میں پایا؛ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ آپ نماز میں پست آواز سے قرآنِ کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، جب کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بلند آواز سے تلاوت فرما رہے تھے، صبح جب دونوں دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے آہستہ تلاوت کرنے کی وجہ معلوم کی، تو اُنھوں نے عرض کیا: "قَدْ أَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَيْتُ." حضور! میں تو نماز اور تلاوت کے ذریعے ربّ العالمین کی مناجات میں مشغول تھا، جس کی شان یہ ہے کہ وہ سننے کے لیے بلند آواز کا محتاج نہیں، وہ تو دِلوں کی دھڑکنوں کو بھی سنتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے بلند آواز میں تلاوت کرنے کی وجہ معلوم کی، تو اُنھوں نے عرض کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللهِ! أُوْقِظُ الوَسْنَانَ، وَأَطْرُدُ الشَّيْطَانَ."

''میرا مقصد سونے والوں کو جگانا اور شیطان کو بھگانا تھا۔''

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو حدّ اعتدال کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"يَا أَبَا بَكْرٍ! اِرْفَعْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا، وَقَالَ لِعُمَرَ: اِخْفِضْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا." (رواه أبوداود والترمذي، مشكوٰة : ۱۰۷، باب صلوٰة الليل)

''ابوبکر! تم اپنی آواز کو ذرا بلند کرو اور اے عمر! تم اپنی آواز کو ذرا پست کردو۔''

خود اللہ ربّ العالمین نے بھی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی کا حکم فرمایا تھا:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۱۰﴾ (الإسراء:۱۱۰)

اس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبادات میں حدّ اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے دور رہنے کی ترغیب وتاکید فرمائی۔

معاملات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنے کی ترغیب:

پھر جس طرح عبادات میں اعتدال ضروری ہے اسی طرح دیگر امور و معاملات میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنا اور بے اعتدالی سے محفوظ رہنا ضروری ہے، مثلاً دیکھیں کہ خوراک، لباس، اخراجات، محبّت اور نفرت جیسے امور و معاملات میں بھی یہی ترغیب وتاکید وارد ہے۔ چنانچہ کھانے پینے کے متعلّق حکم ہے کہ شریعت مطہرہ کی حلال کردہ چیزوں کو بھی حدّ اعتدال میں رہتے ہوئے کھاؤ پیو، کیوں کہ اس میں بھی بے اعتدالی بیماری وسستی کا سبب ہے، فرمایا:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱﴾ (الأعراف:۳۱)

ماہرین علم طب کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں علم الادیان کا بیان تو ہے ہی؛ لیکن

علم الابدان کو بھی قرآنِ کریم نے یہاں نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمادیا، اگر طبی طور پر بھی غور کیا جائے تو صحت وتندرستی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کھانے پینے میں احتیاط و اعتدال ملحوظ رکھا جائے اور بے اعتدالی سے بچا جائے۔

نیز آیت کریمہ کے اس ٹکڑے کی جامعیت کو دیکھیں، حضرات مفسرین نے اس سے آٹھ مسائل مستنبط فرمائے ہیں:

(۱) اس آیت میں کھانے پینے کا حکم فرمایا، معلوم ہوا کہ بقدرِ ضرورت کھانا پینا فرض ہے، بھوک ہڑتال جائز نہیں۔

(۲) کھانے پینے کا حکم مطلقاً آیا، معلوم ہوا کہ دُنیا میں کھانے پینے کی جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں اصل حلت ہے، سب چیزیں جائز اور حلال ہیں، جب تک کسی خاص چیز کی حرمت وممانعت کسی دلیل سے ثابت نہ ہوجائے ہر چیز کو حلال سمجھا جائے گا، کیوں کہ "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا" کا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کیا کھاؤ اور کیا پیو، مفعول ذکر نہ کرنا عموم کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہر چیز کھا پی سکتے ہو سوائے ان چیزوں کے جن کو صراحۃً حرام کردیا گیا ہے۔

(۳) کھانے پینے میں اسراف اور بے اعتدالی جائز نہیں ہے، جس کی مختلف صورتیں ہیں:

(۴) مثلاً حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جانا، اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

(۵) اسراف اور بے اعتدالی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ جو چیزیں حلال ہیں انھیں عقیدۃً، عملاً یا قولاً حرام سمجھ کر چھوڑ دینا، اس کی بھی اجازت نہیں۔

(۶) اسراف اور بے اعتدالی یہ بھی ہے کہ باوجود بھوک اور قدرت کے اتنا کم کھائے کہ فرائض وواجبات اور ذمّے داریاں ادا کرنا مشکل ہوجائے۔

(۷) اسراف اور بے اعتدالی میں یہ بھی داخل ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائیں، "لَا تُسْرِفُوْا" کے ذریعے اس کی بھی ممانعت فرمادی گئی۔

(۸) کھانا بقدرِ ضرورت تو فرض ہے؛ لیکن کھانے ہی کو زندگی کا مقصد بنالیا جائے اور ہر وقت اسی کی فکر، یا جس کھانے کی خواہش ہو بہر صورت اُسے حاصل کرنے کا اہتمام، یہ بھی اسراف اور بے اعتدالی میں داخل ہے۔

قرآنِ کریم میں نہایت جامعیت کے ساتھ اس سلسلے میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الأعراف:۳۱)

یہی حکم خوراک کے علاوہ لباس کا بھی ہے کہ جس طرح حدّ اعتدال میں رہتے ہوئے ہر چیز کھانے پینے کی اجازت ہے، اسی طرح حدّ اعتدال میں رہتے ہوئے مرد و زن کو ہر چیز پہننے کی بھی اجازت ہے، اس کو حدیث پاک میں اس طرح فرمایا:

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ قَالَ: "قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا، وَتَصَدَّقُوْا، وَالْبَسُوْا مَا لَمْ يُخَالِطْ إِسْرَافٌ وَّلَا مَخِيْلَةٌ." (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة المصابيح : ۳۷۷، كتاب اللباس)

(اعتدال ملحوظ رکھتے ہوئے جو حلال چیز بآسانی میسّر ہو) کھاؤ پیو اور (جو چیز حاجت وضرورت سے زائد ہو اسے) صدقہ کردو، نیز پہننے کی ہر مباح وجائز چیز اعتدال میں رہتے ہوئے پہنو، البتہ اِسراف (بے اعتدالی) اور تکبّر سے بچو۔

(۲) اخراجات کے معاملے میں بھی شریعت نے اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی ترغیب وتاکید فرمائی ہے، حکم ہے کہ تم جائز محنت وکوشش کرکے حق

وحلال کماؤ اور اہل وعیال اور دیگر ضروریات میں لگاؤ، یہی اعتدال کی راہ ہے، اس کے برخلاف جو کچھ کمایا اس میں سے کچھ بھی خرچ ہی نہ کریں یا سب کچھ ہی خرچ کر دیں یہ دونوں صورتیں بے اعتدالی کی ہیں، قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ (الإسراء : ۲۹)

یعنی نہ فضول خرچی کی اجازت ہے، نہ کنجوسی کی گنجائش ہے، بس بوقت ضرورت بقدرِ ضرورت خرچ کیا جائے، یہی اعتدال کی راہ ہے جس کی ترغیب وتاکید وارد ہوئی ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی پوری جائداد اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کرنا چاہتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا (کیوں کہ یہ بھی بے اعتدالی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی راہ نکالی اور) ایک تہائی مال خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَّتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ." (متفق علیه، مشکوٰۃ المصابیح : ۲۶۵، باب الوصایا)

''تم اپنے ورثاء (اولاد اور اہل خانہ) کو مال دار اور خوش حال چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو مفلس اور بدحال چھوڑو، کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔'' یہ بے اعتدالی ہے، جس سے منع فرمایا۔

(۳) رہی بات محبّت وعداوت کی، تو اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبّت و عداوت کرنا بھی ایمان کا حصّہ ہے؛ لیکن اس میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی ترغیب وتاکید آئی ہے، کیوں کہ عموماً محبّت یا عداوت میں بے اعتدالی کسی

بھی انسان کو نہ صرف یہ کہ بصیرت سے محروم کر دیتی ہے، بصارت بھی چھین لیتی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ کسی سے محبّت وعقیدت میں غلو اور بے اعتدالی کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے محبوب ومقتدیٰ کی ہر بُرائی بھی بھلائی نظر آتی ہے، نیز ان کو دوسروں کی کوئی خوبی جچتی ہی نہیں، یہی حال نفرت وعداوت کے وقت بھی ہوتا ہے کہ دشمن میں رائی جتنی بُرائی بھی پہاڑ کے مانند محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ جیسی خوبی بھی رائی کی طرح حقیر نظر آتی ہے۔

عربی زبان کے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَعَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيْلَةٌ كَمَا أَنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِيْ الْمَسَاوِيَا

''محبّت اور خوشنودی کی نگاہ ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے، جب کہ ناراضی کی نگاہ تمام عیوب وبُرائیوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ سب بے اعتدالی کی شکلیں ہیں، ہمیں اس راہ میں بھی اعتدال پر چلنے کی ترغیب وتاکید ہے، نہ عقیدت میں غلو، تملق اور خوشامد کی اجازت ہے اور نہ عداوت میں حدّ اعتدال سے نکلنے کی گنجائش ہے، کیوں کہ آج کا دوست کل دشمن بھی بن سکتا ہے اور آج کا دشمن کل دوست بھی بن سکتا ہے۔ ایسی صورت میں محبّت وعداوت میں شدّت شرمندگی وندامت کا سبب ہوگی، اس لیے اعتدال میں رہنے کی ترغیب و تاکید کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً﴾ (الممتحنة:۷)

''کیا عجب (اور بعید ہے) کہ اللہ پاک عن قریب ہی تم اور تمھارے دشمنوں کے مابین محبّت پیدا کر دے۔'' (اور عداوت ختم کر دے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں بھی ایسا بہت ہوا اور آج تک ایسا ہوتا رہا ہے،

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبّت وعداوت میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی ترغیب وتاکید اس طرح بیان فرمائی:

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًامَّا، عَسٰى أَنْ يَكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًامَّا، وَأَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًامَّا، عَسٰى أَنْ يَكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًامَّا." (رواه الترمذي، باب ما جاء في الاقتصاد في الحب والبغض)

''دوستی میں اعتدال ملحوظ رکھو اور بے اعتدالی سے بچو، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ کسی دِن تمھارا دوست بھی دُشمن بن جائے، اسی طرح دُشمنی میں بھی دامن اعتدال کو نہ چھوڑو، کیوں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ تمھارا دشمن بھی جگری دوست بن جائے۔''

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے ہمیں دینی عبادات بلکہ زندگی کے تمام ہی امور ومعاملات میں حدّ اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی ترغیب وتاکید فرمائی ہے، اس بنا پر یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ

شریعت کا نظام ہے پُر اعتدال جو ہوگا اس پے عامل وہ ہوگا خوش حال

حق تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے تمام ہی دینی، دُنیوی اور اُخروی امور ومعاملات میں اعتدال ملحوظ رکھنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۴ر صفر المظفر ۱۴۴۲ھ ر قبل الجمعہ

مطابق: ۲ر اکتوبر ۲۰۲۰ء

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۶)

صحت وعافیت کی اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ مِحْصَنٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَصْبَحَ مِنكُمْ اٰمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ، مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ، عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ، فَكَأَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا." (رواه الترمذي وقال هٰذا حديث غريب، مشكوٰة المصابيح : ص٤٤٢/ كتاب الرقاق)

ترجمہ : حضرت سلمہ بن عبیداللہ بن محصن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنے اہل و عیال میں سکونِ قلبی اور صحت وعافیت سے ہو اور اس کے پاس (کم از کم) ایک دِن کے بقدر خوراک اور دیگر سامانِ ضرورت موجود ہوں تو گویا (یہ وہ نعمتیں ہیں کہ) دنیا کی کل نعمتیں اس کے پاس ہیں۔

تمہید:

اللہ ربّ العالمین نے انسان کو دُنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی دُنیا کے عارضی وفانی ہونے کے باوجود اپنی خاص حکمت کے تحت دُنیا کو قسما قسم کی نعمتوں، لذتوں اور

زینتوں سے مزین فرمادیا، اس کی زمین کو بہترین فرش تو آسمان کو بہترین چھت بنادیا، اتناہی نہیں؛ بلکہ آسمان سے صاف ستھرا، عمدہ اور بہترین پانی برسا کر زمین سے ضرورت کی بہترین غذاؤں اور سہولت وزینت کی بہترین چیزوں کو پیدا فرمادیا، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ﴾ (البقرة : ۲۲)

صحت وعافیت کی حقیقت:

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں آنے والا انسان یہاں کی نعمتوں، زینتوں اور لذتوں سے کما حقہ اسی وقت لطف اندوز ہوسکتا ہے جب وہ صحت و عافیت کی نعمت سے مالا مال ہو، بندہ جسمانی، قلبی دِماغی اور ہر طرح کی ظاہری و باطنی، وبائی وغیر وبائی، چھوٹی بڑی بیماریوں سے محفوظ وسلامت ہو، اسے صحت کہتے ہیں، عافیت یہ ہے کہ بندہ دینی اعتبار سے فتنوں سے محفوظ ہو اور جسمانی اعتبار سے بیماریوں اور آزمائشوں سے سلامت ہو۔ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ عافیت کی تعریف اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"السَّلَامَةُ فِيْ الدِّيْنِ مِنَ الفِتْنَةِ، وَالسَّلَامَةُ فِيْ البَدَنِ مِنْ سَيِّئِ الأَسْقَامِ وَالمِحْنَةِ." (مرقاة المفاتيح : ۳۹۶/۵، باب جامع الدعاء)

ظاہر ہے کہ جو بندہ صحت وعافیت کی نعمت سے مالا مال ہوگا وہی دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے کما حقہ نفع اٹھا سکے گا، اس کے برخلاف صحت وعافیت کی نعمت سے محروم اور مبتلائے امراض وآفات وفتن شخص یہاں کی نعمتوں اور لذتوں سے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

صحت وعافیت عظیم الشان نعمت ودولت ہے:

اگرچہ بیماری و پریشانی بھی مؤمن صابر کے لیے کفّارۂ معاصی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے؛ لیکن اگر بیماری کے بجائے شکر الٰہی کے ساتھ تندرستی اور پریشانی کے بجائے عافیت وسلامتی میسّر آجائے تو یقین جانیں کہ صحت وعافیت وہ نعمت الٰہی ہے جو دیگر بے شمار نعمتوں کی اصل جڑ ہے، حدیث مذکور میں صحت وعافیت کو عظیم الشان نعمت اور دنیا کی اصل دولت قرار دیا گیا، فرمایا:

"مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ، مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ، عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ، فَكَأَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا."

جو بندہ صبح کو اس حالت میں اُٹھے کہ وہ قلبی اعتبار سے بے خوف اور پُرسکون ہو، جسمانی اعتبار سے بھی صحت وعافیت سے ہو، نیز اس کے پاس بقدرِ ضرورت اسباب ووسائل بھی ہوں، تو اب خواہ دیگر بہت سی نعمتیں اور سہولتیں اسے میسّر نہ بھی ہوں تو اسے نعمتوں کا بڑا حصّہ مل گیا ہے، صحت وعافیت ہی عظیم الشان نعمت ودولت ہے۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ صحت وعافیت والا انسان غریب ہے ہی نہیں، وہ اگر ظاہری اعتبار سے غریب ہے بھی تو حقیقی اعتبار سے امیر ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ نے اس کے سر پر صحت وعافیت کا قیمتی تاج سجا دیا ہے، جس کا گو اس بندے کو احساس ہو یا نہ ہو، بیمار کو ضرور ہوتا ہے، صحت وعافیت کی قدر وقیمت ایک بیمار ہی اچھّی طرح سمجھ سکتا ہے، جیسے ایمان وہ عظیم الشان نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں، اسی طرح صحت وعافیت بھی وہ قیمتی نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان وہدایت کے بعد صحت وعافیت کو عظیم الشان نعمت اور قیمتی دولت قرار دے کر اللہ پاک سے صحت وعافیت طلب کرنے کی ترغیب دی۔

حدیث پاک میں ہے، سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوکر رونے لگے۔

"عَنْ أَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "قَامَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ، ثُمَّ بَكَىٰ، فَقَالَ: "سَلُوْا اللهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ، فَإِنَّ أَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِيْنِ خَيْرًا مِّنَ الْعَافِيَةِ." (الترمذي، ابن ماجه، مشكوٰة : ۲۱۹، باب جامع الدعاء)

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاک سے عفو (گناہوں کو مٹا دینا ''عفو'' کہلاتا ہے اور پردہ ڈال دینا ''مغفرت'' کہلاتا ہے، اللہ پاک کو گناہوں پر پردہ ڈالنے سے زیادہ مٹا دینا پسند ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ''مغفرت'' سے زیادہ ''عفو'' پسند ہے، حدیث میں ہے: "تُحِبُّ الْعَفْوَ". (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۱۸۲) اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دی) وعافیت کی دعا کرو، کیوں کہ یقین (یعنی ایمان وہدایت) کے بعد اس سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔

اللہ پاک سے صحت وعافیت کی طلب بہترین دعا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی نہایت اہتمام کے ساتھ اللہ ربّ العزت سے صحت وعافیت کی دعا مانگیں۔ احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ربّ العزت سے عصمت وعافیت طلب کرنا بہترین دُعا ہے۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کونسی دُعا سب سے بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے رب سے عافیت (ایمانی وجسمانی اعتبار سے سلامتی) اور معافات (یعنی دارین میں تم لوگوں سے اور لوگ تم سے محفوظ وسلامت رہیں، یا اللہ پاک تمھارے ظلم سے لوگوں کو اور لوگوں کے ظلم سے تمھیں دارین میں محفوظ وسلامت

رکھے اس) کی دعا مانگو۔ (یہ بہترین دعا ہے)۔

"أَنْ يُّعَافِيَكَ اللهُ مِنَ النَّاسِ، وَأَنْ يُّعَافِيَهُمْ مِنْكَ." (مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح : ٥ / ٣٩٦)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سائل نے یہ سوال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسلسل تین دِن تک کیا، تو روزانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی جواب مرحمت فرمایا کہ اللہ پاک سے عافیت اور معافاۃ کی دُعا مانگو، نیز فرمایا کہ اگر تمھیں عافیت ومعافات مل گئی تو سمجھو کہ فلاحِ دارین مل گئی۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: "يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَيُّ الدُّعَاءِ أَفْضَلُ؟" قَالَ: "سَلْ رَبَّكَ العَافِيَةَ وَالمُعَافَاةَ فِيْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، ثُمَّ أَتَاهُ فِيْ اليَوْمِ الثَّانِيْ، فَقَالَ: "يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَيُّ الدُّعَاءِ أَفْضَلُ؟" فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ أَتَاهُ فِيْ اليَوْمِ الثَّالِثِ، فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ، فَالَ: فَإِذَا أُعْطِيْتَ العَافِيَةَ وَالمُعَافَاةَ فِيْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَقَدْ أَفْلَحْتَ." (رواه الترمذي وابن ماجه، مشكوٰة: ص۲۱۹، باب جامع الدعاء)

ایک واقعہ اور صحت وعافیت کی جامع ترین دعا:

اس سلسلے میں ایک واقعہ منقول ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو اللہ پاک سے صحت وعافیت طلب کرنے کی ترغیب وتاکید فرماتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ جب بیمار ہو گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت اور بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا تو وہ سوکھ کر پرندے کے چوزے کے مانند ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر دریافت فرمایا کہ تم اللہ پاک سے کیا دُعا مانگتے ہو؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ میں اللہ پاک سے اس طرح دعا مانگتا ہوں:

"اَللّٰهُمَّ مَا كُنْتَ مُعَاقِبِيْ بِهٖ فِي الْاٰخِرَةِ فَعَجِّلْهُ فِي الدُّنْيَا."

''یا اللہ! آپ آخرت میں مجھے جو عذاب دینے والے ہیں اُسے دنیا ہی میں دے دیجیے اور آخرت میں عذاب سے بچا لیجیے۔''

یہ سن کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا کہ عجیب ہو! اللہ پاک سے عذاب مانگتے ہو؟ یاد رکھو! "لَا تُطِيْقُهٗ وَلَا تَسْتَطِيْعُهٗ" (اللہ پاک بڑے ہیں، تو اُن کے معمولی عذاب کا ادنیٰ سا جھٹکا بھی بہت بڑا ہے) عذابِ الٰہی کو نہ تم دُنیا میں برداشت کر سکتے ہو نہ آخرت میں، لہٰذا اللہ پاک سے عذاب مانگنے کے بجائے عافیت مانگو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ پاک سے عذابِ الٰہی سے حفاظت اور طلب عافیت کی ایک جامع ترین قرآنی دُعا کی طرف توجہ دِلا کر اس کی ترغیب وتاکید فرمائی کہ اللہ پاک سے اس طرح دعا مانگو کہ

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرۃ:۲۰۱)

''اے اللہ! ہمیں دُنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا فرما اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما۔''

یہ قرآنِ کریم کی وہ جامع دعا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر مانگتے تھے۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح: ص۲۱۸)

اس میں آخرت کی بھلائی تو یہ ہے کہ بلا حساب وکتاب جنّت میں داخلہ نصیب

ہو، لیکن دنیا کی بھلائی میں علّامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول صحت وعافیت یعنی ایمانی وجسمانی سلامتی، حلال روزی، نیک اعمال پر توفیق الٰہی، مالداری وخوشحالی اور نیک نامی وغیرہ داخل ہیں۔ (روح المعانی: ۲/۲۹۱)

حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب وتاکید پر جب اس بیمار صحابی نے اس جامع ترین قرآنی دُعا کا اہتمام کیا تو حق تعالیٰ نے انھیں شفا عطا فرمائی۔

"قَالَ: فَدَعَا اللهَ بِهٖ، فَشَفَاهُ اللهُ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۲۰)

اس کے علاوہ حدیث پاک میں بھی اللہ پاک سے صحت وعافیت طلب کرنے کے لیے دُعائیں منقول ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ العَفْوَ وَالعَافِيَةَ وَالمُعَافَاةَ فِيْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ."

(رواه الطبراني، مجمع الزوائد، باب الأدعية المأثورة عن رسول الله ﷺ: ۱۰ / ۱۷۵)

یہ بھی بہت جامع دعا ہے، اس میں بندہ حق تعالیٰ سے دارین میں عفو وعافیت اور معافات کا سوال کرتا ہے۔ (رزقنا الله بمنّه وفضله. آمين)

دوسری دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالعِفَّةَ وَالأَمَانَةَ وَحُسْنَ الخُلُقِ وَالرِّضَا بِالقَدْرِ." (مشكوٰة المصابيح : ص۲۲۰/ باب جامع الدعاء)

''اے اللہ! میں آپ سے صحت وتندرستی، عفت (پاک دامنی اور روزی میں کشادگی) امانت داری، خوش اخلاقی اور رضا بر قضائے الٰہی کا سوال کرتا ہوں۔''

ان جامع ترین دعاؤں کا اہتمام ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔

صحت وعافیت کی حفاظت:

پھر اللہ پاک اپنے فضل وکرم اور ان دُعاؤں کی برکت سے ہمیں صحت و

عافیت عطا فرمادیں تو ان عظیم الشان نعمتوں کا حق وشکر یہی ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے اور دینی یا دُنیوی اعتبار سے کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جس سے ایمان یا جان یعنی صحت وعافیت متاثّر ہو، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ : ۱۹۵)

''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

ہلاکت کی اس ممانعت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے بندے کے ایمان یا جان یعنی اس کی صحت وعافیت کو نقصان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ہماری رعایت کرتے ہوئے ہمیں کسی ایسے فعل یا عمل کی اجازت نہیں دی جس سے ہم ایمانی یا جسمانی اعتبار سے واقعی ہلاکت میں مبتلا ہوجائیں، نہ شرعاً ایسی عبادات مطلوب ہیں نہ ان کی اجازت ہے۔

چنانچہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سیّدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جنھیں عبادات کا بڑا شوق تھا، آپ رضی اللہ عنہ نہایت اخلاص واہتمام کے ساتھ دِن میں صیام اور رات میں عموماً قیام فرماتے تھے، خود کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خوب تھکاتے تھے اور اس پر خوش رہتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ نہ سب کے بس کی بات ہے، نہ شرعاً مطلوب ہے، کیوں کہ اس سے انسان کی صحت متاثّر ہوسکتی ہے، اس لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کا پتا چلا تو ارشاد فرمایا:

"يَا عَبْدَ اللهِ! أَلَمْ أُخْبَرْ أَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ؟"

''عبداللہ! کیا تم روزانہ دِن میں روزہ رکھ کر رات میں نمازیں پڑھتے ہو؟''

اُنھوں نے اقرار کیا، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ مناسب نہیں، بہتر یہ ہے کہ کبھی روزہ رکھیں، کبھی چھوڑ دیں، نیز رات میں آرام بھی کریں اور قیام بھی کریں۔

"فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا...الخ." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ص۱۷۹، باب صیام التطوع)

''کیوں کہ تمھارے جسم اور جان کا بھی تم پر حق ہے (اس کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ پر عباداتِ نافلہ کا ایسا بوجھ نہ ڈالیں جس سے صحت متاثّر ہو) تمھاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے (لہٰذا رات میں قیام کے ساتھ آرام کا بھی اہتمام کریں، تاکہ آنکھیں بھی آرام وسکون پائیں، اور طبیعت بھی اس سے متاثّر نہ ہو) اسی طرح تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے (کہ تم اس کے ساتھ شب باشی اور صحبت ومباشرت کرو، یہ ساری باتیں بھی صحت وعافیت کے لیے ضروری ہیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایسی عباداتِ نافلہ سے منع فرمادیا جن سے صحت وعافیت متاثّر ہوسکتی ہے۔

تو صاحبو! جب ایسی عبادات کی اجازت نہیں جن سے صحت متاثّر ہوسکتی ہے تو ایسی عادات کی اجازت کیوں کر ہوسکتی ہے جن سے صحت و عافیت متاثّر ہو؟ مثلاً بد پرہیزی، نشہ خوری، رات میں بلاوجہ دیر تک جاگنا اور صبح دیر سے اُٹھنا، یہ وہ عاداتِ بد ہیں جن سے صحت متاثّر ہوتی ہے، جب شریعت نے ہماری رعایت میں ایسی عبادات کی اجازت نہیں دی تو ہم بھی شریعت کی رعایت میں ایسی عادات سے بچیں جن سے ہماری صحت متاثّر ہوسکتی ہے، یہی صحت وعافیت کی عظیم الشان نعمت کا حق وشکر ہے۔

اس کے برخلاف جو شخص صحت و عافیت کی حفاظت نہیں کرتا وہ قابل افسوس اور لائق تعجب ہے، بقول:

دولت کمانے کے لیے اپنی صحت کھودیتا ہے
پھر صحت پانے کے لیے اپنی دولت کھودیتا ہے

مستقبل کا سوچ کر اپنا حال ضائع کر دیتا ہے
پھر مستقبل میں اپنا ماضی یاد کر کے رو دیتا ہے

قیامت کے دِن صحت کے متعلق سوال:

یاد رکھو! صحت و عافیت کی حفاظت نہ کرنے سے دُنیا میں جو کچھ نقصان ہوگا وہ تو اپنی جگہ ہے ہی، آخرت میں بھی ایسے لوگوں کے لیے اللہ پاک کے حضور جواب دینا مشکل ہوگا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨﴾ [التکاثر : ۸]

''پھر اُس دِن تم سے نعمتوں کے متعلّق ضرور پوچھا جائے گا۔'' (کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی حفاظت اور ان کا صحیح استعمال کیا تھا یا نہیں؟)

آیت کریمہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ کفّار کے علاوہ اہل ایمان سے بھی آخرت میں انعاماتِ الٰہیہ کے متعلّق سوال ہوگا، البتہ جو خوش نصیب بندے بلا حساب و عذاب جنّت میں جائیں گے وہ اس سوال وحساب سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اَللّٰھُمَّ اجعَلنَا مِنھُم. آمین.

اور نعمتوں میں دُنیا کی ہر وہ چیز شامل ہے جو کسی بھی حیثیت سے مفید، لذیذ اور عزیز ہوتی ہے، بالخصوص تندرستی اور اعضاء کی سلامتی، اس کی تائید ایک دوسری آیت کریمہ سے ہوتی ہے جس میں فرمایا:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝٣٦﴾ [الإسراء:۳۶]

''بلاشُبہ قیامت کے دِن کان، آنکھ اور دِل (وغیرہ اعضائے جسمانی) کے متعلّق سوال ہوگا۔'' لہٰذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ''میرا جسم، میری مرضی'' ہمارا جسم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت اور اس کا عظیم انعام ہے، اس کی ناقدری پر سوال ہوگا۔

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ صحت وعافیت ایک عام انسان کے لیے محض ذاتی مسئلہ ہوسکتا ہے، مسلمان کے لیے نہیں، ہمارے لیے تو صحت وعافیت دین وایمان اور دنیا وآخرت سے جڑی ہوئی چیز ہے، اس لیے اگر اللہ پاک نے اس عظیم الشان نعمت سے نوازا ہے تو اس کی حفاظت اور صحیح استعمال کرنا ضروری ہے، کہ ایمان کے بعد صحت و عافیت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، نظیر اکبرآبادی کا شعر ہے:

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں تمام ظاہری وباطنی نعمتوں کے ساتھ صحت وعافیت عطا فرما کر ان کی قدردانی اور شکرگزاری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مؤرخہ: ۲۸ر صفر المظفر ر ۱۴۴۲ھ
مطابق: ۱۶ر اکتوبر ر ۲۰۲۰ء
قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

(۷)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عائلی زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا، حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقُرُوْنِ الَّذِيْ كُنْتُ مِنْهُ." (رواه البخاري، مشكوٰة المصابيح : ص۵۱۱ / باب فضائل سيد المرسلين صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بنی آدم کے یکے بعد دیگرے ہر زمانے کے بہترین طبقات میں مبعوث کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس موجودہ زمانے کے بہترین طبقے میں پیدا کیا گیا۔

تمہید:

اللہ ربّ العزت نے انسان کی فطرت وطبیعت میں اُنسیت، اپنائیت اور محبّت رکھی ہے، انسان جس حیثیت کا بھی حامل اور جس مرتبے ومقام پر بھی فائز ہو، جس زمین اور زمان ومکان میں بھی ہو اُنسیت، اپنائیت اور محبّت کے بغیر یعنی سماج، معاشرہ اور خاندان کے افراد کے بغیر سب سے ہٹ کٹ کر کسی سیون اسٹار ہوٹل یا بہترین فارم ہاؤس میں بھی مکمّل تنہائی کی زندگی گزار نہیں سکتا، خواہ اس کے پاس سامانِ سکون اور عیش

وعشرت کے سارے اسباب ووسائل موجود ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ انسانِ اوّل سیّدنا آدم علیہ السلام کو جب جنّت میں رکھا گیا تو وہاں ناقابل تصوّر سامانِ سکون، اسباب و وسائل اور ہر قسم کی نعمتوں اور لذتوں کے باوجود انھیں بے چینی و بے قراری کا احساس ہوا، جس کو دور کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے اَماں حوّا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (النساء : ۱)

پھر حق تعالیٰ نے حضرت آدم اور حوّا علیہما السلام کے مابین سب سے پہلے میاں بیوی کا رشتہ قائم فرمایا، جس کی برکت سے اولاد، خاندان اور انسانی معاشرہ وسماج وجود میں آیا، جس میں مل جل کر رہنے سے انسان کو اُنسیت، اپنائیت اور محبّت کی لازوال نعمت حاصل ہوتی ہے۔

عائلی زندگی کی تباہی کی بنیادی وجہ:

حق تعالیٰ نے انسان کو اُنسیت، اپنائیت اور محبّت کی لازوال نعمت سے مالامال کرنے کے لیے پیدائشی طور پر ہی مختلف خونی اور قدرتی رِشتوں سے جوڑ کر ساری زندگی اُن رشتوں کو نبھانے کی ترغیب وتاکید فرمائی:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ (النساء : ۱)

واقعہ یہ ہے کہ خونی اور قدرتی رِشتوں کو نبھائے بغیر ایک مضبوط اور مستحکم معاشرہ جس پر زندگی کی خوش گواری کا دارومدار ہے وجود میں نہیں آسکتا۔ آج مغربی خاندان اپنی ظاہری ترقّی کے باوجود تیزی سے بکھرتے جارہے ہیں، جن پر مغربی

دانشور اظہارِ افسوس وتشویش کر رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد میں خونی وخاندانی رِشتوں کی کوئی خاص اہمیت، عظمت اور وقعت نہیں ہے، جس کی وجہ سے نہ وہ رشتے داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، نہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، وہ لوگ ان رشتوں کو فرسودہ اور بیہودہ قرار دے کر سال میں ایک دِن ان رشتوں کے نام سے منا کر خونی وخاندانی رشتوں کی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہو رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا عائلی، خاندانی وسماجی نظام اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور زندگی بے رونق بن گئی ہے۔

اس کا حل یہی ہے کہ جن رِشتوں کو خود حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہم انھیں پہچانیں اور نبھائیں اور ان کے حقوق ادا کریں، اور یہ بات کسی کے لیے مشکل نہیں، ہر انسان ہر رشتے کو نبھا سکتا ہے، خواہ وہ جس حیثیت کا حامل اور جس مرتبے ومقام پر فائز ہو، سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنی عائلی، خاندانی وسماجی زندگی سے اس بات کو ثابت کر دیا، کیوں کہ عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں جس طرح ہم مختلف رِشتوں سے جڑے ہوئے ہیں حضور ﷺ بھی اسی طرح مختلف رِشتوں سے منسلک اور جڑے ہوئے تھے، لیکن ہر رِشتے کو آپ ﷺ نے کما حقہ نبھا کر اس سلسلے میں بھی اُمّت کے سامنے اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا۔

اللہ کے رسول ﷺ بیٹے کی حیثیت سے:

اس مضمون میں ہم اللہ کے رسول ﷺ کی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

(۱) انسانی رِشتوں میں سب سے گہرا رِشتہ اولاد اور ماں باپ کا ہے، اس کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعدد

جگہوں پر اپنی عبادت کا حکم دینے کے بعد فوراً والدین کی عزّت واطاعت، خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (الإسراء:۲۳)

رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے قول وعمل سے والدین کی اہمیت وعظمت کو واضح فرمایا۔ اسی لیے حضراتِ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد انسانی رِشتوں میں سب سے مضبوط، مستحکم، اہم اور مقدّم رِشتہ اولاد اور والدین کا ہے۔

اب جہاں تک تعلق ہے اللہ کے رسول ﷺ کی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں اس رشتے کا، تو اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ کے والدین کی وفات آپ ﷺ کے بچپن ہی میں ہو چکی تھی، لیکن بہترین اولاد اور بیٹے کی حیثیت سے آپ ﷺ نے اپنے رضاعی والدین اور چچا خواجہ ابوطالب کے ساتھ انتہائی بہترین سلوک کر کے اس سلسلے میں اُمّت کے سامنے نہایت اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا، آپ ﷺ کو سب سے پہلے آپ ﷺ کی حقیقی والدہ سیّدہ آمنہ بنت وہب (بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لوی ..... الخ) نے اور ان کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثویبہ اسلمیہ نے اور سب سے زیادہ سیّدہ حلیمہ بنت ابی ذویب سعدیہ رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا، آپ ﷺ نے بہ حیثیت بیٹا اپنی ماؤں کے ساتھ محبّت، عظمت اور خدمت کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، آپ ﷺ حسب موقع اپنی والدہ ماجدہ سیّدہ آمنہ کا تذکرہ فرماتے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ ﷺ کا گزر مقامِ ابواء کے پاس سے ہوا، جہاں آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کی قبر تھی، آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ

والدہ ماجدہ کی قبر پر حاضر ہوئے تو ماں کی ممتا یاد آ گئی، آپ ﷺ خود بھی روئے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی رونے لگے، حدیث پاک میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "زَارَ النَّبِيُّ ﷺ قَبْرَ أُمِّهٖ، فَبَكٰى، وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهٗ." (رواه مسلم، مشكوٰة: ص۱۵۴ / باب زيارة القبور)

سعادت منداولاد وفات کے بعد بھی اپنے والدین کو بھولتی نہیں۔ والدین کی وفات کے بعد ان کی قبر کی زیارت کرنا، وہاں دعائے مغفرت کے لیے حاضر ہونا سعادت مندی اور بڑی نیکی ہے، حدیث پاک میں وارد ہے کہ جو شخص اپنے والدین یا ان میں سے کسی بھی ایک کی قبر پر جمعہ کو (یا مطلقاً ہفتے میں کسی بھی دِن) حاضر ہو کر زیارت (اور دُعائے مغفرت) کرے تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور اسے نیک اولاد میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ النُّعْمَانَ يَرْفَعُ الْحَدِيْثَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ زَارَ قَبْرَ أَبَوَيْهِ أَوْ أَحَدِهِمَا فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ غُفِرَ لَهٗ وَكُتِبَ بَرًّا." (رواه البيهقي في شعب الإيمان مرسلا، مشكوٰة: ص۱۵۳/ باب زيارة القبور)

سیرتِ نبی ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت بیٹا آپ ﷺ اپنی ماؤں کے ساتھ حسب موقع حسن سلوک فرماتے تھے۔ حضرت ثویبہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مروی ہے کہ اکثر آپ ﷺ انھیں کپڑے بھیجا کرتے تھے۔

"وَكَانَ يَبْعَثُ إِلٰى ثُوَيْبَةَ مَوْلَاةِ أَبِيْ لَهَبٍ مُرْضِعَتِهٖ بِصِلَةٍ وَكِسْوَةٍ."

(الشفا بتعريف حقوق المصطفٰى، فصل: وأما تواضعه ﷺ على علو منصبه ورفعته)

سیّدہ ثویبہ رضی اللہ عنہا بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئیں اور فتح خیبر کے بعد آپ کی وفات ہوئی۔ (مرقاۃ)

اسی طرح سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد ایک مرتبہ آپ ﷺ کی رضاعی ماں سیّدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا اپنے علاقے میں قحط کے حالات سے پریشان ہوکر حاضر خدمت ہوئیں تو آپ ﷺ نے بیٹے کی حیثیت سے چالیس بکریاں اور سامانِ ضرورت سے لدا ہوا ایک اونٹ عطا فرمایا، جس سے سیّدہ حلیمہ رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوگئیں اور دعائیں دے کر رُخصت ہوئیں۔ (رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی: ۵۶)

اس کے بعد غزوۂ حنین کے موقع پر حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا جب حضور ﷺ کی خدمت میں اپنے شوہر کے ہمراہ حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر ان کا اکرام فرمایا اور ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی، اسی وقت سیّدہ حلیمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر مسلمان ہو گئے۔ سیّدہ حلیمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۸ھ میں ہوئی، آپ مدینہ منورہ جنّت البقیع میں مدفون ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی عائلی، خاندانی وسماجی زندگی میں بحیثیت بیٹے کے اپنے قول وعمل سے اُمّت کو یہ پیغام پہنچایا کہ والدین سے محبّت، ان کی عزّت، اطاعت، خدمت اور حسن سلوک کا بہر حال اہتمام کیا جائے اور ہر حال میں ان کا خیال رکھا جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ بھائی کی حیثیت سے:

(۲) پھر والدین سے جو مقدّس رِشتہ بطورِ تحفہ ملتا ہے ان میں سب سے قریبی رِشتہ بھائی بہن کا ہے، اللہ کے رسول ﷺ چوں کہ اپنے والدین کے اِکلوتے بیٹے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے حقیقی بھائی بہن تو نہ تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے اپنے رِشتے کے بھائی بہنوں کے ساتھ بہترین سلوک فرما کر اس سلسلے میں بھی اُمّت کے سامنے نمونہ پیش کیا۔

مثلاً حضرت جعفر طیّار رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ (جو بچپن ہی سے حضور ﷺ کی تربیت میں تھے، ان) سے دس سال بڑے تھے، بالکل شروع ہی میں اِکیس لوگوں کے بعد ہی مسلمان ہو گئے تھے، صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے حضور ﷺ کے بہت مشابہ تھے، مکہ مکرّمہ سے جن مہاجرین نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی ان میں آپ رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے، شاہِ حبش کے دربار میں بہترین تقریر فرما کر غلط فہمیوں کو آپ رضی اللہ عنہ ہی نے دور فرمایا تھا، اس کے بعد فتح خیبر کے موقع پر جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو حضور ﷺ نے ان کا والہانہ استقبال کیا، سلام ومصافحہ کے بعد معانقہ فرمایا، ان کی آمد پر محبّت وخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ پتا نہیں مجھے جعفر طیّار رضی اللہ عنہ کی آمد کی خوشی زیادہ ہے یا فتح خیبر کی۔

"قَالَ: مَا أَدْرِيْ أَنَا بِفَتْحِ خَيْبَرَ أَفْرَحُ أَمْ بِقُدُوْمِ جَعْفَرٍ." (رواه في شرح السنة، مشكوٰة المصابيح: ص۴۰۲/ باب المصافحة والمعانقة)

پھر آپ ﷺ نے انھیں اپنے مکان کے قریب رکھا، چند ماہ قیام کے بعد ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے لیے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں ایک لشکر آپ ﷺ نے شام کی طرف روانہ فرمایا، جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے بھی شرکت فرمائی اور جامِ شہادت نوش کیا، حضور ﷺ کو بطورِ معجزہ شہادت اور دخولِ جنّت کے علاوہ اس کی اطلاع دی گئی کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دو پر اور بازو ہیں جن کے ذریعے آپ جنّت میں فرشتوں کے ساتھ اُڑ رہے ہیں۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : "رَأَيْتُ جَعْفَرًا يَطِيْرُ فِي الْجَنَّةِ مَعَ الْمَلَائِكَةِ." (الترمذي، مشكوٰة: ص۵۷۰/ باب مناقب أهل البيت)

اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کا لقب ''جعفر طیّار'' ہوگیا، نیز آپ رضی اللہ عنہ مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے، جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے ان کی کنیت ''ابو المساکین'' رکھی تھی۔ (ترمذی، مشکوۃ: ۵۷۰)

آپ ﷺ کے رِشتے کے بھائیوں میں پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی ہیں، یہ حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے، سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول فرما کر شروع ہی سے اسلام کی خاطر بڑی مشقتیں برداشت کیں، اللہ تعالیٰ کی راہ میں سب سے پہلے تلوار آپ رضی اللہ عنہ ہی نے اُٹھائی، غزوۂ اُحد میں حضور ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے، اس کے علاوہ بھی تمام غزوات میں شریک رہے، آپ رضی اللہ عنہ ان دَس خوش نصیب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنھیں دُنیا ہی میں اللہ کے رسول ﷺ نے جنّت کی بشارت سنائی۔ (بخاری، مشکوۃ: ۵۶۵، باب مناقب العشرۃ)

حضور ﷺ اپنے اس پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ کتنا محبّت کا برتاؤ کرتے تھے اس کا اندازہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ ساری دُنیا اور اُمّت مسلمہ حضور ﷺ سے اظہارِ محبّت میں کہتی ہے کہ ''ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں''؛ لیکن حضور ﷺ نے اپنے اس پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''میرے ماں باپ تم پر فدا (اور قربان) ہوں۔''

"قَالَ: "فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ." (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٦٥)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنّت میں ہر نبی کا ایک حواری (جان نثار، وفادار، مددگار) ہے اور میرے حواری زبیر ہیں۔''

"قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا،

وَحَوَارِيُّ الزُّبَيْرُ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۵۶۵)

آپ رضی اللہ عنہ جنگ جمل کے موقع پر ۳۶ھ میں بہ عمر ۶۴ سال عمرو بن جرموز ملعون کے ہاتھوں شہید ہوئے، ابتداءً وادیٔ سبا میں دفن ہوئے پھر آپ رضی اللہ عنہ کو بصرہ منتقل کیا گیا۔ (توضیحات: ۸/۴۴۰، مظاہر حق جدید: ۵/۷۰۷)

آپ ﷺ کی رشتے دار بہنوں میں سیّدہ اُمامہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی چچازاد بہن ہیں، ہجرت سے قبل پیدا ہوئی تھیں، والد کی شہادت کے بعد بہ حالت یتیمی مکّہ مکرّمہ میں اپنے ننہال میں رہائش پذیر تھیں۔ سن ہجری ۷ میں جب اللہ کے رسول ﷺ عمرۃ القضاء سے فارغ ہوکر تین دِن کے بعد مکہ مکرّمہ سے مدینہ طیبہ واپس لوٹنے لگے تب یہ یتیم بچّی حضور ﷺ کو "يَا عَمِّ!... يَاعَمِّ!" پکارتی ہوئی حاضر ہوئیں اور ساتھ ہوگئیں، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ نے یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم وہدایت فرمائی تھی اس کے نتیجے میں تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس یتیم بچّی کو اپنی تربیت اور پرورش میں لینے کی پیش کش کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ یہ میرے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے: "وَهِيَ بِنْتُ عَمِّيْ" لہٰذا اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حق میرا ہے، حضرت جعفر طیّار رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میرا حق (علی سے بھی) زیادہ ہے، کیوں کہ یہ (علی کی طرح) میری بھی بہن ہے اور اس کی خالہ (حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا) میرے نکاح میں ہے۔ "وَقَالَ جَعْفَرٌ: "هِيَ بِنْتُ عَمِّيْ، وَخَالَتُهَا تَحْتِيْ." اس لیے اس کی پروش کا سب سے زیادہ حق مجھے حاصل ہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ بچّی کے والد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور میرے درمیان حضور ﷺ نے مواخات قائم فرمائی تھی، اس لیے یہ میرے بھائی کی بیٹی ہوئی، لہٰذا اس کی پرورش کا موقع مجھے ملنا چاہیے، اس مباحثے کا حل فرماتے ہوئے حضور

ﷺ نے سیّدہ اُمامہ رضی اللہ عنہا کو سیّدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی پرورش میں دے دیا، کیوں کہ بچّی کی خالہ اُن کے نکاح میں تھیں، اور فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔

"قَضٰى بِهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِخَالَتِهَا، وَقَالَ: الخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الأُمِّ." (متفق عليه، مشكوٰة: ص۲۹۳/ باب بلوغ الصغير وحضانته في الصغر)

حضور ﷺ نے اپنی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں بھائی کی حیثیت سے اپنے قول وعمل کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ بھائی اگر عمر میں بڑا ہو تو باپ کا کردار ادا کرتے ہوئے چھوٹے بھائی بہن کی پرورش، تربیت اور ان پر شفقت کا اہتمام کرے، اور اگر بھائی عمر میں چھوٹا ہو تو وہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ عزّت واطاعت کا برتاؤ کرے اور بہر حال اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

اللہ کے رسول ﷺ شوہر کی حیثیت سے:

عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں ہر شخص کے سامنے ایک مرحلہ وہ آتا ہے جس میں وہ نکاح کے بعد کسی کا شوہر بن جاتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ بھی اس مرحلے سے گزرے۔ سیرت وحدیث کی مستند روایات کے مطابق باتفاقِ علماء آپ ﷺ نے کل گیارہ نکاح فرمائے، جن میں سب سے پہلا (۱) نکاح سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے فرمایا، ان کی موجودگی میں آپ ﷺ نے اور کوئی نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے (۲) سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۳) سیّدہ عائشہ بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۴) سیّدہ حفصہ بنت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۵) سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا (اُمّ المساکین) سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۶) سیّدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بنت ابی اُمیہ سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۷) سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح

فرمایا، ان کے بعد (۸) سیّدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۹) سیّدہ اُمّ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، ان کے بعد (۱۰) سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حُیی بن اخطب سے نکاح فرمایا اور اخیر میں (۱۱) سیّدہ میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔ (سیرتِ مصطفی: ۲/۴۴۲، مظاہر حق جدید: ۵/۷۹۶)

یہ تمام ازواجِ مطہرات فرقِ مراتب کے باوجود اس شرف میں یکساں طور پر شریک ہیں کہ انھیں حضور ﷺ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا اور قرآنِ کریم نے اُنھیں مؤمنین کی مائیں قرار دیا:

﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ (الأحزاب : ٦)

حضرات علمائے کرام نے اس پر بھی کلام فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے گیارہ عورتوں سے نکاح کیوں فرمایا؟ عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ چار بنیادی وجوہ سے حضور ﷺ نے متعدد نکاح فرمائے: (۱) حکم ربّانی اور وحیٔ الٰہی (۲) اظہارِ ہمدردی و دل جوئی (۳) ضرورتِ ملّی و دینی (۴) خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے اُسوۂ مثالی و عملی۔

صاحبو! جب پیغمبرانہ حیثیت سے کوئی کلام آپ ﷺ وحیٔ الٰہی کے بغیر نہیں فرماتے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم:۳-۴) تو زندگی کا اہم کام وحی الٰہی اور حکم ربّانی کے بغیر آپ ﷺ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی نکاح خواہش نفس کے لیے نہیں کیا؛ بلکہ حکم ربّانی اور وحیٔ الٰہی کی وجہ سے کیا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَا تَزَوَّجْتُ شَيْئًا مِنْ نِسَائِيْ وَلَا زَوَّجْتُ شَيْئًا مِنْ

بَنَاتِيْ، إِلَّا بِإِذْنٍ جَاءَنِيْ بِهٖ جِبْرِيْلُ عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ." (الفردوس بمأثور الخطاب للديلمي / باب الميم، الرقم : ٦٢٨٩)

حضور ﷺ کے متعدد نکاح کی دوسری بڑی وجہ ازواجِ مطہرات اور ان کے یا خود اپنے اعزّہ واقرباء کے ساتھ اظہارِ ہمدردی و دل جوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے سوائے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے کسی باکرہ سے نکاح نہیں کیا، اور سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی آپ ﷺ نے جو نکاح فرمایا اس کی بڑی وجہ وحیٔ الٰہی ہے، نبی کا خواب بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے، حدیث میں ہے کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے حضور ﷺ کو تین مرتبہ خواب میں ان کی صورت دِکھا کر کہا گیا کہ

"هٰذِهِ امْرَأَتُكَ" (متفق عليه، مشكوٰة: ٥٧٣)

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ یہ (عائشہ رضی اللہ عنہا) دنیا وآخرت میں آپ کی بیوی ہے:

"هٰذِهِ زَوْجَتُكَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ." (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٥٧٤)

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ ﷺ کے نکاح میں آنے والی تمام ازواجِ مطہرات بیوہ تھیں، سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے پہلے ابوہالہ بن زرارہ تمیمی اور ان کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے بیوہ ہوگئی تھیں، پھر حضور ﷺ سے نکاح کے وقت ان کی عمر چالیس سال اور حضور ﷺ کی عمر پچیّس سال تھی۔

(سیرتِ مصطفیٰ: ۲/ ۴۴۷)

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات بہ عمر ۶۴ سال ہجرت سے قبل ہوئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے دوسرا نکاح سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے کیا، جو اپنے چچازاد بھائی سکران بن عمرو سے نکاح کے بعد بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کے بعد تیسرا نکاح سیّدہ عائشہ

رضی اللہ عنہا سے بحکم الٰہی مختلف دینی وملّی ضرورتوں کے تحت ہوا۔ چوتھا نکاح سن ہجری تین میں سیّدہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما سے ہوا، یہ بھی اپنے پہلے شوہر خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہوگئی تھیں۔

حضور ﷺ کا پانچواں نکاح سن ہجری تین میں سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت ہوا جب ان کے سابق شوہر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوگئے، آپ اس وقت حاملہ بھی تھیں، کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں ایک ناتمام بچّہ پیدا ہوا، جس سے عدت ختم ہوگئی اور حضور ﷺ نے ان سے نکاح فرمالیا۔ اس نکاح کو ابھی تین ہی مہینے گزرے تھے کہ تیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا، حضور ﷺ نے خود نمازِ جنازہ پڑھا کر انھیں جنّت البقیع میں دفن فرمایا۔

حضور ﷺ کا چھٹا نکاح سیّدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے سن ہجری چار میں ہوا، یہ بھی آپ ﷺ سے پہلے اپنے چچازاد بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی سے نکاح کے بعد بیوہ ہوگئی تھیں۔ حضور ﷺ کا ساتواں نکاح سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے سن ہجری پانچ میں ہوا، جو آپ ﷺ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، آپ ﷺ کی زوجیت میں آنے سے پہلے آپ ﷺ کے متبنیٰ (منھ بولے بیٹے) اور آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں، حضور ﷺ سے ان کا نکاح حق تعالیٰ نے اپنی ولایت خاصہ سے فرمایا۔

ان کے بعد حضور ﷺ کا آٹھواں نکاح سیّدہ جویریہ بنت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہما سے سن ہجری پانچ میں ہوا، آپ بنی المصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح مسافح بن صفوان مصطلقی سے ہوا تھا، جو غزوۂ مریسیع میں مارا گیا، اس غزوے میں بہت سے بچّے اور عورتیں گرفتار ہوئے، جن میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، آپ

ﷺ نے انھیں آزاد کیا اور مزید احسان یہ فرمایا کہ انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔

حضور ﷺ کا نواں نکاح سیّدہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے سن ہجری چھ میں ہوا، جن کی کنیت اُم حبیبہ تھی، حضور ﷺ سے قبل وہ عبید اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں، ابتدا ہی میں مسلمان ہوکر اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئیں، جہاں ان کے پہلے شوہر نے نصرانیت اختیار کر لی اور وہ اسی حالت میں وہاں مر گیا، حضور ﷺ نے ان سے اظہارِ ہمدردی و دل جوئی کے لیے شاہِ حبش کو عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہاتھوں نکاح کا پیغام بھیجا، جسے بہ خوشی قبول کر لیا گیا۔

حضور ﷺ کا دسواں نکاح سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیی بن اخطب سے سن ہجری سات میں اس وقت ہوا جب آپ فتح خیبر کے بعد قیدی و باندی ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئیں، آپ رضی اللہ عنہا بنی نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، حضور ﷺ سے نکاح سے قبل آپ دو مرتبہ بیوہ ہو گئی تھیں، ان کا پہلا شوہر سلام بن مشکم قرظی تھا، جس نے طلاق دے دی، تو آپ کا دوسرا عقد کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا، یہ غزوۂ خیبر میں قتل ہوا تھا، تو آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد فرما کر ان کی آزادی کو مہر قرار دے کر دورانِ سفر نکاح فرمایا۔

حضور ﷺ نے گیارہواں نکاح سیّدہ میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے سن ہجری سات میں عمرۃ القضاء کے موقع پر بہ حالت احرام مقام سرف میں فرمایا، آپ رضی اللہ عنہا اُمّ المساکین سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کی سوتیلی بہن بھی ہیں (دونوں کی والدہ ہند ہیں) نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور مشہور تابعی حضرت یزید بن اصم رحمۃ اللہ علیہ کی خالہ بھی ہیں۔ حضور ﷺ سے پہلے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ابو رہم بن عبد العزیٰ کے نکاح میں تھیں، ان کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کے نکاح میں

آئیں۔(مستفاداز: سیرتِ مصطفیٰ:۲/۴۴۲تا۵۰۸،مظاہرحق:۵/۷۹۶تا۸۰۹)

حضور ﷺ نے ان بیوہ عورتوں سے نکاح فرما کر اُمّت کو یہ پیغام دیا کہ بیواؤں سے حقیقی ہمدردی ودل جوئی یہی ہے کہ ان کے نکاح کا انتظام کیا جائے۔

حضور ﷺ کے متعدد نکاح کی تیسری وجہ دینی وملّی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، خواتین اُمّت کو نبوی علوم کا بڑا حصّہ ان ہی اَزواجِ مطہرات کے ذریعے پہنچا، گویا اَزواجِ مطہرات کے مقدّس حجرات خواتین اُمّت کے حق میں مدرسۃ البنات تھے۔ نیز حضور ﷺ کی عائلی، خاندانی ونجی زندگی کا بیشتر علم بھی اُمّت کو اَزواجِ مطہرات کے ذریعے حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں بعض نکاح کی برکت سے پورے قبیلے اسلام کی طرف مائل ہوئے، جیسے سیّدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کا حضور ﷺ کی زوجیت میں آنا ان کے قبیلے بنی المصطلق کے لوگوں کی آزادی اور ایمان لانے کا ذریعہ بنا۔(مظاہرحق جدید:۵/۸۰۶)

نیز سیّدہ اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کا نکاح کرنا ان کے والد ابوسفیان کی اسلام دشمنی میں کمی کا سبب بنا، حتیٰ کہ فتح مکّہ کے وقت وہ مسلمان ہوگئے۔

حضور ﷺ کے متعدد نکاح کی چوتھی وجہ اُمّت کے سامنے مثالی شوہر کی حیثیت سے عملی نمونہ پیش کرنا بھی ہے، یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی عائلی، خاندانی وسماجی زندگی میں شوہر کی حیثیت سے بھی نہایت اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا، آپ ﷺ کی کل گیارہ بیویاں تھیں، جن میں سے دو(سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا) کا آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں انتقال ہوگیا، باقی نو بیویاں وفات تک آپ ﷺ کی زوجیت میں رہیں اور آپ ﷺ ان تمام کے بہترین وکامیاب ترین شوہر رہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قُبِضَ عَنْ تِسْعِ نِسْوَةٍ." (متفق علیه، مشکوٰة : ۲۷۹)

آپ ﷺ نے ساری زندگی اَزواجِ مطہرات کے حقوق بھی ادا فرمائے اور ان کے ساتھ حسن سلوک بھی فرمایا، ان کی ضروریاتِ زندگی کا بھرپور لحاظ فرمایا۔ مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد جب مسجد نبوی کی تعمیر مکمّل ہوگئی تو اَزواجِ مطہرات کے مستقل حجرات تعمیر کروائے، ہر حجرے کی لمبائی دس ہاتھ اور چوڑائی تقریباً سات ہاتھ تھی۔ (طبقات ابن سعد)

اکثر حجرے کھجور کی شاخوں اور بعض کچی اینٹوں کے تھے، دروازے پر کمبل اور ٹاٹ کے پردے تھے، ان حجرات میں رات کو عموماً چراغ نہیں جلتے تھے۔
(سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۴۳۰)

ابتدائی زندگی کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ وسعت ہوئی تو ہر زوجہ محترمہ کے لیے اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جو (اَناج) کا سالانہ خرچ کے طور پر انتظام کیا جاتا۔ (دلائل النبوۃ: ۱/ ۱۳۰)

منصب نبوت پر فائز ہونے کے باوجود آپ ﷺ ہر ایک زوجہ کو وقت دیتے، آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ عصر کی نماز کے بعد اَزواجِ مطہرات کے یہاں تشریف لے جاتے اور ان کی ضروریات معلوم فرما کر تکمیل کا انتظام فرماتے، ہر ایک سے اس قدر محبّت کا اظہار فرماتے کہ ہر بیوی یہ محسوس کرتی کہ حضور ﷺ سب سے زیادہ مجھے ہی چاہتے ہیں، آپ ﷺ سے کوئی جدا ہونا نہ چاہتا۔

چنانچہ ایک موقع پر سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تو سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: حضور! مجھے اپنی زوجیت میں رہنے دیجیے، میری تمنّا اور خواہش صرف یہ ہے کہ قیامت کے دِن حق تعالیٰ مجھے آپ کی زوجہ کی حیثیت سے

اُٹھائے اور جنّت میں آپ کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہوں، اور چوں کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں، اس لیے اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کرتی ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے اس پیش کش کو منظور فرمالیا۔

"أَمْسِكْنِيْ، قَدْ وَهَبْتُ يَوْمِيْ لِعَائِشَةَ، لَعَلِّيْ أَنْ أَكُوْنَ مِنْ نِسَائِكَ فِيْ الجَنَّةِ." (مشكوٰة : ۲۸۰، باب القسم)

اسی طرح فتح خیبر کے بعد جب مال و دولت کی فراوانی ہوئی تو اَنصار و مہاجرین کی خواتین کو دیکھ کر بعض اَزواجِ مطہرات نے بھی حضور ﷺ سے نان ونفقہ میں اضافے (خرچ بڑھانے) کی درخواست کی، حضور ﷺ کو سادگی والی زندگی پسند تھی، اس لیے اس درخواست پر حضور ﷺ ناراض ہوگئے اور اَزواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار فرمالی، جو ایک ماہ تک جاری رہی، اس دوران مسجد نبوی کے قریب دو منزلہ مکان کے بالا خانے میں آپ ﷺ نے وقت گزارا، بالآخر حق تعالیٰ نے آیت تخییر نازل فرمائی:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝﴾ (الأحزاب : ۲۸)

''اے نبیؐ (مکرّم!) اپنی اَزواج سے فرمادیں کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت و آرائش کی خواہش مند ہو تو آؤ! میں تمھیں مال و متاع دے دوں اور تمھیں حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کردوں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے تمام اَزواجِ مطہرات کو اختیار دیا تھا (اسی سے تفویض طلاق کے احکام ثابت ہوئے کہ شوہر اگر مجلس میں یا مطلق یا مشروط طور پر طلاق کا اختیار دے دے اور عورت اسے استعمال کرلے تو عندالاحناف طلاقِ بائن

ہوگی۔ (جس کے بعد نکاح کیے بغیر میاں بیوی جمع نہیں ہو سکتے) (مستفاد از: عام کتب فقہ و توضیحات: ۵/ ۲۰۲)

اس اختیار دیے جانے پر ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے بھی اللہ کے رسول ﷺ سے علیحدگی کو گوارا نہ کیا۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: "خَيَّرَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، فَاخْتَرْنَا اللهَ وَرَسُوْلَهُ، فَلَمْ يَعُدَّ ذٰلِكَ عَلَيْنَا شَيْئًا." (متفق عليه، مشكوٰة: ص۲۸۳)

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ شوہر کی حیثیت سے آپ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ خوش گوار بہترین زندگی گزاری، جب بھی آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے سلام کر کے داخل ہوتے، گھر میں ایک بہترین شوہر کی حیثیت سے بلا تکلّف گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتے، انھیں وقت دیتے؛ بلکہ ان کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتے اور ساتھ دیتے، محض آرام فرمانے کے بجائے کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے، خاص طور پر اپنے ذاتی کام حتی الامکان آپ ﷺ خود کرتے تھے، کسی کو حکم نہ فرماتے، حدیث میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: "كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهُ، وَيَخِيْطُ ثَوْبَهُ، وَيَعْمَلُ فِيْ بَيْتِهِ كَمَا يَعْمَلُ أَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهِ." (رواه الترمذي، مشكوٰة: ص۵۲۰)

آپ ﷺ مخدوم بننے کے بجائے خادم بن کر گھریلو کام میں گھر کے ایک فرد کی طرح شریک ہوتے، تاکہ اہل خانہ سے اُنسیت اور اپنائیت برقرار رہے۔

نیز آپ ﷺ مزید اُنسیت و اظہارِ محبّت کے لیے اپنی بیوی کو پیارے نام سے بلاتے، مثلاً سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے: "يَا عَائِشُ!" (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۵۷۳)

رسول اللہ ﷺ شوہر ہونے کی حیثیت سے بیویوں کے ناز ونخرے بھی برداشت فرماتے؛ بلکہ ان کی ناگواری کو بھی فوراً محسوس فرمالیتے، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہوتو مجھے پتا چل جاتا ہے اور کسی دُنیوی معاملے میں تمھیں ناگواری ہوتو بھی مجھے پتا چل جاتا ہے، عرض کیا: کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم خوش ہوتی ہوتو "وَرَبِّ مُحَمَّدٍ" کہتی ہو، اور ناراض ہوتی ہوتو "وَرَبِّ إِبْرَاهِيْمَ" کہتی ہو۔ (متفق علیہ، مشکوۃ:۲۸۰)

آپ ﷺ اہل خانہ کی خدمات واحسانات کا اعتراف فرماتے اور حسب موقع تعریف بھی فرماتے، چنانچہ آپ ﷺ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے متعلّق فرماتے:

"إِنَّهَا كَانَتْ، وَكَانَتْ، وَكَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ." (متفق علیہ، مشکوۃ:۵۷۳)

اس قدر اپنائیت ومحبّت کے باوجود کبھی اَزواج سے خلافِ شرع کوئی بات پیش آتی تو فوراً آپ ﷺ تنبیہ فرماتے، جیسے حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سیّدہ حفصہ بنت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہودی کی بیٹی کہہ دیا، کیوں کہ ان کا سلسلۂ نسب سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی سیّدنا ہارون علیہ السلام تک پہنچتا ہے، حضور ﷺ ان کا خاص خیال فرماتے، اس لیے جب سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے انھیں یہودی کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیا تو سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا رو پڑیں، تب انھیں حضور ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نبی (ہارون علیہ السلام) کی بیٹی، نبی (سیّدنا موسیٰ علیہ السلام) کی بھتیجی اور نبی (سیّدنا محمد ﷺ) کی بیوی ہو، اِتنا اونچا تمھارا مقام ہے۔

"إِنَّكِ لَابْنَةُ نَبِيٍّ، وَإِنَّ عَمَّكِ نَبِيٌّ، وَإِنَّكِ تَحْتَ نَبِيٍّ، فَفِيْمَ تَفْتَخِرُ عَلَيْكِ؟"

پھر حفصہ تم پر کس وجہ سے فخر کرتی ہیں؟ پھر آپ ﷺ نے سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا

سے فرمایا: اے حفصہ! اللہ سے ڈرو۔

"اِتَّقِيْ اللّٰهَ يَا حَفْصَةُ!" (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٥٧٤)

تنبیہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتدال ملحوظ رکھتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ حیثیت شوہر ازواجِ مطہرات کے حقوق ادا فرماتے، ان کے ساتھ حسن سلوک بھی فرماتے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اس سلسلے میں ڈرتے اور دعا کرتے کہ اے اللہ! جس کا میں مالک ہوں، جس کا مجھے اختیار ہے اور جس قدر میں ادائے حقوق اور حسن سلوک کر سکتا ہوں میں نے وہ کیا، لیکن جو میرے اختیار میں نہیں، جیسے قلبی محبّت میں کمی بیشی، جو تیرے اختیار میں ہے، تو اس پر مجھے معاف فرمادے!

"اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا أَمْلِكُ، فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ." (رواه الترمذي، مشكوٰة : ص۲۷۹)

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں بیویوں کے ساتھ عدل و اعتدال سے بہترین برتاؤ کے ذریعے بہترین شوہر ہونے کا نمونہ پیش فرمایا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باپ کی حیثیت سے:

عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں شادی کے بعد شوہر کی حیثیت سے وقت گزارنے والا ایک عرصے کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ باپ بن جاتا ہے، یہی معاملہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی ہوا، مستند و معتبر روایات کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سات اولاد کے باپ تھے، جن میں سے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اَولاد میں سوائے سیّدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کے تمام اَولاد سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوئی، سب سے پہلے نکاح کے پانچ سال بعد حضرت قاسم رضی اللہ عنہ بعثت سے قبل پیدا ہو کر صرف دو

سال کی عمر میں انتقال فرما گئے، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کی کنیت ''ابوالقاسم'' تھی۔ (سیرتِ مصطفی: ۲/۵۲۵)

ان کے بعد سب سے بڑی بیٹی سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا بھی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئیں، بعد میں آپ نے اپنے والدین کی بہترین تربیت کے نتیجے میں مسلمان ہو کر غزوۂ بدر کے بعد مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی، اپنے خالہ زاد بھائی حضرت ابوالعاص بن ربیع سے بیاہی گئیں، سن ہجری آٹھ میں آپ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی اُمامہ بہ طورِ یادگار چھوڑ گئیں، علی کا انتقال سن تمیز کو پہنچ کر ہوا، اور ایک قول کے مطابق وہ معرکۂ یرموک میں شہید ہوئے، جب کہ اُمامہ کی شادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ان کی شہادت کے بعد حضرت مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے ہوئی، اور ان ہی کے یہاں وفات ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ اُمامہ رضی اللہ عنہا کے مغیرہ سے ایک بیٹے یحییٰ تھے، اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ (سیرتِ مصطفی: ۲/۵۲۶)

سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کے بعد حضور ﷺ کے دوسرے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ دورِ نبوت میں پیدا ہوئے، ان کا لقب ''طاہر'' (سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے) اور ''طیب'' (رسول اللہ ﷺ کی جانب سے) تھا، ان کی وفات بھی بچپن میں ہوگئی، جس پر ابولہب اور بعض جہلاء نے حضور ﷺ کو ''اَبتر'' یعنی لا وارث اور بے نام و نشان ہونے کا طعنہ دیا تھا، تب تسلی کے طور پر سورۂ کوثر نازل فرما کر حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝﴾ (الکوثر: ۳)

''پیارے! ابتر آپ نہیں، آپ کے دشمن ہوں گے۔'' اور ایسا ہی ہوا، ان کے بعد حضور ﷺ کی مسلسل تین صاحبزادیاں یعنی سیّدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا، سیّدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا اور اخیر میں سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ (مظاہر حق جدید: ۵/۷۹۷)

سیّدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا، آپ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ کی ہجرت بھی فرمائی، وہاں ایک بیٹے عبداللہ پیدا ہوئے، جو چھ سال کی عمر میں وفات پا گئے، سیّدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات سن ہجری تین میں بہ عمر بیس یا اِکیس سال چیچک کی بیماری سے ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کی تیسری صاحبزادی سیّدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح بھی حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد سن ہجری تین میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا، چھ سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر سن ہجری نو رماہِ شعبان میں ان کی وفات ہوئی، حضور اکرم ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھا کر دفن کیا، آپ سے کوئی اولاد نہیں تھی۔
(سیرتِ مصطفی: ۲/۵۲۸)

حضور ﷺ کی سب سے چھوٹی بیٹی سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جن کی ولادت بعثت کے پہلے سال ہوئی، سن ہجری دو میں غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا، اس وقت ان کی عمر پندرہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اِکیس سال تھی، حضور ﷺ کی وفات کے چھ ماہ بعد ۳؍رمضان المبارک سن ہجری گیارہ میں ان کی وفات ہوئی، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما نے قبر میں اُتارا، آپ کے تین بیٹے حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور محسن رضی اللہ عنہ تھے، اور تین بیٹیاں اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا، زینب رضی اللہ عنہا اور رُقیہ رضی اللہ عنہا تھیں، ان میں حضرت محسن رضی اللہ عنہ اور رُقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، باقی سے سلسلۂ نسب چلا اور تا قیامت چلتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

آپ کے بڑے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پندرہ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ (مستفاد از: فضائل اعمال: ۷۔۱۴)

سیّدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے چالیس ہزار درہم

مہر کے عوض ہوا، ان سے ایک بیٹے زید رضی اللہ عنہ اور ایک بیٹی رُقیہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا نکاح عون بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا، ان سے کوئی اولاد نہیں تھی، ان کے وصال کے بعد ان ہی کے دوسرے بھائی محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما سے آپ کا نکاح ہوا، ان سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو بچپن میں انتقال کر گئی، ان کے انتقال کے بعد ان کے تیسرے بھائی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے نکاح ہوا، ان سے بھی کوئی اولاد نہیں تھی، ان ہی کے نکاح میں ہوتے ہوئے وفات ہوئی۔ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیسری صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں، جن کا نکاح عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا، آپ کے دو بیٹے عدی اور عون تھے۔ (مستفاد از: فضائل اعمال: ۱۴۷، رحمۃ للعالمین: ۱۲۹)

حضور ﷺ کی اولاد میں سب سے چھوٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے، جو حضور ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوئے، سیّدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اسکندریہ کے بادشاہ مقوقص کی جانب سے حضور ﷺ کی خدمت میں بہ طورِ تحفہ بھیجی گئی تھیں، آپ ایمان لے آئیں، حضور ﷺ نے انھیں عزّت بخشی اور اُمّ ولد بنایا، ان کی وفات سن ہجری سولہ (۱۶ھ) میں خلافت فاروقی کے دوران ہوئی اور بقیع میں دفن ہوئیں۔ (سیرتِ مصطفیٰ: ۲/ ۵۱۰)

ان سے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ سن ہجری آٹھ ذی الحجہ میں پیدا ہوئے، ساتویں روز آپ ﷺ نے عقیقہ فرمایا، جس میں دو مینڈھے ذبح کرائے، سر منڈوایا گیا، بالوں کے برابر چاندی کے وزن کا صدقہ کیا گیا اور بال زمین میں دفن کر کے ابراہیم نام رکھا گیا، عوالی میں ایک دودھ پلانے والی کے حوالے کیا، جن کا نام اُمّ سیف اور ان کے خاوند ابوسیف تھے، کبھی کبھی آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے جاتے اور گود میں لے کر پیار کرتے، تقریباً پندرہ یا سولہ مہینے زندہ رہ کر سن ہجری دس میں حضرت ابراہیم

رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔ (سیرتِ مصطفی: ۵۳۱/۲)

چوں کہ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات رضاعت کی عمر میں ہوئی اس لیے وفات ہوتے ہی جنّت میں داخل کر دیے گئے اور وہاں جنّتی عورتوں کے ذریعے انھیں مدّتِ رضاعت تک دودھ پلایا گیا، حدیث پاک میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَرْحَمَ بِالْعِيَالِ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ."

''حضور ﷺ کے خادمِ خاص سیّدنا انس رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے زیادہ کسی کو اپنے اہل وعیال پر مہربان اور مشفق نہیں دیکھا۔''

"كَانَ إِبْرَاهِيْمُ ابْنُهُ مُسْتَرْضِعًا فِيْ عَوَالِي الْمَدِيْنَةِ."

''آپ ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اطرافِ مدینہ (چار یا چھ میل کے فاصلے پر) ایک گھر میں دودھ پینے کے لیے رکھے گئے تھے۔''

"فَكَانَ يَنْطَلِقُ وَنَحْنُ مَعَهُ، فَيَدْخُلُ الْبَيْتَ وَإِنَّهُ لَيُدَّخَنُ، وَكَانَ ظِئْرُهُ قَيْنًا."

حضور پاک ﷺ اکثر اس محلے (اطرافِ مدینہ) میں بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دیکھ بھال کے لیے تشریف لے جاتے، تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے، آپ ﷺ (اس دایہ کے) گھر میں داخل ہوتے تو چوں کہ مکان تنگ تھا اور دایہ کا شوہر لوہار تھا، جو لوہا گرم کرنے کے لیے آگ جلاتا رہتا، جس کی وجہ سے بھٹی کا دُھواں گھر میں چاروں طرف بھرا رہتا، مگر پھر بھی بیٹے کی محبّت میں آپ ﷺ اسی دُھواں بھرے گھر میں چلے جاتے۔

"فَيَأْخُذُهُ، فَيُقَبِّلُهُ، ثُمَّ يَرْجِعُ."

''پھر آپ ﷺ اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے، ان کا بوسہ لے کر انھیں پیار کرتے، پھر گھر واپس لوٹ آتے۔''

"فَلَمَّا تُوُفِّيَ إِبْرَاهِيْمُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ ابْنِيْ، وَإِنَّهُ مَاتَ فِيْ الثَّدْيِ، وَإِنَّ لَهُ لَظِئْرَيْنِ تُكَمِّلَانِ رَضَاعَهُ فِي الْجَنَّةِ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ٥٢٠، باب في أخلاقه وشمائله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

''جب حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات مدّتِ رضاعت میں ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ابراہیم میرا بیٹا ہے، جو مدّتِ رضاعت میں اللہ کو پیارا ہوگیا، (تو حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا بیٹا ہونے کی نسبت سے یہ درجہ عطا فرمایا کہ) ان کے لیے جنّت میں دو دائیاں متعین کی گئیں جو جنّت میں ان کی مدّتِ رضاعت کو مکمّل کر رہی ہیں۔''

آپ ﷺ بہ حیثیت باپ جس طرح بیٹوں سے محبّت فرماتے اسی طرح بیٹیوں سے بھی بے حد محبّت فرماتے، ان کی ضروریات کا انتظام فرماتے۔

ایک مرتبہ حالتِ عسر (تنگی) میں میزبانِ رسول ﷺ سیّدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں گوشت، روٹی اور کھجور وغیرہ پیش کیا، تو آپ ﷺ نے روٹی پر گوشت رکھ کر بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں بھیجا اور سیّدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ فاطمہ کے گھر والے بھی آج بھوکے ہیں، لہٰذا یہ کھانا انھیں پہنچادو۔

"يَا أَبَا أَيُّوْبَ! أَبْلِغْ بِهٰذَا فَاطِمَةَ، فَإِنَّهَا لَمْ تُصِبْ مِثْلَ هٰذَا مُنْذُ أَيَّامٍ." (المعجم الأوسط للطبراني : ٢ / ٣٦٥، الرقم : ٢٢٤٧)

اللہ کے رسول ﷺ باپ کی حیثیت سے جس طرح اپنی حقیقی اولاد کے ساتھ شفقت و محبّت کا معاملہ فرماتے اپنی اَزواج کی اَولاد کے ساتھ بھی شفقت و محبّت کا

معاملہ فرماتے اوران کی تعلیم وتربیت کا بھی اہتمام فرماتے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے ہر ایک شرفِ صحابیت کے منصب جلیل پر فائز ہونے کے ساتھ اسلام کا داعی، مبلغ اور پیغمبر اسلام ﷺ کا مطیع وتبع بنا۔

مثلاً حضور ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تین اولاد تھی، ان میں پہلے شوہر ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے دو بیٹے ہند اور ہالہ تھے، حضور ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں دونوں نے مسلمان ہوکر شرفِ صحابیت حاصل کیا، ہند بن ہالہ نہایت فصیح وبلیغ تھے، حلیۂ نبی ﷺ سے متعلق مفصل روایت ان ہی سے مروی ہے۔ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دوسرے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، وہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں مسلمان ہوکر شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئیں، جن کا نام ہند بنت عتیق مخزومی ہے۔ (سیرتِ مصطفی: ۲/ ۴۴۲)

اسی طرح سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد جب سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں تو ان کے پہلے شوہر سکران بن عمرو سے ایک بیٹے عبدالرحمٰن بن سکران رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کی کفالت وتربیت میں آئے اور الحمدللہ وہ بھی مسلمان ہوکر شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئے اور جنگ میں شہید ہوئے۔ (سیرتِ مصطفی: ۲/ ۴۵۲)

نیز سیّدہ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا جب حضور ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی سے چار اولاد حضور ﷺ کی کفالت وتربیت میں لائیں، جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، بیٹوں میں حضرت سلمہ بن عبدالاسد مخزومی رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر بن ابی سلمہ مخزومی رضی اللہ عنہما اور بیٹیوں میں حضرت درّہ بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا تھے، آپ ﷺ ان بچّوں سے بڑی شفقت ومحبّت کا معاملہ فرماتے، سیّدہ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو

کبھی فرطِ محبّت میں بجائے ''زینب'' کے ''زوینب'' کہہ کر خطاب فرماتے۔

"وَفِي الجَامِعِ الصَّغِيْرِ : "كَانَ يُلَاعِبُ زَيْنَبَ بِنْتَ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، وَيَقُوْلُ: "يَا زُوَيْنَبُ!" (مرقاة، عن أنس/ باب الأسامي، كنز العمال:٧/ ٨٥)

اُن کے علاوہ سیّدہ اُمِ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا بھی جب حضور ﷺ کے عقد میں آئیں تو اپنے سابق شوہر کی بیٹی حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت عبید اللہ بن جحش کو حضور ﷺ کی کفالت وتربیت میں لے کر آئیں، حضور ﷺ نے تمام اَزواجِ مطہرات کی اولاد کو بھی باپ کی طرح محبّت وشفقت دی اور ان کی تعلیم وتربیت کی فکر فرمائی، حضور ﷺ نے اپنی عائلی وخاندانی زندگی میں باپ کی حیثیت سے اپنے قول وعمل سے اُمّت کو بتا دیا کہ اولاد سے حقیقی محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں وقت دیا جائے، ان کی ضروریات کا انتظام کیا جائے اور ان کی تعلیم وتربیت کی فکر کر کے شادی کی عمر میں مناسب اور دین دار رِشتہ تلاش کر کے شادی کرائی جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ داماد کی حیثیت سے:

عائلی زندگی میں سسرالی رِشتوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، حق تعالیٰ نے اسے بھی بطورِ نعمت ذکر فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ﴾ (الفرقان:٥٤)

اللہ کے رسول ﷺ نے گیارہ نکاح فرمائے، اس اعتبار سے آپ ﷺ کے سسرالی رِشتہ داروں کا سلسلہ طویل ہے، بہ حیثیت داماد آپ ﷺ نے سبھی کے ساتھ بہترین اخلاق کا برتاؤ فرمایا۔

اس سلسلے میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب کے مسلمان ہونے کا واقعہ بہترین مثال ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہونے سے قبل جب

اللہ کے رسول ﷺ نے اسلامی لشکر کے ساتھ مرّالظہران میں رات کا قیام فرمایا، جہاں اسلام دشمنی میں جاسوسی کے لیے آئے ہوئے سردارِ مکہ ابوسفیان اور ان کے دو ساتھی حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء کو گرفتار کر کے خدمت اقدس میں حاضر کیا گیا، تو اس وقت حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اپنے خسر محترم کے متعلق فرمایا کہ انھیں اپنے خیمے میں لے جاؤ، صبح میرے پاس لے آنا، رات بھر آرام کرانے کے بعد جب صبح حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ابوسفیان کو دردِ دل کے ساتھ دین کی دعوت دی، ابوسفیان حضور ﷺ کے عفو وکرم اور صلہ رحمی ومہربانی کا بار بار مشاہدہ کر چکے تھے، فوراً اسلام لے آئے، اللہ کے رسول ﷺ نے مزید اپنے خسر محترم کے ساتھ عفو وکرم اور صلہ رحمی و مہربانی کا معاملہ کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ مکہ والوں میں سے جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے، اس پر ابوسفیان کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! میرے گھر میں سب لوگ کیسے سما سکتے ہیں؟ (عفو وکرم میں اضافہ فرما دیجیے، تب شریف داماد نے درخواست کو قبول فرما کر) ارشاد فرمایا: جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے وہ بھی مامون ہے، ابوسفیان عرض کرنے لگے: حضور! مسجد بھی کافی نہ ہوگی (لہٰذا معافی اور مہربانی میں مزید وسعت پیدا فرمایئے، تو شریف داماد نے خسر محترم کی اس پیش کش کو بھی قبول فرمالیا اور اعلان) فرمایا کہ جو شخص اپنے دروازے بند کرلے وہ بھی آج مامون ہے، اس عفوِ عام کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق دامن اسلام میں آ گئے اور وعدۂ ربانی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا۔

﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ (النصر : ۲)

(مستفاد از: سیرتِ مصطفی: ۲/ ۱۷۸ تا ۱۸۰/۲)

اللہ کے رسول ﷺ کی عائلی زندگی میں اور بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں آپ ﷺ نے داماد کی حیثیت سے سسرالی رِشتے داروں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا، موقع بہ موقع ان کی خیر خبر لی اور حتی الامکان دل جوئی کا اہتمام فرما کر دنیا بھر کے دامادوں کے لیے بہترین نمونہ قائم فرمایا کہ سسرالی رِشتے دار بھی دین دار ہوں یا بے دین، وہ تمھارے ساتھ خوش اَخلاقی کا معاملہ کریں یا بداَخلاقی کا، تم بہر حال ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، ان پر بوجھ بننے کے بجائے ان کے دینی و دُنیوی بوجھ کم کرنے کی فکر کرو۔

اللہ کے رسول ﷺ خسر کی حیثیت سے:

جہاں تک تعلق ہے خسر کی حیثیت کا، تو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی میں بہ حیثیت خسر اپنے دامادوں کے ساتھ انتہائی مشفقانہ اور مربیانہ برتاؤ فرمایا۔

اس کی ایک بہترین مثال آپ ﷺ کے بڑے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ ﷺ کا بہترین برتاؤ بھی ہے۔ جس کا اجمالی تذکرہ کچھ اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بڑی صاحبزادی کا عقد ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع سے فرمایا، جو مکہ مکرّمہ کے نہایت امانت دار تاجر تھے، بعثت کے بعد سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور تمام صاحبزادیاں تو ایمان لے آئیں؛ مگر ابوالعاص شرک پر مصر رہے، قریش مکہ نے ابوالعاص پر بہت دباؤ بھی ڈالا کہ وہ ابولہب کے بیٹوں کی طرح محمد ﷺ کی بیٹی کو طلاق دے دیں؛ لیکن ابوالعاص نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ زینب جیسی شریف عورت کے مقابلے میں دنیا کی کسی بھی عورت کو میں پسند نہیں کرتا، حضور ﷺ بھی بہ حیثیت خسر اپنے داماد کا بہت خیال فرماتے، چنانچہ اسیرانِ بدر میں

ابوالعاص بھی شریک تھے، اہل مکہ نے جب اپنے قیدیوں کا فدیہ دیا تو سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے شوہر کے فدیہ میں وہ ہار پیش کیا جو امّی جان سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انھیں شادی کے وقت دیا تھا، حضور ﷺ اس ہار کو دیکھ کر آب دیدہ ہو گئے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو اس ہار کو واپس کر کے ابوالعاص کو چھوڑ دیا جائے، جاں نثاروں نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور ابوالعاص کو رہا کر کے ہار بھی واپس کر دیا گیا، لیکن حضور ﷺ نے ابوالعاص سے یہ وعدہ لیا کہ مکہ پہنچ کر بیٹی زینب کو مدینہ بھیج دیں، اُنھوں نے وعدہ کر لیا اور ایسا ہی کیا، اس کے بعد سے صاحبزادی تو حضور ﷺ کے پاس مدینہ میں مقیم رہیں، جب کہ داماد مکہ میں تھے، اسی دوران فتح مکہ سے قبل ایک مرتبہ ابوالعاص بغرضِ تجارت شام گئے ہوئے تھے، واپسی پر مسلمانوں کے ایک دستے نے ان کا تمام مال ومتاع ضبط کر لیا اور سوائے ابوالعاص کے قافلے کے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا، اس وقت ابوالعاص چھپ کر مدینہ طیبہ اپنی بیوی سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو پناہ دی، حضور ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو بہ حیثیت خسر کے آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ابوالعاص کو پناہ دینے اور ان کا مال واپس کر دینے کی درخواست فرمائی، وہاں کیا دیر تھی؟ فوراً صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پناہ دے کر ابوالعاص کا مال لوٹا دیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے بیٹی سے فرمایا کہ اپنے شوہر کا اکرام ضرور کرنا؛ لیکن ان سے خلوت وقربت نہ رکھنا، وہ اب تک مسلمان نہیں ہوئے؛ اس لیے وہ تمھارے لیے حلال نہیں ہیں، خسر محترم کے اس مشفقانہ سلوک کا اثر دامادِ محترم پر یہ ہوا کہ ابوالعاص مکہ گئے، وہاں جا کر اہل مکہ کی امانتیں واپس لوٹائیں اور سب کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، پھر مکہ سے مدینہ واپس آ گئے، تب حضور ﷺ نے دوبارہ نکاح فرما کر سیّدہ زینب

رضی اللہ عنہا کو آپ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دے دیا۔ (مستفاد از: سیرتِ مصطفی: ۱/ ۵۹۵ تا ۵۹۸)

ان کے علاوہ بھی حضور ﷺ نے اپنی عائلی زندگی میں خسر کی حیثیت سے اپنے دیگر داماد سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بہترین برتاؤ کیا ان کے واقعات کتب سیرت میں بہ کثرت موجود ہیں، اگر کبھی دامادوں کی اپنی بیویوں کے ساتھ کوئی ناچاقی پیدا ہوئی (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) تو بہ حیثیت خسر آپ ﷺ نے اسے نہایت خوش اُسلوبی سے حل فرمایا۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ سب سے چھوٹے داماد سیّدنا علی رضی اللہ عنہ اور بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مابین کسی بات کو لے کر کچھ بحث ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ ناراض ہوکر گھر سے باہر نکل گئے، اتفاق سے اسی وقت حضور ﷺ بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاضر نہ پاکر دریافت کیا تو بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ میرے اور علی کے درمیان کچھ ناگواری پیش آئی، جس سے ناراض ہوکر وہ باہر چلے گئے اور قیلولہ بھی نہیں کیا، حضور ﷺ نے اپنے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ دیکھو! علی کہاں ہیں؟ تلاش کرنے پر پتا چلا کہ مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں، تو حضور ﷺ تشریف لائے، دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح فرش پر لیٹے ہوئے ہیں کہ چادر اُتری ہوئی ہے اور جسم پر مٹّی لگی ہوئی ہے، خسر محترم نے اپنے داماد کے جسم سے مٹّی جھاڑتے ہوئے فرمایا: "قُمْ يَا أَبَا تُرَاب!" اے ابوتراب! (مٹّی والے!) اٹھو! حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھ گئے (حضور ﷺ نے انھیں راضی کرلیا اور گھر لے آئے) تبھی سے آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ''ابوتراب'' مشہور ہوگئی؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خسر محترم کی دی ہوئی یہ کنیت اتنی پسند تھی کہ جب بھی کوئی آپ رضی اللہ عنہ کو اس کنیت سے پکارتا تو آپ خوش ہوجاتے۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/ ۶۷۴)

اللہ کے رسول ﷺ کی عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی کی یہ چند جھلکیاں ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی آپ ﷺ نے خاندان کے مختلف رشتوں میں ہر حیثیت سے نہایت اعلیٰ نمونہ اُمّت کے سامنے پیش فرمایا۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی اپنی عائلی زندگی میں ان نمونوں کو اپنا کر عائلی، خاندانی اور سماجی زندگی کو خوش گوار بنائیں، تاکہ ہمیں دارین کی سرخ روئی نصیب ہو۔

حق تعالیٰ ہمیں بھی ہر حیثیت سے اُسوۂ طیبہ کو اپنا کر ایسا بنادیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو پسند آجائیں۔ آمین یارب العالمین۔

مؤرخہ: ۲۶ ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۱۳ نومبر ۲۰۲۰ء

قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ، وَأَجْوَدَ النَّاسِ، وَأَشْجَعَ النَّاسِ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۵۱۸/ بابٌ في أخلاقه وشمائله صلى الله عليه وسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل، تمام لوگوں سے زیادہ سخی اور تمام لوگوں سے زیادہ بہادر تھے۔“

تمہید:

اللہ ربّ العالمین کی بعض صفات وہ ہیں جو ان ہی کے ساتھ خاص ہیں، جیسے مختارِ کل ہونا، عالم الغیب والشہادۃ ہونا، فعال لما یرید ہونا، متکبّر ہونا وغیرہ؛ لیکن بہت سی صفات وہ ہیں جو اللہ ربّ العالمین کے ساتھ خاص نہیں، مثلاً: صبر وحلم، عفو ورحم، جود وکرم، حیا وشرم وغیرہ صفات ایسی ہیں جو بندوں میں مطلوب ہیں، اسی لیے صوفیائے کرام فرماتے ہیں:

"تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللهِ." (روح البيان، الأعراف: ۱۸۰)

''اللہ ربّ العزت کے (جو) اوصاف و اخلاق (اس کے ساتھ خاص نہیں اُنھیں) اختیار کرو۔'' کیوں کہ ان اوصافِ الٰہیہ سے متصف ہونے والا بندہ بآسانی قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔

چنانچہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور ان میں بھی بطورِ خاص امام الانبیاء، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا سب سے اعلیٰ مقام و درجہ حاصل ہوا، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات و حیات میں حق تعالیٰ کی یہ پاکیزہ صفات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، مثلاً اللہ پاک کی صفات میں سے ایک اہم صفت و عادت صبر و حلم ہے، حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنْ أَبِيْ مُوْسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا أَحَدٌ أَصْبَرَ عَلٰى أَذًى يَسْمَعُهٗ مِنَ اللهِ، يَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ، ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ." (متفق علیه، مشکوٰۃ : ۱۳، کتاب الإیمان)

''تکلیف دہ باتوں کو سن کر اللہ پاک سے زیادہ صبر و تحمل کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کے لیے بیٹا تجویز کرتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود وہ انھیں عافیت و رزق عطا فرماتا رہتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ بندوں کی اِس نادانی و گستاخی پر سزا دینے کی پوری قدرت کے باوجود انھیں مہلت دینا اور نعمتوں سے محروم نہ کرنا اللہ پاک کا صبر و تحمل ہی تو ہے۔ یہی حکم حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی دیا گیا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الأحقاف : ۳۵)

''محبوبم! اولوالعزم رسولوں کی طرح آپ بھی صبر و تحمل اپنائیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ (الروم : ٦٠)

''آپ صبر وتحمل سے کام لیں، یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔'' حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی اس پر عمل فرمایا۔

صبر وحلم:

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اوصاف میں صبر وحلم نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت وتبلیغ کی راہ میں پیش آنے والے حالات اور شدائد ومصائب پر نہایت صبر وتحمل فرمایا، سیرتِ طیبہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(۱) ابوجہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور ایذا رسانی میں شروع ہی سے پیش پیش رہا۔ اس اُمّت کا سب سے پہلا فرعون ابوجہل تھا۔ ابتدائے اسلام میں جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے کہ ''لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔'' تو ابوجہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹّی پھینکتا اور کہتا کہ ''اے لوگو! تم اس کے دھوکے میں مت آنا، یہ تمھیں لات وعزّیٰ سے دور کرنا چاہتا ہے۔'' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر وتحمل دیکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف بالکل التفات نہ فرماتے تھے۔ (مسند احمد، سیرت مصطفی: ۱/ ۳۰۴)

ایک مرتبہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا سے گزر رہے تھے، اتفاق سے ابوجہل بھی اسی طرف سے آنکلا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وہ بہت سخت وسست باتیں کہنے لگا؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت صبر وتحمل سے برداشت کیا اور کوئی جواب نہیں دیا، کیوں کہ ''جوابِ جاہلاں باشد خموشی'' حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی کے ساتھ تشریف لے گئے، عبداللہ بن جدعان کی باندی یہ پورا واقعہ دیکھ رہی تھی، تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شکار سے اپنا تیر وکمان لے کر واپس آئے، اُنھیں دیکھ کر عبداللہ بن جدعان کی باندی نے صورتِ حال سے انھیں باخبر کیا، سنتے ہی حضرت

حمزہ رضی اللہ عنہ کی غیرت وحمیت جوش میں آ گئی اور آپ وہیں سے اللہ کے دشمن ابوجہل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

صاحبو! یہ بھی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ شانہ جب کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے دل میں اپنے دشمنوں کا غیظ وغضب ڈال دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے محبّت اور اس کے لیے عداوت دونوں ہی ایمان کی علامات ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبّت اور ابوجہل سے عداوت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کا سبب بن گئی۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کو حرم میں قریش کی ایک جماعت کے ہمراہ بیٹھا ہوا پایا، آپ نے اس کے پاس پہنچ کر اِتنے زور سے کمان ماری کہ ابوجہل کا سر زخمی ہوگیا، آپ فرمانے لگے کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دیتا ہے، سن! میں خود ان کے دین حق کو قبول کرتا ہوں، پھر آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے، پھر فرمایا: بھتیجے! آپ دین اسلام کو علی الاعلان ظاہر فرمائیں! میں نے آپ کا دین قبول کرلیا، اللہ کی قسم! مجھے اب دنیا و مافیہا مل جائے تب بھی دین اسلام کو چھوڑ کر آبائی دین اختیار نہیں کروں گا۔ اس کے بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار پڑھے:

حَمِدْتُ اللّٰهَ حِيْنَ هَدَى فُؤَادِيْ إِلَى الْإِسْلَامِ وَالدِّيْنِ الْحَنِيْفِ

''میں نے اللہ پاک کی حمد وثنا کی، کیوں کہ اس نے میرے دل کو دین اسلام قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔''

لِدِيْنٍ جَاءَ مِنْ رَبٍّ عَزِيْزٍ خَبِيْرٍ بِالعِبَادِ بِهِمْ لَطِيْفِ

''اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس دین کی توفیق عطا فرمائی جو ایسے پروردگار کی طرف سے آیا ہے جو بندوں کے احوال سے باخبر اور ان پر مہربان ہے۔''

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کا ثمرہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (مستدرکِ حاکم، سیرتِ مصطفی: ۱/ ۱۸۲ تا ۱۸۴)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی (دیہاتی) جو غالباً مؤلّفۃِ قلوب (یعنی وہ لوگ جن کی دل جوئی کے لیے غنائم اور صدقات وغیرہ کے اموال میں سے کچھ دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنی مالی حاجتیں پوری ہوتیں دیکھ کر اسلام کی طرف مائل ہو جائیں، یا اسلام میں پختہ ہو جائیں) میں سے تھا (کمافی توضیحات: ۸/ ۱۵۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک کو اس قدر زور سے کھینچنے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سینے اور گلے کے قریب ہو گئے اور سختی سے کھینچنے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک پر چادر کا نشان پڑ گیا، پھر وہ دیہاتی کہنے لگا:

"مُرْ لِيْ مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِيْ عِنْدَكَ."

''تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کا جو مال ہے (زکوۃ وغیرہ) اس میں سے کچھ مجھے دلایئے۔''

اندازہ لگائیں کہ اس دیہاتی نے کس قدر بداخلاقی، گستاخی اور سخت کلامی کا معاملہ کیا، باین ہمہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر وتحمل دیکھیے! آگے حدیث میں ہے:

"فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ ضَحِكَ، ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِعَطَاءٍ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ۵۱۸، باب في أخلاقه وشمائله)

''حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس کی طرف دیکھا، پھر مسکرائے، اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اسے (ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر جَو اور ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کھجوریں) عطا کرنے کا حکم فرمایا۔''

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رضائے الٰہی کی خاطر حکم

الٰہی "وَاصْبِرْ" پر ساری زندگی اس طرح عمل فرمایا کہ خود حق تعالیٰ نے گواہی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل: ۱۲۷)

''توفیق الٰہی سے آپ کا صبر وتحمل رضائے الٰہی کی خاطر ہی ہے۔''

(۳) ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علمائے یہود میں سے زید بن سعنہ سے قرض لیا، وقت سے پہلے ہی وہ تقاضا کے لیے آ گیا اور آتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھے سے چادر اُتار لی اور کُرتا پکڑ کر سختی سے بولا کہ ''عبدالمطلب کی اولاد ادائے قرض کے بارے میں بڑی لاپرواہ ہے۔'' حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس بے ادبی وگستاخی پر اسے جھڑک دیا؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمالِ صبر وتحمل سے مسکراتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"أَنَا وَهُوَ كُنَّا إِلٰى غَيْرِ هٰذَا مِنْكَ أَحْوَجَ، تَأْمُرُنِيْ بِحُسْنِ الْأَدَاءِ، وَتَأْمُرُهُ بِحُسْنِ التَّبَاعَةِ."

''عمر! بہتر تو یہ تھا کہ تم مجھے حسن ادائیگی اور اُسے حسن مطالبہ کی تلقین کرتے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو حکم فرمایا کہ

"يَا عُمَرُ! فَاقْضِهِ حَقَّهُ، وَزِدْهُ عِشْرِيْنَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ مَكَانَ مَا رُعْتَهُ."

''عمر! میری (جانب سے) اس کا حق ادا کر دو اور بیس صاع زیادہ دو، کیوں کہ تم نے اسے جھڑکا بھی تھا۔''

روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس صبر وتحمل کو دیکھتے ہی زید بن سعنہ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے، پھر کہنے لگے کہ بات دراصل یہ تھی کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جن علامات اور اوصاف کے متعلق میں نے پڑھا اور سنا تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

ملاقات میں پہلی نظر آپ کے چہرۂ انور پر پڑتے ہی محسوس ہوگیا، البتہ دو علامتیں اور اوصاف ایسے تھے جن سے مطمئن ہونا چاہتا تھا، ایک "يَسْبِقُ حِلْمُهُ جَهْلَهُ" ان کا صبر و حلم جہالت پر غالب ہوگا۔ اور دوسرا:

"وَلَا تَزِيْدُهُ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَيْهِ إِلَّا حِلْمًا." (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب ما جاء في التقاضي)

''شدّتِ جہل سے پیش آنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صبر و حلم میں اِضافے کا سبب ہوگا۔''

زید بن سعنہ رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہونے کے بعد کہا کہ میں نے ان ہی علامات و اوصاف کو جانچنے کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

صاحبو! اگر جانوروں کو ذبح کرنا سنّت ابراہیمی ہے تو نفرتوں کو ذبح کرنا سنّت محمدی ہے، جس کی سینکڑوں مثالیں سیرتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملتی ہیں۔

عفو و رحم:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سراپا رُشد و ہدایت کو جب ہم پڑھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف میں صبر و حلم کے ساتھ عفو و رحم کا پاکیزہ وصف بھی نمایاں نظر آتا ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تھا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الأعراف:۱۹۹)

ربّ العالمین نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اخلاقِ عالیہ کی اس جامع ترین آیت کریمہ میں عفو و درگذر، امر بالمعروف اور اعراض عن الجاہلین کی ترغیب دی، تو دنیا نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری زندگی رضائے الٰہی کی خاطر اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اپنی طبیعت کے خلاف پیش آنے والے حالات پر صبر و حلم کا مظاہرہ تو فرمایا ہی، اس سے بڑھ کر ان مواقع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفو و درگذر سے بھی کام لیا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی زوجہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بقول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے کوئی ادنیٰ انتقام نہیں لیا۔

"مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِنَفْسِهٖ فِيْ شَيْءٍ قَطُّ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۵۱۹)

اپنے ذاتی امور و معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ عفو و درگذر سے ہی کام لیا۔ سیرتِ طیبہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مجرم کو سزا دینے پر قدرت کے باوجود معاف فرما دیا۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لُدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

نام ہے اُن کا قریہ قریہ، ذکر ہے ان کا عالم عالم
یاد میں اُن کی چشم ہے پُرنم، صلی اللہ علیہ وسلم
دُکھے دلوں کا درماں وہ ہے، ہم جیسوں کا شافع وہ ہے
بعد خدا کے وہ ہیں اَرحم، صلی اللہ علیہ وسلم

(۳) خیبر کی ایک یہودیہ عورت زینب بنت حارث بن سلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جوشِ عداوت میں مغلوب ہو کر بکری کے بھنے ہوئے گوشت میں زہر ملا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس گوشت کو تناول فرمایا ہی تھا کہ بطورِ معجزہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گوشت کے زہر آلود ہونے کا علم ہو گیا، اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ روک لیا اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی کھانے سے منع فرما دیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس یہودیہ کو طلب فرما کر تحقیق فرمائی تو اس نے اپنے جرم کا اِقرار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ حرکت و جرأت اس لیے کی کہ

"إِنْ كَانَ نَبِيًّا فَلَنْ تَضُرَّهُ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا اسْتَرَحْنَا مِنْهُ."

''اگر آپ نبیٔ برحق ہیں تو زہر آلود گوشت آپ کو نقصان نہیں دے گا، اور اگر آپ نبیٔ برحق نہیں ہیں تو اس طرح ہمیں آپ سے نجات مل جائے گی۔''

چوں کہ اس وقت معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق تھا، اس لیے اِقرارِ جرم کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس یہودیہ کو معاف فرمادیا اور کوئی انتقام نہیں لیا۔

"فَعَفَا عَنْهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَمْ يُعَاقِبْهَا."

(رواه أبوداود، مشكوٰة : ٥٤٢، باب في المعجزات)

بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زہر کا اثر ختم کرنے کے لیے اپنے مونڈھوں کے درمیان پچھنہ لگوالیا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس زہر آلود گوشت کو کھانے کی وجہ سے ایک صحابی حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاصاً اس عورت کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ (توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۸/۲۸۵)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر حملہ کرنے کی غرض سے بالکل صبح کے وقت اہل مکہ کے اسّی (۸۰) مسلّح افراد جبل تنعیم کے دامن میں اُترے اور انتظار کرنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ فجر وغیرہ میں مشغول ہوجائیں تو ان پر حملہ کردیں، مگر ان کی تدبیر پر اللہ تعالیٰ کی تقدیر غالب آگئی، سب کے سب پکڑے گئے۔

حدیث میں ہے:

"فَاسْتَحْيَاهُمْ،" وَفِيْ رِوَايَةٍ: "فَأَعْتَقَهُمْ."

(رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٤٥، باب حكم الأسارٰى)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتقاضائے حکمت سزا دیے بغیر سبھی کو آزاد کردیا اور معاف فرمادیا، اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ

بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ (الفتح : ۲۴)

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا کہ اس نے مشرکین کے ہاتھوں سے تمھیں محفوظ رکھا اور ان کی طرف سے تمھیں تکلیف پہنچنے نہیں دی اور خود مؤمنین کے ہاتھوں کو بھی مشرکین تک پہنچنے نہ دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اُن پر غلبہ عطا فرما دیا تھا۔''

مفسرین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے ساتھ نرمی (اور عفو ورحم) کا معاملہ فرمایا عموماً وہ لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے۔ (انوار البیان: ۵/ ۱۵۷)

(۵) شہسوار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ بغرضِ جہاد نجد کی طرف روانہ ہوا، جہاں اُنھوں نے یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو گرفتار کیا، جس کا تعلق قبیلہ بنو حنیفہ سے تھا، گرفتاری کے بعد مدینہ منورہ لاکر مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ اُسے باندھ دیا۔ (اس زمانے میں قیدیوں کے لیے جیلوں کا کوئی نظام نہیں تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا تو اس کے پاس آکر پوچھا:

"مَاذَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ؟"

کہو ثمامہ! کیا تمھارا کوئی عذر ہے؟ یا میرے متعلّق تمھارا کیا خیال ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق واوصاف کا مشاہدہ کرنے کے بعد غیروں کو بھی یقین ہو جاتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو فضل وعفو سے کام لیتے ہیں یا پھر عدل وانصاف سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی پر قطعاً ظلم نہیں کرتے، اس لیے ثمامہ نے کہا:

"عِنْدِيْ يَا مُحَمَّدُ خَيْرٌ."

''میرے پاس خیر وبھلائی ہے۔'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ کے متعلّق میرا گمان بہت ہی اچھا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''خیر'' سے مراد مال ہے، لہٰذا

مطلب یہ ہے کہ میرے پاس بہت زیادہ مال ہے، بس آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ پھر اپنے ظلم کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگا:

"إِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَا دَمٍ."

''اگر آپ نے میرے قتل کا حکم دے دیا تو اس میں کوئی ظلم زیادتی کی بات نہیں، کیوں کہ میں اپنے جرم کے سبب قتل کا مستحق ہوں۔''

"وَإِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ."

''لیکن اگر آپ نے عفو و رحم سے کام لیتے ہوئے مجھے معاف کر دیا تو آپ مجھے شکر گزار اور قدر دان پائیں گے۔''

"وَإِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ الْمَالَ فَسَلْ، تُعْطَ مِنْهُ مَا شِئْتَ."

''اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو جیسا کہ میں نے عرض کیا میرے پاس بہت سا مال ہے، بس آپ حکم کیجیے! جتنا مال چاہیں گے دیا جائے گا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے، پھر دوسرے اور تیسرے دن بھی سوال و جواب کا یہی سلسلہ جاری رہا، بالآخر اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی سزا دیے بغیر اور کچھ بھی لیے بغیر معاف فرما دیا۔ (خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین کے لیے اپنی صواب دید کے مطابق کسی مجرم کو اس طرح رِہا کرنے کی شرعًا اجازت ہے)۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عفو و رحم کا اثر یہ ہوا کہ رہائی اور معافی پانے کے بعد ثمامہ بن اثال کچھ کہے سنے بغیر مسجد نبوی کے قریب کھجوروں کے ایک جھنڈ کے پاس گئے اور غسل کر کے دربارِ نبوی میں حاضر ہو کر کلمہ شہادت پڑھ لیا:

"أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ."

پھر عرض کیا:

"وَاللهِ مَا كَانَ عَلَى وَجْهِ الأَرْضِ وَجْهٌ أَبْغَضُ إِلَيَّ مِنْ وَجْهِكَ، فَقَدْ أَصْبَحَ وَجْهُكَ أَحَبَّ الْوُجُوْهِ كُلِّهَا إِلَيَّ، وَاللهِ مَا كَانَ مِنْ دِينٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ دِينِكَ، فَأَصْبَحَ دِينُكَ أَحَبَّ الدِّينِ إِلَيَّ، وَاللهِ مَا كَانَ مِنْ بَلَدٍ أَبْغَضُ إِلَيَّ مِنْ بَلَدِكَ، فَأَصْبَحَ بَلَدُكَ أَحَبَّ الْبِلَادِ إِلَيَّ." (رواه البخاري، مشكوٰة : ٣٤٥ / باب حكم الأسارٰى)

''اللہ تعالیٰ کی قسم! (اسلام سے قبل میرا حال یہ تھا کہ) میرے نزدیک روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ نفرت انگیز چہرہ کوئی نہیں تھا؛ لیکن اب آپ کے چہرۂ انور سے زیادہ محبوب اور کوئی چہرہ نہیں، اسی طرح میرے نزدیک دین اسلام سے زیادہ نفرت انگیز کوئی دین نہیں تھا، اور اب دین اسلام سے زیادہ عزیز کوئی دین نہیں ہے، نیز آپ کے شہر سے زیادہ نفرت انگیز کوئی شہر نہیں تھا، اور آج یہ حال ہے کہ شہر مدینہ سے زیادہ پیارا شہر کوئی نہیں۔''

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس کی طبیعت میں شقاوت نہ ہو؛ لیکن کسی غلط فہمی کے سبب وہ نفرت میں مبتلا ہو، تو جب اس کے ساتھ عفو و رحم کا معاملہ کیا جائے تو اس کا ثمرہ و نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی نفرت محبّت سے بدل جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآنِ کریم نے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝﴾ (فصلت : ٣٤)

ثمامہ بن اثال کے معاملے میں یہی ہوا۔ شاعر اسلام سیّدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و رحم اور جود و کرم کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا:

عَفُوٌّ عَنِ الزَّلَّاتِ يَقْبَلُ عُذْرَهُمْ وَإِنْ يُحْسِنُوْا فَاللهُ بِالخَيْرِ أَجْوَدُ

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لغزشوں کو معاف کرنے والے اور عذر قبول کرنے والے ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جود وکرم کا معاملہ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے جود وکرم کا کیا حال ہوگا۔''

جود وکرم:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طبیعت کے خلاف پیش آنے والے حالات پر صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے مجرموں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ عفو ورحم کا معاملہ فرمایا؛ بلکہ اکثر اوقات ان کے ساتھ جود وکرم کا معاملہ بھی فرمایا، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اللہ تعالیٰ کی مقدّس صفات کا مظہر عظیم ہے، یہی وجہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ میں جود وسخا ایک اہم صفت ہے تو یہی صفت اپنے کمال کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں بھی نظر آتی ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ سے بڑا کوئی جوّاد اور سخی ہو نہیں سکتا، تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا کوئی جوّاد (جو بغیر مانگے بھی عطا کرے) اور سخی (جو مانگنے والوں کو اپنی عطا سے محروم نہ کرے) نہیں۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ أَجْوَدُ جُوْدًا؟ قَالُوْا: اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: اللهُ تَعَالٰى أَجْوَدُ جُوْدًا، ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِيْ آدَمَ، وَأَجْوَدُهُمْ مَنْ بَعْدِيْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهُ، يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمِيْرًا وَحْدَه، أَوْ قَالَ: أُمَّةً وَحْدَهُ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ۳۷، كتاب العلم)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑا جوّاد کون ہے؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے لاعلمی کا اظہار کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد

فرمایا کہ سب سے بڑا سخی اور جوادّ تو اللہ تعالیٰ ہے۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مانگنے والوں سے عطا کا وعدہ فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن : ٦٠)

اور اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ بغیر مانگے اپنے بندوں کو بلا امتیاز نہ جانے کتنی ساری ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازا، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (لقمان : ٢٠)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی آدم میں سب سے بڑا سخی میں ہوں، اور لوگوں میں میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ عالم دین ہے جس نے (رضائے الٰہی کی خاطر) علم سیکھ کر اسے پھیلایا، وہ قیامت کے دن ایک امیر (جس کے ماتحت جم غفیر ہوگا) کی شان سے آئے گا۔

حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ جود وسخا کا وصف اللہ ربّ العالمین کے بعد سب سے زیادہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے، جود وسخا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری وصف تھا، نبوت سے قبل جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''الصادق الامین'' کے وصف سے معروف تھے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخاوت وفیاضی میں بھی مشہور تھے، جیسا کہ پہلی مرتبہ کی وحی کے بعد سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے کہے گئے تسلی کے کلمات میں اس بات کی گواہی ہے:

"كَلَّا وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِيْ الضَّيْفَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ٥٢٢، باب المبعث)

''آپ صلہ رحمی، سچائی، بے یارو مددگار کی دستگیری، کمزوروں کے ساتھ بھلائی، مہمان نوازی اور مصائب میں مبتلا لوگوں کے تعاون جیسی صفات کے حامل ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رُسوا نہیں ہونے دے گا۔''

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے جانب سے کہے گئے تسلی کے یہ کلمات واضح کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزِ اوّل ہی سے فیاض اور انسانیت نواز کے طور پر جانے جاتے تھے۔

سخاوت کی حقیقت یہ ہے کہ اپنا جائز حق بخوشی دوسرے کے حوالے کر دینا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً اپنا حق معاف کر دینا، اپنا بچا ہوا مال بِلا کسی عوض دوسرے کے حوالے کر دینا، ضرورت کے باوجود خود پر دوسرے کو ترجیح دینا۔ اور بعض شراحِ حدیث کے بقول "وَالْجُوْدُ فِي الشَّرْعِ: "إِعْطَاءُ مَا يَنْبَغِيْ لِمَنْ يَنْبَغِيْ". (فتح الباري / باب بدء الوحي : ۱ / ۳۱)

بغیر کسی مفاد کے ضرورت مند (خواہ وہ ضرورت مند مال، علم، یا خدمت کا محتاج ہو اس) کو اس کے مناسب حال چیز عطا کرنا جود و سخا کہلاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات و حیات میں سخاوت کا یہ وصف اپنی جامعیت کے ساتھ پایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی سائل اور ضرورت مند کو منع نہیں فرمایا۔ حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ، فَقَالَ: "لَا". (متفق عليه، مشكوٰة: ص۵۱۹/ باب في أخلاقه وشمائله)

عربی کے مشہور شاعر فرزدق نے آلِ رسول امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو کہا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حرف بحرف صادق آتا ہے:

مَا قَالَ: "لَا" إِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاؤُهٗ نَعَمُ

''کلمہ شہادت میں غیر اللہ کی نفی کے لیے تو آپ نے ''لا'' فرمایا، ورنہ ساری

زندگی آپ کبھی "لا" نہ کہتے۔"

سیرتِ طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جود وسخا کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک صحابیہ عورت نے قیمتی چادر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ اس وقت پیش فرمائی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چادر کی ضرورت بھی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرما کر فوراً) اسے اوڑھ لیا، ایک شخص نے اس چادر کی تعریف کرتے ہوئے کہا: حضور! یہ چادر بہت دِل کش اور خوب صورت ہے، آپ مجھے مرحمت فرما دیجیے! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً وہ چادر اسے عطا فرما دی، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سائل کی اس حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا کہ جب تمھیں معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کا سوال رَد نہیں فرماتے، پھر تم نے اس چادر کا سوال کیوں کیا؟ تو اُنھوں نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ یہ چادر میرا کفن ہو جائے۔

"لَعَلِّيْ أُكَفَّنُ فِيْهَا." (رواه البخاري، باب حسن الخلق والسخاء)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس واقعے سے معلوم ہوا کہ صالحین کے آثار سے برکت حاصل کرنا جائز ہے۔

"وَفِيْهِ التَّبَرُّكُ بِآثَارِ الصَّالِحِيْنَ." (فتح الباري: ٣ / ١٤٤)

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے کفن وغیرہ کا پہلے سے انتظام کر کے رکھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا: حضور! میری والدہ آپ سے ایک کُرتے کا سوال کرتی ہیں، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن مبارک پر جو کُرتا تھا اس کے سوا اور

کوئی کُرتا نہیں تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعد میں آنا، میں کوئی انتظام کر دوں گا، کیوں کہ اس وقت جو پہنا ہے وہی کُرتا ہے، وہ لڑکا گھر گیا اور کچھ ہی دیر میں واپس آکر کہنے لگا: حضور! میری والدہ کہنے لگی کہ آپ کے بدن مبارک پر جو کُرتا ہے وہی عنایت فرمادیں، یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک سے کُرتا اُتار کر اس کے حوالے کر دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برہنہ بدن رہ گئے۔

یہ ہے اس آیت کریمہ کی عملی تصویر کہ

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر: ۹)

اس کے بعد جب نماز کا وقت ہوا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کُرتا نہ ہونے کے سبب باہر تشریف نہ لائے، جس پر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو فکر ہوئی، بعض لوگ حجرۂ مبارکہ میں حاضر ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کُرتے کے بیٹھے ہیں، اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ (الإسراء: ۲۹)

اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سخاوت کرنے سے منع فرمایا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔ (قرطبی، معارف القرآن: ۵/ ۴۷۳)

(۳) پھر جب من جانب اللہ وسعت عطا کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ لینے والے کے لیے اُٹھا کر چلنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بحرین سے بہت سا مال (خراج کا) آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسجد نبوی کے صحن میں رکھوا دیا، نماز کے وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس کی طرف مڑ کر ایک نظر بھی نہیں دیکھا، پھر نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقسیم کرنا شروع کیا، جو بھی سامنے آتا اسے دیتے چلے جاتے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے (جو اس وقت ضرورت

مند تھے) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں اتنا مال عطا فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ اُٹھ کر چل نہ سکے۔

حدیث میں ہے:

"ثُمَّ احْتَمَلَهُ، فَأَلْقَاهُ عَلٰى كَاهِلِهٖ، ثُمَّ انْطَلَقَ." (البخاري، باب القسمة)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جود وسخا کے ان ہی نمونوں کو لے کر آپ کے خادمِ خاص سیّدنا انس رضی اللہ عنہ نے گواہی دی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ (مشکوٰۃ:۵۱۸)

حیاوشرم:

جہاں تک حیاوشرم کی بات ہے تو اللہ ربّ العزت کی پاکیزہ صفات میں سے یہ بھی ایک اہم صفت ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ، يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا." (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح، كتاب الدعوات : ص۱۹۵)

''تمھارا پروردگار بہت ہی زیادہ حیا والا ہے، وہ بغیر مانگے دینے والا ہے، جب بندہ اس سے دعا مانگتا ہے تو اسے بندے کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

اب اس صفت الٰہی کو سیرتِ نبوی میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے پیاری اور چہیتی بیوی ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاوشرم کی گواہی دیتے ہوئے فرماتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف تہہ بند پہنے ہوئے اس موقع پر دیکھا ہے جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کسی سفر یا غزوے سے مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ملاقات کی غرض سے آئے تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے حجرے میں تھے، حضرت زید رضی اللہ عنہ

کے دستک دینے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دروازے پر اس طرح تشریف لائے کہ بدن مبارک پر تہہ بند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ امّی جان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"وَاللهِ مَا رَأَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ." (رواه الترمذي، مشكوٰة: ٤٠٢، باب المصافحة والمعانقة)

''اللہ کی قسم! میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح برہنہ بدن کے نہیں دیکھا۔'' (وظیفۂ زوجیت کے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیاوشرم کے سبب مکمّل برہنہ نہ ہوتے، جسم اطہر پر کوئی نہ کوئی کپڑا ضرور ہوتا تھا)۔

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرم وحیا کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَىٰ شَيْئًا يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِيْ وَجْهِهِ." (متفق عليه، مشكوٰة: ص٥١٩/ باب في أخلاقه وشمائله)

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باکرہ (کنواری) باپردہ لڑکی (جو عموماً شرمیلی ہوتی ہے) سے بھی زیادہ باحیا تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی ناپسندیدہ چیز (یعنی وہ چیز طبیعت کے خلاف ہوتی) دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیاوشرم کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے؛ مگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر ناگواری کے آثار دیکھ کر سمجھ جاتے۔'' (پھر ہم اس کے ازالے کی کوشش کرتے)۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے سن ہجری پانچ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح فرمایا تو

ولیمے کے لیے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حاضر ہوئے، کھانے کے بعد کچھ لوگ وہیں جم کر آپس میں باتیں کرنے کے لیے بیٹھ گئے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قلبی و ذہنی طور پر اذیت و تکلیف ہوئی؛ لیکن اخلاق اور شرم وحیا کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کچھ نہیں فرمایا؛ بلکہ خاموشی و ناگواری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اُٹھ کر وہاں سے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف چلے گئے، اس بات کو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے محسوس کرلیا، بعد میں وہ بھی چلے گئے، اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ﴾ (الأحزاب:۵۳)

(بخاری، ترمذی، مستفاد از: انوار البیان: ۴/ ۴۳۵، معارف القرآن: ۷/ ۲۰۲)

اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے متعلّق حقوق وآداب بیان فرمائے گئے، من جملہ ان کے ایک یہ کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں دعوت کے لیے بلائیں تو موقع دعوت پر جاؤ اور دعوت کے بعد واپس آجاؤ، وہیں بیٹھے نہ رہو، تمھاری اس حرکت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے؛ لیکن آپ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں فرماتے۔

﴿إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ﴾ (الأحزاب : ۵۳)

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی امور و معاملات میں خود تکلیف برداشت فرمالیتے؛ مگر شرم وحیا کے سبب دوسروں کو کچھ نہ فرماتے۔

(۳) نیز اسی شرم وحیا کا اثر یہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کی نامناسب بات کو دیکھ کر تنہائی میں اسے شفقت کے ساتھ نصیحت فرماتے، مجلس میں اس کو کبھی فضیحت نہ فرماتے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص خدمت اقدس میں اس حالت میں حاضر ہوا کہ اس پر زعفران کا رنگ لگا ہوا تھا۔

"دَخَلَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، وَعَلَيْهِ صُفْرَةٌ، فَكَرِهَهَا."

اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی؛ لیکن شرم وحیا کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا، البتہ جب وہ چلا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

"لَوْ أَمَرْتُمْ هٰذَا أَنْ يَدَعَ هٰذِهِ الصُّفْرَةَ." (مسند أحمد / الرقم : ۱۲۵۷۳)

''کاش! تم میں سے کوئی اسے کہہ دیتا کہ وہ اس رنگ کو چھوڑ دے۔''

ہمت وشجاعت:

شرم وحیا کا یہ فطری وصف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کمزوری اور بزدلی کا سبب کبھی نہیں بنا، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس قدر باحیا تھے اسی قدر بہادر بھی تھے، حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف بیان ہوئے ان میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے: "أَشْجَعَ النَّاسِ."

(متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح : ص۵۱۸)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری، دلیری، شجاعت وجرأت کی بڑی علامت یہ بھی ہے کہ منصب نبوت سے نوازے جانے کے بعد دین حق کی نشر واشاعت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر تمام ہی باطل خداؤں کی نفی کا اعلان فرمایا، پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا؛ بلکہ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب وعجم کے تین سب سے بڑے بتوں کے نام لے لے کر ان کی تردید فرمائی، حالانکہ کسی ایسی قوم کے سامنے جو اپنے بتوں کو دِل وجان سے محبوب اور معبود سمجھتی ہو، اللہ ربّ العزت کی اُلوہیت کا اثبات اور اس کے علاوہ تمام بتوں کی بے وقعتی، بے بسی اور بے حیثیتی کا اظہار بڑی جرأت کا کام

ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر دکھایا۔

قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس اعلان کا مکلّف فرمایا جس کے لیے انتہائی جرأت مندی، دلیری اور بہادری کی ضرورت تھی:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝١٩ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝٢٠ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝٢١ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝٢٢ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝٢٣﴾ (النجم : ۱۹ إلی ۲۳)

''بھلا کیا تم نے لات وعزّیٰ (کی حقیقت) پر بھی غور کیا؟ پھر ایک اور تیسرے پر جس کا نام منات ہے، کیا (یہ عجیب ضلالت و جہالت نہیں کہ) تمھارے لیے تو بیٹے ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ (مشرکین مکہ کے عقیدۂ باطلہ میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں تھیں، جس کی طرف اشارہ ہے) واقعی یہ تو بہت بھونڈی تقسیم ہوئی۔ (سنو! تمھارے) ان (بتوں) کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ داداؤں نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو ان کے حق میں کوئی ثبوت نازل نہیں کیا۔ در حقیقت یہ (کافر) لوگ محض وہم و گمان اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چل رہے ہیں، حالانکہ (اب) ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔''

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہارِ نبوت کے بعد عرب و عجم کے تین بڑے مشہور بتوں سمیت تمام ہی باطل خداؤں کے خلاف کسی کی پرواہ کیے بغیر تن تنہا آواز اُٹھائی، اس لیے بعد میں ساری زندگی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفّار و مشرکین کی جانب سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا، لیکن کسی بھی موڑ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزور ثابت نہیں ہوئے، ہمیشہ بڑی شجاعت و جرأت سے ہر ایک کا مقابلہ فرمایا۔ سیرت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت و

جرأت کے ایسے واقعات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "أَشْجَعُ النَّاسِ" ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا کوئی بہادر نہیں۔

چند واقعات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سن ہجری آٹھ رمضان المبارک میں جب مکہ مکرّمہ فتح ہوا اور قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے (ان میں سے اکثر و بیشتر مسلمان ہو گئے) تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی تھے، ان میں ہل چل مچ گئی، اُنھوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہو گئی ہے، مکہ سے فارغ ہونے کے بعد لازمی طور پر ان کا رُخ ہماری طرف ہوگا، اس لیے دانش مندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم ان پر حملہ کر دیں، اس کام کے لیے قبیلۂ ہوازن نے اپنی تمام شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کیا، اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے (جو بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کے علم بردار ثابت ہوئے) اُنھوں نے عورتوں اور بچّوں سمیت تقریباً چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا لشکر وادیِ حنین میں جمع کیا، جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مقابلے کے لیے جانے کا عزم فرمالیا، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ ہزار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر جنگ حُنین کے لیے بڑھے، جن میں بارہ ہزار انصارِ مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ مکرّمہ اور اس کے اطراف کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان ہوئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ چودہ ہزار مجاہدین پر مشتمل لشکر جرّار پوری تیاری اور ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھا تھا، جب کہ اس سے قبل بدر و اُحد میں اقلیت کے باوجود مسلمانوں نے اکثریت پر فتح حاصل کی تھی، اس لیے بعض کی زبان پر یہ جملہ آ گیا کہ ہم نے اپنی قلت کے باوجود کفّار کی اکثریت پر فتح حاصل کی ہے، لہٰذا آج تو ہماری فتح یقینی ہے، کیوں کہ ہمارے پاس تعداد بھی ہے اور قوت بھی۔

اللہ ربّ العالمین کو یہ عجب (خود پسندی) والی بات پسند نہیں آئی، حق تعالیٰ نے انھیں متنبہ کرنے اور اس بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہ تمھاری نظر اپنی تعداد و طاقت پر ہرگز نہ ہونی چاہیے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے، جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا، ابتداءً مسلمانوں کو بے خبری میں بنو ثقیف اور ہوازن کے تیر اندازوں کی جانب سے شدید تیر اندازی کے سبب پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بھاگنے لگے۔ قرآنِ کریم نے اس کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝﴾ (التوبة : ۲۵)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمھاری بہت سے (میدانوں اور) موقعوں پر مدد فرمائی اور حنین کے دِن بھی، جب کہ تم اپنی کثرت پر نازاں تھے، پھر وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی، اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔''

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت و جرأت دیکھیے! اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگنے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے چند صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ برابر جمے رہے اور مقابلے

کے لیے آگے بڑھے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سفید خچر پر آگے بڑھے۔

"وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَلٰى بَغْلَتِهِ الْبَيْضَاءِ". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح: ص۵۳۴/ باب في المعجزات)

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے (خطرے کے خوف سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کی طرف آگے بڑھنے سے) روکنا چاہا تو "فَنَزَلَ، وَاسْتَنْصَرَ". آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خچر سے نیچے اُتر آئے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کے بعد پوری جرأت مندی سے فرمایا کہ

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ

غور کیجیے! میدانِ جنگ میں عموماً تیز رَفتار گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں، تاکہ بوقت ضرورت بھاگ سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھاگنے والے نہیں، آگے والے بڑھنے والے تھے، اس لیے خچر پر سوار ہوئے، پھر جنگ میں ایسے رَنگ کا جانور پسند کیا جاتا تھا جو ذرا سے گرد وغبار میں چھپ جائے، فوج کی خاکی وَردی کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خچر کا رَنگ سفید تھا، جو بآسانی نظر آجاتا ہے، پھر پسپائی کے وقت لیڈر بھی اپنی شناخت چھپاتا ہے، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پہچان کرانے کے لیے علی الاعلان فرمایا کہ ''میں نبی ہوں، اس بات میں کوئی جھوٹ نہیں، اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نسبت والد کے بجائے دادا کی طرف اس لیے فرمائی کہ جناب عبدالمطلب عزّت وبزرگی میں زیادہ مشہور تھے، نیز یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن پر مزید رُعب ڈالنے کے لیے بھی فرمایا تھا۔ اسی سے علماء نے مستنبط فرمایا ہے کہ میدانِ جنگ میں دُشمن پر رُعب ڈالنے کے لیے اپنی تعریف کرنا یا ایسا اَنداز اختیار کرنا جس

سے دشمن مرعوب ہو، مثلاً سفید بال پر سیاہ خضاب لگانا، اَکڑ کر چلنا وغیرہ جائز ہے)۔

(مظاہر حق جدید: ۴۱۶/۵)

غزوۂ حنین ہی کے موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفّار نے خچر کے بغیر پیدل دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیر لیا، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھبرائے بغیر زمین سے ایک مشت مٹّی لی اور "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" فرما کر کفّار کی طرف پھینکی، جو تمام کفّار کی آنکھوں میں بطورِ معجزہ پہنچ گئی اور وہ پشت پھیر کر بھاگنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "نَادِ أَصْحَابَ السَّمُرَةِ". اصحابِ سمرہ (وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو بیعت رضوان میں شریک تھے) کو پکارو۔ (مسلم، مشکوۃ: ۵۳۳ تا ۵۳۴)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جہوری الصوت تھے، آپ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو پکارا، ہمت دلائی تو بطورِ کرامت آپ کی آواز تمام نے سن لی، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی بڑی دِلیری اور بہادری سے مقابلہ کرنے لگے اور بالآخر شکست فتح سے بدل گئی۔

(مستفاد از: معارف القرآن)

(۲) ایک مرتبہ رات کے وقت مدینہ طیبہ میں خوف ناک قسم کی آواز آنے لگی، جس کی وجہ سے یہ اَفواہ پھیل گئی کہ دشمن نے مدینہ پر اچانک حملہ کر دیا ہے اور یہ آواز دشمن کی آمد کی ہے، لوگ اس آواز کی طرف چلے، تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سامنے سے تشریف لا رہے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اس گھبراہٹ والی آواز کی سمت سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے، اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار تھے (معلوم ہوا کہ کسی کی سواری وغیرہ عاریت پر لینا جائز ہے) جس پر زین بھی نہیں تھی، اور تلوار گردن مبارک میں لٹکی ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو اطمینان دِلاتے ہوئے فرمانے لگے کہ گھبراؤ نہیں، کوئی خطرہ نہیں ہے۔

"وَلَقَدْ فَزِعَ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَانْطَلَقَ النَّاسُ قِبَلَ الصَّوْتِ، فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَبَقَ النَّاسَ إِلَى الصَّوْتِ، وَهُوَ يَقُوْلُ: "لَنْ تُرَاعُوْا، لَنْ تُرَاعُوْا، وَهُوَ عَلٰى فَرَسٍ لِأَبِيْ طَلْحَةَ عُرْيٍ، مَا عَلَيْهِ سَرْجٌ، فِيْ عُنُقِهِ سَيْفٌ، فَقَالَ: لَقَدْ وَجَدْتُهُ بَحْرًا، أَوْ إِنَّهُ لَبَحْرٌ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٥١٨، باب في أخلاقه و شمائله)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی "أشجع الناس" لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے، جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بہادر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور رُکانہ جیسے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سے زیادہ بہادر پا کر نبی تسلیم کیا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑھ کر بہادر نہ ہوتے تو وہ لوگ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم نہ کرتے، کیوں کہ ایک بہادر آدمی کبھی کسی بزدل کی اطاعت نہیں کرتا۔

کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ''رُکانہ'' نامی مشہور پہلوان تھا، جس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج کیا، حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مقابلہ کیا اور پچھاڑ دیا، پھر وہ مسلمان ہوگئے۔

"أَنَّ رُكَانَةَ صَارَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَصَرَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (رواه أبوداود: ٥٦٣/٢)

مخلوق کی خدمت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں یہ شہادت بھی موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر ہونے کے باوجود کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بہادری کا غلط استعمال نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت و جرأت لوگوں کے لیے مشقت و مضرت کا نہیں؛ بلکہ راحت و منفعت کا سبب بنی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حتی الامکان اپنی ذات سے لوگوں

کو فائدہ پہنچاتے، بالفاظِ دیگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخدوم بن کر رہنے کے بجائے خادم بن کر رہنا پسند فرماتے اور مخلوق کی خدمت کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ خدمت خلق کا اظہار تو سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ان جملوں سے بھی ہوتا ہے جو اُنھوں نے پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائے تھے:

"كَلَّا، وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِيْ الضَّيْفَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ٥٢٢، باب المبعث)

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن عادات واوصاف کا ذکر فرمایا وہ خالص خدمت خلق کی نوعیت کے ہیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سیّدنا عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر آپ کے اَوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفٰى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ الذِّكْرَ وَيُقِلُّ اللَّغْوَ، وَيُطِيْلُ الصَّلٰوةَ، وَيُقْصِرُ الخُطْبَةَ، وَلَا يَأْنَفُ أَنْ يَمْشِيَ مَعَ الأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ، فَيَقْضِيْ لَهُ الحَاجَةَ". (رواه النسائي والدارمي، مشكوٰة: ٥٢١، باب في أخلاقه و شمائله)

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اَوصاف میں یہ بھی ہے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت بلکہ ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتے اور لغویات وفضولیات کی طرف بالکل التفات نہ فرماتے۔ (کیوں کہ علماء کے بقول "يُقِلُّ" میں قلت کا اطلاق عدم پر بھی ہوتا ہے، یہاں یہی عدم کے معنیٰ مراد ہیں)۔ (توضیحات: ۸/ ۱۶۷)

نماز کو طویل فرماتے (کیوں کہ نماز اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز اور مناجات کے لیے ہوتی ہے، جس کا تقاضا یہی ہے کہ اسے طویل کیا جائے، جب کہ خطبہ لوگوں سے

متعلّق ہوتا ہے، پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جوامع الکلم دیے گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختصر کلمات بھی مفصل مضامین کے جامع ہوتے، اس لیے عام حالات میں نماز طویل) اور خطبہ مختصر فرماتے تھے۔

بیوہ عورت یا مسکین آدمی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی کام کے لیے چلنے کا تقاضا کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ چلنے اور میل جول رکھنے میں کوئی عار یا ذلت محسوس نہ فرماتے؛ بلکہ ان کے کام میں معین ومددگار ثابت ہوتے۔

اسی لیے حضرت مفتی رشید احمد صاحب لُدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

مظلوموں کا ماویٰ وملجا، کمزوروں کا حامی وناصر
حسن مجسم، حسن دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی بھی حاجت مند اور پریشان حال کو دیکھتے تو خود پریشان ہوجاتے، حاجت مند کی جانب سے اظہارِ ضرورت کے بغیر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِتمامِ ضرورت کا انتظام فرمادیتے۔ سیرتِ طیبہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں:

(۱) حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ دِن کے ابتدائی حصے میں ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ قبیلہ مضر کے کچھ لوگ آئے، جو نہایت خستہ حال تھے، ان پر فقر وفاقہ کے اثرات دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے چین ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی وقت اپنے گھر تشریف لائے، تاکہ ان کے لیے کھانے وغیرہ کا کچھ نظم کیا جاسکے، اتفاق سے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ذاتی طور پر کوئی انتظام نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے واپس تشریف لائے، جب نمازِ ظہر یا جمعہ کا وقت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیّدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم فرمایا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اَذان واِقامت کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد اپنے اُن آنے والے فقراء ومساکین کی حاجت

رَوائی کے لیے لوگوں سے چندہ کی گزارش کرنے کے لیے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں قرآنِ پاک کی وہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس میں انسانیت کے ساتھ ہمدردی کا درس دیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ (النساء : ۱)

پھر سورۂ حشر کی وہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس میں فکرِ آخرت کی طرف متوجّہ کیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۱۸﴾ (الحشر: ۱۸)

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو دل کھول کر ان آنے والوں کا تعاون کرنے کی ترغیب دی، روایت میں ذکر ہے:

"حَتّٰى قَالَ: وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ". (مسلم، مشكوٰة : ۳۳، كتاب العلم)

''صدقہ کرو! اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو؟ پھر کیا دیر تھی؟ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، یہاں تک کہ غلّہ اور کپڑے وغیرہ کے دو ڈھیر ہو گئے، اپنے تربیت یافتہ لاڈلوں کا یہ جذبہ دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ انور خوشی سے چمک اُٹھا۔

(۲) ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اَنصار اور مہاجرین کے مابین مواخات کا بے مثال نظام قائم فرمایا، جس سے ان کے معاشی مسائل حل ہوئے اور ریاست مدینہ کی معیشت پر اس کا بڑا اچھا اَثر ہوا، اس طرح کہ مہاجرین تجارت میں ماہر تھے، تو انصار کو کھیتی باڑی کا تجربہ تھا، اس بھائی چارے کے بعد ہر ایک نے اپنی

صلاحیت کے جوہر دِکھائے، جس سے ان کی معیشت نے خوب ترقّی کی۔

لیکن مدینہ میں مختلف علاقوں سے دین اسلام اور احکامِ اسلام سیکھنے کی غرض سے آنے والا ایک طبقہ ایسا تھا کہ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، یہ وہ افراد تھے جو دائمی طور پر نقل مکانی کر کے نہیں آئے تھے؛ بلکہ اپنے قبائل کی نمائندگی کے طور پر یا ذاتی شوق و رغبت کی وجہ سے عارضی طور پر علم دین حاصل کرنے کی غرض سے خدمت اقدس میں آئے تھے، ان کے لیے بھی محدود وقت کے لیے ٹھکانہ فراہم کرنے کی ضرورت تھی، جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو فکرمند تھے ہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے مسجد نبوی کے صحن میں ایک وسیع چبوترہ بنوادیا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کا نگراں مقرر فرمایا، خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مختلف اوقات میں ان کی خبر گیری فرماتے، ان کے پاس آکر بیٹھتے، ان کی دل جوئی فرماتے، ان کو خود قرآن بھی سکھاتے، کبھی کبھی ان سے مزاح بھی فرماتے، ان کے کھانے پینے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی اور لوگوں کو فکر دلا کر انتظام فرماتے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ مغرب کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اصحابِ صفہ کے متعلّق فرمایا:

"مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ أَوْ سَادِسٍ، وَأَنَّ أَبَا بَكْرٍ جَاءَ بِثَلَاثَةٍ، وَانْطَلَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَشَرَةٍ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ٥٤٥، باب الكرامات)

جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ (اصحابِ صفہ میں سے) تیسرے کو لے جائے، اور جس کے ہاں چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے کو لے جائے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تین آدمیوں کو لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ (اور گھر جا کر انھیں کھانا کھلایا)۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدمت خلق میں ہر ایک کی عزّتِ نفس کا بھی خیال فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبۂ جمعہ دینے لگے، اُسی وقت ایک نہایت غریب اور خستہ حال صحابی حضرت سُلیک غطفانی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے اور بیٹھ گئے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت یہی تھی کہ خطبہ کے وقت سلام وکلام اور نماز وغیرہ نہ پڑھی جائے؛ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی خستہ حالی دیکھی تو اپنی عام ہدایت کے خلاف فرمایا:

"يَا سُلَيْكُ! قُمْ فَارْكَعْ رَكْعَتَيْنِ، وَتَجَوَّزْ فِيهِمَا". (مسلم: ۱/ ۵۸۸)

کہ مختصراً دو رکعات پڑھ لیجیے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں مجمعِ عام میں نماز کے لیے اس لیے کھڑا کیا تاکہ لوگ اُنھیں دیکھ سکیں اور مدد کریں، یہ اُن کی مدد کا ایک بہانہ تھا۔ (مستفاد از: توضیحات: ۳/ ۱۱۳)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ چند صفاتِ الٰہیہ ہیں جن کی جھلکیاں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، ان کے علاوہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بہت سے اوصافِ کمال پائے جاتے تھے، واقعہ تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر وصف مثالی تھا، بقول شاعر:

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر وصف مثالی ہے
صورت بھی نرالی ہے، سیرت بھی نرالی ہے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو بھی اُمتی ایمان و اِخلاص کے ساتھ اِن اَوصاف کو اختیار

کرے گا وہ بلا شبہ خیر الناس کا مصداق بن جائے گا، پھر وہ اگر کسی کی اَولاد ہے تو بہترین اولاد، والد ہے تو بہترین والد، شوہر یا بھائی ہے تو بہترین شوہر اور بھائی بن جائے گا، وہ معاشرہ کا بہترین فرد بن کر دارین میں قربِ الٰہی و رضائے الٰہی کا حق دار بن سکتا ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرما کر ایسا بنادیں کہ ہم اُسے پسند آجائیں۔ آمین۔

مؤرّخہ: ۹ر جمادی الاولیٰ ر ۱۴۴۲ھ
مطابق: ۲۵ر دسمبر ر ۲۰۲۰ء، قبل الجمعہ
بمقام: بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اِک سمت شریعت ہوتی ہے، اِک سمت محبّت ہوتی ہے

اُس دِل پہ خدا کی رحمت ہو جس دِل کی یہ حالت ہوتی ہے
اِک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

اے صَلِّ علیٰ! اِک ایک ادا اللہ کی آیت ہوتی ہے
ہے روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیشِ نظر، قرآں کی تلاوت ہوتی ہے

اِک وہ بھی مقدّر ہوتا ہے، اِک ایسی بھی قسمت ہوتی ہے
بوجہل یوں ہی رہ جاتا ہے، بوذرؓ کو ہدایت ہوتی ہے

جو بات وہ فرما دیتے ہیں معیارِ صداقت ہوتی ہے
دستورِ عمل بن جاتی ہے اور دین میں حجّت ہوتی ہے

طیبہ کے ببولوں کے کانٹے پھولوں سے بھی نازُک تر نکلے
تلووں کو بھی لذّت ملتی ہے، آسودہ طبیعت ہوتی ہے

مقصودِ جہاں، محبوبِ خدا اور اس پر یہ شانِ فقر و غنا
کپڑے بھی وہ خود دھو لیتے ہیں، فاقوں کی بھی عادت ہوتی ہے

أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ فرما کر اللہ نے خود یہ اعلان کیا
اِتمامِ کرم اب ہو تو چکا، بس ختمِ نبوت ہوتی ہے

(۹)

کاشت کاری کی اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا، أَوْ لِيَمْنَحْهَا أَخَاهُ، فَإِنْ أَبٰى فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۲۵۷، باب المساقاة والمزارعة)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس زمین ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس میں یا تو خود کھیتی کرے، یا پھر اپنے کسی بھائی کو (بطورِ عطیہ یا عاریت) دے دے، پھر اگر وہ بھی انکار کر دے تو اپنی زمین روکے رکھے"۔

کاشت کاری زمین کی آبادکاری کا ذریعہ:

اللہ ربّ العزت نے انسان کو زمین (کی مٹّی) سے بنا کر زمین ہی میں بسایا اور آباد فرمایا، ارشادِ الٰہی میں اسی کو بتایا گیا:

﴿هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا﴾ (هود : ٦١)

انسان سے اس کا تقاضا اور مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین کو حقیقی و ظاہری

اعتبار سے آباد رکھے، اس میں فساد نہ پھیلائے۔

﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ﴾ (الأعراف : ٥٦)

زمین کی حقیقی آبادی کے لیے اپنی جبین نیاز کو اس پاک ذات کی زمین پر جھکانا اور ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ اس کی بندگی کرنا ضروری ہے، تو ظاہری آبادی کے لیے مکانات کی تعمیر، باغبانی و شجر کاری اور کاشت کاری کی ضرورت ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ میں ﴿وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا﴾ کے تحت مفسرین علماء نے فرمایا کہ ''روئے زمین کی آبادکاری انسان کی ذمّے داری ہے، جس کی ایک ظاہری شکل یہ ہے کہ انسان زمین میں کاشت کاری کا اہتمام کرے۔ (احکام القرآن للجصّاص) کاشت کاری زمین کی آبادی اور زمین والوں کی غذائی و بنیادی ضروریاتِ زندگی کا ذریعہ ہے۔

کاشت کاری کی قدر و منزلت:

کاشت کاری کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ربّ العالمین نے قرآنِ کریم میں کاشت کاری کی نسبت اپنی پاک ذات کی طرف فرمائی، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ الزَّٰرِعُونَ﴾ (الواقعة : ٦٤)

مزید برآں ابو الانس سیّدنا آدم علیہ السلام بحکم الٰہی جب جنّت سے زمین (ہند) پر تشریف لائے تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (البقرة : ٣٦)

''تمھیں وقت مقرر تک زمین میں رہ کر زمین کی موجودہ و پوشیدہ نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا ہے''۔

اب حضرت آدم علیہ السلام سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین سے فائدہ کیسے حاصل کیا جائے؟ تو حق تعالیٰ نے آپ کے دل میں کاشت کاری کا اِلہام فرمایا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے باقاعدہ کھیتی کا طریقہ بھی سکھایا، جس کے بعد آپ نے گیہوں کی کھیتی فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک اَثر میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلّق وارد ہے:

"وَأُحَدِّثُكَ عَنْ آدَمَ، إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا حَرَّاثًا". (المستدرك على الصحيحين للحاكم: ٥/ ٦٥٢)

آپ کاشت کاری کیا کرتے تھے، گویا ابوالبشر سیّدنا آدم علیہ السلام نے جنّت سے زمین پر آکر اس کی حقیقی آبادی کے لیے جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اہتمام فرمایا وہاں اس کی ظاہری آبادی کے لیے کاشت کاری کا التزام بھی فرمایا۔

نیز اس سے معلوم ہوا کہ کاشت کاری کی تاریخ بھی اِتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تاریخ، کیوں کہ دُنیا کے سب سے پہلے انسان، سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے کاشت کار بھی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح ابوالانبیاء سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلّق بھی منقول ہے:

"وَأُحَدِّثُكَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا زَرَّاعًا". (المستدرك على الصحيحين للحاكم: (٢ / ٦٥٢)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کاشت کاری کا پیشہ اختیار فرمایا۔ امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلّق امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے:

"وَازْدَرَعَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالجُرُفِ". (المبسوط: ٢ / ٢٣، كتاب المزارعة)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مقامِ جُرف میں کاشت کاری فرمائی ہے۔''

کاشت کاری کی تعریف وترغیب:

ذکر کردہ باتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کاشت کاری پسند تھی، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کے کسانوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے تھے، حدیث مبارک میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى بَنِيْ حَارِثَةَ، فَرَأَى زَرْعًا فِيْ أَرْضِ ظُهَيْرٍ، فَقَالَ: مَا أَحْسَنَ زَرْعَ ظُهَيْرٍ!". (أبوداود: ۲/ ۴۸۲، كتاب البيوع)

''رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ (مدینہ طیبہ کے ایک قبیلے) بنی حارثہ کے یہاں تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ظُہیر بن رافع رضی اللہ عنہ (جو بدری صحابی ہیں، اور مدینہ منورہ میں بڑے کاشت کار تھے) کی زمین میں کھیتی دیکھی تو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ واہ! ظُہیر کی کھیتی کتنی اچھّی ہے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاشت کاری کو پسند فرماتے تھے۔ اسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی پسند فرماتے تھے کہ کسی کے بھی پاس اگر کھیتی کی زمین ہو تو اسے بیکار نہ چھوڑے، یا تو خود کھیتی کرے یا کسی کو اس زمین میں کھیتی کرنے دے۔ حدیث مذکور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشت کاری کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

"مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا، أَوْ لِيَمْنَحْهَا أَخَاهُ، فَإِنْ أَبىٰ فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ".

البتہ اگر اس کا کسان بھائی بھی کسی وجہ سے کاشت کاری کے لیے تیار نہ ہو تو اس زمین کو بغیر کھیتی کے رکھے۔ (کیوں کہ کھیت کو ایک آدھ سال کے لیے بغیر کھیتی کے چھوڑنا بھی اس کی زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے)۔

اس حدیث پاک کے آخری جملہ "فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ" کا مطلب بعض علماء

نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ یہ بات آپ ﷺ نے بطورِ توبیخ وتنبیہ بیان فرمائی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنی کھیتی کی زمین پر خود بھی کھیتی نہ کرے اور کسی دوسرے کو بھی نہ کرنے دے تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت زمین کی ناقدری اور دُنیوی واُخروی ثمرات وبرکات سے محروم رہنے کے مترادف ہے۔ واللہ اعلم۔

کاشت کاری کی برکات:

صاحبو! یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ نیک نیتی اور شرعی رہنمائی کے مطابق کاشت کاری کا محبوب ومرغوب پیشہ اختیار کرتے ہیں وہ بفضل الٰہی مختلف قسم کے منافع وفوائد اور ثمرات وبرکات سے مالا مال ہوتے ہیں۔

☆.....ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے کاشت کار کو رزقِ حلال حاصل ہوتا ہے، یوں تو رزقِ حلال کے بہت سے ذرائع ہیں؛ لیکن جن کے پاس کھیتی کی زمین اور اس کی صلاحیت ومواقع بھی مہیا ہیں ان کے لیے یہ رِزقِ حلال کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ ہے، جس میں سرمایہ بھی نسبۃً کم خرچ ہوتا ہے اور ایک اَن پڑھ آدمی بھی اس محبوب ومرغوب پیشے کو اختیار کر کے بڑے بڑے فوائد ومنافع حاصل کر سکتا ہے، اسی لیے حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کاشت کاری کو فضل الٰہی کا ثمرہ بتا کر اس سے فوائد و منافع حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۝۱۵﴾ (الملك : ۱۵)

ربّ العالمین نے اپنے فضل وکرم سے زمین کو تمھارے لیے عاجز، نرم اور مسخر کر دیا، تاکہ تم جس طرح چاہو اس میں تصرف کر سکو، چاہو تو اس میں مختلف قسم کی تعمیرات کرو، چاہو تو اس میں باغات لگاؤ، چاہو تو اس میں مختلف قسم کی کھیتیاں اُگاؤ، تم

زمین کے راستوں میں چلو پھرو اور اس کی پیداوار سے رِزق حاصل کر کے کھاؤ؛ لیکن اپنے اللہ کو، اپنے اَنجام یعنی آخرت کو نہ بھولو، کہ اَنجام کار اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

آیت کریمہ میں زمین جو دراصل اللہ تعالیٰ کا بہترین عطیہ وتحفہ ہے اس سے منافع وفوائد حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی، حدیث مبارک میں بھی اس کی ترغیب اس طرح دی گئی:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اِلْتَمِسُوْا الرِّزْقَ فِيْ خَبَايَا الْأَرْضِ". (شعب الإيمان، كنز العمال: ۲ / ۱۹۷)

''زمین کی تہوں میں رِزق تلاش کرو''۔ تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کی بہترین و آسان ترین شکل کاشت کاری ہی ہے۔

☆..... چنانچہ جب کاشت کار زمین کی تہہ سے رِزق تلاش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اپنا بیج امانت کے طور پر زمین میں دَفن کرتا ہے تو حق تعالیٰ اسے ضائع نہیں ہونے دیتے؛ بلکہ اس کی ایک امانت کو کئی گُنا کر کے واپس عطا فرماتے ہیں، پھر اس کاشت کاری سے پیدا ہونے والی اَنواع واَقسام کی سبزیوں، ترکاریوں، غلوں، میووں، پھلوں اور پھولوں سے صرف کاشت کار ہی کو نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو نہ معلوم کہاں کہاں سے رِزق میسّر ہوتا ہے اور ان کی غذائی اور بنیادی ضروریاتِ زندگی جیسے خوراک، اَدویات (جو عموماً پیڑ، پودوں، ان کی جڑوں اور ان سے پرورش پانے والے جانوروں کے اَجزاء سے حاصل ہوتی ہیں) اور پوشاک ولباس (جنھیں کھیتوں میں پیدا ہونے والی روئی کے ذریعے بنایا جاتا ہے) کا انتظام ہوتا ہے۔

ارشادِ ربّانی میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ

مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ (السجدة : ۲۷)

''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم (بارش، نہروں اور تالابوں کے) پانی کو بنجر اور خشک زمین کی طرف بہا کر لے جاتے ہیں، پھر اس سے ہم ہی کھیتیاں نکالتے ہیں، جسے ان کے جانور اور وہ خود بھی کھاتے ہیں (اپنی غذائی و بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرتے ہیں) کیا پھر بھی یہ نہیں دیکھتے سمجھتے''۔

داتا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے؛ لیکن حق تعالیٰ نے اس کا ظاہری ذریعہ کاشت کار کو بنایا ہے۔ اس لیے عاجز کے خیالِ ناقص میں کسان بھی انسان کا بہت بڑا محسن اور میزبان ہے، کہ حق تعالیٰ اس کی محنت سے وجود میں آنے والی کھیتی سے ہماری غذائی اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام فرماتے ہیں۔

☆..... غالباً یہ اسی کا صلہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک مسلمان کاشت کار کو اس کی کاشت کاری پر صدقہ کے اَجر و ثواب کی خوش خبری عطا فرمائی ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ إِنْسَانٌ، أَوْ طَيْرٌ، أَوْ بَهِيْمَةٌ، إِلَّا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةً". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۱۶۸/ باب فضل الصدقة)

''جو بھی مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، یا کھیتی کرتا ہے، پھر اس میں سے کوئی انسان یا پرندہ یا جانور اپنی غذا حاصل کرتا ہے تو حق تعالیٰ اسے صدقے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔'' کیوں کہ شجر کاری و کاشت کاری کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے حصولِ غذا و نفع کا سبب ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس شجر کاری و کاشت کاری میں اگر بندے کو کسی بھی مخلوق سے یا پھر کسی لا پرواہ حکومت کے ظالمانہ قانون کے نتیجے میں نقصان پہنچا تو حق تعالیٰ اس پر صدقے کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

کاشت کاری معاشی وملکی ترقّی کا ذریعہ:

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی کاشت کاری سے انفرادی واجتماعی طور پر مختلف دُنیوی واُخروی منافع اور فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین معیشت نے زراعت کو ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈّی کا درجہ اور معاشی وملکی ترقّی اور خوش حالی کا یقینی ذریعہ قرار دیا، اور یہ حقیقت بھی ہے۔

دُنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن ملکوں اور قوموں نے زراعت و کاشت کاری کے اَسباب ومواقع کی فراہمی کے باوجود اس شعبے کو نظر انداز کیا وہ خاطر خواہ ترقّی نہیں کر سکے۔ نیز زراعت وکاشت کاری سے صنعت وتجارت کو خام مال فراہم ہوتا ہے، اس طرح صنعت وتجارت کی ترقّی کے لیے بھی زراعت وکاشت کاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں حدیث پاک سے بھی تابیر کی اِجازت ملتی ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ انصارِ مدینہ جو عموماً کاشت کاری سے جڑے ہوئے اور اس میں ماہر تھے، وہ کھجور کے درختوں میں تابیر یعنی پیوند کاری کرتے تھے۔

"هُمْ يُؤَبِّرُوْنَ النَّخْلَ". (مسلم، مشكوٰة: ۲۸، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

کھجور کے درختوں میں ایک نر ہوتا ہے اور دوسرا مادہ، نر کھجور کے درخت کے پھول مادہ کے پھولوں میں لگاتے ہیں، یہ عمل محنت ومشقت والا ضرور ہے؛ مگر اس سے پیداوار اور منافع میں اضافہ ہوتا ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت حال سے واقفیت کے بعد اس کی اِجازت مرحمت فرمائی۔ تو علماء نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا کہ کاشت کاری میں بھی شرعی حدود میں رہ کر جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اگر ایسا کیا جائے تو اس سے معاشی وملکی ترقّی میں اور بھی اِضافہ ہوگا۔

کاشت کاری کے اَحکامِ شرعیہ:

الغرض ماہرین معیشت کے بیان کے مطابق زراعت و کاشت کاری معاشی و ملکی ترقّی کا ذریعہ ہے۔

☆..... ماہرین شریعت کے بقول احکامِ شرعیہ میں کاشت کاری فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (البقرة : ۲۶۱)

اس آیت کریمہ کے تحت مفسر قرآن علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کاشت کاری کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے:

"وَالزِّرَاعَةُ مِنْ فُرُوْضِ الكِفَايَةِ". (قرطبي، سورة البقرة، الآية: ۲۶۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمّت مسلمہ میں کوئی بھی کاشت کاری نہ کرے اور اس سلسلے میں غیروں پر بھروسہ کرلیا جائے تو مجموعی طور پر ساری اُمّت اس فریضے میں کوتاہی کرنے والی شمار ہوگی، اُس وقت امیر المؤمنین و خلیفۃ المسلمین کی ذمّے داری ہے کہ وہ کاشت کاروں کو کاشت کاری پر مجبور کرے، کیوں کہ تحت الاسباب انسان اور حیوان سبھی اس کے محتاج ہیں۔

☆..... کاشت کاری کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں حفاظت کے مختلف ضروری اَسباب و وَسائل اختیار کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اگر اس کے لیے کُتا بھی رکھنا پڑے تو شرعاً اس کی اجازت ہے، حالانکہ کتے کے متعلّق حدیث پاک میں ہے کہ جس گھر میں (دیوار وغیرہ پر جاندار کی مکمّل سر والی) تصویر ہو، یا (فیشن اور شوق کی خاطر)

کُتا رکھا ہو، یا (سستی کے سبب غسل جنابت کا عادی) جنبی ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : "لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ وَلَا كَلْبٌ وَلَا جُنُبٌ". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ص۵۰ / باب مخالطة الجنب وما يُباحُ له)

دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص فیشن اور شوق کی خاطر کُتا پالتا ہے تو اس کے اعمال کے اَجر میں روزانہ ایک قیراط ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کُتا پالنے کی اجازت نہیں؛ البتہ اگر کسی نے کاشت کاری یا مویشی کی حفاظت یا شکار کرنے کے لیے کُتا پالا ہے تو اس کی اِجازت ہے، اس صورت میں اَجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ، أَوْ صَيْدٍ، أَوْ زَرْعٍ، انتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۳۵۹، باب ذكر الكلب)

☆..... پھر چوں کہ کاشت کاری رِزقِ حلال کے ساتھ نفع عام کا ذریعہ بھی ہے، اس لیے شریعت مطہرہ نے کاشت کاروں یا ان سے خریدنے والوں کو گرانی کے انتظار میں ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا، حدیث پاک میں ایسے شخص کو ملعون کہا گیا ہے:

"وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ". (ابن ماجه والدارمي، مشكوٰة : ۲۵۱، باب الاحتكار)

وجہ یہ ہے کہ اس سے ملک میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوگا اور عام لوگ حرج و مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لیے شریعت نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی۔

اگر کاشت کار نیک نیتی اور اَحکامِ شرعیہ کی رِعایت کے ساتھ زراعت کا محبوب

ومرغوب پیشہ اختیار کرے تو خود اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رَضا ورحمت اور خلق خدا کے لیے خیر وبرکت کا سبب ہے۔

دُنیا آخرت کی کھیتی ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ کاشت کاری کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے جن لوگوں کو اللہ پاک نے قابل کاشت زمین اور اس کے اَسباب ووسائل عطا فرمائے ہیں اُنھیں چاہیے کہ حصولِ رزقِ حلال اور نفع عام کی نیت سے احکامِ شرعیہ کی رعایت کرتے ہوئے زراعت کے محبوب ومرغوب پیشے کو اختیار کریں، اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ دُنیا کی عارضی کھیتی ہے، اس سے زیادہ قیمتی آخرت کی دائمی کھیتی ہے، جس کی تیاری کے لیے دُنیا کی یہ زندگی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، بزرگوں نے فرمایا ہے:

"الدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الآخِرَةِ". (مرقاة المفاتيح)

''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ دُنیوی زندگی کی مثال ایک کھیت کی سی ہے، اور اعمالِ انسانی کی مثال بیج کی سی ہے، اور انسان مثل کسان کے ہے، جس طرح کسان کو انتخاب کا اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جس چیز کی کھیتی کرنا چاہے کرسکتا ہے، اسی طرح دنیا میں انسان کو بھی اچھے یا بُرے اعمال کا اختیار ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الكهف:۲۹)

نیز فرمایا گیا:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ (الدهر : ۳)

البتہ اِتنی بات تو سبھی سمجھ دار سمجھتے ہیں کہ بیج اگر اچھا بوئیں گے تو اس کا نتیجہ بھی اچھا ہی پائیں گے، بالکل یہی حال ہے دُنیوی زندگی کا کہ اگر اعمالِ صالحہ کا بیج بوئیں گے تو کل قیامت کے دِن اس کے اچھے نتائج وثمرات پائیں گے، ورنہ

پچھتائیں گے، کسی نے سچ ہی کہا ہے:

تیری کرنی کے تجھ کو ملیں گے پھل　　آج جو بوئے گا وہ کاٹے گا کل

پھر جس طرح دُنیا کی کھیتی میں کسان جب عمدہ اور اچھا بیج ڈالتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بیج کو ضائع نہیں فرماتے؛ بلکہ ایک بیج اور دانے کے عوض کئی دانے عطا فرماتے ہیں، اسی طرح ایک مسلمان دُنیوی زندگی میں جب کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو حق تعالیٰ اسے ضائع نہیں ہونے دیتے، اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (التوبة: ۱۲۰)

بلکہ اللہ تعالیٰ ایک عمل پر کئی گنا بڑھا کر اَجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرة: ۲۶۱)

حق تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آئندہ کل خواہر زادی مصلحہ خاتون ہمراہ محمد علی کے عقد مسنون کو قبول فرما کر اس شادی کو خانہ آبادی اور دارین کی کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۲۴ر جمادی الاولیٰ ر ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۹ر جنوری ر ۲۰۲۱ء، بروز سنیچر (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع: ۲۱۰)

(۱۰)

مٹّی کے مطلوبہ اَوصافِ اَربعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "إِنَّ اللهَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُوْا اٰدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ، مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ، وَالْأَبْيَضُ، وَالْأَسْوَدُ، وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ، وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيْثُ، وَالطَّيِّبُ". (رواه أحمد والترمذي وأبوداود، مشكوٰة : ۲۲، باب الإيمان بالقدر)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بلا شبہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹّی کی ایک مشت (کما یلیق بشأنہ) سے پیدا فرمایا، جو ہر جگہ کی زمین سے لی گئی تھی۔ (حضرت آدم علیہ السلام کی طرح اَولادِ آدم کو بھی بالواسطہ مٹّی سے پیدا فرمایا) یہی وجہ ہے کہ اَولادِ آدم زمین (مٹّی) کے موافق پیدا ہوئی۔ (مطلب یہ ہے کہ ان میں مٹّی کے ظاہری و باطنی اَوصاف کے اَثرات پائے جاتے ہیں، ظاہری اَوصاف کے اَثرات کا نتیجہ ہے کہ) ان میں بعض سرخ ہیں تو بعض سفید، اور بعض سیاہ ہیں تو بعض درمیانی، یعنی گندمی رَنگ کے ہیں۔ (باطنی اَوصاف کے اَثرات کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں) بعض نرم مزاج

ہوتے ہیں تو بعض سخت مزاج، اور بعض ناپاک مزاج ہیں تو بعض پاک باز ہیں۔

مٹّی اِنسان کی اصل:

اللہ ربّ العزت نے اپنی خاص حکمت کے تحت اِنسانِ اوّل ابو البشر سیّدنا آدم علیہ السلام کو مٹّی سے پیدا فرمایا، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ (آل عمران : ۵۹)

یعنی ان کے قالب اور جسم کو عام خشک مٹّی سے پیدا فرمایا۔ (''تراب'' اس مٹّی کو کہتے ہیں جو ابتداءً بالکل خشک ہو، پھر جب اس میں پانی ملا دیا جائے تو اسے ''طین'' کہتے ہیں، آیت کریمہ میں سیّدنا آدم علیہ السلام کی ابتدائی تخلیق کا ذکر ہے) اور اسی کی کچھ تفصیل حدیث مذکور میں ذکر کی گئی ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر، خاکی پتلے اور جسم کو تیار کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ روئے زمین کے تمام خطوں، حصوں اور جگہوں سے تھوڑی تھوڑی مٹّی لے کر آؤ، چنانچہ تعمیل ارشاد میں حضرت عزرائیل علیہ السلام گھوم کر دُنیا بھر کی زمین سے ایک مشت مٹّی لے آئے، پھر اس مٹّی سے حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسد خاکی کو پیدا فرمایا، جسے حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ". (مظاہر حق جدید: ۱/ ۲۰۴)

رہی بات اَولادِ آدم کی، تو چوں کہ باپ کی تخلیق مٹّی سے ہوئی اس لیے اَولاد کی تخلیق بھی مٹّی سے ہوئی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ سیّدنا آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مٹّی سے پیدا فرمایا، جب کہ اَولادِ آدم کو نطفۂ منی سے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾ (الدھر : ۲)

یہ نطفہ دراصل مٹّی سے نکلنے والی غذا کھانے ہی سے بنتا ہے، اس اعتبار سے نطفۂ منی سے تخلیق دراصل مٹّی ہی سے تخلیق ہوئی، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی طرح اَولادِ آدم کی اصل بھی مٹّی ہوئی۔

عاجز نے عرض کیا ہے:

نہ پوچھئے کسی کی ذات، سب ہی مٹّی ہیں ہماری تمھاری اَوقات ہی مٹّی ہے

اور عربی شاعر نے خوب کہا ہے کہ

مِنْ تُرَابٍ، عَلٰی تُرَابٍ، إِلٰی تُرَابٍ ثُمَّ حِسَابٌ، فَثَوَابٌ، أَوْ عِقَابٌ

''انسان مٹّی سے پیدا ہوتا ہے، پھر مٹّی (روئے زمین) پر زندگی بسر کرتا ہے، یہاں تک کہ موت ہونے پر مٹّی (قبر) میں پہنچتا ہے، پھر (آخرت میں) حساب ہوگا، نتیجۃً یا تو بندہ ثواب پائے گا یا عقاب۔''

مٹّی اِنسان کی ابتدا وانتہا:

اس دُنیا میں ہر انسان کی ابتدا بھی مٹّی ہے اور انتہا بھی مٹّی ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں بیان فرمایا ہے:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (طٰہٰ:۵۵)

(بعض روایات میں بہ وقت تدفین تین مشت مٹّی ڈالتے وقت اس آیت کا پڑھنا اگرچہ منقول ہے؛ لیکن وہ روایات سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، تاہم اس آیت کو پڑھے بغیر سر کی طرف سے مٹّی کی تین لپیں ڈالنا ثابت ہونے کی وجہ سے مسنون و مستحب ہے)۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ، ثُمَّ أَتَى الْقَبْرَ، فَحَثٰى عَلَيْهِ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ ثَلَاثًا". (رواه

ابن ماجه، مشكوٰة : ۱۲۹، باب دفن الميت)

الغرض حق تعالیٰ نے دُنیا کے انسان کو مٹّی سے بنا کر مٹّی میں بسایا، پھر موت کے بعد مٹّی میں ملا کر قیامت کے دِن اسے مٹّی ہی سے دوبارہ نکالا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مٹّی کو انسانی زندگی میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔

مٹّی کے اَثرات انسان کے اَلوان واَوصاف پر:

حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بھر کے انسانوں میں جو مختلف اَلوان (رنگ) واَوصاف پائے جاتے ہیں، مثلاً کوئی سرخ ہے تو کوئی سفید، کوئی کالا ہے تو کوئی گندمی، اسی طرح کوئی گرم، سخت مزاج، بداَخلاق اور کافر ہے، تو کوئی نرم مزاج، خوش اَخلاق اور مؤمن ہے، تحت الاسباب یہ سب مٹّی کے ظاہری و باطنی اچھے بُرے اَوصاف واَثرات کا نتیجہ ہے، حدیث میں اسی بات کا انکشاف فرمایا:

"فَجَاءَ بَنُوْا اٰدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ، مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ، وَالْأَبْيَضُ، وَالْأَسْوَدُ، وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ، وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيْثُ، وَالطَّيِّبُ".

جب یہ بات مسلّم ہے کہ مٹّی کے ظاہری و باطنی اَثرات واَوصاف فطری وطبعی طور پر انسان کے اَلوان واَوصاف پر پڑتے ہیں تو یہ بھی حقیقت ہے کہ مٹّی میں موجود اچھے اَوصاف کو معلوم کر کے انھیں اختیار کیا جاسکتا ہے، تاکہ مٹّی سے بنا انسان مٹّی کے اچھے اَوصاف اختیار کر کے اچھا اِنسان اور بہترین مسلمان بن جائے۔

مٹّی کے چار بہترین اَوصاف:

اس سلسلے میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے (اِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللهِ، وَاِنْ كَانَ خَطَأً فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ) کہ مٹّی کے چار ظاہری و باطنی اَوصاف تو وہ ہیں جن کی

طرف حدیث مذکور میں اشارہ موجود ہے۔

علاوہ ازیں مٹّی کے چار بہترین اَوصاف و اَثرات ایسے ہیں جن کو اختیار کرنے کی استعداد حق تعالیٰ نے ہر انسان میں رکھی ہے، اب جو خوش نصیب بندہ ان بہترین اوصاف کو اختیار کرے گا وہ سماج کا اچھا انسان، بہترین مسلمان اور خالق و مخلوق کا محبوب بن جائے گا، حالانکہ یوں تو قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ کا مطالبہ ہم سے یہ ہے کہ ہم اپنے اندر ''عباد الرحمٰن'' کے اُن تیرہ پاکیزہ اَوصاف کو پیدا کریں جن کا تذکرہ سورۂ فرقان (۶۳ تا ۷۴) میں ہے، یا پھر مؤمنین کاملین کی اُن دس مقدّس صفات کو اپنائیں جن کا تذکرہ سورۂ احزاب (۳۵) میں ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم مٹّی کے چار بہترین اَوصاف ہی اختیار کر لیں۔ ان شاء اللہ العزیز اس سے بھی ہم دُنیوی صلاح اور اُخروی فلاح حاصل کر لیں گے۔

مٹّی کا پہلا وصف جذب وقبول کی صلاحیت:

مٹّی کا پہلا وصف جذب وقبول کی صلاحیت ہے، مٹّی عموماً اپنے اَندر پانی کو جذب کر لیتی ہے، جسے ہر کوئی جانتا اور سمجھتا ہے، پھر اس کے نتیجے میں مسبب الاسباب مُردہ زمین کو زندہ اور بنجر زمین کو آباد و شاداب کر دیتا ہے، قرآنِ کریم نے انسانیت کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرمایا کہ

﴿فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾﴾ (الروم : ۵۰)

رحمت الٰہیہ کے آثار تو دیکھیے! کہ کس طرح بارانِ رحمت سے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں، آج جو اللہ مُردہ زمین کو زندہ کرتا ہے کل وہی مُردہ اِنسان کو بھی زندہ کرنے والا ہے، اور جس طرح آسمانی بارش کو جذب وقبول کر کے مُردہ زمین زندہ ہو

جاتی ہے اسی طرح آسمانی ہدایت قبول کرنے سے مُردہ دل انسان بھی زندہ ہوجاتا ہے۔

اور جس طرح زمین کی مٹّی میں پانی کو جذب وقبول کرنے کی صلاحیت ربّ العالمین نے رکھی ہے اسی طرح زمین کی مٹّی سے بنے ہوئے ہر اِنسان کے دل میں بھی ربّ العالمین نے دین اسلام اور اس کے احکام کو قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد رکھی ہے، جسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (الشمس : ۸)

خیر وشر اور صحیح وغلط کی سوجھ بوجھ انسانی فطرت میں من جانب اللہ ودیعت کی گئی ہے، اسی کو دوسرے ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد : ۱۰)

حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کسی بھی انسان کو شتر بے مہار کی طرح ضلالت وجہالت کے جنگلوں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا؛ بلکہ رِجال اللہ اور کتاب اللہ کے ذریعے تعلیم وہدایت، خیر وشر کی طرف رہنمائی اور ان کے اَنجام سے بھی باخبر کیا۔ اسی پس منظر میں غالباً علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا:

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی زرخیز ہے ساقی

اب جو بھی بندہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ استعداد سے فائدہ اُٹھا کر مٹّی کے وصف اوّل جذب وقبول کی صلاحیت سے دین اسلام اور اس کے احکام کو قبول کرے گا حق تعالیٰ اسے بہتر اور عزیز بنادیں گے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران : ۱۳۹]

مؤمن کے ساتھ غلبے کا وعدہ ہے قرآن میں
تو مؤمن ہو کر غالب نہیں تو نقص ہے ایمان میں

ایک عبرت انگیز واقعہ:

اسلامی و اِنسانی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، من جملہ ان کے تغلق تیمور خان کا واقعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کا شغر تشریف لائے، جہاں اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی دشمن تاتاری قوم کا تسلط تھا، ایک مرتبہ تغلق تیمور خان شکار کے لیے نکلا، تب ہی اس کی ممنوعہ شکار کی زمین میں حضرت شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے رُفقاء کے ہمراہ نادانستہ طور پر جا پہنچے، اس جرم میں انھیں گرفتار کر کے قیدی بنا کر تغلق تیمور کے روبہ رو پیش کیا گیا، اس نے سخت غصّے میں کہا کہ تم ہماری زمین میں بغیر اجازت کے کیسے داخل ہو گئے؟ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم اِس ملک میں اَجنبی ہیں، اس لیے ہمیں ممنوعہ زمین کا علم نہیں تھا۔

گفتگو کے دوران جب بادشاہ کو پتا چلا کہ یہ مسلمان ہیں، تو نہایت نفرت آمیز انداز میں کہا کہ تم مسلمانوں سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ہم نے دین حق قبول نہ کیا ہوتا تو واقعی ہم کتے سے بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق سوچ میں پڑ گیا؛ مگر اس وقت وہ جلدی میں تھا، اس لیے اس نے حکم دیا کہ جب ہم شکار سے لوٹیں تو انھیں دوبارہ ہمارے پاس حاضر کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تو بادشاہ نے شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اُس وقت کہتے تھے اب سمجھاؤ کہ دین حق سے تمھاری کیا مراد ہے؟ تب شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے توفیق الٰہی سے دین اسلام اور اس کے احکام واَخلاق کو اس انداز میں پیش کیا کہ تغلق کا جذبۂ قبولِ حق بیدار ہو گیا؛ لیکن چوں کہ اس وقت وہ مکمّل سلطنت کا مالک نہیں تھا، اس لیے کہنے لگا کہ آج اگر میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو اپنی بقیہ رعایا کو راہِ راست پر نہ لاسکوں گا، لہٰذا کچھ عرصے تک انتظار

وسکوت کیجیے، جب میں اپنے باپ کے ملک وتخت کا مکمّل مالک بن جاؤں تب آپ میرے پاس تشریف لائیے، اس کے بعد بات آئی گئی ہوگئی۔

قدرتِ الٰہی سے شیخ بیمار ہوکر انتقال فرما گئے؛ لیکن انتقال سے قبل وہ اپنے بیٹے شیخ رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اس سلسلے میں وصیت وہدایت کر گئے کہ جس وقت تغلق تیمور سلطنت عظیمہ کا بادشاہ بن جائے تو تم جاکر میرا اسلام پیش کرکے بے خوف وخطر اسے مجھ سے کیے ہوئے قبولِ اسلام اور اس کے پیغام کو عام کرنے کا وعدہ یاد دِلانا۔

پھر ایسا ہی ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد جب تغلق تیمور خان سلطنت عظیمہ کا بادشاہ بن گیا تو موقع بنا کر ایک دِن شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے شیخ رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ تغلق کے پاس جا پہنچے اور والد گرامی کا سلام پیش کرکے ان سے کیا ہوا وعدہ یاد دِلایا، تو اس نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا، پھر اس نے بعد کی زندگی میں اسلام کے پیغام کو عام کیا، جس کے نتیجے میں اس زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا جو چغتائی بن چنگیز خان کی اَولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔ (کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۷۴، بحوالہ: تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/ ۹۵)

واقعی مٹّی سے بنے ہوئے دُنیا کے ہر انسان میں مٹّی کے وصف اوّل قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہے، بس ضرورت ہے اسے بیدار کرکے اس سے فائدہ اُٹھانے کی اور عملی زندگی میں آگے بڑھنے کی۔

مٹّی کا دوسرا وصف اُگانے کی صلاحیت:

مٹّی کا دوسرا وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اُگانے کی صلاحیت رکھی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پانی کو جذب وقبول کرنے کے بعد عموماً مٹّی رحمت الٰہی سے قسمہا قسم کی سبزیوں، غلوں، پھلوں، میووں اور پھولوں کو اُگاتی ہے، قرآنِ کریم میں مٹّی

کی اس صلاحیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ﴾ (ق:۹)

''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ باغیچے اور ایسی کھیتی اُگائی جو پکنے اور تیار ہونے کے بعد کاٹی جاتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں اُگانے کی صلاحیت رکھی ہے، تو جو حال زمین کی مٹّی کا ہے وہی حال قلب انسانی کا ہے کہ پانی کو جذب وقبول کرنے والی زمین کی مٹّی سے قسم ہا قسم کی سبزیاں، غلے اور میوے اُگتے ہیں، تو دین اسلام اور اس کے احکام کو قبول کرنے کے بعد قلب انسانی میں بھی خیر وصلاح اور اعمالِ صالحہ واَخلاقِ حسنہ کے مخلصانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

پھر جس طرح پانی کو جذب وقبول کرنے والی زمین سے حق تعالیٰ ایک دانے کے عوض کئی دانے اور پھل و پھول وغیرہ اُگاتے ہیں اسی طرح قبولِ حق کے بعد قلب انسانی میں پیدا ہونے والے خیر وصلاح، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے جذبات پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ایک عمل پر کئی گنا بڑھا کر اَجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام : ١٦٠)

مؤمن کے اخلاص والے عمل پر حق تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق دَس گُنا ہی نہیں بلکہ لاکھوں گُنا اور پہاڑوں کے مانند بھی ثواب عطا فرماتے ہیں، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ من جانب اللہ قلب انسانی میں خیر وصلاح کے جو پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں ہر وقت ان پر اخلاص کے ساتھ عمل کیا جائے، پھر اللہ تعالیٰ سے عمل میں خیر و برکت اور قبولیت کو مانگا جائے۔

مٹّی کا تیسرا وصف چھپانے کی صلاحیت:

مٹّی کا تیسرا وصف چھپانے کی صلاحیت ہے، یہ اپنے سینے میں مختلف قسم کے بیج کو چھپا لیتی ہے، اس کے علاوہ مختلف قسم کے ذخائر وخزائن اور دفائن کو چھپا لیتی ہے، جس کی طرف آیت قرآنیہ میں اشارہ کیا گیا:

﴿وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ﴾ (طٰہٰ : ۵۵)

مٹّی کی یہ صلاحیت مٹّی سے بنے ہوئے انسان میں بھی موجود ہے اور مطلوب بھی، دُنیا کا ہر انسان اپنے سینے میں اپنے اور دوسروں کے نہ جانے کتنے راز چھپائے رکھتا ہے جنھیں وہ عموماً لوگوں کے سامنے زندگی بھر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ لوگو! تم آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے پوشیدہ راز لوگوں سے تو چھپا سکتے ہو؛ لیکن اپنے رَب سے نہیں چھپا سکتے، اس کی شان تو یہ ہے:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (الغافر : ۱۹)

معلوم ہوا کہ جس طرح زمین کی مٹّی میں چھپانے کی صلاحیت ہے اسی طرح مٹّی سے بنے ہوئے اِنسان میں بھی چھپانے کی صلاحیت ہے، اس لیے عام حالات میں ہم سے دین حق کا مطالبہ یہی ہے کہ اپنی اَچھائیوں اور دوسروں کی بُرائیوں کو چھپاؤ۔

صاحبو! اِخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی اچھّائیوں کو چھپایا جائے اور اَخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی بُرائیوں کو چھپایا جائے اور رُسوائیوں سے بچایا جائے، مٹّی کا یہ وصف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صلحائے اُمّت میں بہت نمایاں تھا، وہ اپنی اچھّائیوں اور دوسروں کی بُرائیوں کو اس طرح چھپاتے تھے جیسے عام لوگ اپنی ذاتی بدکاریوں اور بُرائیوں کو چھپاتے ہیں۔

تم ہو آپس میں غضب ناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلے میں ایک نصیحت آموز واقعہ حضرت فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جو دین دار ہونے کے ساتھ مال دار اور دل دار بھی تھے۔ منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ایک جعلی خط تحریر کیا، جس میں اپنے لیے ایک ہزار دینار کا حکم جاری کر کے (بالکل ان ہی کی طرح دست خط کیے تھے) اُن کے خزانچی کے پاس گیا، تو وہ پڑھ کر بغیر کسی شبہ کے ایک ہزار دینار اس جعلی شخص کے سپرد کرنے لگا، اتفاق کی بات کہ عین اُسی وقت حضرت فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ کسی کام سے خود ہی وہاں آپہنچے، خزانچی نے اس شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے جعلی خط بھی دِکھا دیا، فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے خط دیکھنے کے بعد ایک بھرپور نظر اس جعلی شخص پر ڈالی، تو اس کا چہرہ زَرد ہو گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا، فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے لگے، پھر اپنے خزانچی سے فرمانے لگے کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس وقت میں تمھارے پاس کیوں آیا ہوں؟ اس نے نفی میں گردن ہلائی، تو فرمایا: میں تمھیں صرف یہ تاکید کرنے آیا ہوں کہ اِس شخص کو فوراً ایک ہزار دینار دے کر اس کی ضرورت پوری کر دی جائے، پھر کیا تھا، خزانچی نے اسی وقت ایک ہزار دینار اُس جعلی شخص کو دے دیے، تو وہ ہکا بکا رہ گیا، اس پر حضرت فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، بہ خوشی جلدی سے گھر جاؤ اور اس سے اپنی ضرورت پوری کر لو، اس شخص نے فرطِ جذبات سے فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور کہنے لگا: جس طرح آج آپ نے میری پردہ پوشی فرما کر رُسوائی سے بچا لیا، اسی طرح کل قیامت کے دِن حق تعالیٰ آپ کی بھی پردہ پوشی فرما کر رُسوائی سے بچائے۔ یہ دُعا دے کر اس نے دینار لیے اور چل پڑا۔

(مستفاد از: کتابوں کی درسگاہ میں: ۸۶، بحوالہ: المستطرف: ۲۰۶)

مٹّی کے اس بہترین وصف کو اختیار کر کے ہم بھی اچھے انسان اور بہترین مسلمان بن سکتے ہیں، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسروں کو بدلنے کے بجائے اَوّلاً اپنے اندر بدلاؤ اور انقلاب لانے کی فکر کر کے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کی جائے۔

مٹّی کا چوتھا وصف تواضع کی صلاحیت:

مٹّی کے اَوصافِ حمیدہ میں چوتھا وصف عاجزی وتواضع ہے۔ دیکھیے! مٹّی کی صورتِ حال یہ ہے کہ اپنی مسلّمہ عظمت اور قدر و قیمت کے باوجود وہ خلق خدا کے پیروں تلے پڑی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص زمین سے ڈھیلا اُٹھا کر اوپر کی جانب پھینکے تب بھی وہ نیچے کی جانب آجاتا ہے، معلوم ہوا کہ مٹّی کا فطری وصف بلندی اور بڑائی نہیں؛ بلکہ عاجزی اور تواضع ہے۔ ابلیس نے اسی لیے تو حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ سیّدنا آدم علیہ السلام خاک سے پیدا کیے گئے تھے، جب کہ اِبلیس آگ سے پیدا کیا گیا تھا، اور اس کے خیالِ فاسد میں آگ افضل تھی خاک سے، اسی لیے اس نے یہ کہا تھا:

﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الأعراف:۱۲)

میں ناری ہوں اور آدم خاکی ہے، نار میں تیزی اور بلندی ہے، جب کہ خاک میں پستی و عاجزی ہے، لہٰذا میں آدم سے افضل ہوں، اور افضل غیر اَفضل کے سامنے کیوں جھکے؟ حق تعالیٰ کو یہ تکبّر پسند نہ آیا، اسی لیے شیطان کو ہمیشہ کے لیے راندۂ بارگاہ کر دیا گیا۔ اس کے برعکس مٹّی سے بنے حضرت آدم علیہ السلام نے مٹّی کا بہترین وصف عاجزی وتواضع اختیار کیا تو حق تعالیٰ نے آپ کو ہمیشہ کے لیے قبول فرمالیا۔ ضابطۂ الٰہیہ یہی ہے کہ جو بھی بندہ اپنے تمام تر کمالات کے باوجود مٹّی کے اس وصف کو اللہ تعالیٰ کی رَضا اور خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اختیار کرے گا اور فنائیت، عاجزی، انکسار اور تواضع پیدا کرے گا اسے عظمتوں سے نوازا جائے گا۔ حدیث پاک میں اسی

ضابطے کو بیان کیا گیا:

"مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ". (مشکوٰۃ : ٤٣٤، باب الغضب والکبر)

اسی لیے کہتے ہیں کہ

مٹادے اپنی ہستی کو گر کچھ مرتبہ چاہے کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

ہمارے شاہ صاحب علّامہ سیّد عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''عاجزی میں کمال ہے اور تکبّر میں زَوال ہے''۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سچّی بات ہے کہ اَکڑنا مُردہ اور شیطان کی پہچان ہے، جب کہ جھکنا زندہ اور عبادالرحمٰن کی شان ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (الفرقان : ٦٣)

رحمٰن کے خصوصی بندے تواضع کے پیکر ہوتے ہیں۔

ایک ہدایت آموز واقعہ:

ماضی قریب کے بزرگوں میں تواضع کے پیکر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلّق حضرت مولانا عبداللہ صاحب فاروقی (خلیفہ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران ایک روز جب میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز کے لیے گیا تو ادباً واکراماً میں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جوتا اُٹھالیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس وقت خاموش رہے؛ لیکن دوسرے وقت جب ہم نماز کے لیے گئے تو جلدی سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میرا جوتا اُٹھا کر سر پر رکھ لیا، میں پیچھے بھاگا اور کوشش کی کہ جوتا لے لوں؛ مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے نہیں دیا، تب میں نے کہا کہ اللہ کے واسطے سر پر تو نہ رکھیے! فرمایا: عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہیں اُٹھاؤ گے! میں نے عہد کیا تب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جوتا سر پر سے اُتار کر نیچے رکھا۔ (کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۳۹)

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اَسلاف واَکابر ویسے ہی بڑے نہیں بن گئے، اولاً

اُنھوں نے اپنے علم وفضل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے لیے خود کو مٹایا، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں عظمتوں کے تخت پر بٹھایا۔

ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے اَسلاف واَکابر کے اَخلاق اختیار کریں، ورنہ کم از کم مٹّی کے مطلوبہ اوصافِ اَربعہ ہی اختیار کرلیں۔ اور پتھر کی طرح سخت بننے کے بجائے مٹّی کی طرح بن جائیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سالہا تو سنگ بودی دل خراشش　　آزموں را یک زمانے خاک باش
در بہاراں کہ شود سرسبز سنگ　　خاک شو، تا گل بروید رنگ رنگ

''برسوں سے تو دِلوں کو زخمی کرنے والا پتھر بن کر رہا ہے، کچھ وقت آزمانے ہی کی خاطر مٹّی بن جا۔ کیوں کہ موسمِ بہار میں پتھر کبھی سرسبز نہیں ہوتے، لہٰذا تو مٹّی بن جا، تاکہ قسم ہا قسم کی رنگت کے پھول کھل سکیں۔''

حق تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلائیں، اخلاقِ رذیلہ سے بچائیں اور اَوصافِ حمیدہ سے متصف فرمائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۴؍جمادی الاخریٰ؍۱۴۴۲ھ
مطابق: ۱۸؍جنوری؍۲۰۲۱ء
بروز: پیر (بزمِ صدیق، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۱۱)

خواب کی حقیقت اور اُس کی اَقسام واَحکام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، قَالُوْا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ٣٩٤، كتاب الرؤيا)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نبوت کے آثار میں سوائے مبشرات کے اور کچھ باقی نہ رہا، (صحابہ رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) فرمایا: اچھے اور سچّے خواب۔''

(امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "يَرَاهَا الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ أَوْ تُرَىٰ لَهُ". یعنی مبشرات سے مراد وہ اچھے اور سچّے خواب ہیں جو ایک مسلمان بندہ دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کسی کو دِکھائے جاتے ہیں)۔

خواب کی حقیقت:

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ اِنسان جب رات کو بستر راحت پر پہنچتا ہے تو عموماً ایک لطیف وخوش گوار چیز اس کے اعضائے جسم اور جوڑ جوڑ میں سرایت کرتی محسوس ہونے لگتی ہے، دِماغ پر ایک بخار سا چھا جاتا ہے اور آنکھیں بند ہونا شروع ہوجاتی ہیں، اَعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے آدمی بے خبر و بے خود ہوکر اپنے ہوش و حواس سے ماوراء کسی اور دُنیا میں پہنچ جاتا ہے، یہ کیفیت تقریباً ہر ایک شخص پر روزانہ طاری ہوتی ہے، اس کو ''نیند'' کہتے ہیں۔ اور سونے والا نیند میں جو کچھ دیکھتا ہے اُسے خواب کہتے ہیں۔

اللہ ربّ العزت جس طرح اپنے بندوں کو بہ حالت بیداری مختلف امور و مناظر دِکھا کر علوم عطا فرماتے ہیں اسی طرح کبھی بہ حالت خواب (سونے کی حالت میں) بھی مختلف امور و مناظر دِکھا کر علوم عطا فرماتے ہیں، نیند کی حالت میں بندہ من جانب اللہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے خواب (Dream) کہتے ہیں، خواب ایک ایسا عجوبہ اور تجربہ ہے جس سے ہر عام وخاص واقف تو ہے؛ لیکن کوئی بھی از خود اس پر قادر نہیں، جس طرح نیند آنا غیر اختیاری چیز ہے اسی طرح نیند میں خواب آنا بھی غیر اختیاری چیز ہے، اسی لیے کسی نے کہا ہے:

بڑی مشکل سے سُلایا ہے خود کو میں نے
اپنی آنکھوں کو تیرے خواب کا لالچ دے کر

خواب کا تعلق نیند سے ہے، اس لیے سونے والی ہر مخلوق خواب دیکھ سکتی ہے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور، اور جسے نیند نہیں آتی اُسے خواب بھی نہیں آتا۔

خواب کے متعلق ایک علمی لطیفہ:

اس سلسلے میں ایک لطیفہ منقول ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں دو شخص حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے دو سوالوں کے جواب چاہتے ہیں، ایک یہ کہ وہ کونسی چیز ہے جو قرآنِ کریم میں نہیں؟ فرمایا: جھوٹ قرآنِ کریم میں قطعاً نہیں۔ کہنے لگے: دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جسے سب دیکھ سکتے ہیں؛ لیکن رَب نہیں دیکھتا؟ فرمایا: وہ خواب ہے، جسے بندے تو دیکھتے ہیں، بندوں کا رَب نہیں دیکھتا، کیوں کہ اس کی شان یہ ہے کہ ﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) وہ سونے اور اونگھنے سے پاک ہے۔ یہ سن کر دونوں سائل لاجواب ہوگئے۔

خواب کی حیثیت:

الغرض خواب اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے دیکھتے ہیں، مجموعی طور پر ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اَنبیائے کرام علیہم السلام، ان کے خواب خیالی نہیں؛ بلکہ وحیِ الٰہی ہوتے ہیں، اس لیے ان کا ہر خواب سچا، اچھا، یقینی اور دلیل شرعی شمار ہوتا ہے، اَنبیائے کرام علیہم السلام کو خواب میں بھی کوئی حکم دیا جائے تو اس پر عمل ضروری ہوتا ہے، جیسے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم خواب ہی میں ملا تھا، قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (الصٰفّٰت:۱۰۲)

(۲) صالحین، ان کے خواب عموماً سچے اور اچھے ہوتے ہیں؛ لیکن قطعی اور

دلیل شرعی نہیں ہوتے، ان کے خواب قواعد شرعیہ کے مطابق ہوں تب تو قبول ہوں گے ورنہ محتاجِ تعبیر یا مردود ہیں۔

(۳) حضرات اَنبیائے کرام علیہم السلام اور صالحین کے علاوہ عام اِنسانوں کے خواب صحیح وغلط، اچھے و بُرے، سچّے اور جھوٹے ہر طرح کے ہو سکتے ہیں، عموماً سچّے لوگوں کے خواب سچّے اور جھوٹوں کے خواب جھوٹے ہوتے ہیں، تاہم اچھے خواب باعث تسلی وسرور تو ہوں، باعث غرور نہ ہوں؛ اس لیے فن تعبیر الرؤیا کے امام سیّدنا محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: "الرُّؤْيَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ". ''اچھے اور سچّے خواب سے تسلی وخوشی تو ہو؛ لیکن دھوکہ نہ ہو۔'' (اصلاحی خطبات: ۵/۸۷)

خواب کی تین قسمیں:

اس پس منظر میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ خواب نہ مطلقاً خیالِ باطل ہے اور نہ ہی کسی کے لیے معیارِ کامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض خواب خیالات ہیں، اور بعض خواب شیطانی وَساوِس واثرات ہیں، تو بعض خواب من جانب اللہ مبشرات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمّت میں فن تعبیر الرؤیا کے امام حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے خواب کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) خیالاتِ نفسانی (۲) وَساوِسِ شیطانی (۳) مبشرات و اِلہاماتِ ربّانی۔

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ سِيْرِيْن: "وَأَنَا أَقُوْلُ: "الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: حَدِيْثُ النَّفْسِ، وَتَخْوِيْفُ الشَّيْطَانِ، وَبُشْرٰى مِنَ اللهِ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ص۳۹٤)

ان تینوں قسموں کی تفصیلات مع احکام حسب ذیل ہیں۔

خواب کی پہلی قسم اور اس کا حکم:

خواب کی پہلی قسم خیالِ نفس ہے، جس میں خیالاتِ نفس خواب کی صورت

اختیار کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دِن بھر جن خیالات میں کھویا رہتا ہے، یا جن خیالات کو لے کر سوتا ہے اس کے دِل و دِماغ پر اُن ہی خیالات کا نقشہ چھایا رہتا ہے، اس لیے وہی چیزیں بعض اَوقات خواب میں متشکل ہو کر نمودار ہوتی ہیں، خواب کی اس قسم کو خیالاتِ نفسانی کہتے ہیں۔

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صلحاء نے چوں کہ خواہشاتِ نفسانی کو مرضیاتِ ربانی پر قربان کر دیا تھا اس لیے ان کے خیالاتِ نفسانی نہایت پاکیزہ ہوا کرتے ہیں، لہٰذا اُن کے اَکثر خواب از قبیل مبشرات ہوتے ہیں۔

اس کی دلیل اَذان کی ابتدا کا واقعہ ہے، ہجرتِ مدینہ کے بعد جب نماز باجماعت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اجتماعی طور پر غور وفکر اور مشورہ فرمایا، جس میں مختلف آراء تھیں؛ لیکن ان پر عمل کرنے میں یا تو تشبّہ بالغیر کی صورت پیش آسکتی تھی یا دُشواری تھی، اس لیے کسی کی رائے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کرنے کے بجائے مزید غور وفکر کی ترغیب دی، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی فکر وخیال میں تھے کہ اس دوران سیّدنا عبداللہ بن زید بن عبدربہ اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہما نے اَذان کے متعلّق خواب دیکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اُنھوں نے آکر بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ إِنْ شَاءَ اللهُ". (أبوداود، مشكوٰة: ص٦٤ / باب الأذان)

علّامہ اِقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی کی شان اور خواب کے متعلّق کہا تھا کہ

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر　　خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نَو کی تصویر
اور جب بانگِ اَذاں کرتی ہے بیدار اُسے　　کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دُنیا کی تعمیر

اس کے برعکس جن لوگوں کے نفسانی جذبات وخیالات گندے ہوتے ہیں

عموماً ان کے خواب بھی گندے اور نا قابل اعتبار وفضول ہوتے ہیں، اسی لیے مثل مشہور ہے کہ ”بلّی کے خواب میں چھیچھڑے۔“

ایک واقعہ:

اس سلسلے میں ایک واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ مہدی کے دورِ حکومت میں حضرت شریک بن عبداللہ قاضی اور جسٹس تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مہدی نے علی الصباح ان کو طلب کیا اور قتل کا حکم سنا دیا، قاضی صاحب نے حیران ہوکر وجہ دَریافت کی تو مہدی کہنے لگا کہ بات یہ ہے کہ میں نے کل رات یہ خواب دیکھا کہ تم میرا بستر روندتے ہو اور مجھ سے منھ موڑتے ہو، میں نے جب اس کی تعبیر معلوم کی تو مُعبّر نے کہا کہ قاضی شریک ظاہراً تو آپ کی اِطاعت کرتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ آپ کے مخالف ہیں، اس تعبیر کو سن کر میں نے تمھارے قتل کا فیصلہ کرلیا ہے۔

اس پر قاضی شریک فرمانے لگے: اللہ کی قسم! نہ یہ خواب دیکھنے والا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام سے بہتر ہے، نہ اس کی تعبیر بیان کرنے والا سیّدنا یوسف علیہ السلام سے بہتر ہے، پھر کیا آپ ایسے فضول خوابوں کی بنیاد پر اپنے لوگوں کی گردنیں اُڑانا چاہتے ہیں؟ جواب سن کر خلیفہ مہدی شرمندہ ہوا اور قتل کے ارادے کو ملتوی کردیا۔
(اعتصام: ۳۵۳/۲، از: تراشے: ۱۰۵)

اس قسم کے خواب نیک لوگوں کے لیے مبشرات ہیں اور بُرے لوگوں کے لیے فضولیات ہیں۔

خواب کی دوسری قسم اور اس کا حکم:

خواب کی دوسری قسم وَساوِس ہیں، جو شیطانی اثرات کے عکاس اور نتیجہ ہوتے ہیں، انسان کو پریشان کرنے کے لیے شیطان حق تعالیٰ کے دیے ہوئے

تصرفات کا استعمال کر کے خواب میں انسان کے ساتھ کھیلتا ہے اور اثرات ڈالتا ہے، جس کی وجہ سے انسان کو بُرے اور خوف ناک خواب نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ احتلام بھی شیطان کی اسی حرکت کا اثر اور نتیجہ ہے۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۴/ ۳۴۷)

خواب کی اس قسم کو وَساوِسِ شیطانی کہتے ہیں۔ اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ بائیں طرف تین بار تھتکار دے۔ اور دوسرا حکم یہ ہے کہ تین بار شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ (اعوذ باللہ یا آیت الکرسی پڑھے)

تیسرا حکم یہ ہے کہ اپنی اُس کروٹ کو بدل دے جس پر سویا تھا۔ اور چوتھا حکم یہ ہے کہ وہ خواب کسی سے بیان نہ کرے۔ حدیث پاک میں ایسے خواب کے متعلّق ارشادِ نبوی ہے:

"فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثًا، وَيَسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ثَلَاثًا، وَيَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِيْ كَانَ عَلَيْهِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٩٤)

حدیث پاک میں ہے کہ ایک دیہاتی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ایک خوف ناک خواب بیان کرنے لگا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کاٹ دیا گیا ہے، یہ سن کر حضور ﷺ ہنس دیے، پھر فرمایا: جب تم میں سے کسی کے ساتھ شیطان کھلواڑ کرے یا شرارت کرے (جس کی وجہ سے بُرا خواب دیکھے) تو اسے چاہیے کہ وہ اس خواب کو لوگوں کے سامنے بیان نہ کرے۔

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! رَأَيْتُ فِيْ الْمَنَامِ كَأَنَّ رَأْسِيْ قُطِعَ، قَالَ: فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ: "إِذَا لَعِبَ الشَّيْطَانُ بِأَحَدِكُمْ فِيْ مَنَامِهِ، فَلَا يُحَدِّثْ بِهِ النَّاسَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٩٥)

ان احکام پر عمل کرنے والے کو ایسے فضول یا خوف ناک خواب سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ حدیث میں ہے: "فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ". (متفق علیه، مشکوٰة: ۳۹٤)

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ اصل اعتبار بیداری کی حالت میں کیے ہوئے نیک اعمال کا ہے، اس لیے نیک آدمی اگرچہ بُرے خواب دیکھے اسے ان شاء اللہ کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس کے برعکس بُرا آدمی کتنے ہی اچھے خواب دیکھ لے اسے کوئی نفع نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ بیداری کی حالت میں اعمالِ صالحہ اور اپنی اِصلاح کی فکر نہ کرے۔ اس لیے محض خواب کے پیچھے پڑنے کے بجائے اصلاحِ احوال اور نیک اعمال کی فکر واہتمام کرنا چاہیے۔

خواب کی تیسری قسم اور اس کا حکم:

خواب کی تیسری قسم وہ ہے جسے اِلہامات اور مبشراتِ ربّانی کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ سونے والا جتنے بھی اچھے خواب دیکھتا ہے وہ من جانب اللہ ہیں۔

"الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللهِ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۳۹٤)

دوسری ایک روایت میں اچھے خواب کو آثارِ نبوت اور مبشرات قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت اور وحی کا سلسلہ تو بند ہوگیا، اب من جانب اللہ بشارت اور خوش خبری کا ذریعہ خواب ہی رہ گیا، اس اعتبار سے اچھے اور سچّے خواب کو آثارِ نبوت قرار دیا گیا، چنانچہ فرمایا:

"لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، قَالُوْا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ". (رواه البخاري، مشکوٰة : ۳۹٤)

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھے اور سچّے خواب عموماً نیک لوگوں کو ہی آتے ہیں، اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا کہ مؤمن بندے کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "إِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ تَكَدْ تَكْذِبُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ، وَرُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّأَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ، وَمَا كَانَ مِنَ النُّبُوَّةِ فَإِنَّهُ لَا يَكْذِبُ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ۳۹٤)

''جب زمانہ قیامت سے قریب ہوگا تو مؤمن کا خواب جھوٹا نہ ہوگا۔'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ قربِ قیامت میں مؤمن کو بہ کثرت خواب دِکھائی دیں گے، بالخصوص حضرت مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں مؤمن کا خواب سچا ہوگا۔ (توضیحات:۶/۶۴۱)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کا موت کا وقت جب قریب ہوگا تو آخری عمر میں اس کے خواب سچّے ہوں گے۔

اور تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ جب صبح کا وقت قریب ہوگا تو مؤمن کا اس وقت کا خواب سچا ہوگا۔ اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "أَصْدَقُ الرُّؤْيَا بِالْأَسْحَارِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ۳۹۷)

''سحر کے وقت دیکھے جانے والے خواب سچّے ہوتے ہیں۔'' (مظاہر حق جدید: ۴/۳۴۶، توضیحات:۶/۶۴۱)

بہر کیف حدیث پاک کے عموم سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے خواب سچّے اور اچھے ہوتے ہیں۔ فاسق و فاجر شخص کے خواب عموماً خیالاتِ نفسانی اور وَساوِسِ شیطانی کے قبیل سے ہوتے ہیں، تو نیک مؤمن بندے کے خواب عموماً مبشرات اور اِلہاماتِ ربّانی کے قبیل سے ہوتے ہیں۔

اس کی تائید اِس ارشادِ ربّانی سے بھی ہوتی ہے:

﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ (یونس : ٦٤)

جس میں حق تعالیٰ نے صالحین اور مؤمنین کاملین کے لیے دارین کی خوش خبری دی ہے۔ علمائے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس آیت کریمہ میں آخرت کی بشارت سے مراد موت کے وقت یا قبر سے اُٹھنے کے وقت فرشتوں کا جنّت کی خوش خبری دینا ہے۔ اور دنیا کی بشارت کے متعلّق ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سچّے اور اچھے خواب ہیں، جو ایک مسلمان خود دیکھتا ہے یا اس کے متعلّق کسی اور کو دِکھائے جاتے ہیں (جن میں مؤمن کے لیے خوش خبری ہوتی ہے) كما ورد في البخاري عن أبي هريرة رضي اللهُ عنه. (مستفاد از: معارف القرآن)

مؤمن کا ہر خواب اچھّا ہوتا ہے:

اور جب یہ حقیقت ہے تو اس کا صاف مطلب یہ بھی ہے کہ مؤمن کامل کا کوئی خواب بُرا نہیں ہوتا، جس طرح کامل مؤمن کا ہر خواب سچا ہوتا ہے اسی طرح اس کا ہر خواب خواہ وہ کیسا بھی ہو اچھّا ہی ہوتا ہے، کیوں کہ مؤمن کے خواب کو حدیث پاک میں نبوت کا حصّہ قرار دیا گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نبوت کا سلسلہ جاری تھا تو وحی کا سلسلہ بھی باقی تھا، اب نبوت کا سلسلہ تو بند ہو گیا؛ لیکن حق تعالیٰ نے مبشرات یعنی اچھے اور سچّے خواب کا سلسلہ باقی رکھا ہے، جس طرح نبیوں کو وحی کے ذریعے اچھّائی یا بُرائی پر مطلع کر دیا جاتا تھا اسی طرح نیک بندوں کو خواب کے ذریعے اچھّائی یا بُرائی پر مطلع کیا جاتا ہے، اسی لیے مؤمن کامل کا خواب اچھّا بھی ہوتا ہے اور سچا بھی ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کی بیداری کی مصیبت کو خواب میں منتقل فرما دیتے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ

وہ بندۂ مؤمن پریشان کن خواب سے گھبرا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ پریشان کن خواب بھی اس بندۂ مؤمن کے حق میں اَنجام کار اچھا ثابت ہوتا ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگوں میں گزرے ہیں، منقول ہے کہ آپ کی توبہ کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے خواب کو بنادیا، وہ اس طرح کہ ابتداءً وہ شراب و شباب میں مشغول رہتے تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نہایت حسین باندی تھی، جس سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بہت خوب صورت بیٹی پیدا ہوئی، آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے بھی بڑی محبّت تھی؛ مگر اللہ تعالیٰ کی شان کہ صرف دو سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا، آپ رحمۃ اللہ علیہ پھر شراب وشباب میں مشغول ہوگئے۔

اسی دوران ایک مرتبہ شب براءۃ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت ہی خوف ناک خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہوگئی، لوگ اپنی قبروں سے نکل کر میدانِ حشر کی جانب جارہے ہیں، اور میں بھی ان میں ہوں، اِتنے میں میں نے اپنے پیچھے ایک نہایت خطرناک اژدہا دیکھا جو میری طرف بڑھ رہا تھا، میں اس کے ڈر سے خوف زدہ ہوکر تیزی سے بھاگنے لگا، سامنے ایک بڑے میاں نظر آئے، میں نے اُنھیں سلام کر کے مدد طلب کی تو اُنھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! میں کمزور آدمی تمھاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟ لیکن تم آگے بھاگو! شاید نجات کا کوئی راستہ مل جائے، آگے ایک پہاڑ کے ٹیلے پر بہت سے بچّے ملے، جن میں میری وہ دو سالہ بچّی بھی تھی، اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو جلدی سے میں اس سے لپٹ گیا، اس نے اژدہے کو اشارہ کیا تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا، پھر اس بچّی نے مجھے بٹھایا اور خود میری گود میں آکر بیٹھ گئی اور اپنے دائیں ہاتھ کو میری ڈاڑھی میں پھیرتے ہوئے کہنے لگی کہ

﴿اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ (الحدید : ۱۶)

ابّا جی! ''کیا اب تک ایمان والوں (میں سے جولوگ گناہوں میں مبتلا ہیں ان) کے لیے وقت نہیں آ گیا کہ ان کے دِل اللہ تعالیٰ کی یاد اور قبولِ حق کے لیے جھک جائیں؟''

بچّی کی بات سن کر آپ رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے، پھر جب نیند سے آنکھ کھلی تو اللہ تعالیٰ نے دِل کی آنکھیں بھی کھول دیں اور آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سچّی توبہ کر لی۔ اس طرح ایک خواب کو اللہ تعالیٰ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے لیے توبہ کا ذریعہ بنا دیا۔ (مستفاد از: فضائل صدقات: ۶۰۷)

خواب حبیب ولَبیب ہی کے سامنے بیان کریں:

الغرض مؤمن بندے کے خواب عموماً مبشرات و اِلہامات یعنی سچّے اور اچھے ہوتے ہیں، ایسے خواب کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ہر کسی کے سامنے بیان نہ کریں؛ بلکہ سچّے اور اچھے لوگوں کے سامنے بیان کریں، حدیث میں ہے:

"لَا تُحَدِّثْ إِلَّا حَبِيْبًا أَوْ لَبِيْبًا". (الترمذي، مشكوٰة : ۳۹۶)

کسی ایسے شخص کے سامنے بیان کرو جو محبوب و خیر خواہ ہو، یا لبیب یعنی عاقل و عالم اور خواب کی تعبیر کا ماہر ہو، تا کہ وہ اس کی اچھّی تعبیر بیان کر سکے، کیوں کہ جب تک خواب کی تعبیر بیان نہیں کی جاتی وہ خواب پرندے کے پَر پر ہوتا ہے (نقصان دہ نہیں ہوتا) البتہ جب اس کی تعبیر بیان کر دی جاتی ہے تو پھر بہ تقدیرِ الٰہی اس کے مطابق فیصلہ ہو جاتا ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں تمام حقائق سمجھا کر اپنا بنالیں۔ آمین یا ربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۱۲ر جمادی الاخریٰ ر ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲۶ر جنوری ر ۲۰۲۱ء

بروز: منگل (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۲)

جمہوری نظامِ حکومت کی خوبیاں اور خامیاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِنِ الأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ، وَيُحِبُّوْنَكُمْ، وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ، وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ، وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ، وَيُبْغِضُوْنَكُمْ، وَتَلْعَنُوْنَهُمْ، وَيَلْعَنُوْنَكُمْ، قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَ فَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ؟ قَالَ: لَا، مَا أَقَامُوْا فِيْكُمْ الصَّلٰوةَ، لَا، مَا أَقَامُوْا فِيْكُمْ الصَّلٰوةَ، أَلَا! مَنْ وَلِيَ عَلَيْهِ وَالٍ، فَرَاٰهُ يَأْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللهِ، فَلْيَكْرَهْ مَا يَأْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللهِ، وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۳۱۹، كتاب الإمارة)

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے حاکموں میں بہترین وہ ہیں (جن کے

واقعی کمالات اور اَوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بے غرض ہوکر) تم ان سے محبّت کرتے ہو، اور وہ (بھی تم سے اس لیے) محبّت کرتے ہیں (کہ تم اللہ پاک کا کنبہ ہونے کی وجہ سے قابل محبّت ہو) اور تم ان (کی حسن کارکردگی اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے ان) کے لیے دُعائیں کرتے ہو تو وہ بھی تمھارے لیے دعائیں کرتے ہیں، اور تمھارے بدترین لیڈر وہ ہیں کہ تم ان سے بغض وعداوت رکھو اور وہ تم سے، اور تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر، حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اس صورت میں ہم ان سے کیے ہوئے عہدِ وفاداری (بیعت سیاست) توڑ نہ ڈالیں؟ (یعنی ایسے حاکموں کے خلاف بغاوت واحتجاج کرکے اُنھیں معزول نہ کردیں؟) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کریں، نہیں جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کرین (ان کے خلاف اعلانِ بغاوت اور ترکِ وفا جائز نہیں، لیکن اگر وہ حاکم ولیڈر نماز جو دین کا اہم ستون ہے اس کے ساتھ بے وفائی کرے تو ایسے حاکم کے ساتھ وفاداری ضروری نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا) خبردار! جس شخص کو تم پر (من جانب اللہ) حاکم مقرّر کیا جائے اور تم اس کا کوئی ایسا فعل دیکھو جو خدا کی نافرمانی پر مبنی ہو تو اس گناہ کے فعل کو بُرا سمجھنا چاہیے (بلکہ حسب استطاعت قانون کے دائرے میں رہ کر اس کا اِظہار بھی کرنا چاہیے، کہ اسلام نے ضمیر کی آزادی کو نہ صرف معاشرہ اور ملک کے ہر فرد کا حق قرار دیا ہے بلکہ حسب استطاعت ہر ایک کی ذمّے داری قرار دیا ہے، اور اس میں کوتاہی برتنے کو ایمان کی کمزوری قرار دیا ہے، چنانچہ دوسری روایت میں "وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ" (مسلم، مشکوۃ: ۴۳۶) فرمایا، اس کے برخلاف جو اس حق کا استعمال بے خوف ہوکر کرتا ہے اسے "أَفْضَلُ الْجِهَادِ" (ترمذی، مشکوۃ: ۴۲۲) فرمایا ہے، لیکن حاکم کی اطاعت وفرماں برداری سے (محض اس

کے گناہ کی وجہ سے) درست بردار نہ ہونا چاہیے۔"

ہندوستان جنّت نشان:

اللہ ربّ العزت نے ہمارے وطن عزیز ہندوستان کو یہ شرف عطا فرمایا ہے کہ ابوالبشر سیّدنا آدم علیہ السلام کو بتقاضائے حکمت جنّت سے سرزمین ہند پر اُتارا، ایک حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "نَزَلَ آدَمُ بِالْهِنْدِ". (رواه الطبراني، كنز العمال، ابن عساكر وغيره)

جس کی برکت سے ہندوستان جنّت نشان بن گیا، اس کی مٹّی میں نزولِ آدم علیہ السلام کے بعد جنّت کی خوشبو مل گئی، تو ہندوستان کی آب و ہوا بھی معتدل اور خوش گوار بن گئی، نیز یہاں تینوں موسم مکمّل ہیں۔

یہاں اکثریت کی فطرت میں عام طور پر ایک دوسرے کے لیے اُنسیت، اُلفت اور محبّت بھی ہے، غالباً اِن ہی وجوہات کے پیشِ نظر ہندوستان شاہانِ عالم اور اقوامِ عالم کا مرکزِ توجّہ بنا رہا، خود مسلمان حکمرانوں نے بھی پہلی صدی سے انگریزوں کی آمد تک بڑی شان وشوکت کے ساتھ موجودہ جمہوریت کے طرز پر نہیں؛ بلکہ اسلام کے عدل واعتدال پر مبنی نظامِ خلافت کے مطابق حکومت کر کے ہندوستان کو عروج دے کر حجازِ مقدّس اور ملک شام کے بعد سارے جہاں سے اچھّا اور سونے کی چڑیا بنا دیا۔

عروج کے بعد دو مرتبہ بنی اسرائیل کو زوال ہوا:

قانونِ فطرت ہے کہ اس دنیا میں ہر عروج وکمال کے بعد زوال ہے، حکومتوں، ملکوں اور ان کے باشندوں کے سلسلے میں بھی یہی نظامِ فطرت ہے، جس کا

ایک اہم سبب بندوں کے بُرے اعمال ہیں، جب اعمال اچھے ہوتے ہیں تو احوال بھی اچھے ہوتے ہیں، اس کے برخلاف جب اعمال بگڑتے ہیں تو احوال بھی بگڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ جیسے سورج کو عروج وکمال دے کر زوال سے اور دِن کو رات سے بدل دیتا ہے اسی طرح زمانے کے اچھے احوال وایام کو بُرے احوال وایام سے بدل دیتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران : ۱۴۰)

''ہم زمانے کے احوال وایام کو لوگوں کے مابین بدلتے رہتے ہیں۔'' کبھی غالب کو مغلوب اور کبھی مغلوب کو غالب کر دیتے ہیں، کسی حاکم قوم کو محکوم اور محکوم قوم کو حاکم بنا دیتے ہیں، اس کی عبرت انگیز مثال اولادِ انبیاء یعنی بنی اسرائیل ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی خصوصی نعمتوں، عروج اور عزّتوں سے نوازا تھا، لیکن جب ان میں مجموعی طور پر دنیا کی محبّت اور آخرت کی طرف بے رغبتی بڑھ گئی، جس کے سبب ان کے ایمان واخلاق میں کمزوری اور باہمی اختلاف جیسی بُرائیاں اور خامیاں پیدا ہو گئیں تو ربّ العالمین نے انھیں عزّت کی سربلندی سے قعرِ ذلّت میں دھکیل دیا۔

قرآنِ پاک کہتا ہے کہ یہ معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ بنیادی اور مجموعی طور پر دو مرتبہ ہوا:

﴿وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِي الْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝٤﴾ (بني إسرائيل:٤)

''اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو قطعی طور پر بتا دیا تھا کہ تم زمین میں ضرور دو مرتبہ فساد کرو گے اور (اطاعت الٰہی سے) بڑی سرکشی برتو گے۔''

اس کی تفصیل میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ بھی

ہے کہ ایک مرتبہ جالوت کو مسلط فرما کر تو دوسری مرتبہ بخت نصر کو، دونوں ہی نے بنی اسرائیل کے بے شمار اَفراد کو ذلّت و ہلاکت میں مبتلا کیا، حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ﴾ [بني اسرائيل:۷]

''اگر تم اچھے کام کرو گے تو خود اپنے ہی نفع کے لیے کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو ان کا نقصان بھی تم ہی کو بھگتنا ہے۔''

صاحبو! یہ آسمانی و الٰہی قانون و ضابطہ انفرادی و اجتماعی طور پر ہر دور اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے کہ اچھے اعمال کا ثمرہ اچھے احوال ہیں اور بُرے اعمال کا ثمرہ بُرے احوال ہیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اُمّت محمدیہ پر دہرائی گئی:

یہی وجہ ہے کہ حضرات موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی شریعت کی مخالفت کے بعد پہلے جو حال بنی اسرائیل کا ہوا تھا شریعت محمدیہ سے غفلت کے بعد اُمّت محمدیہ کا بھی وہی حال بعد میں ہوا، عہد نبوت و دورِ خلافت کے بعد جب مجموعی طور پر اس اُمّت میں بھی دنیا کی محبّت، آخرت سے بے رغبتی، ایمان و اخلاق میں کمزوری اور باہمی اختلافات جیسی خرابیاں پیدا ہوئیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ اس اُمّت میں بھی دہرائی گئی اور اس اُمّت کو بھی مجموعی طور پر دو مرتبہ عروج و کمال سے زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی مرتبہ تاتاریوں کو اللہ تعالیٰ نے مسلط فرمایا اور دوسری مرتبہ انگریزوں کو، دونوں ہی مرتبہ اُمّت کے بے شمار افراد ذلّت و ہلاکت میں مبتلا ہوئے، جس کی داستانِ ظلم و ستم بڑی دِل خراش اور ناقابل فراموش ہے۔

ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے:

لیکن یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جس طرح خون گرتا ہے تو جم جاتا ہے اسی

طرح ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے؛ کیوں کہ جب مظلوموں کی آہیں فرشِ زمیں سے عرشِ بریں کو پہنچتی ہیں تو بعض اوقات آسمانی و سلطانی آفتیں نازل ہو کر ظالم حکومتوں کو تہس نہس کر دیتی ہیں، یا پھر بعض اوقات من جانب اللہ مظلوموں میں وہ ہمت وحوصلہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ظلم وستم کے خاتمے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں، اس کے بعد اِس فرمانِ باری کا مظاہرہ ہوتا ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران : ۱۴۰)

''پھر ہم دنیا کے ایام واحوال بدلتے ہیں۔'' پھر مغلوب ومظلوم کو غالب اور محکوم کو حاکم بنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ انگریز کے ظالمانہ وغاصبانہ تسلط کے ایک طویل عرصے کے بعد ایسا ہی ہوا، عالم اسلام بالخصوص جنّت نشان ہندوستان کے مسلمان یہاں کے دیگر باشندگان کو لے کر اپنے حکمرانوں اور رہنماؤں کے ہمراہ اِس عزم کے ساتھ کھڑے ہوئے کہ

سوچا ہے کفیل اب کچھ بھی ہو ہر حال میں اپنا حق لیں گے
عزّت سے جیے تو جی لیں گے یا جامِ شہادت پی لیں گے

یہ سلسلہ نواب سراج الدولہ رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ حکومت میں ۱۷۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتوائے جہاد کے بعد جب عروج پر پہنچا تو ملک کی آزادی کے لیے تقریباً باون ہزار علماء اور ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کے علاوہ بے شمار ہندوستانیوں نے اپنی جان کا نذرانہ بہ زبانِ حال یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ

وطن کی اُلفت مر کے بھی دِل سے نہ نکلے گی
میری مٹّی سے خوشبوئے وَفا آتی رہے گی

ملک میں جمہوری دستور کا نفاذ:

بالآخر مجاہدین وطن کی قربانیاں رنگ لائیں اور مؤرخہ: ۲۸ر رمضان المبارک ر ۱۳۶۶ھ مطابق: ۱۵ر اگست ر ۱۹۴۷ء بروز جمعہ وطن عزیز انگریز کی غلامی سے الحمدللہ آزاد ہو گیا۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دورِ حکومت سے انگریزوں سے آزادی تک اور اس کے بعد کے دور میں بھی یہاں مختلف مذاہب وعقائد کو ماننے والے عموماً باہم شیر وشکر کی طرح رہتے چلے آئے اس لیے حکومت کے لیے ایک ایسے دستور کی ضرورت تھی جس میں بلا کسی تفریق مذہب وقومیت سب کو آزادی و ترقی کے برابر حقوق حاصل ہوں، جس کے لیے آزادی کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان میں حکومت کرنے کے لیے خود اپنا ہی بنایا ہوا ایک ایسا آئین ودستور ہو جس کو روبہ عمل لانے کی صورت میں ملک کے ہر باشندے کو مذہبی، سیاسی اور تعلیمی وغیرہ ہر اعتبار سے مکمّل آزادی حاصل ہو اور کسی کو بھی اپنے ہی ملک میں (دیگر بعض ممالک کی طرح) دوسرے نمبر کا شہری بن کر نہ رہنا پڑے، اس مقصد کے تحت شروع میں پارلیمانی انتخاب کرایا گیا، جس میں تقریباً پونے چار سو اَراکین منتخب ہوئے، جن میں ۳۵ ممبران مسلمان تھے، ان پونے چار سو اَراکین نے دستور سازی اور وضع آئین وقوانین کے لیے تیرہ کمیٹیاں تشکیل دیں، ان تیرہ کمیٹیوں نے اپنے اپنے مسودات تیار کرنے کے بعد پھر ایک سات رُکنی کمیٹی تشکیل دی، جس میں حضرت مولانا حسرت موہانی رحمۃ اللہ علیہ بھی داخل تھے، اس کے صدر ڈاکٹر بھیم راؤ بابا صاحب امبیڈکر متعین ہوئے، اس کمیٹی نے تیرہ کمیٹیوں کے مسودات کا بہ خوبی جائزہ لیا، مسلسل دو سال، گیارہ مہینے اور اٹھارہ دِنوں کی محنت اور غور وفکر کے بعد ایک نیا مسودہ تیار کر کے پارلیمنٹ میں پیش کیا، جس کو مناسب تصحیح وتنقیح اور حذف واِضافے کے بعد منظور کر کے مؤرخہ: ۲۶ر

رجب المرجب ۱۳۶۹ھ مطابق: ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء بروز جمعرات نافذ کرنے کا اعلان کر دیا گیا کہ اب ملک میں نظامِ حکومت اس جمہوری دستور کے مطابق چلے گا، جس کی پابندی ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔

جمہوری نظامِ حکومت کی خوبیاں:

اُس دِن سے ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت کا آغاز ہوا اور ہر سال ۲۶ رجنوری کو بھی ۱۵ راگست کی طرح اسے ملکی تہوار اور یادگار کے طور پر منایا جانے لگا۔ جمہوری نظامِ حکومت اسلامی نظامِ حکومت وخلافت کے قائم مقام تو نہیں ہے؛ البتہ اپنی چند خصوصیات وخوبیوں کے سبب اُسے اسلامی نظامِ حکومت وخلافت کے مشابہ اور قریب کہہ سکتے ہیں۔

مثلاً اس کی پہلی خصوصیت اور خوبی یہ ہے کہ جمہوری نظامِ حکومت کی بنیاد وہ جمہوری دستور وآئین ہے جس کا اہم مقصد حقوقِ انسانی کی حفاظت ہے، واقعہ یہ ہے کہ ملک میں نظامِ حکومت جمہوری دستور کے مطابق قائم ہو تو یہاں کے ہر باشندے کو آزادی وعزّت کے ساتھ زندگی گزار کر ملکی مصنوعات وخدمات سے مکمّل فائدہ اُٹھانے؛ بلکہ مذہبی، تعلیمی، سماجی ومعاشی اور سیاسی اعتبار سے ترقّی حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اسلامی ہدایات وتعلیمات میں بھی حقوقِ انسانی کی حفاظت و رعایت پر بہت زور دیا گیا ہے، حتیٰ کہ ہر ایک کو مذہبی وفکری آزادی بھی عطا فرمائی گئی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِ﴾ (البقرة : ٢٥٦)

اور بہ حیثیت انسان ہر ایک کو قابلِ احترام قرار دے کر کامیابی وترقّی کے

مواقع فراہم کیے گئے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ (بني إسرائيل : ۷۰)

جمہوری نظام کی دوسری خصوصیت وخوبی یہ ہے کہ اس میں اقتدار کی باگ ڈور کسی ایک یا چند افراد کے ہاتھ میں نہیں؛ بلکہ عوام کی اکثریت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اسی لیے جمہوریت کی مشہور تعریف یہ ہے کہ ''عوام کی ایسی حکومت جسے عوام نے بنایا ہو اور عوام ہی کے لیے بنایا ہو۔''

جمہوری ملک میں عام رعایا کو کسی بھی خوف یا لالچ کے بغیر یہ اختیار اور مکمّل آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند کا لیڈر چنیں۔ اگر واقعی جمہوری ملک کی اکثر عوام اپنے ووٹ کی شکل میں اس اختیار کا صحیح استعمال کرے، پھر آج کل کی طرح ای۔وی۔ایم۔ میں کسی قسم کی جعل سازی وغیرہ نہ ہو، تو عام لوگ اپنی پسند کے لیڈروں کو منتخب کر کے مسند اقتدار پر بٹھا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات و ہدایات بھی یہی ہیں کہ لوگوں کی امامت و قیادت ایسے ہی اَفراد کے حوالے کی جائے جنھیں لوگ ان کے اوصافِ حمیدہ اور حسن کارکردگی وغیرہ کے سبب پسند کرتے ہوں۔

چنانچہ حدیث مذکور میں ان قائدین کو بہترین فرمایا گیا جنھیں لوگ پسند کرتے ہیں اور ان کے لیے دُعائیں کرتے ہیں، فرمایا:

"خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ، وَيُحِبُّوْنَكُمْ، وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ، وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ".

اس کے برخلاف اُس قیادت و امامت کو قبول اور پسند نہیں کیا گیا جس کو کسی

واقعی شرعی عیب و بُرائی کے سبب لوگ ناپسند کرتے ہوں۔ حدیث پاک میں مروی ہے کہ تین قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، ان کی نماز بھی قبول نہیں فرماتے، ان میں سے ایک بھگوڑا غلام ہے، یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے۔ دوسرے بداخلاق بیوی، جو شوہر کو ناراض کر کے رات گزارے، حتیٰ کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو جائے۔ اور تیسرے وہ امام جسے قوم اس کی کسی شرعی عیب و بُرائی مثلاً بدعت و جہالت یا فسق و بدکاری کے سبب پسند نہ کرے۔ فرمایا:

"رَجُلٌ أَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ". (رواه الترمذي: باب ماجاء فيمن أمّ قوما وهم له كارهون)

صاحبو! جب اسلام نے مسجد کے ایسے امام کو پسند نہیں کیا جسے اکثریت ناپسند کرتی ہو، تو پھر ملک کی ایسی قیادت کو کیسے پسند کیا جا سکتا ہے جسے اکثریت ناپسند کرتی ہو؟ حکم یہ ہے کہ قیادت خواہ مسجد کی ہو یا ملک کی، پسندیدہ اور اخلاقِ حمیدہ کے حامل لوگوں کے سپرد کی جانی چاہیے۔

جمہوری نظام کی تیسری خصوصیت و خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اقتدار کی مدّت پانچ سال متعین ہے، اس کا نتیجہ اور فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی اکثریت نے پانچ سال کے لیے اپنی پسند کے جس لیڈر کو مسندِ اقتدار پر (تحت الاسباب) بٹھایا ہو، اگر وہ ان کی اُمیدوں اور آرزوؤں پر پورا نہ اُترے اور ملک و قوم کے لیے نقصان دہ ثابت ہو تو پانچ سال بعد انتخاب کے ذریعے اسے مسندِ اقتدار سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ (کاش کہ یہ نظام اُن مساجد و مدارس کے ذمّے داروں کے لیے بھی قائم ہو جائے جو عوامی چندوں سے بنائے گئے ہیں۔)

جمہوری نظامِ حکومت کی خامیاں:

اسی کے ساتھ جب ہم جمہوری حکومت کا موازنہ اسلامی حکومت وخلافت کے ساتھ کرتے ہیں تو موجودہ جمہوری نظامِ حکومت میں چند خامیاں بھی واضح ہوتی ہیں۔

مثلاً اسلامی حکومت کی پہلی اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں اصل حکم اور حاکمیت تو اللہ ربّ العالمین کی ہے، جس کو قرآنِ کریم نے مختلف مواقع میں مختلف انداز میں بیان فرمایا:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾ (الأنعام : ٥٧)

''حاکمیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾ (الأنعام : ٦٢)

''یاد رکھو کہ حاکمیت تو اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الأعراف : ٥٤)

''یاد رکھو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا سب اسی کا کام ہے۔''

اس لیے اسلامی حکومت وخلافت میں اصل حاکمیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور نیابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا ومرضی کے مطابق حکومت چلے گی، جب کہ جمہوری نظامِ حکومت کی خامی یہ ہے کہ اس میں اصل حاکمیت عوام کی مانی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ ملک کی اکثریت جیسا چاہے ویسا قانون اور نظام بن سکتا ہے، اس میں کوئی اَخلاقی بندش اور مذہبی پابندی نہیں ہے، حلال وحرام کی کنجی بھی عوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، یہ وراثت ونیابت دراصل انگریز کی

ہے، کیوں کہ جمہوری نظامِ حکومت انگریز کا ایجاد کردہ ہے، اس لیے ''خلافت'' اسلامی طرزِ حکومت کا نام ہے اور ''جمہوریت'' انگریزی نظامِ حکومت کا نام ہے، اور انگریز کتنے سچّے، اچھے، ایمان دار، دیانت دار اور انصاف پسند ہیں اسے ایک سنجیدہ انسان بہ خوبی سمجھ سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں اصحابِ رائے (جو دین دار، امانت دار اور تجربہ کار ہونے کے سبب مشورہ دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں) اتفاقِ رائے سے پہلے کسی کو اسلامی حکومت وخلافت کے لیے اس کی واقعی صالحیت وصلاحیت اور اہلیت ولیاقت کے سبب سربراہ وخلیفہ نامزد کرتے ہیں، بعد میں عوام اس کے ہاتھ پر (سیاسی) بیعت کرتے ہیں، اس طرح اسلامی حکومت کا نظام قائم ہوتا ہے، جس کا بنیادی مقصد نفاذِ شریعت اسلامی اور ملک کی ظاہری و مادّی ترقّی کے علاوہ عوام کی بھلائی وخیر خواہی ہوتا ہے، جسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ (الحج : ٤١)

جب کہ جمہوری حکومت میں بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مسند اقتدار پر آنے کے لیے نہ تو اصحابِ رائے کا اتفاقِ رائے سے کسی کو نامزد کرنا ضروری ہے اور نہ ہی کسی قسم کی لیاقت وصلاحیت ضروری ہے، مسند اقتدار پر عوامی ووٹ کے ذریعے اکثریت (Majority) حاصل کرلینا ہی کافی ہے، یعنی اسلامی حکومت کا مدار تو استعداد پر ہے؛ لیکن جمہوری حکومت کا مدار تعداد پر ہے۔ بقولِ علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بھولی بھالی عوام کو انتخاب کے موقع پر سبز باغ اور جھوٹے

خواب دِکھا کر یا نوٹ دے کر ووٹ حاصل کر کے مسندِ اقتدار پر پہنچنے والے ایسے اَن پڑھ بھی ہیں جن میں حکومت چلانے کی صلاحیت تو کُجا خود اپنا نام تک لکھنے کی اور قلم چلانے کی صلاحیت نہیں، نشانِ ابہام سے انھیں کام چلانا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ جن میں کوئی استعداد نہ ہو ایسے لوگ اکثریت اور تعداد کی بنا پر حکومت میں آجائیں تو اس سے ملک کا فائدہ کم اور اصحابِ اقتدار کا نجی فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی حکومت کی تیسری بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حکمران شرعی دستور و قانون کا پابند ہوتا ہے، جو بلاشبہ ہر اعتبار سے کامل و مکمّل اور عدل و اعتدال پر مبنی ہے، جب کہ جمہوری نظامِ حکومت کی خرابی یہ ہے کہ اس میں حکمران جمہوری دستور و قانون کا پابند ہوتا ہے۔

حقائق کا جائزہ لینے کے بعد اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شرعی دستور و قانون کے مقابلے میں جمہوری دستور و قانون چوں کہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے، اس لیے ناقص و نامکمّل ہے، جمہوری دستور و قانون کچھ حد تک مفید تو ہے؛ لیکن مقدّس، مکمّل اور کافی نہیں ہے۔

اگر اقتدار کا اختیار کسی طرح نااہلوں کو مل جائے تو پھر جمہوری دستور "إثمها أكبر من نفعها" کا مصداق بن جاتا ہے۔ چنانچہ دستور جمہوری کمیٹی کے سربراہ بابا صاحب نے کہا تھا کہ ''دنیا کا کوئی بھی قانون کامل نہیں ہوسکتا، اس کو مؤثّر اور قابل استعداد بنانا اسے روبہ عمل لانے والے افراد اور اداروں کی نیت پر منحصر ہے۔''

نیز یہ بھی کہا کہ ''اچھے سے اچھا آئین بھی اگر نااہل اور بے ایمان کے ہتھے چڑھ جائے تو بد سے بدتر ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کو چلانے والے اداروں کے ذمّے دار اگر ذہین، فراخ دِل اور بامروّت ہوں تو خراب سے خراب تر آئین بھی اچھا

ثابت ہوسکتا ہے۔'' (از: پیغامِ منبر ومحراب، ص: ۵ تا ۶، یومِ جمہوریہ اور آئین ہند)

ہمارے ملک میں اِس وقت کی صورتِ حال کچھ یہی ہے، حکومت چلانے والے عموماً نااہل، بے مروّت، بد باطن، ظالم اور آئین کے دشمن ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان کی سیاسی چالوں کو سمجھیں۔ اور جہاں اسلامی نظامِ حکومت وخلافت قائم نہیں، جیسے ہمارے ملک میں، وہاں ملوکیت اور آمریت کے برخلاف جمہوریت کو غنیمت سمجھیں اور اس کے دستور کی حفاظت ونفاذ کی متحد ہوکر فکر کریں۔

جمہوریت کی عمارت جن چار ستونوں پر قائم ہے: (۱) مقننہ (پارلیمنٹ) (۲) انتظامیہ (گورمنٹ) (۳) عدلیہ (سپریم کورٹ) (۴) میڈیا۔ انھیں مضبوط اور مؤثر بنانے کی کوشش کریں، اس کے لیے ہمت ومحبّت سے کام لے کر قدم بڑھائیں، محض چرچے اور تبصرے کرنا بند کریں، عوام کی بیداری ہی ملک میں انقلاب لاسکتی ہے، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ صرف حکومتیں بدلنے سے حالات نہیں بدل جاتے، حالات کے بدلنے سے حکومتیں بدلتی ہیں، اچھے حالات چاہتے ہیں تو اچھے اعمال کرنے پڑیں گے۔

اس لیے قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ﴾ (بني إسرائيل : ۷)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے رضا والے اعمال کی توفیق عطا فرما کر ملک میں اَمن وسلامتی کی فضا عام فرمائے اور آئندہ کے حالات کو گزرے ہوئے حالات سے بہتر بنائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

الحمدللہ! خادم زادہ محمد خلیق سلّمہٗ نے مؤرّخہ: ۲۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۴۲ھ مطابق: ۷ر فروری ۲۰۲۱ء بروز اتوار اپنے حفظ کا آخری سبق باقی رکھ کر ان کے اُستاذِ محترم حضرت مولانا حافظ ثناء اللہ سندھیاپوری مدظلہ العالی کے پاس دور شروع کردیا۔

حق تعالیٰ اسے اور ہم سبھی کو قرآنِ کریم سے کامل اور مکمّل وابستگی نصیب فرما کر دارین کی صلاح وفلاح عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۶؍رجب المرجب؍ ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۱۹؍فروری؍ ۲۰۲۱ء

بروز: جمعہ، قبل الفجر

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۳)

جمہوری حکومت میں ووٹ کی اہمیت اور حیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا؛ فَقَالَ رَجُلٌ: "يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ مَظْلُوْمًا؛ فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ ظَالِمًا؟ قَالَ: تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ، فَذٰلِكَ نَصْرُكَ إِيَّاهُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٢٢، باب الشفقة والرحمة على الخلق)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے (اسلامی اور انسانی) بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ (اسے اِنصاف دِلانے کی فکر اور کوشش کی جائے، اس سلسلے میں اس کا تعاون کیا جائے، اسے سہارا اور ساتھ دیا جائے یا کم از کم اسے تسلی دی جائے) لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جاسکتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔ (اس کے لیے حسب موقع وضرورت طاقت وصلاحیت، قانون، انتظامیہ وعدلیہ کا سہارا لیا جائے،

یا اس کے علاوہ اور کوئی مناسب ومعقول طریقہ اختیار کیا جائے، جیسے جمہوری ممالک میں جب انتخاب کا وقت آئے تو ظالم حکمرانوں کے خلاف متحد ہوکر پوری ذمے داری، دور اندیشی اور دیانت داری سے ووٹنگ کی جائے، تاکہ مسند اقتدار سے ظالم کا خاتمہ ہو اور مظلوم عوام کو ان کے جائز وضروری حقوق مل سکیں، وغیرہ) ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اس کی مدد کرنا ہے۔

جیسے تمھارے اعمال ہوں گے ویسے تمھارے حُکّام وعُمّال ہوں گے:

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ۠ ۸﴾ (التین : ۸)

اللہ تعالیٰ خیر الحاکمین اور ارحم الراحمین بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی بداعمالیوں پر فوراً گرفت نہیں فرماتے، نیکیوں پر اَجر تو ضرور دیتے ہیں؛ لیکن گناہوں پر لازمی پکڑ نہیں فرماتے، نہ گنہگاروں اور نافرمانوں پر اپنی نعمتوں اور عنایتوں کا سلسلہ بند فرماتے ہیں، البتہ جب بندے اس کی بے شمار نعمتوں اور عنایتوں کا جواب غفلتوں اور نافرمانیوں سے دیتے ہیں تب انھیں عذابِ اُخروی سے قبل عذابِ دُنیوی میں اس لیے مبتلا کیا جاتا ہے کہ بندے دُنیوی آزمائش ومصائب سے پریشان ہوکر اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کریں اور اس سے اپنا تعلق درست کرلیں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۲۱﴾ [السجدة : ۲۱]

اور دُنیوی سزا وعذاب کی ایک شکل ظالم حاکم کا تسلط ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۱۲۹﴾ [الأنعام: ۱۲۹]

بات یہ ہے کہ بندوں کے جیسے اعمال اوپر جاتے ہیں اسی کے مطابق اوپر سے

ان کے لیے حکام وعمال کے فیصلے ہوتے ہیں، اس لیے حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ جیسے تم ہوگے ویسے تمھارے حاکم ہوں گے، یعنی اگر تمھارے اعمال اچھے ہوں گے تو حکام بھی اچھے ملیں گے، اور اعمال بُرے ہوں گے تو حکام بھی بُرے ہوں گے، اُردو زبان کا ایک محاورہ ہے: ''جیسی روح ویسے فرشتے''۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ يَحْيَى بْنِ هَاشِمٍ عَنْ يُوْنُسَ بْنِ أَبِيْ إِسْحَاقٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ".

(مشكوٰة : ٣٢٣، باب الإمارة والقضاء)

اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کسی فارسی شاعر نے کہا ہے:

آدمیاں گم شدند، ملک خدا خر گرفت　　شامت اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

''انسان (جن میں واقعی انسانیت ہو وہ) غائب ہوگئے اور گدھے (نما اوصاف کے حامل لوگ) غالب ہوگئے، تو یہ ہمارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے جو اس عجیب صورت میں ظاہر ہوا۔''

جیسے بنی اسرائیل کے مجموعی اعمال جب اچھے تھے تو ان کے حکام حضرت داود وسلیمان علیہما السلام جیسے انبیاء تھے، پھر جب ان میں مجموعی طور پر فساد و بگاڑ پیدا ہوگیا تو بخت نصر جیسے ظالم حاکم کو مسلط کر دیا گیا، اسی طرح عہد نبوت کے بعد تک اس اُمّت کے بھی مجموعی شکل میں اعمال اچھے تھے تو اُنھیں خلفائے راشدین جیسے عادل حاکم ملے؛ لیکن بعد میں جب اعمال میں بگاڑ آیا تو اس اُمّت پر بھی ظالم حکمرانوں کو من جانب اللہ مسلط کر دیا گیا۔

موجودہ صورتِ حال کے دو حل:

صاحبو! اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ انگریزوں سے طویل جدّ و جُہد اور

قربانیوں کے بعد آزاد ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت کے باوجود آج بھی ہر چھوٹے بڑے دینی، دُنیوی، سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر تقریباً نا اہلوں اور ظالموں کا غلبہ، قبضہ اور تسلط رہا ہے، جس کی وجہ سے اب تک ملک کی اکثر عوام جائز و ضروری حقوق سے تقریباً محروم ہے، تو بلا شبہ یہ ہماری مجموعی غفلتوں اور گناہوں کی نحوست ونتیجہ ہے۔

اس لیے عاجز کے خیالِ ناقص میں موجودہ صورتِ حال کے دو حل ہیں:

(۱) پہلا حقیقی ویقینی حل رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غفلت اور معصیت والی زندگی سے بیداری، پرہیز گاری اور توبہ وفرماں برداری والی زندگی کی طرف لوٹ آئیں، اپنے رب سے تعلق درست کرلیں۔ قرآنِ کریم نے اس پر کامیابی کی خوش خبری سنائی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [النور:۳۱]

نیز حدیث قدسی میں وارد ہے کہ ظالم حکمرانوں کے تسلط کے وقت جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی و بندگی کروگے تو تمھارا رب جو احکم الحاکمین ہے، تمھیں کافی ہو جائے گا، پھر مجال نہیں کہ کوئی بھی حکومت تمھیں کوئی نقصان پہنچا سکے۔ فرمایا:

"اشْغِلُوْا أَنْفُسَكُمْ بالذِّكْرِ والتَّضَرُّعِ، كَيْ أَكْفِيَكُمْ مُلُوْكَكُمْ".

(رواه أبونعيم في الحلية، مشكوٰة : ۴۲۳، كتاب الإمارة والقضاء)

(۲) دوسرا حل: ظاہری و زمینی حل یہ بھی ہے کہ اسبابِ ظاہری کی دنیا میں جمہوری حکومت کے انتخاب اور اس کے ووٹ کو آج بھی اہمیت حاصل ہے، کامیاب انتخاب صالح انقلاب کا سبب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم سیاسی شعور وسمجھ بوجھ پیدا کرکے اس سلسلے میں فعال اور بیدار ہوں۔

کامیاب انتخاب اور صالح انقلاب کے لیے دو کام ضروری ہیں:

اس کے لیے ہمیں بنیادی طور پر دو کام کرنے ہوں گے:

ایک یہ کہ ملک کی سیاسی وغیر سیاسی ایسی جماعت یا پارٹی جس کی لوگوں پر اچھی پکڑ اور اثر ہو وہ علماء یا غیر علماء میں جو حکومت یا اس کے کسی عہدے کی اہلیت، قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں انھیں وسعت ظرفی و کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے میدانِ سیاست میں اُتارے، اُمیدواری ونمائندگی کے لیے نامزد کرے، اگر یہ کام کوئی پارٹی نہ کرے تو پھر اللہ تعالیٰ نے جنھیں حکومت اور اس کے کسی عہدے کی اہلیت، قابلیت اور صلاحیت دی ہے اور انھیں اس ذمّے داری کو پوری دیانت داری اور دور اندیشی کے ساتھ نبھا سکنے کا خود پر اعتماد اور اطمینان ہے، ایسے لوگ انتخاب کے موقع پر از خود بھی میدانِ سیاست میں اُتر سکتے ہیں، جیسے سیّدنا یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو تقاضائے وقت کے مطابق پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

﴿اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (یوسف:۵۵)

''یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا: (اگر تمھیں واقعی مجھ سے کوئی خاص کام لینا ہے تو) مجھے سرزمین (مصر) کے خزانوں پر (وزیر اور امین) مقرّر کردو، بے شک میں (ان کی) خوب حفاظت کرنے والا (اور اقتصادی امور کا) خوب جاننے والا ہوں۔''

اس کے تحت فقہاء ومفسرین نے لکھا ہے کہ جب مقصود نفع رسانی ہو، نہ کہ نفس پروری، تو خود کو عہدے کے لیے پیش کردینا ناجائز نہیں، یہاں تک کہ غیر مسلم نظامِ حکومت کے ماتحت بھی عہدہ ومنصب قبول کرنا مطلق صورت میں حرام نہیں۔ (تفسیر ماجدی)

نیز حدیث مذکور میں یہ ترغیب دی گئی کہ "اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا، أَوْ مَظْلُوْمًا". اپنے اسلامی، انسانی اور ملکی ووطنی بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ پھر ظالم کی

مدد کا طریقہ یہ بتا دیا کہ اسے ظلم سے روکا جائے، جس کی مختلف شکلوں میں سے ایک بہترین شکل یہ بھی ہے کہ جمہوری ملک میں انتخاب کے وقت باصلاحیت لوگوں کو آگے کیا جائے، یا بوقت ضرورت بہ شرطِ قابلیت ایسے لوگ از خود میدانِ سیاست میں اس نیت سے اُتریں کہ ظالم حکمرانوں کے بڑھتے قدموں اور پنجوں کو روک کر ملک کی مظلوم عوام کو ان کے جائز اور ضروری حقوق دِلوانے کی پوری ذمّے داری و دیانت داری سے کوشش کی جائے۔

دوسرا بنیادی کام یہ ہے کہ ملک کے عوام میدانِ سیاست کے اُمیدواروں کو اچھّی طرح سمجھیں، ایک دفعہ جن کو موقع دینے پر دھوکہ کھایا ان سے ہوشیار رہیں، اُمیدواروں سے مناسب مذاکرے اور جائز معاہدے کے بعد جسے ملک وملّت کے لیے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مفید یا کم نقصان دہ سمجھیں انھیں متحد ہوکر بلاخوف و لالچ کے ووٹ دیں، غفلت نہ برتیں۔ مطلب یہ ہے کہ انتخاب کے موقع پر اچھے نمائندوں کو نامزد کریں، پھر متحد ہوکر انھیں ووٹ دیں، ایسی صورت میں اُمید ہی نہیں؛ بلکہ یقین ہے کہ انتخابِ صالح انقلابِ صالح کا سبب بنے گا۔

اَفراد کے ہاتھوں میں ہے اَقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدّر کا ستارا

ووٹ کی حیثیت مسلم جمہوری ملک میں:

اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ جمہوری حکومت میں جب تک دستور محفوظ ہے تب تک تحت الاسباب حکومت کی لگام عوام کے ہاتھوں میں ہے، حکومت کے چھوٹے بڑے لیڈروں کو عوام ہی تو اپنے ووٹ کے ذریعے منتخب کرتے ہیں، اس لیے جمہوری حکومت میں آج بھی ووٹ کی بڑی اہمیت ہے، حکومت عوام کے ووٹوں سے قائم ہوتی ہے۔

ووٹ کی اس اہمیت کے پیشِ نظر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے

جواہر الفقہ میں پاکستان جیسے مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے شہادت، شفاعت اور وکالت کا درجہ دے کر لازمی اور ضروری قرار دیا۔

شہادت کا مطلب یہ ہے کہ ووٹ دینے والا جس اُمیدوار کو ووٹ دے رہا ہے اس کے حق میں یہ گواہی دیتا ہے کہ دیگر اُمیدواروں کے مقابلے میں یہ زیادہ قابل اور ملک وملّت کے حق میں مفید و بہتر ہے۔ جب ووٹ کو شہادت مانتے ہیں تو شہادت کے متعلّق کتاب وسنّت میں جو احکام ہیں وہ اس پر بھی جاری ہوں گے، مثلاً شہادت کے متعلّق قرآنِ کریم نے یہ ضابطہ بیان کیا کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ (النساء : ۱۳۵)

''اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کے لیے سبھی شہادت دو، خواہ وہ تمھارے، یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔'' کیوں کہ جھوٹی گواہی دینا حرام ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (البقرۃ:۲۸۳)

نیز بوقت ضرورت وطلب شہادت کو چھپانا حرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دُعِيَ إِلَيْهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّوْرِ".

(الترغيب والترهيب للمنذري : ۳ / ۱۵۲)

نیز ووٹ کی دوسری حیثیت مسلم جمہوری ملک میں شفاعت کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ووٹ دے کر ووٹر اپنے نمائندہ اُمیدوار کے لیے یہ سفارش کرتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں یہ زیادہ قابل اور ملک وملّت کے حق میں مفید و بہتر ہے، یا کم نقصان دہ ہے، ایسی صورت میں شفاعت کے احکام یہاں بھی جاری ہوں گے، مثلاً قرآنِ کریم

نے اس کا اصول یہ بیان فرمایا کہ

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ﴾ (النساء : ۸۵)

''جو شخص کسی نیکی (یا نیک آدمی) کی سفارش کرے گا تو اسے بھی اس کی نیکی سے حصّہ ملے گا۔ اور جو شخص کسی بُرائی (یا بُرے آدمی) کی سفارش کرے گا تو اسے بھی اس کی بُرائی سے حصّہ ملے گا۔'' اسی لیے حدیث پاک میں نیکی اور نیک آدمی کے لیے سفارش کی ترغیب وتلقین وارد ہوئی ہے، چنانچہ فرمایا:

"اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا". (متفق علیه، مشکوٰة: ص۴۲۲/ باب الشفقة والرحمة...)

''تم سفارش کرو، تمھیں اجر دیا جائے گا۔''

اسی طرح مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جسے ووٹ دیا جارہا ہے اسے حکومت اور اس کے عہدے کے لیے (خواہ وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ہو) ہم اپنا وکیل اور نمائندہ نامزد کرتے ہیں۔ اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر کسی کو ووٹ دیا جائے، گویا مسلم جمہوری ملک میں ووٹ دودھاری تلوار ہے، جو دونوں طرف سے نقصان دے سکتی ہے، تو یہی حال ووٹ کا بھی ہے، نہ دینا بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے اور غلط آدمی کو دینا بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے، اس لیے نہایت دور اندیشی اور دیانت داری سے ووٹ دیا جائے، ووٹ کی یہ تفصیلات مسلم جمہوری ملک کے متعلّق ہیں۔

ووٹ کی حیثیت غیر مسلم جمہوری ملک میں:

رہی بات غیر مسلم ملک جمہوری ملک میں ووٹ کی حیثیت کی، جیسے ہندوستان، تو یہاں بدقسمتی اور ہماری سیاسی بے شعوری، بے حسی اور غفلت کی نحوست سے میدانِ

سیاست گندگی اور نجاست سے بھرا ہوا ہے، میدانِ سیاست میں اُترنے والے عموماً غیر مسلم یا بے عمل بلکہ بدعمل مسلمان ہیں، جو عموماً عیاشی وعیاری کے عادی ہیں، الا ماشاء اللہ، جنھیں ملک وملّت کے مفاد سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، اس لیے فقیہ الامت حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان جیسے غیر مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی شرعی حیثیت کو تسلیم نہیں فرمایا۔

(ملفوظاتِ فقیہ الامت، صفحہ: ۳۴۴، قسط اوّل، کتاب النوازل، جلد: ۱۷، صفحہ: ۵۷)

ہمارے ملک ہندوستان میں ووٹ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک مشورے کی ہے، یعنی ووٹر اپنے اُمیدوار کو ملک وملّت کے حق میں دوسروں کے مقابلے میں بہتر ہونے یا کم نقصان دہ ہونے کی رائے دے رہا ہے، جب غیر مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی حیثیت ایک مشورے کی ہے تو شرعاً مشورہ دینے والے کے لیے امانت دار اور تجربہ کار ہونا ضروری ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں ہم اپنے جس اُمیدوار اور نمائندے کو بہ خوبی جانتے ہیں اور واقعی مفید سمجھتے ہیں اسی کو ووٹ دیں، خواہ وہ کوئی ہو، ہمارے یہاں وہی اصول کارگر ہوگا جو فقہاء نے بیان فرمایا:

"إِذَا ابْتُلِيْتَ بِبَلِيَّتَيْنِ فَاخْتَرْ أَهْوَنَهُمَا". (مجموعة أبحاث ودراسة فقهية: ۱۴۰)

''جب دو بُرائیاں تمھارے سامنے ہوں تو ان میں سے جو ہلکی ہو اسے اختیار کرلو'' لہٰذا ہمارے غیر مسلم جمہوری ملک میں انتخاب کے موقع پر ہمارے صوبوں، شہروں اور علاقوں کے نمائندوں اور اُمیدواروں میں دوسروں کے بالمقابل جو زیادہ اچھا ہو یا کم نقصان دہ ہو اسے ووٹ دیا جائے۔

نیز رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ کا بہر حال اہتمام کیا جائے، حق تعالیٰ ہمیں توفیقِ عمل عطا فرما کر ملک میں اَمن وسلامتی کی فضا عام فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۱۳؍رجب المرجب؍۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲۶؍فروری؍۲۰۲۱ء

قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۴)

بہترین لیڈر کی خوبیاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِأَشَجِّ عَبْدِ الْقَيْسِ: "إِنَّ فِيْكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ، الحِلْمُ وَالأَنَاةُ". (رواه مسلم : ۱/ ۳۵، مشكوٰة: ۹، باب الحذر والتأني في الأمور)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے ہجرت سے تین سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں کتاب وحکمت سمجھنے کی دعا دی، جس کی وجہ سے آپ گفتگو میں افصح الناس، علم میں اعلم الناس اور شکل میں اجمل الناس تھے، قد بھی اتنا لمبا کہ پیدل چلتے ہوئے بھی آپ سواری پر سوار معلوم ہوتے، آپ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں بڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی آپ کو مقدم فرماتے، آپ سے مشورہ لیتے، آپ اخیری عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور ۶۸ھ میں بہ عمر ۷۱ سال وفات پائی، طائف میں مدفون ہوئے، جہاں آج جامع مسجد ابن عباس ہے۔ مستفاد از توضیحات شرح مشکوٰۃ: ۱/ ۱۹۱) آپ فرماتے

ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلۂ عبدالقیس کے سردار اور لیڈر (منذر بن عائذ) سے فرمایا کہ ''تمھارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، ایک تو حلم و بُردباری اور دوسرے اَنجام بینی و دور اَندیشی۔''

ہمارا لیڈر کیسا ہونا چاہیے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس طرح بہترین شکل وصورت، مناسب قدر وقامت اور مفید علم وحکمت جیسی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ دنیا کی دوسری بے شمار مخلوقات کو حاصل نہیں، اس طرح کی خوبیوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر بہت سی مخلوقات کا سردار اور لیڈر بنایا، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ [بني إسرائيل : ۷۰]

''ہم نے انسانوں کو اپنی بہت سی مخلوق پر شرافت اور سرداری عطا کی۔'' پھر انسانوں میں بعض وہ ہیں جنھیں ان کے مخصوص صفات وکمالات اور خوبیوں کے سبب اپنے زمانے وعلاقے کے لوگوں پر فضیلت، شرافت اور سرداری عطا فرمائی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ کسی بھی زمانے وعلاقے میں بہترین لیڈر کی بنیادی پہچان، صفات، علامات اور اصلی وحقیقی نشانیاں وخوبیاں کیا ہیں؟ جنھیں دیکھ کر جمہوری ملک کے انتخاب میں ہم اپنے لیڈر کا انتخاب کرسکیں، ہمارا لیڈر کیسا ہونا چاہیے؟

بہترین لیڈر کی چھ خوبیاں:

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کا جواب یہ ہے کہ بہترین دینی رہبر اور سیاسی لیڈر وہ ہے جس میں کم از کم یہ چھ خوبیاں پائی جائیں: (۱) حسن کارکردگی (۲) خدمت

گزاری (۳) بہادری (۴) سادگی (۵) تحمل مزاجی (۶) دور اندیشی۔ جس میں یہ خوبیاں ہوں اسے لیڈر بنانا اور منتخب کرنا ہمارے اور ملک وملّت کے حق میں بہتر، مفید اور نفع بخش ہے۔

(۱) حسن کارکردگی:

حسن کارکردگی کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ماضی میں ملک وملّت کے لیے شان دار کارنامے انجام دیے ہوں، کائنات کے سب سے بڑے رہبر اور بہترین لیڈر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماضی اتنا تاب ناک اور شان دار تھا کہ اسے بہ طورِ ثبوت پیش فرمایا گیا:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾﴾ (یونس : ۱۶)

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے میں نے تمھارے درمیان چالیس سال گزارے ہیں، اس طویل عرصے میں میری سچائی، امانت داری اور ہم دردی کے تم سب گواہ ہو، تم نے میری حسن کارکردگی کو اچھی طرح دیکھا ہے، جس کی بنیاد پر تم میرے متعلّق یقین کر سکتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی لیڈر کے بہتر ہونے کا بنیادی معیار اس کے ماضی کا شان دار کردار ہے، اس کی پچھلی زندگی میں سچائی، امانت داری اور ملک وملّت کے لیے ہم دردی پائی جاتی ہے تو ایسے لیڈر کے لیے آئندہ بھی اچھی توقع کی جاسکتی ہے، اس کے برخلاف جس کا ماضی شان دار اور تاب ناک نہ ہو، دروغ گوئی، دھوکہ دہی اور غنڈہ گردی سے پُر ہو، ایسے لیڈر پر آئندہ کے لیے اس کے دعوؤں اور وعدوں کی وجہ سے اعتماد کر لینا کوئی دانائی نہیں ہے۔

(۲) خدمت گزاری:

اسی طرح بہترین لیڈر کی خوبی یہ ہے کہ وہ خدمت گزار ہو، مخدوم بننے کے بجائے خادم بن کر رہنا پسند کرتا ہو، حدیث پاک میں قوم کے سردار اور لیڈر کی یہی پہچان بیان فرمائی گئی ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "سَيِّدُ الْقَوْمِ فِيْ السَّفَرِ خَادِمُهُمْ، فَمَنْ سَبَقَهُمْ بِخِدْمَةٍ لَمْ يَسْبِقُوْهُ بِعَمَلٍ إِلَّا الشَّهَادَةَ". (شعب الإيمان، مشكوٰة : ۳٤٠، باب آداب السفر)

''سفر (زندگی) میں قوم کا سردار اور لیڈر ان کا خادم ہے۔'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ خادم ہی لیڈر بن سکتا ہے۔ اور خدمت ایک ایسا عہدہ ہے جو مفت میں حاصل ہوتا ہے؛ لیکن اس کا ثمرہ و نتیجہ لوگوں کی محبّت ہے، پھر یہی محبّت اسے لوگوں کا لیڈر بنا دیتی ہے، یہ تو دنیا کا عارضی نفع ہے۔ آخرت کا دائمی نفع یہ ہوتا ہے کہ خدمت کے ذریعے اللہ تعالیٰ اسے وہ مقام عطا فرماتے ہیں جو شہید کے علاوہ کسی کو میسّر نہیں، اسی کو اس حدیث پاک میں "لَمْ يَسْبِقُوْهُ بِعَمَلٍ إِلَّا الشَّهَادَةَ" سے تعبیر فرمایا۔

علاوہ ازیں "سَيِّدُ الْقَوْمِ فِيْ السَّفَرِ خَادِمُهُمْ" کا ایک دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو لیڈر بن گیا اُسے خادم بن کر رہنا چاہیے، مخدوم بن کر بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، حالات کے مطابق خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ کائنات کے سب سے بڑے رہبر اور بہترین لیڈر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیشہ خادم بن کر رہے، خدمت کے مواقع پر اپنے آپ کو پیش پیش رکھا، غزوۂ خندق اس کی بہترین مثال ہے۔

پانچویں ہجری میں یہود اور مشرکین مشترک طور پر بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ طیبہ پر حملے کے لیے بڑھے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت دور اندیشی سے کام

لیتے ہوئے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے دِفاعی تدابیر کے لیے مشورہ فرمایا، تو سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تجویز پر خندق کھودنے کا فیصلہ لیا گیا، جس طرف سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا وہاں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خط کھینچ کر خندق کی حدود مقرّر فرمائیں اور تین ہزار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دس دس کی جماعت بنا کر چالیس ہاتھ کا رقبہ کھودنے کی ذمّے داری سپرد فرمائی، جس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شریک رہے، چھ دِن میں یہ کام مکمّل ہوا، دشمن جب قریب پہنچے تو خندق دیکھ کر حیران رہ گئے، انھوں نے خندق کی دوسری طرف تقریباً ایک مہینے کا طویل محاصرہ کیا، بالآخر اللہ تعالیٰ کی نصرت بہ شکل آندھی آگئی اور مسلمانوں کو کامیابی ملی۔ (مستفاد از: انوار البیان)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدمت کے مواقع میں اپنے آپ کو پیش پیش رکھا اور اپنے طرزِ عمل سے بتادیا کہ قوم کے لیڈر کو خدمت کے مواقع پر آگے ہی ہونا چاہیے۔ غالباً اسی لیے یہ نعرہ مشہور ہوگیا کہ ''اے قوم کے لیڈرو! آگے بڑھو، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔'' یہ نہ ہو کہ عین ضرورت کے وقت اپنا دامن بچا کر بھاگ کھڑے ہوں اور دوسروں کو ''بلی کا بکرا'' بنادیں۔ یہ اچھے لیڈر کی پہچان نہیں۔

(۳) بہادری:

بہترین لیڈر کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہادر ہوتا ہے، بزدِل نہیں، یاد رکھو! جنھیں لیڈر بننے کا شوق ہو اُنھیں مشکلات ومصائب کا قطعاً خوف نہیں ہونا چاہیے، اگر اُڑنے کا شوق ہو تو گرنے کا خوف نہیں ہونا چاہیے، بقولِ شاعر:

جو یقین کی راہ پہ چل پڑے اُنھیں منزلوں نے پناہ دی
جنھیں وسوسوں نے ڈرا دیا وہ قدم قدم پہ بہک گئے

جو لوگ مصائب ومشکل حالات سے ٹکرانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ قوم کے

اچھے رہبر اور لیڈر کبھی نہیں بن سکتے۔ کائنات کے سب سے بڑے رہبر اور بہترین لیڈر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعلانِ نبوت کے بعد ساری زندگی مسلسل مشکل حالات آئے؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ثابت قدمی اور بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی موقع پر گھبرا کر بیٹھ نہیں گئے۔ اس کی بہترین مثال ہجرتِ مدینہ بھی ہے، اللہ پاک کے حکم سے جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تب سارا مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹا دینے کے لیے درِ اقدس پر جمع ہو گیا تھا؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بستر پر لٹا دیا اور ضروری ہدایات دے کر دشمنوں کے بیچ سے بآسانی نکل گئے اور راستے کی پُرخطر منازل طے کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور اپنے مشن میں مشغول ہو کر منزلِ مقصود حاصل فرمائی۔ بزدل لیڈر نہ کبھی منزلِ مقصود حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی قوم وملّت کے لیے بہتر اور نفع بخش ہو سکتا ہے۔

(۴) سادگی:

بہترین لیڈر میں سادگی بھی نہایت ضروری ہے، سادگی میں سبھی کے لیے آسانی ہے، جب کہ تکلّفات میں تکلیف ہے، اس لیے یوں تو یہ وصف اور خوبی ہر ایک میں ہونی چاہیے؛ لیکن قوم کے لیڈر میں یہ وصف لازمی ہے، تاکہ قوم کا ہر فرد بآسانی اپنے لیڈر تک پہنچ کر اپنے مسائل حل کرا سکے، کائنات کے سب سے بڑے رہبر اور سب سے بڑے لیڈر کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ باہر سے آنے والے اجنبی کو یہ پوچھنا پڑتا تھا کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ "أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ؟" (البخاري: باب ماجاء في العلم وقوله تعالىٰ: وقل رب زدني علما)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم شان وشوکت کے ساتھ رہنے کے بجائے سادگی سے رہتے

تھے۔ روایتوں میں ہے کہ ایک مرتبہ دربارِ رسالت میں حاضر ہونے والے شخص پر گھبراہٹ اور کپکپی طاری ہوئی تو کائنات کے سب سے بڑے رہبر اور سب سے بڑے لیڈر نے فرمایا:

"هَوِّنْ عَلَيْكَ! فَإِنِّيْ لَسْتُ بِمَلِكٍ".

''گھبراؤ نہیں! (تم کسی بادشاہ یا بدمزاج لیڈر کے پاس نہیں آئے ہو، میں کوئی دنیا کا بدمزاج) بادشاہ نہیں ہوں۔''

"إِنَّمَا أَنَا ابْنُ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ كَانَتْ تَأْكُلُ الْقَدِيْدَ". (المعجم الأوسط، المستدرك على الصحيحين للحاكم على شرط البخاري ومسلم)

''میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت (بھی) پکا کر کھالیا کرتی تھیں۔''

آپ ﷺ نے اپنے اس طرزِ عمل سے بتادیا کہ لیڈر کو خواہ مخواہ تکلّفات اور بے جا رُعب اختیار نہ کرنا چاہیے، کیوں کہ ضروری حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود سادگی اور بے تکلّفی والی زندگی اختیار کی جاسکتی ہے۔ الحمدللہ ہمارے اکابر میں جو سیاسی لیڈر ہیں اُنھوں نے عملاً اس کی مثال پیش کرکے دِکھائی۔ كَثَّرَ اللهُ أَمثَالَهم.

(۵) تحمل مزاجی اور (۶) دوراندیشی:

لیکن سادگی کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کسی سے بھی بآسانی دھوکہ کھا جائے، یہ بھی بہترین لیڈر کی شان نہیں، چنانچہ منقول ہے کہ جب کسی غیر مسلم حاکم نے صحابیِ رسول ﷺ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے متعلّق سوال کیا تو جواباً عرض کیا کہ

"أَمِيْرُنَا لَا يَخْدَعُ، وَلَا يُخْدَعُ".

''ہمارے امیر (سردار اور لیڈر) نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں، نہ کسی سے دھوکہ کھاتے ہیں۔'' (توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۷/۲۰۶)

دور اندیشی بہترین لیڈر کی بنیادی خوبی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ۵ھ میں بحرین سے قبیلہ عبدالقیس کا وفد حاضر ہوا، (جس میں تقریباً تیرہ افراد تھے) تو ان کے لیڈر کے علاوہ دیگر تمام لوگ حاضر خدمت ہوکر سلام کر کے دست بوسی کرنے لگے، لیکن وفد کے لیڈر حضرت (منذر بن عائذ رضی اللہ عنہ الاشج) نے اولاً سامان وغیرہ بہ حفاظت رکھا، پھر اچھی طرح (غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر) کپڑے تبدیل کیے، اس کے بعد حاضر خدمت ہوئے اور سلام کر کے دست بوسی کی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی کہ تم میں دو پسندیدہ خصلتیں اور خوبیاں ہیں، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہیں۔

"إِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ، الحِلْمُ وَالأَنَاةُ".

اس حدیث کے تحت محدثین عظام نے فرمایا کہ یہ وہ دو خوبیاں ہیں جو کسی بھی لیڈر کو بہترین بنادیتی ہیں۔ ایک تحمل مزاجی، دوسری سنجیدگی و دور اندیشی۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ یہ خوبیاں آج بھی اگر کسی دینی رہبر اور سیاسی لیڈر میں جمع ہوجائیں تو یقیناً لوگ اس پر اعتماد بھی کریں گے اور احترام بھی۔

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

ہجومِ بلبل ہوا چمن میں، کیا جو گل نے جمال پیدا
کمی نہیں قدرداں کی اکبر! کرے تو کوئی کمال پیدا

حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں صفاتِ حسنہ سے متصف فرما کر دارین کی

دائمی رضا عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۰ر رجب المرجب ر ۱۴۴۲ھ ر شب جمعہ

مطابق: ۵ر مارچ ر ۲۰۲۱ء

بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۵)

مقاصدِ بعثت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ، فَقَالَ: "كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ، أَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَدْعُوْنَ اللهَ، وَيَرْغَبُوْنَ إِلَيْهِ؛ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ، وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الفِقْهَ وَالْعِلْمَ، وَيُعَلِّمُوْنَ الجَاهِلَ، فَهُمْ أَفْضَلُ، وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ".

(رواه الدارمي، مشكوٰة : ٣٦، كتاب العلم)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں منعقد دو مجالس کے قریب سے گزرے، (اس موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یوں تو دونوں ہی حلقے خیر و بھلائی کے عمل میں مشغول ہیں؛ لیکن ان میں سے ایک حلقہ دوسرے سے افضل و بہتر ہے، (وہ علم والا حلقہ ہے، کیوں کہ) جو جماعت دُعا و عبادت میں مصروف ہے (تو اس کا نفع عموماً اپنی ذات تک محدود ہے، لوگ دُعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حضور) اپنی رغبت کا اظہار کرتے ہیں، تو

حق تعالیٰ اگر چاہتے ہیں تو اُنھیں عطا فرما دیتے ہیں، اور اگر اس کی حکمت میں مانگی ہوئی چیز کا عطا نہ کرنا بہتر ہوتا ہے تو دُعا مانگنے والوں کو اپنی عطا سے محروم فرماتے ہیں، لیکن جو جماعت حصولِ علم میں مشغول ہے اور ناواقف لوگوں کو علم سکھاتی ہے (تو چوں کہ علم کا نفع محدود نہیں، اس لیے) یہی جماعت افضل ہے۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے معلم بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ (آپ علمی حلقے کی فضیلت زبانی طور پر بیان کرنے کے بعد عملی طور پر ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے) ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔''

دُعائے خلیل علیہ السلام اور اس کی قبولیت:

اللہ تعالیٰ کے گھر کی بنیاد کے وقت سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور آپ کے بیٹے سیّدنا اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے بہت سی دُعائیں مانگیں، ان میں ایک دُعا یہ بھی تھی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ (البقرۃ : ۱۲۹)

اے ہمارے رب! اس عالمی رُشد و ہدایت کے مرکز کی تعمیر تو ہم تیرے حکم پر کر رہے ہیں؛ لیکن اس کی آبادی اور تیرے دین کی سربلندی کے لیے اپنے آخری رسول اور ہادیٔ سبل کو میری اولاد میں مبعوث فرما، جو انھیں کلامِ الٰہی پڑھ کر سنائے، انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور اُن کی تربیت فرمائے، تو ہی ہے قدرت و حکمت والا، تیری قدرت بھی زبردست ہے اور تیری حکمت بھی زبردست ہے۔

دُعا مانگنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمھاری دُعا قبول کروں گا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ﴾ (المؤمن : ۶۰)

پھر دُعا مانگنے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہوں، اس پر آمین کہنے والے حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام ہوں، جس جگہ دُعا مانگی جارہی ہے وہ بیت اللہ ہو، اور جس کے لیے دُعا مانگی جارہی ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، تو یہ دُعا کیسے قبول نہ ہو؟ حق تعالیٰ نے دُعائے خلیل علیہ السلام کو قبول فرما کر قرآنِ کریم میں تین مقامات پر اس کا اعلان بھی فرمادیا:

(۱) ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة : ۱۵۱)

(۲) دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران : ۱۶۴)

(۳) تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعة:۲)

ان میں حق تعالیٰ نے دُعائے خلیل علیہ السلام کی قبولیت کا اعلان فرمایا، البتہ اس میں مناسب ترمیم فرمادی۔

مقاصدِ بعثت تین ہیں:

حضرت خلیل علیہ السلام نے مقاصد بعثت میں تلاوتِ آیات کے بعد تعلیم کتاب وحکمت کو بیان کیا، پھر تزکیۂ نفوس کا تذکرہ فرمایا؛ لیکن حق تعالیٰ نے اس میں یہ ترمیم فرمائی کہ تلاوتِ آیات کے بعد تزکیۂ نفوس کو بیان فرمایا، پھر تعلیم کتاب وحکمت کا

تذکرہ فرما کر بتادیا کہ مقاصد بعثت، فرائض رسالت اور کارہائے نبوت تین ہیں، ان میں اولاً تلاوتِ آیات ہے، پھر تزکیہ وتربیت ہے، پھر تعلیم کتاب وحکمت ہے، چوں کہ پہلے الفاظِ قرآنی کا نزول ہوا، پھر قرآنی احکام کا نزول بہ تدریج ہوا، اس لیے پہلے تلاوتِ آیات کا ذکر ہے، تلاوت کی برکت سے تزکیہ آسان ہوجاتا ہے، جیسا کہ تزکیۂ قلوب کے لیے حدیث پاک میں تلاوتِ قرآن اور موت کو بہ کثرت یاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ (بیہقی، مشکوۃ:۱۸۹، فضائل القرآن)

لہٰذا تلاوتِ آیات کے بعد تزکیہ وتربیت کو بیان فرمایا، تزکیہ کے بعد کتاب و سنّت کا جو علم حاصل ہوگا اس میں رُسوخ بھی ہوگا اور خلوص بھی، یہی وجہ ہے کہ تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب وحکمت کا تذکرہ فرمایا۔ واللہ اعلم۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے طلبہ وعلماء کو بفضلہٖ تعالیٰ علم الٰہی کی سچّی طلب ومحنت، تلاوت کی کثرت، اہل اللہ کی صحبت اور فکرِ آخرت کے نتیجے میں رسوخ فی العلم اور خلوص فی العمل نصیب ہوجائے تو ان کی عظمتوں میں چار چاند لگ جائیں۔ رزقنا اللہ بفضلہٖ ومنہٖ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معلّم اللہ تعالیٰ ہیں اور اُمّت کے معلّم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں:

الغرض حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دُعا میں مناسب ترمیم فرما کر حق تعالیٰ نے اس کی قبولیت کا وعدہ فرمالیا، پھر جب اس کے ظہور کا وقت آیا تو ربِ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ فضلِ عظیم کا معاملہ فرما کر آپ کو اُن علوم سے نوازا جن سے آپ بعثت ونبوت سے قبل واقف نہیں تھے، کیوں کہ علم الٰہی کے بغیر مقاصد بعثت، فرائض رسالت اور کارہائے نبوت کی ادائیگی وتکمیل مشکل ہی نہیں؛ ممکن بھی نہیں۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (النساء : ۱۱۳)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حق تعالیٰ نے تعلیم دی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم تو اللہ تعالیٰ ہیں؛ لیکن اُمّت کے معلم بواسطۂ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾ (البقرة : ۱۵۱)

نیز حدیث مذکور میں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو من جانب اللہ اُمّت کا معلم بنا کر مبعوث ہونے کا اظہار فرمایا کہ "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا".

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم خود اللہ تعالیٰ ہیں تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا، اگرچہ علم الٰہی کے سامنے علم نبوی کی وہ حیثیت بھی نہیں جو سمندر کے سامنے قطرے کی ہے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾﴾ (بني إسرائيل : ۸۵)

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کے سامنے کائنات کی ساری مخلوقات کے علم کی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے سامنے قطرے کی ہے، اگر کائنات کی ساری مخلوق کا علم ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم رکھا جائے تو یقیناً علم نبوی والا پلڑا جھک جائے گا۔ حق تعالیٰ نے جو عالم الغیب والشہادۃ ہیں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چاہا، جہاں چاہا، جتنا چاہا اور جس طرح چاہا علوم سے نوازا، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقاصد بعثت کی ادائیگی آسان ہوجائے۔

مقاصد بعثت کی ادائیگی کا حکم:

اسی کے ساتھ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بھی دیا کہ جس مقصد کے لیے

آپ کو مبعوث کیا گیا ہے اس کی ادائیگی کے لیے آپ تیار ہو جایئے، چنانچہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ : ٦٧)

''اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا آپ اس کلام کو اور اس کے اَحکام و پیغام کو عام کر دیجیے۔''

حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مقاصد بعثت کی ادائیگی میں آسانی کے لیے علوم سے بھی نوازا، پھر حکم بھی فرما دیا تو حضور پاک ﷺ اس کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے، جیسا کہ حضور ﷺ کی سیرت اور کتاب وسنّت میں اس کے شواہد موجود ہیں کہ نزولِ قرآنِ کریم اور نبوت و بعثت کے بعد سے تا حیات حضور ﷺ دِن رات کے تمام اوقات ولمحات مقاصد بعثت کی ادائیگی میں مسلسل مشغول و منہمک رہے اور آپ ﷺ نے تینوں ذمّے داریوں (تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب وحکمت) کو مکمّل نبھایا، جس کی برکت سے اُمّت مسلمہ ہدایت اور خیر وسعادت سے مالا مال ہو گئی، ہر ایک کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

پہلا مقصد قرآنِ کریم کی تلاوت:

حضور ﷺ کی بعثت کا پہلا مقصد قرآنِ کریم کی تلاوت ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا﴾ (البقرۃ : ١٥١)

حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس لیے مبعوث فرمایا کہ آپ ﷺ اُمّت کے سامنے قرآنِ کریم کی تلاوت کریں۔ اس سے تلاوت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ مقاصد بعثت میں ایک مقصد تعلیم کتاب وحکمت بھی ہے، ظاہر ہے کہ تلاوت کے بغیر تعلیم کتاب وحکمت ممکن نہیں، قرآنِ کریم کی تعلیم وتفسیر میں تلاوت داخل ہے، اس کے باوجود اس کی اہمیت بتانے کے لیے تلاوت کو مستقل طور پر بیان کیا گیا۔

مزید یہ کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے ہمیں تلاوت کا حکم فرمایا:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ (العنکبوت : ٤٥)

حق تعالیٰ نے براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوتِ قرآنِ کریم کا حکم فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ﴾ (النمل:۹۱-۹۲)

''مجھے تو بس یہی حکم ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کرتا رہوں، جس نے اُسے حرمت والا بنایا ہے، جس کی ملکیت میں ہر چیز ہے، اور مجھے یہ بھی حکم ہے کہ (مخصوص اعمال وعبادات کے علاوہ بھی زندگی کے تمام اُمور میں) اللہ ہی کی اطاعت کروں اور یہ بھی حکم ہے کہ میں قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا رہوں۔''

اس میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت و اطاعت اور قرآنِ کریم کی تلاوت کا حکم فرمایا۔ یہاں ایک علمی نکتہ یہ بھی ہے کہ حکم تلاوت کا ہے، قراءت کا نہیں، تو حضرات علمائے مفسرین نے تلاوت اور قراءت میں ایک فرق تو یہ بیان فرمایا کہ قراءت مطلقاً پڑھنے کو کہتے ہیں، خواہ کوئی بھی کتاب ہو، جب کہ تلاوت آسمانی کتاب اور بالخصوص قرآنِ کریم پڑھنے کو کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کو پڑھنے کے لیے قرآنی اصطلاح ''تلاوت'' ہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ ''قراءت'' دھیمی آواز سے پڑھنے کو کہتے ہیں، جب کہ ''تلاوت'' بلند آواز سے پڑھنے کو کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت:

یہی وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت کا حکم ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مناسب موقع، جگہ اور مجمع میں باآوازِ بلند قرآنِ کریم کی تلاوت شروع فرمادی، اس لیے

عاجز کے خیالِ ناقص میں اگر یہ کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ نزولِ قرآنِ کریم سے پہلے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن بن کر دِکھایا تو نزولِ قرآنِ کریم کے بعد صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر بھی سنایا، دِن ہو یا رات، حرم ہو یا غیر حرم، نماز ہو یا غیر نماز، اکثر اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ کریم کی تلاوت فرما کر لوگوں کو سناتے، حتیٰ کہ جہلائے مکہ کے لیڈروں میں سے ابوجہل اور نضر بن الحارث نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد پر قرآن کیا نازل ہوا گویا مصیبت آ گئی، نہ دن میں سکون ہے نہ رات میں آرام، وجہ یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دِن کے اکثر اوقات قرآنِ کریم کی تلاوت اور تعلیم وتبلیغ کے علاوہ رات کے اکثر اوقات بھی اللہ تعالیٰ کے حضور نماز کے طویل قیام میں تلاوت فرماتے رہتے، جس کی وجہ سے پاؤں مبارک پر ورَم آجاتا، اس موقع پر حق تعالیٰ نے بڑے پیار سے راہِ اعتدال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢﴾ (طٰہٰ: ۱-۲)

لفظ "طٰہٰ" کے متعلق ایک قول تو یہ ہے کہ اس کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جس طرح ''یٰسین'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے، اسی طرح "طٰہٰ" بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کا نام ہے۔

تیسرا قول حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں: ''یا حبیبی!'' محبوبم! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نہیں اُتارا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں، قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کی تعلیم وتبلیغ میں اپنے آپ کو حد سے زیادہ مشقت میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔

حدیث میں ہے کہ اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

معمول بن گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شروع رات میں آرام فرماتے اور رات کے اخیری پہر میں بیدار ہوکر نمازِ تہجد کے قیام میں تلاوت فرماتے۔ (مستفاد از معارف القرآن: ۶/ ۶۴)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت سے ہدایت پانے والوں کے واقعات:

دین حق کی دعوت کا بہترین ذریعہ قرآنِ کریم کی تلاوت بھی ہے، بشرطیکہ تلاوت تجوید کی رعایت اور احسانی کیفیت کے ساتھ کی جائے، ایسی تلاوت عموماً ہدایت کا سبب بن جاتی ہے، بالخصوص تلاوت جب کسی عام قاریٔ قرآن کے بجائے خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ہو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت کئی لوگوں کی ہدایت کا سبب بن گئی۔

(۱) مثلاً مسند احمد میں سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا خود اپنے متعلق یہ بیان منقول ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک مرتبہ میں حرم میں پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت میں مشغول پایا، بے اختیار میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب کھڑا ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت سننے لگا۔

"فَاسْتَفْتَحَ سُوْرَةَ الْحَاقَّةِ".

اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ حاقہ کی تلاوت فرمارہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے قرآن سن کر میں تو حیران ہوگیا، سوچنے لگا:

"هٰذَا وَاللّٰهِ شَاعِرٌ، كَمَا قَالَتْ قُرَيْشٌ".

قریش مکہ صحیح کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے۔ ابھی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ حاقہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ﴾ [الحاقة: ٤١]

''یہ کسی شاعر کا کلام نہیں؛ لیکن تمھیں یقین نہیں۔''

عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ مجھے بڑا تعجب ہوا، دل میں خیال آیا کہ یہ شخص کاہن معلوم ہوتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلی آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ (الحاقة : ٤٢)

''یہ کسی کاہن کا کلام بھی نہیں؛ لیکن تم نہیں سمجھتے۔''

میرے دل میں خیال آیا کہ یہ نہ شاعر کا کلام ہے نہ کاہن کا، تو پھر کس کا کلام ہے؟ تب ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الحاقة : ٤٣)

''یہ ربّ العالمین کا کلام ہے۔''..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فَوَقَعَ الإِسْلَامُ فِيْ قَلْبِيْ". (مسند أحمد، حديث : ١٩٧)

یہی وہ موقع تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میرے دِل میں جاگزیں ہوگئی، بعد میں یہ ہوا کہ نمازِ تہجد پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مانگا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الإِسْلَامَ بِأَبِيْ جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ أَوْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ".
(رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٥٥٧، باب مناقب عمر)

اس کے بعد حدیث پاک میں ہے کہ صبح وہ واقعہ پیش آیا جس میں آپ رضی اللہ عنہ اپنی بہن فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا اور بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات سن کر مزید متاثر ہوئے اور خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

ہمارے شاہ صاحب علّامہ سیّد عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ شاہ عطاء اللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ ''اس سے معلوم ہوا کہ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں فرق یہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرید ہیں؛ لیکن

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد ہیں۔''

(۲) اسی طرح قبیلۂ دوس کے سردار و شاعر طفیل بن عمرو دوسی کے متعلق منقول ہے کہ جب آپ مکہ مکرمہ آئے تو جہلائے قریش کے کچھ لوگوں نے آپ کو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق خوب ورغلایا، جس کے نتیجے میں انھوں نے بھی ارادہ کرلیا کہ حتی الامکان نبی کا کلام نہیں سنوں گا، اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی، تاکہ بے شعوری میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام اور تلاوتِ قرآن کی آواز کان میں نہ پڑ جائے، لوگ اُنھیں "ذو القطنتین" کہنے لگے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ آپ قرآنِ کریم کو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ضرور سنیں گے۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ طفیل بن عمرو دوسی ایک مرتبہ مسجد حرام پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز میں تلاوت کرتے ہوئے پایا، آپ بے اختیار ہوکر سننے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز و تلاوت سے فارغ ہوکر جانے لگے تو طفیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہولیے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام حالات سے باخبر کرکے مزید تلاوت سننے کی خواہش ظاہر فرمائی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ اخلاص اور معوذتین تلاوت فرمائیں، طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان سے قرآنِ کریم سن کر قربان ہوگئے۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ کی محنت اور دعوت سے قبیلۂ دوس کے ستر سے اسّی گھرانے مسلمان ہوگئے۔
(مستفاد از: سیرتِ مصطفی: ۱/ ۳۸۲)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت انسانوں کے ساتھ جناتوں کے لیے بھی ہدایت کا ذریعہ بن گئی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے مختلف گروہ مختلف مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآنِ کریم کی تلاوت کو سن کر مسلمان ہوگئے۔

علّامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مختلف احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنات کے مختلف گروہ چھ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (تفسیر روح المعانی)

منجملہ ان کے نبوت کے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چند اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ بازارِ عکاظ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں مقامِ نخلہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ فجر پڑھائی، اسی وقت جنات کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت سن کر جناتوں کی یہ جماعت رُک گئی اور دھیان و توجّہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت سن کر نہ صرف مسلمان بلکہ داعیٔ قرآن بن گئی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات سے بالکل بے خبر تھے، حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ واقعہ بتایا، سورۂ جن کی ابتدائی آیات میں اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ [الجن : ۱]

''محبوبم! بتا دیجیے کہ مجھے وحی کی گئی کہ جناتوں کی ایک جماعت نے مجھ سے قرآن سنا'' تو وہ قربان ہی ہوگئی، اپنی قوم میں واپس جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت اور قرآنِ کریم کی کیفیت بیان کرتی ہوئی کہنے لگی:

﴿فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴾ (الجن : ۱)

''ہم نے عجیب قرآن سنا''

جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی لاجواب ہے اور علم و حکمت کے لحاظ سے بھی بے مثال ہے۔

﴿يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴾ (الجن : ۲)

''یہ قرآن سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور کرتا رہے گا، ہمیں تو یقین ہو گیا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں، از اوّل تا آخر ربّ العالمین کا کلام ہے، ہم اس پر ایمان لے آئے اور وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم اپنے رب کے ساتھ کبھی شرک نہیں کریں گے۔'' (مستفاد از: صحیح بخاری: ۲/ ۷۳۲)

دوسرا مقصد تزکیہ وتربیت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا دوسرا مقصد قرآنِ کریم نے تزکیہ، اصلاح اور تربیت کو بیان فرمایا:

﴿وَيُزَكِّيكُمْ﴾ (البقرة : ١٥١)

حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے مبعوث فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کے بگڑے عقائد اور اعمال و اخلاق کی اصلاح فرمائیں، اُنھیں سنواریں اور ان کی اچھّی تربیت فرمائیں، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، یہ اسی مربی کے لیے آسان ہے جو خود تربیت یافتہ ہو اور جس کے ساتھ توفیق الٰہی وابستہ ہو، نیز وہ اصلاح وتربیت کے آداب و انداز سے بھی واقف ہو، ظاہر بات ہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم اللہ تعالیٰ ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مربی بھی اللہ تعالیٰ ہیں، جس کا تذکرہ ایک ضعیف روایت میں اس طرح ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَدَّبَنِيْ رَبِّيْ، فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبِيْ". (كنز العمال، في فضائل متفرقة، الفصل الثالث، الرقم : ٢١٨٩٥)

اس لیے اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور بہتر کوئی معلم نہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور بہتر کوئی مربی بھی نہیں، آپ کی تلاوت کا انداز

بھی نرالا اور تربیت کا انداز بھی نرالا تھا، جہاں نرمی مناسب تھی وہاں نرمی سے اور جہاں سختی ضروری تھی وہاں سختی سے، تو کبھی احساس دِلا کر یا وعدہ لے کر یا پھر اصلاحی بیعت فرما کر، غرض جب جہاں جیسی ضرورت ہوتی اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصلاح وتزکیہ اور تربیت فرماتے، اور یہی کسی مربی کا اصل کمال ہے، اس کے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تربیت:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تربیت کتنا منفرد، انوکھا اور بہترین تھا، اس کے چند نمونے سیرت اور کتاب وسنّت سے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ ایک دیہاتی آیا، اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا، پھر مسجد کے ایک گوشے کی طرف بڑھا، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے حیرت سے تکنے لگے کہ یہ کیا کرنے والا ہے؟ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا تہہ بند اُٹھایا اور مسجد نبوی کے ایک کونے میں بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا، چند صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جلدی سے اُٹھ کر اسے روکنا چاہا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو منع فرمادیا، جب وہ اعرابی پیشاب سے فارغ ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے پاس بلا کر بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنَ الْبَوْلِ".

مساجد اس کام کے لیے نہیں بنائی گئیں، مساجد تو نماز، تلاوت اور ذکر اللہ کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، مختصر نصیحت فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہوگئے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے اس ناصحانہ ومشفقانہ اندازِ تربیت کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ دیہاتی آپ ﷺ کی محبّت کا اسیر ہوگیا، اس لیے نماز کے سلام کے بعد یا رُخصتی کے سلام کے بعد وہ اس طرح دُعا کرنے لگا:

"اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا، وَلَا تُشْرِكْ فِيْ رَحْمَتِنَا أَحَدًا". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ص٤١٤/ باب حفظ اللسان من الغيبة)

''اے اللہ! مجھ پر اور حضرت محمد ﷺ پر اپنی رحمت نازل فرما اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ فرما۔''

یعنی اس کو حضور ﷺ سے اس قدر محبّت ہوگئی کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے اور حضور ﷺ کے علاوہ کسی پر رحمت نازل نہ ہو؛ لیکن بے چارہ آدابِ محبّت واَحکامِ شریعت سے ناواقف تھا، اس لیے حضور اکرم ﷺ نے پھر اس کی اصلاح اور تربیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم نے ایک وسیع چیز (رحمت الٰہی) کو تنگ کردیا۔

بعض شارحین حدیث نے فرمایا کہ یہ وہی دیہاتی ہے جس نے مسجد کے صحن میں پیشاب کیا تھا۔ (مرقاۃ:۸/۵۹۸، ازتوضیحات:۷/۸۱)

چوں کہ یہ اعرابی معمولی سطح کا آدمی تھا، اس لیے آپ ﷺ نے نرمی سے اس کی اصلاح وتربیت فرمائی۔

(۲) حضور ﷺ کے ناصحانہ ومشفقانہ اندازِ تربیت کا ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ جنگل میں اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ رہنے والے ایک صحابی حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ حسب سہولت خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ تعلیم دے رہے تھے کہ اگر کسی کو چھینک آجائے تو وہ ''الحمدللہ'' کہے اور سننے والا ''یرحمک اللہ'' کہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

یہ بات سن کر رخصت ہو گئے، پھر چند دنوں بعد دوبارہ حاضر ہوئے تو اس وقت حضور ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز میں مشغول تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی نماز میں شامل ہو گئے، اتفاق سے نماز کے دوران کسی کو چھینک آ گئی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی نصیحت یاد آ گئی، اُنھوں نے بلند آواز سے ''یرحمک اللہ'' کہہ دیا، ان کی اس حرکت سے نمازیوں کو خلل ہوا اور لوگ اُنھیں تیز نگاہوں سے تاڑنے لگے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پریشان اور خوف زدہ ہو گئے، نماز سے فراغت کے بعد حضور ﷺ نے حقیقت حال دریافت فرما کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا تو وہ ڈرتے ہوئے قریب آئے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود کہتے ہیں کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، واللہ میں نے آپ ﷺ سے پہلے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ جیسے ناصحانہ ومشفقانہ انداز میں تعلیم وتربیت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا، واللہ نہ آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا نہ ڈرایا، بس اتنا فرمایا کہ

"إِنَّمَا الصَّلٰوةُ لِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، وَذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَإِذَا كُنْتَ فِيْهَا فَلْيَكُنْ ذٰلِكَ شَأْنُكَ". (رواه أبوداود، باب تشميت العاطس في الصلوٰة)

''معاویہ! نماز میں بات کرنا مناسب نہیں، نماز میں صرف تلاوت اور تسبیح وغیرہ کی اجازت ہے۔''

(۳) اس کے برعکس جب کبھی سختی کا موقع ہوتا تو آپ ﷺ اسی انداز میں اصلاح فرماتے، مثلاً ایک جلیل القدر صحابی سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ لغزش ہوئی کہ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی امامت کرتے ہوئے لمبی سورتیں پڑھنے لگے، جب اس بات کی اطلاع آپ ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ معاذ! کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہو؟ سورۂ طارق، سورۂ بروج، سورۂ شمس اور سورۂ

لیل اور سورۂ اعلیٰ جیسی سورتیں پڑھا کرو۔ (مشکوٰۃ، صفحہ: ۷۹، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ)

(۴) اسی طرح حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت چہیتے صحابی تھے، اُنھوں نے کسی غزوہ کے موقع پر ایک کافر پر تلوار اُٹھائی، اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا، حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے اس پر اس خیال سے تلوار چلا دی کہ وہ موت کے خوف سے کلمہ پڑھ رہا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور غصّے و حیرت سے پوچھا کہ اس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا؟ جب حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور! وہ دِل سے نہیں کہہ رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کا دِل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے بے قراری کے ساتھ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے رہے کہ اس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا؟ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مجھ سے یہی کہتے رہے، حتیٰ کہ میں نے تمنّا کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوتا۔

"حَتّٰى تَمَنَّيْتُ أَنِّيْ أَسْلَمْتُ يَوْمَئِذٍ". (رواه مسلم، باب تحريم قتل الكافر)

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا ایک طریقہ و انداز یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اولاً غلطی کا احساس دِلاتے، پھر نصیحت فرماتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں ایک نوجوان حاضر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا: یارسول اللہ! مجھے زِنا کی اجازت دیجیے۔ غور کیجیے کہ کس قدر جہالت و جرأت کی بات ہے؛ لیکن قربان جایئے معلم انسانیت کی تعلیم و تربیت پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکمت کے ساتھ اسے غلطی کا احساس دِلایا اور فرمایا کہ کیا کوئی تم اپنی والدہ، بیٹی، بیوی، خالہ اور پھوپھی وغیرہ کے لیے یہ گندی حرکت پسند کرو گے؟ اس نے کہا: بالکل نہیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی حال (سنجیدہ) لوگوں کا ہے، وہ بھی یہ حرکت اپنی ماں، بیٹی، بیوی، بہن، خالہ اور

پھوپھی وغیرہ کے لیے پسند نہیں کرتے، جب اسے اپنی غلطی کا ادراک واحساس ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور دُعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کے دل کو پاک کردے، اس کا گناہ معاف کردے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما، وہ نوجوان یہ کہتے ہوئے مسجد سے باہر نکلا کہ واللہ! جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا تو زِنا سے زیادہ پسندیدہ کام میری نگاہ میں اور کوئی نہیں تھا، اور اب یہ حالت ہے کہ میرے نزدیک زِنا سے زیادہ قبیح کام کوئی نہیں۔ (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۱۷۰۸)

(۶) کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح وتربیت کے لیے بیعت بھی فرماتے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ماہ پہلے اسلام لائے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلاح وتربیت کے لیے باقاعدہ بیعت لی، حدیث میں ہے:

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى إِقَامِ الصَّلٰوةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ، وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٢٣، باب الشفقة والرحمة على الخلق)

فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں پر بیعت لی: (۱) پابندی سے نماز پڑھوں گا۔ (۲) مکمّل زکوٰۃ ادا کروں گا۔ (۳) ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کروں گا۔

اس وفادار اور جاں نثار صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں پر اس قدر اہتمام سے عمل کیا کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ آپ کا یہ عجیب واقعہ منقول ہے کہ آپ نے ایک شخص سے تین سو درہم کے عوض ایک گھوڑا خرید لیا، پھر اس سے کہا کہ یہ گھوڑا تو تیں سو درہم سے زیادہ قیمت کا معلوم ہوتا ہے، پھر آپ قیمت بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ نو سو درہم کے عوض خرید لیا، کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات

پر بیعت کی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کروں گا، یہ شخص گھوڑے کی اصل قیمت نہیں جانتا تھا، گھوڑا کم قیمت میں بیچنا اس کی مجبوری تھی، میری نہیں۔

(توضیحات: ۷/۱۵۶)

تیسرا مقصد تعلیم کتاب وحکمت:

مقاصد بعثت میں تیسرا مقصد ہے تعلیم کتاب وحکمت، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (البقرة : ۱۵۱)

حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام اللہ کا معلم بنا کر مبعوث فرمایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد تا حیات ہر مناسب موقع، جگہ اور طبقے کو کتاب وحکمت کی وہ تعلیم دی جو تا قیامت کافی وشافی ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کتاب وحکمت کی تعلیم کا چلتا پھرتا ادارہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مناسب وقت اور ہر مناسب جگہ سے فائدہ اٹھا کر اُمّت کو کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور اپنی ذمّے داری ادا کی، دِن رات کا کوئی لمحہ اس میں رُکاوٹ نہ بن سکا، کبھی دن میں تو کبھی رات میں، کبھی سفر میں تو کبھی حضر میں، کبھی مَردوں کو تو کبھی عورتوں کو، کبھی مسجد میں تو کبھی گھر اور بازار میں، کبھی گھر والوں کو تو کبھی باہر والوں کو اپنے قول وعمل سے کتاب وحکمت کی تعلیم بھی دی اور ترغیب بھی دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور کتاب وسنّت میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، ہر ایک کی کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم:

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور تربیت بے مثال تھی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم بھی بے مثال تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم علم وعمل کی تعلیم بھی دیتے اور اس کی ترغیب بھی دیتے۔

(۱) جیسے حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "مَنْ يَأْخُذُ عَنِّيْ هٰذِهِ الكَلِمَاتِ، فَيَعْمَلُ بِهِنَّ، أَوْ يُعَلِّمُ مَنْ يَعْمَلُ بِهِنَّ؟"

''کون ہے جو مجھ سے پانچ باتیں سیکھے، پھر ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرنے والا ہو؟''

سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فوراً خود کو پیش کر دیا کہ حضور! میں تیار ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پیار و شفقت سے پکڑ کر ان پانچ باتوں کی تعلیم دینے لگے۔

"فَأَخَذَ بِيَدِيْ، فَعَدَّ خَمْسًا".

یہ شفقت کے ساتھ تعلیم دینے کا ایک طریقہ ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پانچ قیمتی باتوں کی تعلیم دی وہ یہ ہیں:

(۱) اِتَّقِ المَحَارِمَ، تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ.

''حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے (خواہ ان کا تعلق قول سے ہو یا عمل سے) ان سے بچو، اس کی برکت یہ ہوگی کہ تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔'' (اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مامورات پر عمل کرنا عبادت ہے، اسی طرح منہیات سے بچنا بھی عبادت ہے)

(۲) وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللهُ لَكَ، تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ.

''اللہ پاک کی تقسیم پر راضی ہو جاؤ (نعمتوں میں شکر کے ذریعے اور مصیبتوں میں صبر کے ذریعے) تو تم غنی بن جاؤ گے۔''

(۳) وَأَحْسِنْ إِلٰى جَارِكَ، تَكُنْ مُؤْمِنًا.

''اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو (جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی ذات اور زبان وغیرہ سے اس کو محفوظ رکھو، یہ اِتنا مبارک عمل ہے کہ اس کی برکت سے) تم مؤمن کامل بن جاؤ گے۔''

(٤) وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، تَكُنْ مُسْلِمًا.

(امورِ خیر میں) ''جو چیزیں تم اپنے لیے پسند کرو وہی لوگوں کے لیے بھی پسند کرو، اس کی برکت سے تم سچّے پکے اور اصلی مسلمان بن جاؤ گے۔''

(٥) وَلَا تُكْثِرِ الضِّحْكَ، فَإِنَّ كَثْرَةَ الضِّحْكِ تُمِيْتُ الْقَلْبَ. (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٤٤٠، كتاب الرقاق)

''زیادہ ہنسنے سے بچو، کیوں کہ زیادہ ہنسنا (اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت اور) دل کے مُردہ بن جانے کا سبب ہے۔''

یہ اتنی قیمتی باتیں ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے انسانیت خیر وسعادت کی حقدار بن جاتی ہے۔

(۲) یوں تو معلم کائنات ﷺ حق تعالیٰ کی جانب سے توجّہ دِلانے اور ترغیب دینے پر رات کو جلدی سونا پسند فرماتے تھے، حتیٰ کہ عشاء کے بعد غیر ضروری گفتگو بھی آپ ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے؛ لیکن جہاں تک تعلق ہے کتاب وحکمت کی تعلیم کا تو آپ ﷺ کبھی کبھی عشاء کے بعد بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب قائم فرمایا ہے "بَابُ السَّمَرِ فِي الْعِلْمِ" سونے سے پہلے رات کے وقت علمی گفتگو کے بارے میں یہ باب ہے۔ اس میں جو روایت بیان فرمائی وہ یہ ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا : "صَلّٰى بِنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ العِشَاءَ فِيْ أٰخِرِ حَيَاتِهٖ".

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری اَیام میں) ایک مرتبہ ہمیں نمازِ عشاء پڑھائی۔''

فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ، فَقَالَ: "أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ، فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الأَرْضِ أَحَدٌ".

پھر سلام پھیر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور علمی، دینی اور اصلاحی گفتگو کرنے لگے۔

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو تہائی رات گزر جانے کے بعد جب بیدار ہوتے تو اس وقت تعلیم دیتے، جیسے حدیث میں ہے:

"كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا ذَهَبَ ثُلُثَا اللَّيْلِ قَامَ، فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اُذْكُرُوْا اللهَ، اُذْكُرُوْا اللهَ، جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ، وَتَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٥٧)

''جب دو تہائی رات گزر جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے اور فرماتے: اے لوگو! اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، اپنی موت اور آخرت کی فکر اور تیاری کرو۔''

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا بنیادی مرکز اگرچہ مسجد تھا، اور مسجد نبوی میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقل ایک چبوترہ تعلیم کتاب وحکمت کے لیے مخصوص فرما دیا تھا، جہاں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم معلم انسانیت سے تعلیم حاصل فرماتے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی جہاں موقع میسّر ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ خواتین کی جانب سے نمائندگی کرتے ہوئے ایک عورت حاضر خدمت ہو کر

درخواست کرنے لگی کہ حضور! جس طرح مَردوں کو مختلف مقامات پر آپ تعلیم دیتے ہیں، ہمارے لیے بھی خاص کوئی مقام اور دِن متعین فرما دیجیے، جہاں ہم آپ سے تعلیم حاصل کیا کریں۔

"فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَفْسِكَ يَوْمًا نَأْتِيْكَ فِيْهِ، تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ".

(رواه البخاري، مشكوٰة : ۱۵۳، باب البكاء على الميت)

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کے لیے ایک خاص مقام اور دِن متعین فرما دیا اور حکم فرمایا کہ فلاں مقام پر فلاں دِن تم خواتین جمع ہوجایا کرو، تاکہ تمھیں بھی تعلیم دی جاسکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاتون کا گھر (بطورِ مدرسہ) متعین فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مدرسۃ البنات میں تشریف لاکر خواتین اُمّت کو تعلیم دیتے تھے۔

"فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَوْعِدُكُنَّ بَيْتُ فُلَانَةٍ، فَأَتَاهُنَّ، فَحَدَّثَهُنَّ". (فتح الباري : ۱/ ۱۹۶)

(۴) حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ سفر بھی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے فیضِ تعلیم سے محروم نہ فرماتے، حضر کی طرح سفر میں بھی تعلیم کا اہتمام فرماتے، چنانچہ منقول ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كُنْتُ أَقُوْدُ بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاقَتَهُ فِي السَّفَرِ، فَقَالَ لِيْ يَا عُقْبَةُ! أَلَا أُعَلِّمُكَ خَيْرَ سُوْرَتَيْنِ قُرِئَتَا، فَعَلَّمَنِيْ: قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ". (رواه أحمد، وأبوداود والنسائي، مشكوٰة : ۸۰)

''میں دورانِ سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کو ہانک رہا تھا، اس موقع پر آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عقبہ! کیا میں تمھیں دو ایسی سورتیں نہ سکھاؤں جو پڑھی جانے والی سورتوں میں بہترین ہیں؟ میں نے عرض کیا حضور! ضرور سکھائیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سورتیں معوذتین ہیں۔''

اندازہ لگائیے کہ سفر کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس نرالے انداز میں اولاً نام لے کر شوق دِلایا، پھر جب حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ اچھی طرح متوجہ ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معوذتین کی تعلیم وترغیب دی۔

(۵) سواری کے دوران بچّوں تک کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب موقع تعلیم دی، حدیث میں ہے:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالَ: "يَا غُلَامُ! إِنِّيْ أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ، اِحْفَظِ اللهَ، يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللهَ، تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى أَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَنْفَعُوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى أَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَضُرُّوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٥٣، باب التوكل والصبر)

''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سواری کے پیچھے سوار تھا، تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پیارے! میں تمھیں چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں (انھیں اچھی طرح محفوظ رکھو اور عمل میں لاؤ) پھر فرمایا: تم احکامِ الٰہی کی حفاظت کرو، اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت فرمائے گا، جب تم احکامِ الٰہی کی حفاظت کرو گے تو مصائب میں اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ

اور اپنے پاس پاؤ گے (اس کا احساس تمھیں مصائب کے وقت مطمئن رکھے گا) جب تمھیں کسی بھی (دینی یا دُنیوی) حاجت کا سوال کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنا، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے نہ مانگنا، جب بھی مدد مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگو، کسی اور سے نہیں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور یقین رکھو کہ اگر ساری انسانیت مل کر تمھیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تب بھی تمھیں اتنا ہی یا وہی نفع پہنچے گا جو حق تعالیٰ نے تمھارے مقدر میں لکھ دیا ہے، اسی طرح اگر ساری انسانیت مل کر بھی تمھیں کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو تمھیں اتنا ہی یا وہی نقصان پہنچے گا جو حق تعالیٰ نے تمھارے مقدر میں لکھ دیا ہے، تقدیر کے قلم لکھ کر فارغ ہو چکے ہیں اور صحائف خشک ہو گئے۔

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (التوبة : ۵۱)

اندازہ کیجیے! بچّوں کو بھی آپ ﷺ نے کس قدر ایمان وعقائد کی مضبوط تعلیم دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجّہ فرمایا۔ معلوم ہوا کہ بچّوں کو بھی ایمان وعقائد کی بنیادی تعلیم دینا نبوی طریقہ ہے۔

(۶) حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا تو اس کی بنیادی تعلیم کا بھی عموماً آپ ﷺ خود اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ

"كَانَ الرَّجُلُ إِذَا أَسْلَمَ عَلَّمَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ، ثُمَّ أَمَرَهُ أَنْ يَدْعُوَ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ، وَارْحَمْنِيْ، وَاهْدِنِيْ، وَعَافِنِيْ، وَارْزُقْنِيْ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۱۸، باب جامع الدعاء)

''جب کوئی اسلام قبول کرتا تو آپ ﷺ اس نو مسلم کو نماز سکھاتے اور اللہ

تعالیٰ سے دُعا مانگنا سکھاتے کہ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگے۔"

معلوم ہوا کہ نومسلموں کو ایمان کے بعد سب سے پہلے نماز اور دُعا سکھانی چاہیے۔

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تو چند نمونے اور مثالیں ہیں، ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ کتاب و سنّت میں آپ ﷺ کے جتنے ارشادات ہیں وہ تمام کے تمام ہی کسی نہ کسی طرح کی تعلیم و تربیت پر مشتمل ہیں، اس لیے کہ آپ ﷺ کی ذات علم الٰہی کا سب سے بہترین ادارہ و مدرسہ تھی۔

حق تعالیٰ ہمیں اور ہمارے تمام متعلقین و محسنین کو آپ ﷺ کی ہدایات و تعلیمات سے مستفید فرمائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

۱۲ر شعبان/ ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲۶ر مارچ/ ۲۰۲۱ء

(قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۱۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علمی سفرنامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ، مَنْهُوْمٌ فِيْ الْعِلْمِ لَايَشْبَعُ مِنْهُ، وَمَنْهُوْمٌ فِيْ الدُّنْيَا لَايَشْبَعُ مِنْهَا". (شعب الإيمان، مشكوٰة : ص۳۷ / كتاب العلم، الفصل الثالث)

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا، ایک علم کا حریص ہے، اس کا پیٹ (طلب) علم سے کبھی نہیں بھرتا (اسے علم سے کبھی سیرابی نہیں ہوتی، علم کے حصول میں کبھی اکتفا نہیں کرتا، یہ حرص محمود و مطلوب ہے) اور دوسرا دُنیوی مال و متاع کا حریص ہے، اس کا پیٹ بھی دُنیوی دولت و شہرت وغیرہ سے کبھی نہیں بھرتا (ظاہر ہے کہ یہ حرص مذموم ہے، اللھم احفظنا منہ، آمین)

علم کا سچا طالب کبھی سیر نہیں ہوتا:

اللہ تعالیٰ کی ذات تمام علوم و معارف کا ماخذ و مرجع ہے، اس کے علوم و معارف کی کوئی حد اور انتہا نہیں، حق تعالیٰ کے علوم کے سامنے مخلوقات کے علم کی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے سامنے قطرے کی ہے، کائنات کی تمام مخلوقات میں جسے جو کچھ علم ملا

ہے وہ ربّ العالمین کے دریائے علم کا ایک قطرہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے دریائے علم میں سے سب سے زیادہ حضرات انبیائے کرام ورُسل علیہم السلام کو نوازا، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کے سامنے اُمتیوں کے علم کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو سمندر کے سامنے قطرے کی ہے، اس کے باوجود چوں کہ علم الٰہی معرفت الٰہی، قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، اس لیے جس خوش نصیب کو حق تعالیٰ اپنے دریائے علم سے کوئی حصّہ عطا فرما کر اپنے قرب ورضا کا مزہ عطا فرمادیتے ہیں تو حصولِ علم کے لیے اس کی حرص وطلب بڑھ جاتی ہے، اسی کو حدیث مذکور میں فرمایا کہ

"مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ".

علم الٰہی کا سچا طالب وحریص کبھی سیر نہیں ہوتا۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں ایک اچھے اور سچّے طالب علم کی حقیقی ویقینی پہچان یہی ہے کہ وہ ہر وقت مزید علم کا طالب وخواہش مند رہتا ہے۔ چنانچہ علم کے سب سے بڑے طالب حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور ان میں بھی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم خاص تھے، ربّ العالمین نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام میں سب سے زیادہ علوم ومعارف سے نوازا تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید علم کی دُعا فرماتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ : ۱۱۴)

نیز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں میں بھی یہ مروی ہے:

"اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَا عَلَّمْتَنِيْ، وَعَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ، وَزِدْنِيْ عِلْمًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ". (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ : ۲۱۹)

''اے اللہ! جو علم آپ نے مجھے سکھایا ہے اسے میرے لیے نافع بنادیجیے، اور

مجھے وہی علم عطا فرمایئے جو میرے لیے نافع ومفید ہو، اور میرے علم میں اضافہ فرما دیجیے، اور ہر حال میں تمام تعریفیں آپ ہی کے لیے ہیں، اور میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں جہنّم والوں کے حال سے۔''

اسی طرح سیّدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا جو علمی سفرنامہ قرآنِ کریم نے بیان کیا اس سے بھی اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ علم کے سب سے بڑے طالب حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام ہوتے ہیں، ان کے بعد ان کے سچّے نائبین ووارثین ہوتے ہیں۔

احتیاط فی الکلام کی تعلیم:

قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی سفرنامے کا جو تفصیلی تذکرہ اور واقعہ بیان فرمایا وہ عجیب وغریب علمی وعملی عبرت ونصیحت کا مجموعہ ہے۔ (امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کتاب العلم میں دو جگہ: ۱/ ۱۷، ۱/ ۲۳، پھر کتاب التفسیر میں ۲/ ۶۷۲ سورۂ کہف کے تحت نقل فرمایا۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ۲/ ۲۶۹ پر اسے ذکر فرمایا، نیز امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ابواب التفسیر سورۂ کہف میں بیان فرمایا)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ سیّدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو وعظ ونصیحت فرما رہے تھے، لوگوں میں اس کا اس قدر اثر ہوا کہ لوگوں کی آنکھیں پرنم ہوگئیں اور دل نرم ہوگئے، جب آپ بیان فرما چکے تو کسی نے سوال کیا کہ حضرت! کیا دُنیا میں آپ سے بڑا بھی کوئی عالم ہے؟ آپ نے جواباً عرض کیا: نہیں، یہ جواب اگرچہ معنیٰ اور مقصد کے اعتبار سے درست تھا؛ کیوں کہ آپ الوالعزم پیغمبروں میں سے تھے، اس لیے آپ کے زمانے میں آپ سے بڑھ کر علم والا کون ہوسکتا تھا؟ مگر یہ جواب شانِ نبوت اور مقامِ رسالت کے مناسب نہیں تھا، سب سے زیادہ علم کی نسبت

مطلقاً اپنی طرف کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف کرنی چاہیے تھی کہ وہی تمام علوم کا ماخذ و مرجع ہے، مگر جب آپ نے سب سے زیادہ علم کی نسبت اپنی طرف کی تو اللہ تعالیٰ کو یہ جواب پسند نہ آیا، حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم دینے کے لیے وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! ہمارا ایک بندہ ''خضر'' مجمع البحرین میں ہے، اس کے پاس وہ علم ہے جو تمھارے پاس نہیں، اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حصولِ علم کی حرص و طلب بڑھ گئی اور آپ ان کی ملاقات کے مشتاق ہو گئے، عرض کیا: یا اللہ! حصولِ علم کے لیے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے اُن کا پتا بتا دیجیے! ارشاد ہوا: ایک ٹوکری میں مچھلی بھون کر رکھ لو اور مجمع البحرین کی جانب چل دو، جس جگہ وہ مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے وہیں تم ہمارے اس بندے کو پاؤ گے۔

حصولِ علم کی طلب:

اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حصولِ علم کے لیے سفر کا ارادہ فرمایا، ہدایت کے مطابق مچھلی بھون کر ٹوکری میں رکھ لی اور ایک نوجوان خادم حضرت یوشع بن نون (جو آپ کے بھانجے بھی تھے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے نائب بھی ہوئے) کو ساتھ لیا، قرآنِ کریم میں اسی کو بیان کیا گیا:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝﴾ (الکھف : ٦٠)

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان سے فرمایا کہ میں تو (طلب علم کے لیے) مسلسل چلتا ہی رہوں گا، جب تک مجمع البحرین نہ پہنچ جاؤں، خواہ مجھے سالہا سال سفر کرنا پڑے۔''

علم سچّی طلب کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، طلب اگر سچّی ہو تو حصولِ علم کے لیے

ہر طرح کی مشقت آسان ہوجاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں بھی سچّی طلب تھی، اس لیے اُنھوں نے ہر قسم کی مشقت سفر کو برداشت کرنے کا عزم فرمالیا۔ معلوم ہوا کہ حصولِ علم کے لیے سفر کرنا، صعوبتیں برداشت کرنا، نیز سفر کے لیے توشہ اور خادم کا اہتمام کرنا یہ سب انبیائے کرام علیہم السلام کی سنّت ہے۔

پھر یہاں اسلامی اَدب بھی ملاحظہ فرمایئے کہ قرآنِ کریم نے خادم کے لیے ''نوجوان'' کا لفظ استعمال فرمایا، معلوم ہوا کہ خادم جوان ہو اور اسے اچھے نام سے پکارا جائے، اسے سفر کی ذمّے داری اور تفصیلات سے باخبر بھی کردیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

مجمع البحرین:

اب دونوں حضرات سفر میں چل پڑے اور منزل بہ منزل آگے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ دونوں حضرات دِن رات کا سفر طے کرکے مجمع البحرین پہنچ گئے؛ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اُنھیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ہم منزلِ مقصود ''مجمع البحرین'' پہنچ گئے ہیں، حالانکہ حق تعالیٰ چاہتے تو پہلے ہی سے صاف طور پر جگہ اور مقام بتادیتے؛ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طلب کو واضح کرنا اور امتحان لینا مقصود تھا۔

یہ مجمع البحرین یعنی دو دریاؤں کا سنگم کہاں ہے؟ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کی ایک رائے تو یہ ہے کہ بحیرۂ احمر (Red Sea) کے شمالی کونے سے نکلنے والی کھاڑیوں (خلیج سویز اور خلیج عقبہ) کے مقام اتصال کو مجمع البحرین کہا جاتا ہے۔

جب کہ دوسری رائے کے مطابق یہ مقام دریائے نیل پر واقع ہے، کیوں کہ دریائے نیل دو دریاؤں یعنی "النیل الأزرق" اور "النیل الأبیض" سے مل کر بنا ہے، یہ دونوں دریا سوڈان سے نکل کر مصر میں داخل ہوتے ہیں، ایک دریا کے پانی کا

رنگ نیلا ہے اور دوسرے کا سفید، اس قول کے مطابق جس مقام پر یہ دونوں دریا مل کر ایک دریا (مصر کے دریائے نیل) کی شکل اختیار کرتے ہیں اس مقام کو "مجمع البحرین" کہا گیا ہے، یہ مقام خرطوم کی سرحد کے قریب ہے، یہ رائے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کی تعلیم:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خادم کے ساتھ مجمع البحرین پہنچ کر منزل سے بے خبر ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے، اسی دوران مچھلی اچانک حرکت میں آئی، پھر زندہ ہو کر زنبیل سے نکلی اور سمندر میں سرنگ کی طرح راستہ بناتی ہوئی چلی گئی، یوشع بن نون رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سارا معاملہ دیکھا؛ مگر اُنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا، سوچا کہ جب بیدار ہوں گے تو بتادوں گا، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو آپ کے خادم آپ کو یہ بات بتانا ہی بھول گئے اور سفر شروع کر دیا۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾﴾ [الکہف:٦١]

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چلتے وقت حضرت یوشع بن نون کو مچھلی کی نگہداشت کے لیے تاکید فرمائی تھی کہ تمھاری ذمے داری مچھلی کا دھیان رکھنا ہے، اس وقت اُنھوں نے کہا تھا کہ یہ کوئی ایسی بڑی اور اہم ذمے داری نہیں ہے کہ جس کی حفاظت کی تاکید کی جائے، حق تعالیٰ نے نسیان طاری فرما کر یہ سبق دیا کہ معمولی کام میں بھی انسان کو اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (مستفاد از انوار البیان: ٦/ ٨٢)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے مزید ایک دِن رات کا سفر کیا، دوسرے دِن صبح کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھوک اور

تھکان محسوس کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (الکھف : ٦٢)

''ناشتہ لاؤ! ہمیں تو اپنے اس سفر سے سخت تھکان لگی ہے۔''

آج کے اس سفر سے ہم خوب تھک گئے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے آپ نے تھکان محسوس نہیں کی؛ لیکن جب منزلِ مقصود سے آگے نکل گئے تو اب تھکان کا احساس ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بامقصد محنت سے آدمی تھکتا نہیں، جب کہ بے مقصد محنت تھکان اور مشقت کا سبب ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی مشقت کا اظہار جائز ہے، یہ کمال کے منافی نہیں، البتہ بے صبری اور شکوہ ممنوع ہے۔

اسی طرح ﴿اٰتِنَا غَدَآءَنَا﴾ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کو بھی بھوک لگتی ہے، یہ بات نہ نبوت کے منافی ہے نہ ولایت کے۔

المختصر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھانا طلب کیا تو مچھلی نہ دارد، اس وقت حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو مچھلی کے زندہ ہوکر پانی میں چلے جانے کا واقعہ یاد آیا، اُنھوں نے ندامت کے ساتھ معذرت پیش کرتے ہوئے عرض کیا:

﴿قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ﴾ (الکھف : ٦٣)

''حضرت! کیا عرض کروں، میں تو آپ کو بتانا ہی بھول گیا کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس آرام کیا تھا تو میں (وہاں) مچھلی بھول گیا تھا۔''

واقعہ یہ ہے کہ علمی سفر میں طالب علم پر شیطان مختلف حملے کرتا ہے، منجملہ ان کے ایک نسیان بھی ہے، بار بار یاد کرنے کے باوجود طالب علم بھول جاتا ہے، کبھی یہ شیطانی اثر ہوتا ہے اور کبھی گناہوں کا اثر ہوتا ہے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ﴾ (الکھف : ٦٤)

''ارے بندۂ خدا! ہمارا مقصود وہی جگہ تو تھی جہاں مچھلی گم ہوئی۔'' پھر دونوں حضرات اسی راستے سے واپس لوٹے جس پر چلے تھے، تاکہ وہ جگہ مل جائے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات:

جب وہ دونوں اسی چٹان کے پاس آئے تو وہاں ایک بندۂ خدا کو موجود پایا۔

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکھف : ٦٥)

یہ بندۂ خدا وہی تھے جن کی ملاقات کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ علمی سفر فرمایا تھا، احادیث طیبہ میں ان کا نام ''خضر'' بیان ہوا ہے، یہ ان کا وصفی نام ہے، اصل نام بلیا بن ملکان، کنیت ابو العباس اور لقب خضر (سبزہ زار) تھا۔

حدیث پاک میں ''خضر'' کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک بار حضرت خضر علیہ السلام ایک سوکھی سفید زمین پر بیٹھے، تو اچانک وہ سبزہ زار ہوگئی اور لہلہانے لگی، تب ہی سے آپ کا لقب ''خضر'' ہوگیا۔ نیز یہ بھی منقول ہے کہ آپ جہاں جاتے وہ جگہ سرسبز ہوجاتی تھی۔ (معارف القرآن ادریسی: ٥/٦، انوار القرآن: ٦/٧١)

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو ٹھہرے تو جس شجر تلے وہ نہال ہو

حق تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے دو وصف بیان فرمائے:

(۱) ﴿اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا﴾ (الکھف : ٦٥)

''ہم نے ان کو اپنی خصوصی رحمت سے نوازا ہے۔''

(۲) ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکھف : ٦٥)

''ہم نے ان کو ہماری جانب سے خاص علم عطا فرمایا ہے۔''

''رحمت'' سے مراد یہاں یا تو ولایت ہے، یا عام قبولیت ہے، یا نبوت ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے، صحیح یہی ہے کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور زندہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ (جامع الفتاوی: ۲/ ۲۵۴)

اور ''علم'' سے مراد علم باطنی ولدنّی ہے، جس میں اسبابِ ظاہرہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور جس علم میں اسبابِ ظاہرہ کا دخل ہوا سے علم اکتسابی کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو علم من جانب اللہ دِل میں القا کیا جائے وہ علم لدنی ہے، اور جو علم دل میں کسی سبب کے واسطے سے آئے اسے علم اکتسابی کہتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرعیات کا علم عطا فرمایا تھا اور حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات کا۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست.....

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات پر جب سلام کیا تو اُنھوں نے جواباً فرمایا: "وعليك السلام، يا نبي بني إسرائيل!" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کو میرا نبی ہونا کس نے بتایا؟ فرمایا کہ جس نے آپ کو میرا پتا بتایا۔ (انوار القرآن: ۶/ ۷۳)

حضرت خضر علیہ السلام کی معیت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام عرض کرنے لگے:

﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾﴾ (الكهف : ٦٦)

''میں آپ کی (معیت اور) تابعداری میں رہنا چاہتا ہوں، تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس علم مقدس سے آپ کو نوازا ہے وہ آپ مجھے بھی سکھائیں، عطا فرمائیں۔''

سبحان اللہ! حضرت موسیٰ علیہ السلام کس قدر تواضع سے گفتگو فرما رہے ہیں، ہر لفظ سے اَدب اور تواضع ٹپک رہی ہے۔ "هَلْ أَتَّبِعُكَ" سے اتباع کی اجازت چاہی کہ آپ کی اجازت ہو تو میں خود کو آپ کا تابع بنالوں۔ "عَلَىٰٓ أَنْ تُعَلِّمَنِ" سے اقرار واعتراف معلوم ہوتا ہے کہ آپ بڑے عالم ومعلم ہیں، میں آپ کا متعلّم بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ "مِمَّا عُلِّمْتَ" فرما کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے بعض علم کی درخواست کی کہ آپ اپنے علم میں سے کچھ حصّہ مجھے مرحمت فرمائیں۔ نیز "مِمَّا عُلِّمْتَ" سے یہ حقیقت بھی واضح فرمادی کہ یہ علم آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوا ہے۔ پھر لفظ "رُشْدًا" سے یہ بتایا کہ ربّ العالمین کے دریائے علم سے ملنے والا آپ کا علم سراپا رُشد وہدایت ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کا اَدب یہی ہے کہ متعلّم اپنے معلّم کی خوب تعظیم وتکریم کرے، اگرچہ شاگرد اپنے اُستاذ سے بڑا اور افضل ہی کیوں نہ بن جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بعد حصولِ علم کے لیے ان کی معیت میں کچھ وقت رہنے کی اجازت طلب کر رہے تھے تب ایک چڑیا آئی، جس نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں کچھ پانی لیا، تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے تمھارا اور میرا علم اِتنا بھی نہیں ہے جتنا اس پرندے نے سمندر سے لیا ہے۔ (انوار البیان: ۳/۴۲۷)

یہ بھی محض تفہیم کے لیے ہے، ورنہ "أَيْنَ التُّرَابُ وَرَبُّ الْأَرْبَابِ؟"

معلم کا متعلّم سے مناسب شرائط پر پہلے سے قول وقرار لینا جائز ہے:

پھر بھی اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو واقعہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ صبر

نہیں کرسکو گے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾﴾ (الکھف : ٦٧)

کیوں کہ تم پابند شریعت ہو، جس کا دارومدار ظاہر پر ہے، اس لیے میرے بعض کاموں کو تم شریعت کے خلاف پاکر صبر نہیں کرسکو گے، حالانکہ آپ میری خلافِ شرع باتوں پر انکار سے معذور ہوں گے؛ لیکن میں بھی ان امور کے انجام دینے میں معذور ہوں گا، کیوں کہ میں من جانب اللہ ان کاموں کا مامور ہوں اور من جانب اللہ ان کی باطنی حکمتوں پر مطلع ہوں، جب کہ آپ ان مصالح سے آگاہ نہیں ہوں گے، اس لیے آپ میری باتوں پر صبر نہیں کرسکیں گے۔

﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾﴾ (الکھف : ٦٨)

اس کے بعد اگر آپ کی جانب سے سوالات، مؤاخذہ اور روک ٹوک کا سلسلہ جاری رہا تو پھر تعلیم وتعلم کا سلسلہ کیسے جاری رہے گا؟ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان تھا کہ ایسے مقرّب اور مقبول بندے سے کوئی غلط حرکت تو کم از کم صادر نہیں ہوگی جو ان کی شریعت بلکہ عام شرائع واخلاق کے بھی خلاف ہو، اور وہ نکیر کرنے پر مجبور ہوں گے، اس لیے آپ نے وعدہ کرلیا اور تبرک کے طور پر ان شاء اللہ کی قید بھی لگائی۔

﴿قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾﴾ (الکھف:٦٩)

حضرت خضر علیہ السلام کشف سے سمجھ گئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خلافِ شرع باتوں پر صبر نہیں کرپائیں گے، اس لیے آپ نے پیشگی طور پر یہ پابندی لگا دی کہ اگر تم میری معیت میں رہنا ہی چاہتے ہو تو شرط یہ ہے کہ بظاہر کوئی بھی بات تم کو ناحق نظر آئے تو فوراً مجھ سے باز پرس نہیں کرو گے کہ یہ کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں خود ہی مناسب وقت پر اپنے کیے ہوئے کام کی حقیقت بتادوں گا۔

﴿قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝﴾ (الکھف:۷۰)

اس سے ثابت ہوا کہ معلم کو متعلّم کے سامنے مناسب شرائط رکھنے کا حق ہے، اور طالب علم کو بھی ان شرائط کی پابندی کرنی چاہیے۔

اس طرح باہم قول وقرار کے بعد دونوں حضرات نے اگلا سفر شروع فرمایا، جس میں تین واقعات پیش آئے۔ اب آگے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ذکر نہیں ملتا، ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے ملاقات کے بعد انھیں واپس بھیج دیا ہو۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ انھیں آپ نے مجمع البحرین پر ٹھہرا دیا ہو کہ واپسی میں ساتھ کرلیں گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ساتھ ہی ہوں؛ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع ہونے کی وجہ سے اصل متبوع کا ذکر کرکے تابع کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہو۔ مفسرین عام طور پر یہ تیسرا احتمال لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (ہدایت القرآن:۲۴۵)

پہلا واقعہ:

قصہ مختصر! سفر کے اگلے مرحلے میں اس مقام پر پہنچے جہاں سے آگے بڑھنے کے لیے کشتی کی ضرورت پیش آئی، اللہ کی شان کہ کچھ ہی دیر میں ایک کشتی آئی جس کا ملّاح حضرت خضر علیہ السلام کا شناسا، معتقد اور مرید تھا، اس نے بصد تعظیم وتکریم انھیں مفت سوار کرلیا۔

﴿فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۖ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ۝﴾ (الکھف : ۷۱)

لیکن کچھ دور چل کر حضرت خضر علیہ السلام نے کلہاڑی کے ذریعے کشتی کا ایک تختہ نکال دیا، اس طرح کہ کشتی عیب دار ہوجائے؛ مگر پانی اندر داخل نہ ہوسکے، دیکھنے

والا کشتی دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کشتی نہیں؛ کباڑ ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ کشتی کا تختہ اُترتے وقت توڑا اور نکالا تھا، جیسا کہ ﴿لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

یہ واقعہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران ہو گئے کہ احسان کا بدلہ نقصان؟ آپ سے صبر نہ ہوسکا، فرمایا: حضرت! یہ آپ نے کیا کر دیا؟ کیا آپ کشتی والوں کو غرق کرنا چاہتے ہیں؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم کشتی تو عیب دار ہو ہی گئی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: دیکھیے! آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا کہ آپ اپنے معاہدے پر برقرار نہیں رہ سکیں گے، فوراً چھلک گئے نا!

﴿قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝﴾ (الکھف : ۷۲)

حضرت خضر علیہ السلام کے توجّہ دِلانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت پیش کی کہ مجھے بالکل خیال نہیں رہا، بھول ہوگئی۔

﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۝﴾ (الکھف:۷۳)

معلوم ہوا کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی بھول ہو جاتی ہے، چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے کی صراحت ہے:

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝﴾ (طٰہٰ:۱۱۵)

اسی طرح حدیث پاک میں ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھول جانا ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر میں چار کے بجائے پانچ رکعات پڑھا دیں اور آخر میں سجدۂ سہو فرمایا، نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی ایک انسان ہوں، جس طرح اور لوگوں سے بھول ہوتی ہے مجھ سے بھی ہو جاتی ہے (مسند احمد)

اس لیے بھولنا نہ کمالِ نبوت کے خلاف ہے نہ کارِ نبوت کے منافی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بھول پر معذرت چاہی کہ بھول چوک پر نرمی اور چشم

پوشی ہو، سخت گیری نہ ہو، ورنہ میرے لیے آپ کی معیت مشکل ہو جائے گی۔

گذشتہ را اصلوٰۃ آئندہ را احتیاط

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عذر قبول کر لیا گیا اور آگے بڑھنے لگے۔

دوسرا واقعہ:

دونوں حضرات کشتی سے اُتر کر خشکی میں چلنے لگے۔

﴿فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ﴾ (الکھف : ٧٤)

دونوں حضرات نے چند بچّوں کو دیکھا جو کھیل رہے تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے جو بچّہ سب سے زیادہ حسین اور خوب صورت تھا اسے پکڑا اور گردن مروڑ کر مار ڈالا۔ اس حیرت انگیز قتل اور بھیانک و دل دوز واقعے کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بے تاب ہو گئے۔

﴿ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا نُّكْرًا ﴾ (الکھف:٧٤)

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے: حضرت! آپ نے تو غضب ہی کر دیا، ایک معصوم اور بے قصور بچّے کو ایک دم ڈھیر کر دیا، کشتی کے نقصان کا تدارک تو کسی طرح ممکن بھی تھا، یہ تو جان کا معاملہ ہے، اس کی تلافی کی تو کوئی صورت بھی نہیں، کیوں کہ مالی نقصان کے مقابلے جانی نقصان زیادہ ہوتا ہے، اس کی کیا توجیہ یا تاویل ہو سکتی ہے؟ اس مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھول کر نہیں؛ بلکہ بہ ہوش و حواس نکیر فرمائی؛ کیوں کہ احکام شریعت کے خلاف ورزی پر عام صالحین خاموش نہیں رہ سکتے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی ہو کر کیسے خاموش رہتے؟

اس سے معلوم ہوا کہ ظاہری احوال پر حکم لگانا جائز ہے، جب کہ اس کے خلاف کا علم نہ ہو۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ عہد

شکنی کرتے دیکھا تو اب کی بار تنبیہ میں تاکید بڑھا دی:

﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ (الکھف : ۷۵)

''کیا میں نے تمھیں پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ تم میری معیت میں ہرگز صبر نہیں کرسکو گے؟''

پھر وہی بات ہوئی نا! جو میں نے کہی تھی۔ اب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اندازہ ہوگیا کہ اس قسم کے حیرت انگیز واقعات پر میرے لیے صبر کرنا واقعی مشکل ہے، اس لیے آپ نے آخری بات کہہ دی کہ اخیری مرتبہ درگذر فرما دیجیے! آئندہ اگر کوئی سوال کروں تو مجھے اپنی معیت میں نہ رکھیے، آپ بھی معذور ہوں گے اور میری جانب سے کوئی الزام نہ ہوگا، کیوں کہ تین مرتبہ موقع دینے سے حجت پوری ہوجائے گی۔

﴿قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا﴾ (الکھف : ۷۶)

اس مرتبہ بھی خضر علیہ السلام نے وہ بات رفت وگذشت ہوجانے دی۔

تیسرا واقعہ:

دونوں حضرات پھر آگے بڑھے اور ایک بستی میں پہنچے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ بستی ''انطاکیہ'' تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ''اُندلس'' کی کوئی بستی تھی۔ اور محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''ایکہ'' کی بستی تھی۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن: ۵/ ۶۱۸)

یہ حضرات بستی کے لوگوں سے ملے اور مہمان و مسافر کی حیثیت سے کھانا طلب کیا، پرانے زمانے میں جب گیسٹ ہاؤس اور ہوٹلس وغیرہ کا نظام نہیں تھا تو مہمان اور مسافرین بستی والوں سے اپنا حق سمجھ کر کھانا طلب کر لیتے اور بستی والے بھی ان کی

مہمان نوازی کو اپنا فریضہ سمجھتے اور عموماً نہایت خوش دلی سے اس فریضے کو انجام دیتے؛ مگر اس بستی کے باشندے کچھ ایسے سخت دل تھے کہ پوری بستی میں کسی ایک نے بھی از خود کھانا تو نہیں کھلایا، طلب کرنے پر بھی اُنھوں نے انکار کر دیا۔

﴿فَانْطَلَقَا ۖ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا﴾ (الکھف : ۷۷)

جس کی وجہ سے ان حضرات کو بھوکا رہنا پڑا، اس بستی میں ایک بڑی بھاری دیوار گرنے کے قریب تھی، بستی والے وہاں سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے (بطورِ معجزہ) اپنے ہاتھ سے اسے درست کر دیا۔

﴿فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ﴾ (الکھف : ۷۷)

معلوم ہوا کہ معیشت اور اس کے اسباب کا اختیار کرنا بھی منافی کمال نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا کہ ایسے بے مروّت لوگوں کے ساتھ یہ سلوک؟ جہاں سلوک کرنا چاہیے تھا وہاں تو کیا نہیں، یہ کون سا موقع تھا؟ بالآخر آپ نے اعتراض کر ہی دیا:

﴿لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝﴾ (الکھف : ۷۷)

کم از کم کچھ معاوضہ ہی لے لیتے، جس سے ہمارا کام بھی آسان ہو جاتا اور ان بخیلوں کو بھی تنبیہ ہو جاتی۔ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رُخصت ہونے کے لیے جان کر اعتراض کر دیا، آپ سمجھ گئے تھے کہ یہ علم میرے بس کا نہیں۔ (معارف القرآن ادریس: ۵/ ۳)

کیوں کہ ایک جگہ قیل وقال باعث کمال تو دوسری جگہ باعث زوال! اس لیے دونوں کا نبھاؤ مشکل نظر آیا۔ اس موقع پر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ﴾ (الکھف : ۷۸)

''یہ میرے اور تمھارے درمیان جدائی کا وقت ہے۔'' تم نے خود کہا تھا کہ اگر میں پھر کچھ پوچھوں تو مجھے اپنی معیت میں مت رکھنا، لہٰذا آپ حسب وعدہ مجھ سے علیحدہ ہوجایئے! آپ کا نباہ میرے ساتھ مشکل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب مرید و متعلّم سے مناسب موافقت کی اُمید نہ ہو تو اسے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود مرید اور طالب علم بھی جس علم کا تحمل نہ کرسکے اس سے عذر کرسکتا ہے۔

پہلے واقعے کی حکمت وحقیقت:

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جدا ہونے سے پہلے تینوں واقعات کی حکمت وحقیقت سے باخبر کرنا مناسب سمجھا، چنانچہ فرمایا:

﴿اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکھف : ۷۹)

پہلے واقعے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کشتی چند مساکین ومحتاج لوگوں کی تھی جو سمندر میں محنت ومزدوری کرتے تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ دس بھائی تھے، جن میں سے پانچ معذور تھے اور پانچ مزدور تھے جو سبھی کے لیے معاش کا انتظام کرتے تھے، دریا میں کشتی چلا کر جو مزدوری ملتی اس سے وہ گذر بسر کرتے۔ (معارف القرآن: ۶۱/۵)

اب یہ کشتی جدھر جارہی تھی اس طرف آگے ایک ظالم وغاصب حاکم کی عمل داری شروع ہوتی تھی، جو اُدھر سے گزرنے والی ہر اچھی کشتی کو لے لیتا اور عیب دار کشتی کو چھوڑ دیتا، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اس کشتی کو (بحکم الٰہی) اس لیے عیب دار بنادیا کہ وہ بچ جائے اور ان مزدوروں کا گذر بسر چلتا رہے۔ دانائے روم

نے اسے یوں بیان کیا:

گر خضر در بحر کشتی را شکست　　صد درستی در شکستِ خضر ہست

''اگر حضرت خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی توڑ ڈالی تو اس میں کیا بُرا کیا، یہ تو دیکھو کہ حضرت خضر علیہ السلام کے کشتی توڑنے میں سو مصلحتیں ہیں۔''

دوسرے واقعے کی حکمت وحقیقت:

دوسرے واقعے کی حکمت وحقیقت سے باخبر کرتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ (الکھف : ۸۰)

وہ جو خوب صورت لڑکا تھا نا! جس کو میں نے مار ڈالا تھا، تو اس کی حکمت و مصلحت یہ تھی کہ اس کے والدین نہایت صالح اور ایمان دار تھے، جب کہ وہ لڑکا کافر اور سرکش تھا۔ یوں تو ہر بچّہ فطرتِ اسلام پر ہی پیدا ہوتا ہے؛ لیکن بعض اوقات خارجی اثرات کی وجہ سے شروع ہی سے بنیاد بُری پڑ جاتی ہے؛ مگر اس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا، اس بچّے کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا، جس کی اطلاع وعلم من جانب اللہ حضرت خضر علیہ السلام کو دیا گیا کہ اس بچّے کی اُفتادِ بنیاد ہی بُری ہے، اگر یہ زندہ رہا تو بڑا ہو کر خود بھی گمراہ ہوگا اور ماں باپ کی گمراہی کا بھی ذریعہ بنے گا، حق تعالیٰ اس کے والدین کے ایمان کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے، اس لیے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے بہ حکم الٰہی اس لڑکے کا کام ہی تمام کر دیا۔ اس طرح اس بچّے کا مارا جانا اس کے والدین کے حق میں ایمان کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بن گیا، اور جو صدمہ انھیں پہنچا حق تعالیٰ نے صبر کی وجہ سے اس کی تلافی ایسی اولاد سے کر دی جو

پاکیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر تھی اور ماں باپ پر لطف و مہربانی میں بڑھ کر تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مقتول کے والدین کو ایک لڑکی دی، جو بڑی نیک تھی، اس کا ایک نبی سے نکاح ہوا، جس کے پیٹ سے بھی ایک نبی پیدا ہوئے اور ان سے اللہ تعالیٰ نے ایک اُمّت کو ہدایت عطا فرمائی۔ اس طرح یہ نیک بخت لڑکی اُس بد بخت لڑکے کا بدل بن گئی۔ (معارف القرآن: ۵/ ۶۲۱)

تیسرے واقعے کی حکمت وحقیقت:

اب رہی بات اس دیوار کی جسے میں نے بخیلوں کی بستی میں مفت درست کر دیا، اس کی حکمت وحقیقت بھی جان لیجیے:

﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا﴾ (الکھف : ۸۲)

دراصل وہ دیوار اُس شہر کے دو یتیم بچّوں کی تھی، ظاہر بات ہے کہ یتیموں سے اُجرت لینا مناسب نہیں تھا، مزید برآں اُس دیوار کے نیچے ایک خزانہ مدفون تھا، اگر وہ دیوار گر جاتی تو خزانہ ظاہر ہو جاتا اور بستی کے بخیل لوگ اسے لوٹ لیتے اور وہ یتیم بچّے بے چارے کم سنی اور کم زوری کے سبب کچھ نہ کر پاتے، حق تعالیٰ نے میرے ذریعے دیوار کو درست کروا کر اس کی حفاظت کا انتظام فرما دیا، کیوں کہ یہ خزانہ اُن یتیم بچّوں کا تھا جو ان کے باپ سے انھیں میراث میں ملا تھا۔

﴿وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾ (الکھف : ۸۲)

''ان بچّوں کا باپ مردِ صالح تھا۔'' حق تعالیٰ نے اس کی نیکی کے عوض اولاد کو نفع پہنچانے کا انتظام فرما دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کی نیکی کا اثر اور نفع حق تعالیٰ اولاد میں بھی منتقل فرماتے ہیں۔ حضرت محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ ایک بندے کی نیکی اور صالحیت کی وجہ سے اس کی اولاد در اولاد اور اس کے خاندان حتیٰ کہ قرب وجوار کے مکانات کی بھی حفاظت فرماتے ہیں۔ (معارف القرآن:۵/۲۲۲)

نیز ﴿وَكَانَ أَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾ سے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ لوگوں کو علماء وصلحاء کی اولاد کی رعایت وحفاظت کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے، جب تک کہ وہ۔العیاذ باللہ۔بالکل ہی کفر وفسق میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

(تفسیر مظہری:۶/۶۰)

اس کے بعد آگے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی رائے سے نہیں کیا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا:

﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ﴾ (الکھف : ۸۲)

اور جو کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور مشیت سے کرنا ضروری ہوا اس پر اُجرت نہیں لی جاسکتی، اس قاعدے اور ضابطے کے تحت میں نے مزدوری نہیں لی۔فقہاء نے اس آیت سے یہ ضابطہ بنایا کہ ''طاعاتِ مقصودہ پر اجارہ باطل ہے۔'' (ہدایت القرآن:۲۵۲)

نیز ﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ أَمْرِيْ﴾ (الکھف:۸۲) سے ان لوگوں کی بھی تردید ہوگئی جو صالحین وکاملین کے لیے خلافِ شرع امور کا صدور فی الواقع جائز سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کے یہ کام بامر اللہ تھے۔ (انوار القرآن:۶/۹۸)

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ شریعت اور طریقت ایک ہی چیز ہے۔ بعض نادان دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ شریعت میں بعض چیزیں حرام ہیں جو طریقت میں حلال ہیں، وغیرہ، یہ سخت گمراہی کی بات ہے۔حضرت خضر علیہ السلام پر دُنیا کے کسی بھی ولی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، نہ کسی ولی کے ظاہر شریعت کے خلاف قول وعمل کو جائز کہا جاسکتا ہے۔

خلاصہ:

حضرت خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حکمتوں اور حقیقتوں سے واقف کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝﴾ (الکھف : ۸۲)

لیجیے! یہ ہے وہ باطنی حقیقت اور چیزوں کی تاویل جن کے ظاہر کو دیکھ کر آپ سے صبر نہ ہوسکا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ شریعت کے ظاہری احکام کی بنیاد پر معذور و مجبور تھے، تو میں باطنی احکام کی وجہ سے مجبور تھا۔ اور میں نے حسب وعدہ آپ کو تمام واقعات کی تاویلات سے آگاہ کردیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے رُخصت ہوگئے۔

حق تعالیٰ نے متعدد عبرتوں اور حکمتوں کے تحت اس سفرنامے کا تذکرہ قرآنِ کریم میں فرمایا۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ واقعہ پورا ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش! حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر کرلیتے تو عبرتوں اور حکمتوں سے لبریز مزید خبریں ہمیں معلوم ہوتیں۔ (مستفاد از معارف القرآن: ۵/ ۶۱۲)

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر حکم حکمت سے لبریز ہے، خواہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ حق تعالیٰ ہمیں اپنے فیصلوں پر راضی فرمالیں اور ہم سے دارین میں ہمیشہ کے لیے راضی ہوجائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۱۵/ شعبان المعظم/ ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲۹/ مارچ/ ۲۰۲۱ء، بروز پیر

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۷)

جہالت، غربت اور غفلت کا شرعی حل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا أٰتَاهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة :٤٤٠، كتاب الرقاق)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص فلاح ونجات کو پہنچ گیا جس نے اسلام قبول کرلیا (پھر اسلامی شریعت پر اخلاص واستقامت کے ساتھ تا موت عمل کرتا رہا، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ. آمین) اور اسے بقدرِ کفایت (مراد اتنی حلال روزی جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے کافی ہو) روزی دی جائے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا اس پر قناعت (اطمینان اور رضا) نصیب ہوجائے۔

ملک وملّت کی بہتری کے تین بنیادی اصول:

اللہ ربّ العزت نے اس دارالاسباب میں کسی بھی قوم، سماج اور ملک کی ظاہری ترقّی، خوش حالی وبہتری کو تین چیزوں کے ساتھ جوڑا ہے: (۱) تعلیمی نظام مضبوط ہو۔ (۲) معاشی نظام درست ہو۔ (۳) امن اور عدل وانصاف قائم ہو۔ قوم وسماج اور ملک وملّت میں بہتری لانے کے یہی تین بنیادی اصول ہیں، ان کے بغیر ترقّی وخوش حالی بظاہر مشکل ہے۔

آج سماج اور قوم وملّت کی اکثریت پستی وبدحالی میں مبتلا ہے تو اس کی بنیادی وجہ جہالت، غربت اور غفلت ہے، نہ ہمارا تعلیمی نظام درست ہے، نہ معاشی نظام مضبوط ہے، نہ عدل اور امن وسلامتی ہے، عدلیہ اور ملک وملّت کا ہر چھوٹا بڑا ذمّے دار اپنی ذمّے داریوں سے تقریباً غافل ہے، ایسی صورت میں ملک وملّت میں خوش حالی کیسے آسکتی ہے؟ اس کے لیے تعلیمی، معاشی اور عدل وامن کا نظام مضبوط کرنا پڑے گا، تب ہی قوم وسماج اور ملک وملّت میں خوش حالی وترقّی آسکتی ہے۔

اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائے بیت اللہ کے موقع پر مکہ کی آبادی اور خوش حالی کے لیے جو دُعائیں مانگی تھیں ان میں اِن ہی تین چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ طلب کیا:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۲۶)

''اے اللہ! اس کو امن وسلامتی والا شہر بنادے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔''

پھر آگے دُعا میں عرض کیا کہ ان کی تعلیم کے لیے اپنا آخری رسول بھی ان میں سے مبعوث فرما:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ (البقرۃ : ۱۲۹)

حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دُعا قبول فرما کر تینوں چیزیں عطا فرمادیں اور دارین کی ترقّی وخوش حالی سے مالا مال فرمادیا۔

جہالت کا حل تعلیمی ترقّی میں ہے:

حق تعالیٰ نے سب سے پہلے تعلیمی نظام کی مضبوطی کے لیے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابِ ہدایت کے ساتھ مبعوث فرما کر جہالت وضلالت کے بیماروں کو پہلا سبق یہی دیا کہ

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ (العلق:۱-۵)

ان آیات میں تعلیم کی ترغیب دی گئی کہ جہالت کا حل تعلیم ہے، لہٰذا تعلیم و تربیت کا اہتمام کرو، اپنا تعلیمی نظام خود ہی قائم اور مضبوط کرو، اگرچہ یہ ذمّے داری کسی بھی ملک میں حکومت کی ہے کہ وہ اپنے عوام کی تعلیم، صحت وروزگار اور عدل وغیرہ کی فکر کرے؛ لیکن ہمارے ملک کی موجودہ حکومت تو صاف کہہ رہی ہے کہ ”آتم نربھر (خود کفیل) بنو۔“ اس لیے دانائی وسمجھ داری یہی ہے کہ وطن عزیز کے مسلمان اپنے تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل ازخود حل کریں، ان کا حل موجودہ حکومت کے پاس نہیں ہے۔

شریعت میں ان کا حل ہے، چنانچہ شریعت نے جہالت کا حل تعلیم میں رکھا ہے، اس لیے وحی الٰہی میں سب سے پہلے تعلیم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اِقْرَاْ﴾ پڑھو، مگر کیا پڑھو؟ یہ بیان نہیں کیا، ہاں یہ ضرور ارشاد ہوا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ اس میں یہ بتایا کہ سب سے پہلے اپنے خالق کی پہچان کا علم حاصل

کرو، یہ علم تمھیں بنیادی طور پر مکاتب قرآنیہ اور مدارسِ اسلامیہ میں سکھایا جاتا ہے، اس لیے جگہ جگہ ہر مسجد میں مکاتب قرآنیہ اور مدارسِ اسلامیہ کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور ان میں بنیادی عقائد، قرآنِ پاک اور مسنون دُعائیں سکھائی جائیں، مزید معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لیے جامعات اور دارالعلوم کا رُخ کیا جائے، وہاں تعمیری نظام سے زیادہ تعلیمی نظام کو مضبوط کیا جائے، ان میں بچّوں کی تعداد سے زیادہ استعداد پر توجّہ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ آسانی فرمائیں تو معرفت الٰہی کا ضروری علم حاصل کرنے کے بعد ہر وہ علم حاصل کر سکتے ہو جو ہمارے اور قوم وملّت کے لیے نافع ہو اور رب کی ناراضی کا ذریعہ نہ ہو، وہ علم قرآن وحدیث کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھی ہوسکتا ہے، قانون اور سیاست کا بھی ہوسکتا ہے اور بزنس واقتصادیات کا بھی ہوسکتا ہے۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے خلوص کے ساتھ ان تمام علوم کو حاصل کرنا وقت کا تقاضا ہے۔

تعلیم کی ترغیب:

قرآنِ کریم نے معرفت الٰہی اور اسلامی علوم کے حصول کے ساتھ سائنس وٹیکنالوجی، قانون وسیاست اور دیگر علوم کی بھی ترغیب دی ہے، وہ اس طرح کہ تعلیم کے حوالے سے پہلی وحی میں دو دفعہ ﴿اِقْرَأْ﴾ یعنی پڑھنے کا حکم دیا، ایک دفعہ پہلی آیت میں فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ (العلق : ۱)

''اپنے رب کے نام سے پڑھو۔''

اور دوسری دفعہ تیسری آیت میں فرمایا:

﴿اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳﴾ (العلق : ۳)

''پڑھو! آپ کا رب بہت کریم ہے۔''

پھر چوتھی آیت میں فرمایا:

﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝﴾ (العلق : ٤)

''جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔''

پھر پانچویں آیت میں فرمایا:

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝﴾ (العقل : ٥)

''اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

اور ان ہی آیات میں ایک دفعہ آلۂ علم یعنی قلم کا بھی ذکر ہے، یعنی وحیٔ الٰہی کی ابتدائی آیات میں دو دفعہ پڑھنے کا، دو دفعہ پڑھانے کا اور ایک دفعہ قلم کا تذکرہ ہوا، تو اس سے اسلام میں تعلیم کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، گویا اسلامی کتاب کا پہلا سبق ہی تعلیم کی ترغیب پر مشتمل ہے۔

غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ وحیٔ الٰہی کے پہلے سبق میں جہاں معرفت الٰہی اور علومِ شرعیہ کی تعلیم دی گئی وہاں سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر علوم کی بھی ترغیب دی گئی، کیوں کہ حکم دیا جا رہا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝﴾ (العلق : ١)

''اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔''

مگر کس کو پیدا کیا؟ مفعول کا یہاں ذکر نہیں ہے، اس کے متعلّق مختلف اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ "اَلَّذِيْ خَلَقَ الإِنْسَانَ" جس نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق انسانی کا تذکرہ تو دوسری آیت میں موجود ہے، تو پہلی آیت میں تخلیق انسانی کو کیوں مراد لیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ پہلی تخلیق سے انسانِ اوّل سیّدنا آدم علیہ السلام مراد ہیں، کیوں کہ وہ "عَلَق" (دمِ بستہ) سے نہیں؛ بلکہ "تُرَاب" (مٹّی)

سے پیدا کیے گئے، اور دوسری تخلیق سے اولادِ آدم مراد ہے جو "عَلَق" سے پیدا کی گئی، لہٰذا مفہوم اس طرح ہوا کہ

"الَّذِيْ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ وَخَلَقَ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ عَلَقٍ".

جس نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو (سوکھی) مٹّی اور اولادِ آدم کو "عَلَق" (جمے ہوئے خون) سے پیدا فرمایا۔ ان آیات میں انسانی تخلیق میں غور و فکر کی تعلیم اور ترغیب دی گئی کہ ربّ العالمین نے "عَلَق" یعنی جمے ہوئے خون کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے، جس میں جان نہیں، جو حرکت نہیں کر سکتا، جس میں سوجھ بوجھ بھی نہیں، بہترین انسان بنا دیا، جس میں جان ہے، جو بولتا، سنتا اور حرکت کرتا ہے، علاوہ ازیں اس میں بہترین صلاحیتیں بھی رکھیں، تو جس طرح جمے ہوئے خون کے چھوٹے سے ٹکڑے میں انسان بننے کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح کائنات کی دیگر چیزوں میں بھی بہت سی صلاحتیں موجود ہیں، بس ضرورت ہے کہ غور و فکر سے کام لیا جائے اور اس سلسلے کے علوم کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے خلوص سے حاصل کیا جائے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ وحیٔ الٰہی میں سب سے پہلے تعلیم کی ترغیب دے کر ہمیں اپنا تعلیمی نظام مضبوط بنانے کا جو قرآنی درس دیا گیا تھا وہ بدقسمتی سے ہم بھول گئے، تو ہماری بدحالی اور پستی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

اسی لیے کسی نے سچ کہا:

درسِ قرآن نہ اگر ہم نے بھلایا ہوتا — یہ زمانہ نہ زمانے نے دِکھایا ہوتا

تعلیمی میدان میں ترقّی کے لیے توجّہ، ترغیب اور تنظیم ضروری ہے:

کیا یہ افسوس ناک حقیقت نہیں کہ جس اُمّت کو سب سے پہلے تعلیم کی ترغیب دی گئی وہ اس وقت تعلیمی میدان میں سب سے آخری صف میں نظر آ رہی ہے، اس بے

حسی، پستی اور اور پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مسلمانوں میں احساسِ ذمے داری و بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ہمیں اس تعلیمی میدان میں خود کفیل بننا ہوگا، اس کے لیے ایسے ادارے، اسکول اور کالج قائم کرنے ہوں گے جن کا اصل مقصد تجارت کے بجائے تعلیم ہو۔ اور وہاں مکمّل اسلامی ماحول میں دینی وعصری تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا جائے۔ اور بلا شبہ ہم یہ کر سکتے ہیں، بس توجّہ، ترغیب اور تنظیم کی ضرورت ہے، تعلیمی میدان میں اس کے بغیر ترقّی مشکل ہے۔

غربت کا حل معاشی نظام کی مضبوطی میں ہے:

تعلیمی نظام کی مضبوطی کے بعد کسی بھی قوم وسماج اور ملک وملّت کی ترقّی وخوش حالی کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ اس کا معاشی نظام بھی مضبوط ہو، کیوں کہ جہالت کی طرح غربت بھی ذلّت کا ایک سبب ہے، ترقّی وخوش حالی میں معاشی مضبوطی ریڑھ کی ہڈّی کے مانند ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فکر معاد کی تاکید کے ساتھ فکر معاش اور کسب معاش کی بھی ترغیب دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا ہاتھ اس سلسلے میں اوپر رہے، نیچے نہ رہے، مسلمان لینے کے بجائے دینے والے بنیں، اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی کے سہارے جینے کے بجائے دوسروں کے لیے سہارا بن کر جینے والے بنیں، اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمّت کے لوگوں کو مختلف مواقع میں معاشی نظام مستحکم کرنے کی ترغیب دی اور اس کے فضائل بھی بیان فرمائے، اس لیے کہ غربت کا حل معاشی نظام کی مضبوطی میں ہے۔

کسب معاش کی ترغیب وفضائل:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیک نیتی کے ساتھ حلال روزی کمانے والے مؤمن

بندے کو یہ خوش خبری سنائی کہ قیامت کے دِن اس کا چہرہ چودھویں رات کی طرح روشن ہوگا۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

"مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالاً اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ، وَسَعْيًا عَلٰى أَهْلِهٖ، وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ، لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ". (رواه البيهقي، مشكوٰة : ٤٤٤، كتاب الرقاق)

واقعہ یہ ہے کہ شرعاً حصولِ معاش کے لیے جائز جدّ و جُہد اور محنت بھی عبادت ہے، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ عبادت میں مشغول ہے، دریافت فرمایا کہ تمھاری اور تمھارے اہل وعیال کی کفالت کون کرتا ہے؟ اس شخص نے کہا: میرا بھائی، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"أَخُوْكَ أَعْبَدُ مِنْكَ". (إحياء العلوم، كتاب آداب الكسب والمعاش: ٦٢/٢)

''تمھارا بھائی تم سے بڑا اور زیادہ عبادت گزار ہے۔'' دیکھیے! اس روایت میں عبادت کے ساتھ فکرِ معاش اور حصولِ معاش کے لیے کوشش کرنے والے کو عبادت گزار سے افضل و بہتر قرار دیا گیا، کیوں کہ اس نے دونوں فریضوں کو اَنجام دیا: (۱) نماز، ذکر واذکار والی عبادت (۲) حصولِ معاش، جو خود بھی ایک عبادت ہے، اس لیے اسے ایک تو حلال کمانے کا ثواب ملتا ہے، دوسرے بھائی کی کفالت اور اس پر سخاوت کا ثواب بھی ملتا ہے۔

اس سے ایک بات واضح ہوگئی کہ عبادت، دعوت اور خدمت کے ساتھ اپنے اہل وعیال کی کفالت کے لیے کوئی مناسب ذریعۂ معاش اختیار کرنا بھی بہتر ہے۔ حدیث مذکور میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسلمان کو فلاح و کامیابی کی خوش خبری سنائی جو

اسلام قبول کرنے کے بعد حصولِ معاش میں مشغول رہا، جس کے نتیجے میں اسے بقدرِ کفایت روزی بھی مل گئی اور اس پر اُسے قناعت بھی نصیب ہوگئی۔

اتنا ہی نہیں، قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی سہولت کی خاطر حق تعالیٰ نے نمازِ تہجد کی فرضیت بھی ختم فرمادی:

﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (المزمل : ۲۰)

اس لیے عافیت اور عزّت اسی میں ہے کہ ہم معاشی اعتبار سے بھی خود کفیل بنیں، معاشی نظام کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے خلوص کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے مختلف اسباب وسائل اور ذرائع اختیار کریں۔

معاشی ترقّی کے ذرائع:

معاشی ترقّی کے یوں تو بہت سے ذرائع ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حرام کمائی کے ذرائع تو چند ہی ہیں، البتہ حلال کے ذرائع بے شمار ہیں۔

(۱) منجملہ ان کے بہترین اور بابرکت ذریعہ تجارت ہے، نبوت سے قبل خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجارت فرمائی، نیز حضرات شیخین اور اکثر مہاجرین نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا، جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ترقّی اور خوش حالی عطا فرمائی۔ آج بھی جن صوبوں اور علاقوں میں مسلمانوں نے تجارت کی طرف توجّہ دی ہے جیسے بمبئی، گجرات، کلکتہ اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہے۔ آج کل جگہ جگہ تعلیم اور صحت کے ادارے قائم کیے جاتے ہیں، جو عموماً تجارتی نوعیت کے ہوتے ہیں، ہم اگر اصحابِ خیر حضرات کو متوجّہ کر کے اپنے علاقوں میں تعلیم کے لیے اسکولوں، کالجز اور صحت کے لیے بنیادی اور مکمّل علاج کے

اچھے ہسپتال نہ نفع نہ نقصان کے اصول پر قائم کریں تو جہاں تعلیمی و معاشی ترقی اور خود کفیل بننے میں یہ چیزیں بہت معین اور مفید ثابت ہوسکتی ہیں وہاں بہت سے لوگوں کے لیے روزگار کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں۔

(۲) اس کے علاوہ حصولِ معاش کے دو قدیم ذرائع اور بھی ہیں: زراعت اور مویشی پالنا (جانوروں اور مرغیوں وغیرہ کو پالنا اور ان سے منافع حاصل کرنا) یہ کام پہلے معمولی سطح پر کیا جاتا تھا؛ لیکن اب زراعت اور مویشی پالنے کی ایک پوری سائنس وجود میں آچکی ہے۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے کم جگہ میں زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے، نیز جہاں پانی کم ہو وہاں بھی اسی لحاظ سے ایسی چیزوں کی زراعت ہوسکتی ہے جن میں زیادہ پانی کی ضرورت نہیں پڑتی، اسی طرح مویشی پالنے کے بہت سے جدید طریقے وجود میں آگئے، شرعی حدود میں رہتے ہوئے اُنھیں بھی اختیار کرکے منافع حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(۳) اسی کے ساتھ حصولِ معاش کے لیے چھوٹی صنعتوں اور فیکٹریوں کا قیام بھی ایک مفید ترین شکل ہے، جن میں اخراجات بھی کم آتے ہیں اور قانونی مسائل بھی زیادہ پیش نہیں آتے، ہم اپنے علاقوں اور شہروں میں حسب ضرورت وسہولت اُنھیں قائم کرکے منافع حاصل کرسکتے ہیں۔

(۴) ہنر: اگر تجارت، زراعت اور صنعت کے ذرائع کسی وجہ سے مشکل ہوں تو حصولِ معاش کا ایک کم خرچ اور مفید ذریعہ ہنر بھی ہے۔ آج کی سہولت والی دنیا میں ہنرمندوں کی ضرورت قدم قدم پر پیش آتی ہے، خواہ وہ الیکٹریشین ہو یا پلمبر، یا کسی اور فن کا ہنر، ہر جگہ اس کی طلب ہے، اس سلسلے میں بعض ہنر تو ایسے ہیں جن سے گھروں میں خواتین بھی استفادہ کرسکتی ہیں، جیسے گارمنٹ کی تیاری اور نرسنگ وغیرہ۔

(۵) ان ذرائع کے علاوہ بے کاری سے بچنے کے لیے کم از کم اپنی بساط کے مطابق چھوٹی موٹی ملازمت و مزدوری کر لی جائے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ذلیل ہونے سے محنت مزدوری کر لینا ہی اچھا ہے، اس میں عزّتِ نفس محفوظ رہتی ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ العَوَّامِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ حَطَبٍ عَلٰى ظَهْرِهِ، فَيَبِيْعَهَا، فَيَكُفَّ اللهُ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ أَعْطَوْهُ، أَوْ مَنَعُوْهُ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ١٦٢، باب من لا يحلّ له المسألة)

تم میں سے کوئی شخص کندھوں پر لکڑی کا بوجھ اٹھا اٹھا کر محنت مزدوری کر کے اسے فروخت کرے، یہ بہتر ہے اس سے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے اور ذلیل ہو۔

اسلام مسلمانوں کو عزّتِ نفس، جفاکشی اور محنت مزدوری کی ترغیب دے کر خود کفیل بنانا چاہتا ہے۔ اور واقعی جو لوگ ایسا کرتے ہیں تو اللہ پاک انھیں عزّتِ نفس اور برکت رزق سے مالا مال فرماتے ہیں، نیز ان کی نصرت فرماتے ہیں۔

ایک عبرت آموز واقعہ:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا یہ واقعہ سنا کہ دیوبند میں ایک متقی بزرگ تھے، کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے؛ مگر حلال روزی اور تقویٰ کا بڑا اہتمام تھا، اس لیے اُنھوں نے اپنے معاش کی صورت یہ اختیار کر رکھی تھی کہ جنگل سے گھاس کھود کر لاتے اور بازار میں اسے فروخت کر کے گزارا کرتے تھے، چوں کہ جنگل کی خودرَو گھاس براہِ راست خداداد رزقِ

حلال ہے، کسی بھی انسان کا اس میں واسطہ نہیں، اس میں اصول یہ بنایا ہوا تھا کہ صرف اتنی گھاس روزانہ لاتے تھے جو بازار میں آسانی کے ساتھ چھ پیسے میں فروخت ہو جائے، نہ اس سے کم لاتے نہ زیادہ، اور یہ کام جتنی دیر میں ہوتا اس کے علاوہ تمام دیگر اوقات عبادت اور ذکر اللہ میں گزارتے تھے، گھاس فروخت کرنے کے سلسلے میں بھی یہ اصول بنایا ہوا تھا کہ نہ چھ پیسے سے کم میں دیتے نہ زیادہ میں، کوئی زیادہ دینا چاہتا بھی تو نہ لیتے تھے، سب لوگ ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے۔

ایک دفعہ دیوبند کے تحصیل دار کا ایک چپراسی ان کو بلا کر لے گیا کہ تحصیل دار صاحب کے یہاں گھاس لے چلو، وہ چلے گئے؛ مگر چپراسی نے چھ پیسے کے بجائے ان کو چار پیسے دیے، اُنھوں نے کہا کہ بھائی! میری گھاس تو چھ پیسے کی ہے، لیکن اس نے کچھ نہ سنی، یہ بے چارے صبر کر کے واپس چلے آئے۔

پھر ہوا یہ کہ جوں ہی گھوڑے نے گھاس کو منھ لگایا اچانک اس کے درد شروع ہو گیا اور گر کر تڑپنے لگا، تحصیل دار صاحب نے مویشی کے ڈاکٹر بلائے؛ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، پھر کچھ لوگوں نے تحصیل دار کو سمجھایا کہ یہ گھاس والے جن کی گھاس آپ کے یہاں دو پیسے کم کر کے رکھ لی گئی ہے وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں، ان پر ظلم کا یہ اثر ہے، آپ ان کو راضی کر لیں تو گھوڑا اچھا ہو جائے گا۔ اسی وقت نوکر دوڑا کر گھاس والے بزرگ کو بلایا گیا اور تحصیل دار نے معذرت کر کے انھیں دو پیسے کے بجائے دو روپے دینے چاہے، مگر اُنھوں نے کہا کہ میرے تو صرف دو پیسے ہیں، وہ دے دو، زیادہ کی مجھے نہ ضرورت ہے نہ میں لوں گا، مجبور ہو کر دو پیسے دیے گئے، وہ رُخصت ہوئے اور گھوڑا اچھا خاصا کھڑا ہو گیا۔

یہ چھ پیسے جو متقی بزرگ کی روزانہ کی آمدنی تھی اب ان کے خرچ کا انتظام سنیے، وہ اپنی اس آمدنی میں سے چار پیسے تو روزانہ کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات

کے لیے رکھ لیتے، باقی ماندہ دو پیسوں میں سے ایک پیسہ اپنی شادی شدہ لڑکی کے لیے اور ایک پیسہ علماء وصلحاء کی دعوت کے لیے رکھتے تھے، جب دس بارہ پیسے ان دونوں مدوں میں جمع ہو جاتے تو لڑکی کا حق اس کو جا کر دیتے اور علماء کی دعوت کے لیے پیسے دارالعلوم دیوبند کے اکابر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس، مولانا رفیع الدین مہتمم صاحب وغیرہ کے حوالے کر دیتے، یہ حضرات اس کی بڑی قدر کرتے اور اس دعوت کو بڑی رغبت سے کھاتے، جسے کھا کر عبادت میں بڑی حلاوت محسوس فرماتے۔ (میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات: ۷۹، مستفاد از: مسنون اصولِ تجارت: ۳۱۱)

حصولِ عدل وامن کے لیے جا بجا دارالقضاء، محکمۂ شرعیہ یا دارالصلح قائم کریں:

تعلیمی ومعاشی پختگی کے ساتھ قوم وسماج اور ملک وملّت کی سربلندی وخوش حالی کے لیے عدل وانصاف اور امن وسلامتی بھی ضروری ہے۔ اور یہ یقینی حقیقت ہے کہ امن وسلامتی عدل وانصاف پر موقوف ہے، جہاں عدل ہوگا وہاں امن ہوگا، اور جہاں عدل نہ ہوگا وہاں امن بھی قائم نہیں رہ سکتا؛ لہٰذا امن وسلامتی کے لیے عدل وانصاف کا نفاذ و قیام لازم ہے۔ جب کہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ کے چھوٹے بڑے ذمّے دار اپنی ذمّے داری نبھانے میں عموماً غافل ہیں، الا ماشاء اللہ، جس سے ہر جگہ ظلم اور طاقت کا راج ہے، عدالتوں سے بھی مکمّل عدل نہیں ملتا، اس سلسلے میں بھی ہمیں خود کفیل بننا پڑے گا، جس کے لیے ہمیں ملک گیر تنظیم جمعیت علمائے ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی ہدایت کے مطابق ہر صوبے کے چھوٹے بڑے شہر میں محکمۂ شرعیہ Consult center (کنسلٹ سینٹر) یا دارالصلح اور دارالقضاء قائم کرنا ہوگا، جہاں ہم اُمّت کے علماء حضرات، مفتیانِ کرام اور قاضی صاحبان اور اچھے وکلاء سے اپنے عائلی، سماجی اور معاشرتی مسائل حل کروا کر کم وقت اور کم خرچ کے ساتھ شریعت کی روشنی میں انصاف

حاصل کر کے امن وسلامتی کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہماری مجرمانہ غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق میں انصاف کے حصول کے لیے غیروں سے بھیک مانگ رہے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم حصولِ عدل و امن کے لیے جا بہ جا محکمۂ شرعیہ، دارالصلح اور دارالقضاء قائم کریں اور وہیں اپنے نجی مسائل کا شرعی حل تلاش کریں، ان میں معاملہ حل کروانے سے قبل فریقین کو اوّلاً ایثار و انصاف کی اہمیت سمجھا کر شرعی فیصلہ بہر صورت قبول کرنے پر راضی کر لیں، اس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ جیتنے والا تو جیتے گا ہی، ہارنے والا بھی حکمِ شرعی کو قبول کرنے کے سبب جیتنے والا ہی شمار ہوگا۔ اس عدل سے امن وسکون بھی نصیب ہوگا۔ جب کہ اس کے بغیر سماج اور ملک میں امن وسکون مشکل ہے۔

خیر القرون میں دارالقضاء کا قیام:

نبوی سماج میں جو امن وسکون تھا تو اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہاں عدل تھا، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین کبھی کوئی بات پیش آجاتی تو وہ امامِ عدل، سیّد القضاۃ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فیصلہ کرواتے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت توجّہ فرماتے، لوگوں کے معاملات کو اچھی طرح سنتے، سمجھتے، پھر حکم شرع سناتے اور نہایت انصاف سے فیصلہ فرماتے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستے کا امیر بنا کر بھیجا، ان کے زیر امارت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے، اُنھوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے اجازت لیے بغیر کسی شخص کو اَمان دے دی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جب پتا چلا تو انھوں نے ناگواری کا اظہار فرمایا، اس بات پر دونوں حضرات کے مابین کچھ تلخی پیدا ہوگئی، معمول کے مطابق یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت اور

دار القضاء میں پیش ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل معاملہ سن سمجھ کر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی اَمان کو نافذ تو فرما دیا؛ لیکن حکم بھی فرمایا کہ آئندہ امیر سے اجازت لیے بغیر کسی کو امان نہ دیا کریں، اس پر دونوں میں رضامندی بھی قائم ہوگئی، اس موقع پر قرآنِ کریم کی وہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں حکم ہوا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تمھارے ذمّے دار لوگوں کی بھی۔'' (بشرطیکہ وہ کوئی خلافِ شرع حکم نہ دیں)۔

یہاں ''اولو الامر'' سے مسلمانوں کے اربابِ اقتدار و مقتدا مراد ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (روح المعانی:۵/۶۵، مستفاداز: انوار البیان)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصفانہ فیصلوں کا یقین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ غیروں کو بھی تھا، چنانچہ وہ بھی اپنے معاملات میں فیصلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کرواتے تھے، اتنا ہی نہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف جگہوں پر اس کام کے لیے مامور اور متعین فرمایا، مثلاً یمن کے لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو متعین فرمانا بہت ہی مشہور ہے۔ (مشکوۃ:۳۲۴)

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قضاء کی ذمّے داری سپرد فرمائی تو آپ نے عرض کیا: حضور! میں نوجوان ہوں، مجھے محکمۂ قضاء کا علم اور تجربہ بھی نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دُعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمھاری رہنمائی فرمائے گا اور تمھاری زبان کو لغزش سے بچائے گا۔

"اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَلْبَهٗ وَثَبِّتْ لِسَانَهٗ". (رواه ابن ماجه : ۲۳۱۰)

مسند احمد کی روایت ہے کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصول سکھایا کہ جب تمھارے سامنے فریقین آکر بیٹھیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق سے بھی مکمّل اس کی بات نہ سن لو جیسا کہ تم نے پہلے فریق کی بات سنی، اس سے تمھارے لیے فیصلہ واضح ہو جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق میں فیصلے کرتا رہا اور مجھے کبھی تردّد نہیں ہوا۔ (مسند احمد: ۸۸۲)

قیامِ دارالقضاء یا محکمۂ شرعیہ یا دارالصلح وقت کا تقاضا:

عہدِ نبوت اور خیر القرون کے بعد بھی نظامِ قضاء کا پاکیزہ سلسلہ جاری رہا، ہر زمانے کے مسلمان معاشرے میں نظامِ دارالقضاء کا خاص اہتمام رہا، خواہ مسلمان حاکم ہوں یا محکوم، وطنِ عزیز میں بھی مسلمانوں نے ہر دور میں قضاء کا نظام قائم رکھا۔ ہماری حکومت میں عدالتوں کے جج اور قاضی مسلمان اور عالم دین ہوا کرتے تھے، جو مسلمانوں کے معاملات میں شریعت کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے؛ لیکن افسوس کہ انگریزوں کے ظالمانہ تسلط کے بعد اسلام دشمنی کی وجہ سے اولاً مسلمان قاضیوں کی تقرّری ہی ختم کر دی گئی، پھر آہستہ آہستہ نظامِ قضاء کو بھی کمزور کر دیا گیا، آج ان کی روحانی اولاد بھی یہی چاہتی ہے۔

اس صورت میں وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں اور جگہ جگہ ماہر مفتیانِ کرام اور حضرات علمائے کرام کے علاوہ اچھے وکلاء کا ساتھ لے کر دارالقضاء یا محکمۂ شرعیہ (کنسلٹ سینٹر) (Consult center) قائم کریں اور وہاں اپنے نجی، عائلی اور سماجی مسائل شریعت مطہرہ کی روشنی میں حل کرائیں، جیسے میاں بیوی کے جھگڑے، شوہر کا اپنی بیوی کو خرچ نہ دینا، بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرنا، بیوی کو معلق چھوڑ

دینا، طلاق دے کر مُکر جانا، اسی طرح بیوی کا اپنے شوہر کی صریح نافرمانی کرنا، بار بار بغیر کسی وجہ کے میکے چلا جانا، اپنے ذمّے کے حقوق ادا نہ کرنا، نیز صلح، خلع اور تفریق وغیرہ کے مسائل، یا دو جماعتوں، خاندانوں وغیرہ کے درمیان صلح کے معاملات، نیز اپنے مالی حقوق کو حاصل کرنے اور وراثت وغیرہ کی صحیح تقسیم وغیرہ کے مسائل میں دارالقضاء اور محکمۂ شرعیہ (کنسلٹ سینٹر) (Consult center) کی طرف رجوع کر کے کم وقت اور کم خرچ میں مسائل کا شرعی حل کرا کے ہم اپنے معاشرے میں امن و سکون قائم کر سکتے ہیں۔

البتہ ہمارے بڑے اور اجتماعی (فوجداری) مسائل جو غیر مسلموں سے متعلّق ہیں ان میں عدالت کا سہارا قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ضرور لے سکتے ہیں۔

ترقّی کی چار بنیادیں:

اس موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ اقتباس بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا:

''حکماء نے قوم کی ترقّی کی چار بنیادیں بیان فرمائی ہیں: (۱) علم العلماء (۲) جود الاغنیاء (۳) عدل الامراء (۴) دعاء الفقراء'' (تقاریر حکیم الاسلام، صفحہ: ۱۸۰)

توحید و شرک، ایمان و کفر، حق و باطل اور صحیح و غلط کی تمیز کے لیے علم العلماء کی ضرورت ہوگی۔ پھر ظاہر ہے کہ دنیا چوں کہ دارالاسباب بھی ہے، "اَلدُّنْیَا بِالْمَالِ، وَالْاٰخِرَۃُ بِالْاَعْمَالِ". مال نہ ہو تو دنیا بے کار اور ایمان و اعمال نہ ہوں تو آخرت بے کار، اس لیے علم العلماء کے ساتھ جود الاغنیاء کی بھی ضرورت ہے۔ پھر کبھی کہیں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ پیش آجائے تب عدل الامراء کی ضرورت ہوتی ہے،

کیوں کہ علماء وفقہاء کی ذمے داری شرعی فیصلہ سنانا اور اُمراء کی ذمے داری اُسے نافذ کرنا ہے، عدل کے بغیر امن مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ حق تعالیٰ کی مزید نصرت ورحمت کے لیے دعاء الفقراء بھی ضروری ہے۔

حق تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو اور دارین میں ہمیں سربلندی وخوش حالی نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

۶ر رمضان المبارک ر ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۱۹ر اپریل ر ۲۰۲۱ء، بروز پیر

بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۱۸)

ارتداد کی مذمت اور اس کے اَسباب وعلاج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللهَ قَسَمَ بَيْنَكُم أَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ، إِنَّ اللهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ، وَلَا يُعْطِي الدِّيْنَ إِلَّا مَنْ أَحَبَّ؛ فَمَنْ أَعْطَاهُ اللهُ الدِّيْنَ فَقَدْ أَحَبَّهُ. وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُسْلِمُ عَبْدٌ حَتّٰى يُسْلِمَ قَلْبُهُ وَلِسَانُهُ، وَلَا يُؤْمِنُ حَتّٰى يَأْمَنَ جَارُهُ بَوَائِقَهُ". (شعب الإيمان، مشكوٰة: ص۴۲۵/ باب الشفقة والرحمة على الخلق)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے (دین و) اخلاق کو بھی اسی طرح تقسیم فرمایا ہے جس طرح رزق کو تقسیم فرمایا، اور حق تعالیٰ دنیا تو اس شخص کو بھی دیتے ہیں جسے وہ پسند کرتے ہیں اور اسے بھی دیتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتے، لیکن دین (اور ایمان و

اخلاق) تو اسی کو عطا فرماتے ہیں جسے وہ پسند کرتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا کسی کو دولت ایمان سے نوازنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک کامل مسلم و مؤمن نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کے دِل وزبان مسلمان (اسلامی تعلیم وہدایات کے تابع) نہ ہوجائیں اور اس کا پڑوسی (قریبی) اس کے شر سے محفوظ نہ ہوجائے۔

ہر مؤمن بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور ولی ہے:

اللہ ربّ العالمین اپنے بندے اور بندیوں میں سے جسے اپنا محبوب، ولی اور دوست بنانا چاہتے ہیں اسے دنیا میں دولت ایمان سے نوازتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرۃ : ۲۵۷)

''اللہ تعالیٰ ولی، کارساز، سرپرست اور دوست ہیں ایمان والوں کے۔''

حالانکہ یہ بھی تو کہا جاسکتا تھا کہ ایمان والے دوست ہیں اللہ تعالیٰ کے؛ لیکن فرمایا کہ میں خود دوست ہوں ایمان والوں کا، یہ کتنی بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے۔ اسے یوں سمجھیں کہ ایک دیہاتی کا بہت ہی خاص دوست وزیر اعظم بن جائے اور وہ کسی سے کہے کہ ملک کا پی۔ ایم۔ میرا دوست ہے، تو یہ کوئی اہم بات نہیں؛ لیکن اگر خود وزیر اعظم اس دیہاتی کے متعلّق کہے کہ میں اس کا دوست ہوں، تو یہ بڑی بات ہے، یہاں اہل ایمان کے متعلّق حق تعالیٰ یہی فرماتے ہیں کہ میں ایمان والوں کا دوست ہوں، جو بہت بڑی بات ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ ہر مؤمن بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب، ولی اور دوست ہے، جس کے پاس محض دنیا کی دولت، عزّت، شہرت اور حکومت ہو ضروری نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور دوست بھی ہو؛ لیکن جس کے پاس دین وایمان ہے وہ

بالیقین اللہ تعالیٰ کا محبوب اور دوست ہے، حدیث پاک میں اسی کو فرمایا کہ

"إِنَّ اللهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ، وَلَا يُعْطِي الدِّيْنَ إِلَّا مَنْ أَحَبَّ؛ فَمَنْ أَعْطَاهُ اللهُ الدِّيْنَ فَقَدْ أَحَبَّهُ". (مسند أحمد)

''دنیا تو اللہ تعالیٰ ہر کس و ناکس کو (کسی حکمت کے تحت) عطا فرماتے ہیں؛ لیکن دین اسی بندے کو عطا فرماتے ہیں جس سے وہ محبّت فرماتے ہیں۔''

اس لیے اے مردِ مؤمن!

مٹا کر اپنی ہستی کو سراپا جستجو ہو جا جو تو چاہے گا وہ ہوگا، جو وہ چاہے وہ تو ہو جا

لہٰذا جسے حق تعالیٰ نے اپنی محبّت اور دوستی کے لیے پسند فرما کر دولت ایمان سے نوازا اسے چاہیے کہ وہ اس عظیم الشان دولت کی حفاظت کرے، اس میں ہونے والی کوتاہی سے توبہ کرے اور ذرّہ برابر بھی غفلت نہ برتے، خدانہ خواستہ اگر دولت ایمان کی حفاظت نہ کی، اس کے احکام سے غفلت برتی تو پھر خطرہ ہے کہ کہیں محروم نہ کر دیے جائیں۔

اللہ پاک بے نیاز ہے:

چوں کہ اللہ وحدہ لاشریک لہٗ بہت ہی زیادہ غیور، غنی اور بے نیاز بھی ہے، وہ ایمان والوں کو فلاحِ دارین سے نوازنے ہی کے لیے ان سے محبّت کرتا ہے، ورنہ اسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں، ہمیں تو ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں، ہر اعتبار سے اس کی ضرورت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو کسی کی کوئی قطعاً ضرورت نہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۱۵﴾ (الفاطر:۱۵)

سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا ہرگز محتاج نہیں، نہ وہ ہمارے ایمان کا محتاج ہے، نہ ہمارے اعمال کا، ہمارے ایمان و اعمال سے اس کا کوئی فائدہ نہیں، اور ہماری بے ایمانی و بدعملی سے اس کا کوئی نقصان نہیں، اسی کو ایک حدیث قدسی میں فرمایا:

"يَاعِبَادِيْ! إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ".

بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے مزید فرمایا:

"يَاعِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَازَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا، يَاعِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَانَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۰۳، باب الاستغفار والتوبة)

''اومیرے بندو! تمھارے اگلے پچھلے، تمھارے انس وجن، سب کے سب تم میں سب سے زیادہ متقی اور نیک شخص کے مانند بن جائیں، مثلاً سب کے سب اُمّت کے سب سے متقی اور نیک فرد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح بن جائیں، کوئی بھی میری نافرمانی نہ کرے، تب بھی میری سلطنت، مملکت اور شانِ کبریائی و بے نیازی میں کوئی زیادتی ہونے والی نہیں ہے، اس کے برخلاف اگر تمھارے اگلے پچھلے اور سبھی اِنس وجن تمھارے سب سے بڑے بدبخت کافر وفاجر مثلاً ابوجہل زندیق کے مانند بن جائیں، کوئی بھی میری فرمانبرداری نہ کرے، تب بھی میری سلطنت، مملکت اور شانِ کبریائی و بے نیازی میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔''

مطلب یہ ہے کہ اگر تم مجھ پر ایمان لاؤ گے، میری عبادت کرو گے، میری مرضی پر چلو گے، تو دارین میں تمھارا ہی نفع ہوگا۔

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝﴾ (الزمر : ۴۱)

''سو جس نے ہدایت پائی تو اپنے ہی فائدے کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اپنے ہی نقصان کے لیے گمراہ ہوا اور آپ اُن کے ذمّے دار نہیں ہیں۔''

کسی کے ارتداد سے نہ اسلام ختم ہوگا نہ مسلمان:

البتہ اگر تم ایمان سے پھر جاؤ گے اور دولت ایمان کی حفاظت نہ کرو گے تو چوں کہ ہم تمھارے محتاج نہیں؛ اس لیے تمھاری جگہ دوسروں کو ہم دولت ایمان سے نواز کر اپنا محبوب اور ولی بنادیں گے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (المائدۃ : ٥٤)

''اے ایمان والو! اگر تم میں سے جو بھی دین اسلام سے پھر جائے گا تو یاد رکھو! کسی کے ارتداد سے اسلام و ایمان تو ختم نہ ہوگا، نہ ہی مسلمان ختم ہوں گے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم دین اسلام سے پھر جاؤ گے تو ہم تمھاری جگہ دوسروں کو دولت دین و ایمان سے نوازیں گے، دوسروں کو اپنا محبوب بنائیں گے، اور وہ ایسے ہوں گے کہ ہم خود بھی ان سے محبّت کریں گے اور وہ بھی ہم سے محبّت کریں گے، وہ اہل ایمان کے لیے نرم دل اور کفّار کے لیے سخت گیر ہوں گے، ہماری راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، نیز یہ بھی کسی کا کوئی ذاتی کمال نہیں؛ بلکہ فضل الٰہی ہے۔''

اسی لیے کہتے ہیں کہ

منّت مَنِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی　　منّت از و شناس کہ بخدمت گذاشتت

''سلطان نے اگر تجھے اپنی خدمت کے لیے پسند کیا تو یہ تیرا کمال نہیں ہے، یہ

تو اسی کا احسان ہے کہ اس نے تجھے اپنی خدمت کا موقع عطا کیا۔''

اسی طرح صاحبو! شہنشاہِ مطلق نے ہمیں اپنے ایمان و اعمال کی توفیق عطا فرمائی تو یہ اس کا احسان ہے، وہ ہمارا محتاج نہیں ہے، ہم نہیں تو اور کوئی، ہم اگر دین اسلام پر عمل کریں گے تو اس سے اسلام کی عظمت بڑھ جانے والی نہیں، اور اگر العیاذ باللہ کوئی بندہ دین اسلام سے پھر جائے تو اس سے بھی اسلام کی عظمت گھٹنے والی نہیں ہے، دین اسلام پر عمل کرنے سے ہمارا اپنا ہی فائدہ ہے، اور اگر کوئی دین اسلام سے پھر جاتا ہے تو دارین میں نقصان بھی اسی کا ہے۔

ارتداد کی حقیقت اور قسمیں:

اس موقع پر ارتداد اور مرتد کی حقیقت بھی سمجھ لیجیے، ارتداد کہتے ہیں پھر جانے اور لوٹ جانے کو۔ شریعت کی اصطلاح میں ایمان و اسلام سے پھر جانے اور کفر و شرک کی طرف لوٹ جانے کو ارتداد کہتے ہیں، اور ایسے گنہگار، مجرم کو مرتد کہتے ہیں، بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی و عملی ارتداد (۲) فکری و ذہنی ارتداد۔

حقیقی ارتداد کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بد بخت علانیہ اور صاف طور پر ایمان و اسلام سے پھر جائے اور یہودی، عیسائی، ہندو یا قادیانی وغیرہ مذہب اختیار کر لے، یا اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی توحید یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت اور شریعت وغیرہ کا انکار کر دے۔

اور اگر کوئی شخص دین اسلام، توحید و رسالت اور شریعت وغیرہ کا صاف طور پر انکار تو نہ کرے؛ لیکن ایسے افعال و اعمال اور عقائد اختیار کرے جو انکارِ شریعت کے مترادف ہوں، حتیٰ کہ احکامِ شریعت میں سے کسی ایسے حکم کے انکار یا اس سے متعلّق شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جائے جس کا ثبوت قرآنِ کریم کی نص صریح سے ہو، یا رحمت

عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر ثابت ہو، تو یہ صورت بھی باجماعِ اُمّت ارتداد میں داخل ہے، اُسے فکری وذہنی ارتداد کہتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شرک وکفر صرف مندروں میں جا کر گھنٹی بجانے اور بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ نماز روزوں کے ساتھ اسلام کے اَبدی قوانین پر ہلکے سے شک وشبہے سے بھی صاحب ایمان ایمان سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے۔''

(بعنوان: نئی نسل میں ارتداد کا طوفان bhatkallys.com)

واقعہ یہ ہے کہ ذہنی وفکری ارتداد میں بہت سے مسلمان بالخصوص عصری تعلیم یافتہ لوگ شعوری وغیر شعوری طور پر مبتلا ہیں؛ بلکہ فرقہ پرست اور مسلم دشمن طاقتوں کی یہ بنیادی سازش کا اہم حصہ ہے، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرۃ : ۲۱۷)

''اور یہ (کافر) تم سے ہمیشہ جنگ جاری رکھیں گے یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اگر وہ (اتنی) طاقت پاسکیں، اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور پھر وہ کافر ہی مرے تو ایسے لوگوں کے دنیا وآخرت میں (سب) اعمال برباد ہوجائیں گے، اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً﴾ (النساء : ۸۹)

''اور ان (بے ایمانوں) کی خواہش تو یہی ہے کہ تم بھی کافر بن جاؤ، جیسا کہ

یہ کافر ہیں، تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ۔''

آئے دِن اس کی مثالیں پیش آتی ہیں، مثلاً ابھی پچھلے دِنوں سرکاری ملازمت کے لیے ایک پڑھا لکھا مسلمان جب اِنٹرویو کے لیے گیا تو اس سے یہ سوال کیا گیا کہ اسلام میں مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے؛ لیکن عورت اس حق سے محروم ہے (حالانکہ عورت کے لیے حق اختیار، خلع اور فسخ نکاح کا راستہ موجود ہے) اسی طرح مرد کو ایک ساتھ چار بیویاں رکھنے کی اِجازت ہے، جب کہ عورت کے لیے اس کی گنجائش نہیں، اس سلسلے میں بحیثیت مسلمان آپ کا کیا خیال ہے؟ تو دین اسلام کی ناقدری اور علم دین سے دوری کے سبب جناب کا جواب یہ تھا کہ مجھے خود ان اسلامی قوانین پر اعتراض ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

یہ فکری و ذہنی ارتداد کی مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ ارتداد حقیقی و عملی ہو یا فکری و ذہنی، اس سے اللہ ربّ العزت کا، اس کے دین حق کا اور اُس کے وفادار بندوں کا تو کوئی نقصان نہیں، خود اس بدترین جرم کے مرتکب ہی کا نقصان ہے۔

ارتداد کے نقصانات:

قرآنِ کریم نے ارتداد کے نقصانات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۱۷)

''اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور پھر وہ کافر ہی مرے تو ایسے لوگوں کے دنیا و آخرت میں (سب) اعمال برباد ہو جائیں گے، اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

جس طرح اسلام لانے سے پچھلی زندگی کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے

ہیں اسی طرح ارتداد سے پچھلی زندگی کے تمام اعمالِ صالحہ مٹا دیے جاتے ہیں، آخرت میں بھی ان اعمالِ صالحہ کا کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

ظاہر بات ہے کہ یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ بندہ آخرت میں اجر وثواب سے محروم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۖ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (المائدۃ:۵)

علاوہ ازیں ارتداد کا دُنیوی نقد نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ مرتد ہوتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے، نیز مرتد میراث سے بھی محروم ہوجاتا ہے، علاوہ ازیں اسلامی حکومت میں مرتد کے تمام اَموال ضبط ہوجائیں گے اور اُسے تین دِن سمجھنے کا موقع دینے کے بعد اگر وہ توبہ کرلیتا ہے اور دوبارہ اسلام قبول کرلیتا ہے تو اچھا ہے، ورنہ اسے قتل کردیا جائے گا، حدیث پاک میں وارد ہے:

"مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ". (رواه البخاري: ۲/۱۰۲۳، مشكوٰة : ۳۰۷، باب أهل الردة والسعاية بالفساد)

نیز مرتد کی نہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۱/۳۱۰)

اور سب سے بڑا نقصان قرآنِ کریم نے یہ بیان کیا:

﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ (البقرۃ : ۲۱۷)

مرتد بھی کافر ومشرک کے مانند ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ارتداد کے چند بنیادی اَسباب:

اب سوال یہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود موجودہ حالات میں اِرتداد کے واقعات کیوں پیش آرہے ہیں؟ تو سنجیدگی سے غور وفکر کے بعد اس بدترین بُرائی اور جرم

کے مختلف اسباب سامنے آتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک بڑا اور بنیادی سبب دین حق کی ناقدری اور دین اسلام سے دوری ہے، جو لوگ دین اسلام کو عظیم الشان دولت اور نعمت نہیں سمجھتے وہ اس کی قدر بھی نہیں کرتے، نہ اس کے عقائد وفرائض اور احکام ومسائل کا علم حاصل کرتے ہیں، جس کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دین حق سے دور ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات کسی لالچ یا خوف کے سبب دین حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ارتداد کا دوسرا بنیادی سبب اسلام اور اس کے احکام کے متعلق شکوک وشبہات اور بدگمانی ہے۔ ملک کی فرقہ پرست تنظیمیں بہت ہی سوچی سمجھی سازش کے تحت عام لوگوں بالخصوص کمزور مسلمانوں میں اسلام اور اس کے احکام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کر کے انھیں دین حق سے بدگمان کرنے میں لگی ہوئی ہیں، اس کے لیے سوشیل میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا استعمال کیا جاتا ہے، بعض کمزور ایمان والے اس پروپیگنڈہ میں مبتلا ہو کر ارتداد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور دین اسلام کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

ارتداد کا تیسرا بنیادی سبب ''عشق مجازی'' ہے، جس کی ایک شکل غیر مسلم سے شادی ہے، جو عموماً دین سے دوری، مخلوط تعلیم، مخلوط ملازمت اور ملحدانہ خیالات کے سبب ہوتی ہے، اسی میں میاں بیوی کے درمیان بہت سے عائلی وذاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اکثر یہ شادی ناکام ہوتی ہے، اسی لیے شریعت نے غیر مسلم سے شادی کی اجازت ہی نہیں دی، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾ (البقرۃ : ۲۲۱)

مسلمان مرد مشرک عورتوں سے اور مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے نکاح نہیں کر سکتے، خواہ وہ صاحب مال ہوں یا صاحب جمال، اگر وہ دولت ایمان سے محروم ہوں تو اس وقت تک ان سے نکاح نہیں کر سکتے جب تک وہ ایمان نہ لائیں، جس طرح

کوئی شخص اپنی قیمتی موٹر سائکل میں ایک پہیہ موٹر سائکل کا اور دوسرا ٹرک کا لگا دے تو وہ موٹر سائکل نہیں چل سکتی، اسی طرح غیر مذہب میں شادی بھی نہیں چل سکتی۔

ایک فکر انگیز واقعہ:

اس سلسلے میں ایک فکر انگیز واقعہ عہد نبوی میں پیش آیا کہ حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا جب بیوہ ہوگئیں تو مدینہ طیبہ کے ایک رئیس زادے ابوطلحہ نے انھیں شادی کا پیغام بھیجا، اس وقت حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا تو مسلمان ہو چکی تھیں؛ مگر ابوطلحہ اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لہٰذا اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے دوٹوک جواب دے کر ان کے پیغام کو رد کر دیا کہ اے ابوطلحہ! اللہ کی قسم آپ اگر چہ ایسی حیثیت کے حامل ہیں کہ آپ کا پیغام رد نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن بات یہ ہے کہ آپ اب تک مسلمان نہیں ہوئے اور میں الحمدللہ مسلمان ہوں، اس لیے کسی مسلمان عورت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کافر سے شادی کر کے اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دے دے۔ (مسند احمد، سنن نسائی، تراشے)

حالانکہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ ابھی مذہبِ غیر میں شادی کی ممانعت نازل نہیں ہوئی تھی؛ لیکن حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا کی غیرتِ ایمانی نے اسے گوارا نہیں کیا، بعد میں ممانعت کا حکم بھی نازل ہوگیا۔ اس کی خلاف ورزی بھی ارتداد کا سبب ہے۔

ارتداد کا علاج:

ان حالات میں یوں تو ہر مسلمان کی ذمے داری بنتی ہے کہ

(۱) دینِ حق کی دولت ونعمت کو دارین کی سب سے عظیم دولت سمجھ کر اس کی قدر دانی کرے، اس کے صحیح و بنیادی عقائد، حلال وحرام اور ضروری احکام کا علم حاصل کرے، پھر زندگی کے ہر شعبے میں دین کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی فکر وکوشش

کرے، اگر ایسا نہیں کیا تو دنیا تو خیر کسی بھی طرح گزر جائے گی، مسئلہ آخرت کا ہے، قرآنِ کریم کا صاف اعلان ہے کہ دینِ حق کے علاوہ کوئی مذہب قبول نہیں، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران : ۸۵)

موت کے بعد ظاہری آنکھ بند ہوکر آخرت میں حقیقی آنکھ کھلے گی اس وقت بہت دیر ہوجائے گی، اس سے پہلے آج بیدار ہوجائیں۔

(۲) اسی کے ساتھ اس پُرفتن دور میں حفاظت ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ سے خوب گڑگڑا کر دُعا کی جائے؛ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کی کوئی تدبیر تقدیر کا مقابلہ نہیں کرسکتی، لیکن حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے دُعا میں تقدیر کے مقابلے کی طاقت رکھی ہے:

"لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ۱۹۵)

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا يَرُدُّ الْقَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ". (ابن ماجه، مشكوٰة : ٤١٩/ باب البر والصلة)

یعنی تقدیر (مبرم تو نہیں، لیکن تقدیر معلّق) کو دُعا کے علاوہ کوئی چیز ٹال اور بدل نہیں سکتی، اور نیکی کے علاوہ کوئی چیز عمر میں اضافے اور برکت کا سبب نہیں، اور گناہ کے سبب مردِ (مؤمن) رِزق (یا مطلق انسان کو برکت رزق) سے محروم کردیا جاتا ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ان دونوں روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی چیز تقدیر کو بدل سکتی ہے تو وہ دُعا

ہے، وجہ یہ ہے کہ دُعا میں اس ذات سے درخواست کی جاتی ہے جس کے قبضے میں تقدیر ہے، لہٰذا حفاظت ایمان کے لیے اللہ پاک سے خوب اہتمام سے دُعا کی جائے۔

خود حضور پاک ﷺ بھی اُمّت کی ترغیب کے لیے حفاظت ایمان کی دُعا فرماتے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، آپ ﷺ دُعا فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ بِالإِسْلَامِ قَائِمًا، وَاحْفَظْنِيْ بِالإِسْلَامِ قَاعِدًا، وَاحْفَظْنِيْ بِالإِسْلَامِ رَاقِدًا، وَلَا تُشْمِتْ بِيْ عَدُوًّا، وَلَا حَاسِدًا". (رواه الحاكم في المستدرك، وقال: هٰذا حديث صحيح على شرط البخاري)

''اے اللہ! میرے اسلام (اور دین وایمان) کی حفاظت فرما کھڑے ہونے کی حالت میں، میرے اسلام کی حفاظت فرما بیٹھنے کی حالت میں، میرے اسلام کی حفاظت فرما سونے کی حالت میں اور مجھ پر دشمنوں اور حاسدوں کو ہنسنے کا موقع نہ دیجیے۔''

ارتداد سے حفاظت کے لیے اس جامع دُعا کا اہتمام نہایت نافع اور مفید ہے۔

(۳) علاوہ ازیں اتباعِ خواہش نفسانی وعشق مجازی کی بُرائیاں، بالخصوص مذہب غیر میں ہونے والی شادی کی دینی، دُنیوی اور اُخروی تباہ کاریوں کو آنکھیں کھول کر دیکھیں اور سچّے دِل سے اچھّی طرح سوچیں، تاکہ اس سے بچ سکیں۔

اس سلسلے میں ارشادِ الٰہی کو پیش نظر رکھیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت داود علیہ السلام کو فرمایا تھا:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (صٓ : ۲۶)

''اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا، ورنہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے بھٹکا

دے گی، بے شک جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ اُنھوں نے حساب کے دِن کو بھلا دیا ہے۔''

خواہش نفسانی وعشق مجازی سے ہلاک ہونے والوں کے بہت سے واقعات ہیں، من جملہ اُن میں ایک عبرت ناک واقعہ وہ ہے جس کو علّامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے:

ایک عبرت ناک واقعہ:

علّامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک شخص کے بارے میں معلوم ہوا جو بغداد میں رہتا تھا، اس کا نام صالح تھا، یہ نیک نامی میں بہت مشہور تھا، چالیس سال تک اذان دیتا رہا۔

ایک دِن اذان دینے کے لیے منارے پر چڑھا اور مسجد کے پہلو میں ایک عیسائی کے گھر میں اس کی بیٹی کو دیکھا اور اُس کے فتنے میں مبتلا ہوگیا، اُتر کر اس کے دروازے پر آیا اور اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا، عیسائی لڑکی نے دروازہ کھولا اور پوچھا: کون ہے؟ جب اُس مؤذّن کو اندر آنے کی اِجازت ملی تو وہ اندر داخل ہوتے ہی اس لڑکی سے لپٹ گیا، لڑکی نے کہا کہ تم مسلمان تو بڑی دیانت وامانت والے ہوتے ہو، اُن میں حیاو پاک دامنی ہوتی ہے، یہ خیانت و بے حیائی کیسی؟ عشق کا بھوکا درندہ اُس مؤذّن پر سوار ہو چکا تھا، اس نے جواب میں کہا: اگر میری بات مانتی ہو تو ٹھیک، ورنہ میں تمھیں قتل کر دوں گا، لڑکی نے کہا: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، نہ تم مجھے قتل کرسکو گے اور نہ ہی اس حال میں میری عزّت لے سکتے ہو، ہاں، اگر تم اپنا دین چھوڑ دو اور عیسائی بن جاؤ تو پھر تمھاری خواہش پوری ہوگی، اُس نے کہا: میں تمھاری خاطر سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں، پھر وہ کہنے لگا: میں اسلام کو اور محمد کے لائے ہوئے دین کو چھوڑتا ہوں، اس کے

بعد اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا: تم یہ زبانی جملہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم اپنا مقصد پورا کرسکو، مقصد پورا ہوجانے کے بعد اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ گے، تم اپنی بے دینی کا ثبوت دینے کے لیے میری شرط مانو اور خنزیر کا گوشت کھا کر دِکھاؤ، یہ کہہ کر اس لڑکی نے اندر سے خنزیر کا گوشت لاکر سامنے رکھ دیا، وہ فوراً اُٹھا کر کھانے لگا، اس کے بعد اس لڑکی نے شراب پلائی، اس نے خوب سیر ہوکر شراب پی، جب نشہ چڑھ گیا تو اس نے کہا: تھوڑی دیر اوپر چڑھ کر سوجاؤ، جب میرے والد آئیں گے تو ہم دونوں کا نکاح کرادیں گے، اس کو چھت پر چڑھا دیا، نشے میں وہ چھت سے زمین پر گرا، جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، وہ لڑکی دروازہ بند کرکے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کا باپ آیا تو اس کو سارا واقعہ سنایا، جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہ نیچے گر کر مر چکا تھا، دونوں نے اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا، رات ہونے پر اس کو ایک گلی میں پھینک دیا، صبح لوگوں نے مشہور نیک صالح شخص کی لاش دیکھی اور وجہ معلوم ہوئی تو اس کی لاش کو گندگی کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ (الشہوات المہلکہ، بحوالہ: ذم الہوی، صفحہ: ۴۰۹)

(۴) نیز ہر ماں باپ کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے گھر کا ماحول اسلامی و ایمانی بنائیں، خود بھی عملی زندگی میں دین کو داخل کریں، دین پر چلیں اور بچّوں کی بھی دینی تعلیم وتربیت پر توجّہ دیں، ان کی ہر ہر نقل وحرکت پر نظر رکھیں اور مکمّل نگرانی کریں، لقمہ سونے کا دیں؛ لیکن نظر شیر کی رکھیں۔ قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق یہ ہر ماں باپ کی لازمی ذمے داری ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (التحریم : ٦)

عموماً ماں باپ کی غفلت بھی اولاد کے ارتداد کا سبب بنتی ہے، ایسے ماں باپ کو

یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری نقل وحرکت اور اچھے بُرے عمل کا سب سے زیادہ اثر اولاد پر پڑتا ہے، اگر ماں باپ خود بھی دین سے غافل رہے اور اولاد کی دینی تربیت کی فکر نہیں کی، پھر خدانہ خواستہ وہ گمراہی کے راستے پر چل پڑی تو قیامت کے دن یہ اولاد اپنے ماں باپ کے بارے میں شکایت کرے گی کہ اے اللہ! ماں باپ نے ہمیں دنیا کے تمام اسباب ووسائل تو فراہم کیے، اچھا ایجوکیشن دیا، ویل سیٹ کیا، دُنیوی اعتبار سے بہت کچھ دیا؛ لیکن نہ خود دین پر چلے اور نہ ہمیں اس کی ترغیب دی، آج ہمارے جہنّم میں ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے ماں باپ کو فولو کیا، ان کے نقش قدم پر چلے۔

﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴾ (الأحزاب:٦٧)

اتنا ہی نہیں، بددین اولاد اپنے والدین کے لیے جو ان کی دینی تعلیم وتربیت سے مجرمانہ غافل رہے، جس کے نتیجے میں اولاد گمراہی وارتداد کی راہ پر چل پڑی ان کے لیے دوگنے عذاب کی درخواست کرے گی۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا﴾ (الأحزاب:٦٨)

لہٰذا اپنی اور اہل خانہ کی دینی فکر لازم ہے، اس سلسلے میں غفلت برتنا ہلاکت کا سبب ہے۔

(۵) اسی کے ساتھ حضرات علمائے کرام کی بھی ذمّے داری بنتی ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں دینی بیداری کی فکر وکوشش کریں، اپنی تحریر وتقریر، تبلیغ اور تعلق کے ذریعے لوگوں کو دین سے قریب کریں، حکمت کے ساتھ لوگوں کو اصلاحِ عقائد واصلاحِ اعمال کی طرف راغب کریں، منکرات پر متوجّہ کریں، قرآنِ کریم میں اس کا حکم ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران:١٠٤]

یوں تو یہ مجموعی طور پر پوری اُمّت مسلمہ کی ذمّے داری ہے؛ لیکن خصوصی طور پر علماء کی ذمّے داری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (التوبة : ۱۲۲)

''تو ان میں سے ہر ایک گروہ (یا قبیلے) کی ایک جماعت کیوں نہ نکلے کہ وہ لوگ دین میں تفقہ (یعنی خوب فہم وبصیرت) حاصل کریں اور وہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف پلٹ کر آئیں تا کہ وہ (گناہوں اور نافرمانی کی زندگی سے) بچیں۔''

معلوم ہوا کہ حضرات علمائے کرام کی خصوصی ذمّے داری ہے کہ وہ لوگوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لیے کسی بھی خوف یا لالچ کے بغیر رضائے الٰہی کی خاطر کوشش کریں۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرما کر ہماری اور ہماری قیامت تک کی نسلوں کے ایمان کی حفاظت فرمائیں اور ارتداد سے محفوظ فرمائیں۔

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۳ رمئی ۲۰۲۱ء، بروز پیر (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۱۹)

نیک و بد کی پہچان اور ان کا نفع و نقصان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَأَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "خِيَارُ عِبَادِ اللهِ الَّذِيْنَ إِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللهُ، وَشِرَارُ عِبَادِ اللهِ الْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ، الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ، الْبَاغُوْنَ الْبُرَآءَ الْعَنَتَ". (رواه أحمد والبيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ص٤١٥ / باب حفظ اللسان من الغيبة والشتم)

ترجمہ : حضرت عبدالرحمٰن بن غنم اور اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں جنھیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آجائے، اور اللہ تعالیٰ کے بدترین بندے وہ ہیں جو لوگوں میں چغلی کرتے پھرتے ہیں، (جس سے ان کا مقصد) دوستوں کے مابین جدائی پیدا کرنا اور پاکیزہ طبیعت

والے لوگوں کے دامن پر فتنہ و فساد کی چھینٹیں ڈالنا ہوتا ہے۔ (یعنی بے گناہ لوگوں کے متعلّق بدگمانیاں پیدا کر کے اُنھیں مشقت میں ڈالنا ہوتا ہے)۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اَبرار کی پہچان:

اللہ ربّ العالمین نے کتاب و سنّت کے ذریعے ہمیں اپنے بہترین و بدترین بندوں کی پہچان کروائی اور ان کا دُنیوی و اُخروی نفع و نقصان بھی بیان فرما دیا، تاکہ اس کی روشنی میں ہم خود کا جائزہ لے کر اپنے لیے راستہ منتخب و متعین کر سکیں، چنانچہ اہل ایمان میں اَبرار اور نیک لوگوں کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ وہ دِن رات کے اکثر اوقات اور زندگی کے اکثر لمحات میں نیکی، دین کی سربلندی اور اُن امور میں مشغول رہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ بنیں، کیوں کہ حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ ''ابرار'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی عبادت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہو، اس طور پر کہ اس کے عائد کردہ فرائض کا اہتمام کریں اور مناہی سے اجتناب کریں، ظاہر ہے کہ یہی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ''ابرار'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَّ، وَلَا يَرْضَوْنَ الشَّرَّ". (عمدة القاري:۲۱۸/۱، باب المسلم من سلم المسلمون)

یعنی ابرار وہ لوگ ہیں جو (انسان تو کُجا، اللہ تعالیٰ کی بظاہر معمولی مخلوق) چیونٹیوں کو بھی (بلا کسی وجہ کے جان بوجھ کر) نقصان نہ پہنچائیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (خواہ خود سے ہو جائے یا اور کوئی کرے) کو پسند نہ کریں۔ (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بے چین ہو جائیں اور اس کے اِزالے کے فکر کریں)۔

اب جہاں تک تعلق ہے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا، جو بلاشُبہ اُمّت مسلمہ کا

سب سے قیمتی، بہترین طبقہ اور سادۃ الابرار ہیں، تو قرآنِ کریم میں اُمّت کے اس بہترین طبقے کا تعارف اس طرح کروایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ﴾ [الفتح:۲۹]

''وہ کفّار و فجار کے لیے تو بڑے سخت ہیں، لیکن مؤمنین صالحین و ابرار کے لیے بڑے نرم ہیں۔''

علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ترجمانی اس طرح فرمائی کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کفّار و فجار کے ساتھ درشتی، تند خوئی اور بداخلاقی سے پیش آتے ہیں؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی، اصول کی مضبوطی و پابندی، اخلاق و سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفّار و فجار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں، وہ موم کی طرح نہیں ہوتے کہ کفّار و فجار اُنھیں جدھر چاہیں موڑ دیں، وہ کوئی لقمۂ تر نہیں کہ جسے بآسانی نگلا جا سکے، انھیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا تو کسی لالچ و ترغیب سے خریدا بھی نہیں جا سکتا، کفّار و فجار میں یہ طاقت ہی نہیں کہ وہ اُنھیں مقصدِ عظیم یعنی رضائے الٰہی سے ہٹا دیں، جس کے حصول کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

البتہ اہل ایمان و ابرار چوں کہ اصول و مقاصد میں متحد ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے رحیم و کریم اور رفیق و شفیق ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ صفتِ جلال و جمال کے جامع ہیں، جو ان کے کمالِ ایمان کی پہچان ہے۔

ان کی دوسری پہچان یہ ہے کہ

﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ (الفتح : ۲۹)

''تم اُنھیں ہر وقت ہر حال میں رکوع و سجود اور اللہ تعالیٰ کے فضل و خوشنودی کے حصول میں مشغول پاؤ گے۔''

یعنی رضائے الٰہی کا حصول ان کی ہر نقل و حرکت کا مقصد ہوتا ہے، جو کمالِ اعمال کی پہچان ہے۔

ان کی تیسری پہچان یہ ہے کہ ان کے سجدوں اور شب بیداریوں کا نور ان کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے:

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (الفتح : ۲۹)

''دیکھنے والوں کو ان کے چہروں پر نورِ ایمانی نظر آجاتا ہے۔'' اور حدیث پاک کے بیان کے مطابق انھیں دیکھتے ہی اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدّس فوجیں جب شام کی سرحد میں داخل ہوئیں تو اُنھیں دیکھ کر وہاں کے عیسائی کہنے لگے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں اور صحابہ کی جو شان و پہچان ہم سنتے تھے یہ لوگ اسی شان کے نظر آتے ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے:

مردِ حقّانی کی پیشانی کا نور　　کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

اس سلسلے میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نمازیوں کے چہرے کا وہ نور ہے جو قیامت میں نمایاں ہوں گا۔ (معارف القرآن: ۸/ ۹۳)

عاجز کے خیالِ ناقص میں اَبرار کی پہچان یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے دونوں

جہاں میں نوارنی ہوں گے، البتہ فرق یہ ہے کہ دُنیا میں تو ان کا نورِ ایمانی مکمّل طور پر ظاہر نہ ہوگا؛ لیکن آخرت میں جب مکمّل ظاہر ہوگا تو ان کے چہرے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے چودھویں رات کے چاند کے مانند حسین ہوجائیں گے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾
(آل عمران : ۱۰۷)

قرآنِ کریم نے یہ مخصوص اَوصاف اگرچہ اُمّت کے سب سے بہترین طبقے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلّق بیان فرمائے ہیں؛ لیکن اُمّت کے اہل ایمان واَبرار بھی اس میں داخل ہیں، جیسا کہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان فرمایا ہے۔

اس لیے صاحبو! مؤمنین صالحین، ابرار اور اطاعت گزار اللہ تعالیٰ کے بندوں کی یہ بھی بنیادی شان اور پہچان ہے۔

فجار کی پہچان:

اس کے برخلاف فساق وفجار کی پہچان یہ ہے کہ وہ دِن رات کے اکثر اوقات اور زندگی کے اکثر لمحات بدی، بدکاری، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، بدخواہی اور فتنہ پروری میں مشغول رہتے ہیں، اسی کو مذکور حدیث میں اس طرح بیان فرمایا:

"وَشِرَارُ عِبَادِ اللهِ المَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ، المُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الأَحِبَّةِ، البَاغُوْنَ البُرَآءَ العَنَتَ".

یعنی دُنیا کے بدترین لوگ وہ ہیں جو چُغل خوری کرتے پھرتے ہیں، دوستوں (خواہ وہ تمھارے دوست ہوں یا اللہ تعالیٰ کے دوست ہوں) کے درمیان تعلقات خراب کرتے ہیں اور عفیف و پاک دامن لوگوں کے درمیان جھگڑے فساد کی کوشش کرتے ہیں، یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ تو ناراض ہوتے ہی ہیں، اللہ تعالیٰ

کی مخلوق بھی اُن سے بیزار ہو جاتی ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ ہمیں اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم میں اَبرار والی صفات پائی جاتی ہیں یا فجار والی علامات؟ العیاذ باللہ۔

اس کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ ہم اگر اپنی زندگی کو ہر حال میں مطمئن پاتے ہیں تو یہ بھی ہمارے لیے بحمد اللہ ابرار میں شمار ہونے کی علامت ہے، اور اگر ہم اپنی زندگی کو ہر حال میں بے چین پاتے ہیں تو یہ فجار میں شمار ہونے کی ایک بڑی علامت ہے، کیوں کہ ابرار و فجار کا حقیقی نفع و نقصان تو آخرت ہی میں ظاہر ہوگا؛ لیکن دُنیوی زندگی میں بھی اس کے نفع و نقصان کا کچھ اثر ضرور ظاہر ہوتا ہے۔

اَبرار کا دُنیوی نفع:

چنانچہ اہلِ ایمان میں اَبرار اور نیک لوگوں کے دُنیوی نفع کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا کہ ہم انھیں حیاتِ طیبہ یعنی پاکیزہ و پُرلطف زندگی عطا فرمائیں گے۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل:۹۷)

اَبرار کا یہ دُنیوی نفع ہے جو اُنھیں پاکیزہ اور پُرلطف زندگی کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ حضرات مفسرین نے حیاتِ طیبہ یعنی پاکیزہ اور پُرلطف زندگی کے سلسلے میں پانچ اقوال نقل فرمائے ہیں:

(۱) رِزقِ حلال: اللہ تعالیٰ نے برکت حلال ہی میں رکھی ہے، خواہ وہ مقدار میں کم ہو، حرام میں برکت نہیں، خواہ وہ مقدار میں زیادہ ہو۔

(۲) قناعت: یعنی حق تعالیٰ بندے کی محنت اور کوشش سے جو کچھ حلال عطا کرے اس پر بندہ مطمئن ہو جائے۔

دو روٹی ہوں سکون کی تھوڑی سی دال ہو کم ہو تو کوئی غم نہیں؛ لیکن حلال ہو

(۳) توفیق طاعت: ظاہر ہے کہ توفیق عمل عموماً ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو حلال کما کر حلال کھاتے ہیں، حرام خوروں کو عمل صالح کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، اگر وہ کوئی عمل کرتے بھی ہیں تو اس میں عموماً اخلاص نہیں ہوتا۔

(۴) عبادت میں حلاوت: انھیں ایمان و اعمال میں وہ لذت محسوس ہوتی ہے جو دُنیوی اور مادّی چیزوں میں عموماً نہیں ہوا کرتی۔ اہل ایمان و ابرار کو اللہ تعالیٰ کی عبادت، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور خلق خدا کی خدمت میں جو لذت ملتی ہے وہ فساق و فجار کو شراب و کباب میں نہیں ملتی۔

(۵) رضاء بالقضاء: رضاء بالقضاء کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندہ نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور مصیبتوں میں صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہتا ہے، جس کی وجہ سے دُنیا میں ظاہری تنگی، بیماری اور پریشانی کے باوجود اُس کی زندگی پُرلطف اور پرسکون بن جاتی ہے۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۳/۲۷۱، بہ حوالہ تفسیر قرطبی)

اسی لیے مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ

ہر حال میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ دنیا ہی میں رہتے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ

فجار کا دُنیوی نقصان:

اس کے برعکس فساق و فجار کا حال یہ ہوتا ہے کہ دُنیا میں ظاہری ترقّی و خوش حالی کے باوجود دِل اندر سے پریشان اور بے چین ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی زندگی بے لطف ہو جاتی ہے، قرآنِ پاک نے فساق و فجار کے دُنیوی نقصان کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اَعْمٰى﴾ (طٰهٰ : ۱۲۴)

جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا، جو میرے قرآن اور نبی کے فرمان سے روگردانی کرے گا، اسے ظاہری ترقّی و خوش حالی کے باوجود اطمینانِ قلب اور سکونِ زندگی سے محروم کر دیا جائے گا، پھر وہ سامانِ عیش و عشرت کے باوجود سکون و راحت سے محروم کر دیا جائے گا، اس کے منھ میں کباب ہونے کے باوجود دِل میں عذاب ہوگا، اس کا چہرہ بظاہر ہنستا نظر آئے گا؛ لیکن دل بے چین اور پریشان ہی رہے گا، حفاظت مال کا فکر اور افزائش مال کی حرص اسے ہمیشہ پریشان رکھے گی، جس طرح پیاس کا مریض خواہ جس قدر پانی پی لے اس کی پیاس ختم نہیں ہوتی، یہی حال فساق و فجار کا ہے کہ وہ غریب ہوں یا امیر ہوں، ان کی دُنیوی فکر و حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اَبرار کا اُخروی نفع:

یہ تو بات ہوئی اَبرار اور فجار کے دُنیوی نفع و نقصان کی، حقیقی نفع و نقصان تو آخرت کا ہوگا، قرآنِ کریم نے اہل ایمان میں سے اَبرار و نیک لوگوں کے اُخروی نفع کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ (آل عمران : ۱۹۸)

حق تعالیٰ کے یہاں ابرار اور فرماں برداروں کے لیے جو انعام اور اعزاز و اکرام ہے وہ بہت ہی بہترین ہے، اس دنیا میں اس کا حقیقی تصوّر بھی ممکن نہیں، واقعہ تو یہ ہے کہ کتاب و سنّت میں جنّت کی جن نعمتوں کا تذکرہ آیا ہے وہ تو بالکل ابتدائی ہیں، جو اُن میں ترقّی ہوگی اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ قرآن و سنّت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرار اور نیک لوگوں کا یہ حقیقی انعام و اکرام مرتے ہی شروع ہو جائے گا، چنانچہ قرآنِ کریم نے ابرار و متقین کی موت کا منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ملک الموت اپنی

جماعت کے ساتھ آ کر انھیں سلام کرتے ہیں اور جنّت کی بشارت دیتے ہیں، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل : ۳۲)

احادیث طیبہ میں اس کی مزید تشریح منقول ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس میں مؤمنین صالحین اور ابرار و متقین کی موت اور اس وقت کے اعزاز و اکرام کا ذکر ہے:

"قَالَ: إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِيْ انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا، وَإِقْبَالٍ مِنَ الآخِرَةِ، نَزَلَ إِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ مِنَ السَّمَاءِ، بِيْضُ الوُجُوْهِ، كَأَنَّ وُجُوْهَهُمْ الشَّمْسُ، مَعَهُمْ كَفَنٌ مِنْ أَكْفَانِ الجَنَّةِ، وَحَنُوْطٌ مِنْ حَنُوْطِ الجَنَّةِ، حَتَّى يَجْلِسُوْا مِنْهُ مَدَّ البَصَرِ، ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ المَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ، حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهٖ، فَيَقُوْلُ: "أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ! اُخْرُجِيْ إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٍ، قَالَ: فَتَخْرُجُ تَسِيْلُ كَمَا تَسِيْلُ القَطْرَةُ مِنَ السِّقَاءِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ، حَتّٰى يَأْخُذُوْهَا، فَيَجْعَلُوْهَا فِيْ ذٰلِكَ الكَفَنِ، وَفِيْ ذٰلِكَ الحَنُوْطِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَطْيَبِ نَفْحَةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الأَرْضِ، قَالَ: فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّوْنَ يَعْنِي بِهَا عَلٰى مَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوْا: مَا هٰذَا الرُّوْحُ الطَّيِّبُ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، بِأَحْسَنِ أَسْمَائِهِ الَّتِي كَانُوْا يُسَمُّوْنَهُ بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى يَنْتَهُوْا بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَسْتَفْتِحُوْنَ لَهُ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ، فَيُشَيِّعُهُ مِنْ كُلِّ سَمَاءٍ مُقَرَّبُوْهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي تَلِيْهَا، حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهٖ

إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ، فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: اكْتُبُوا كِتَابَ عَبْدِي فِيْ عِلِّيِّيْنَ، وَأَعِيدُوهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَإِنِّيْ مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ، وَفِيهَا أُعِيدُهُمْ، وَمِنْهَا أُخْرِجُهُمْ تَارَةً أُخْرىٰ، قَالَ: فَتُعَادُ رُوحُهُ فِيْ جَسَدِهِ، فَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: رَبِّيَ اللهُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: دِينِيَ الْإِسْلَامُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هُوَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَقُولَانِ لَهُ: وَمَا عِلْمُكَ؟ فَيَقُولُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللهِ، فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ، فَيُنَادِيْ مُنَادٍ فِي السَّمَاءِ: أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ، فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوهُ مِنْ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ، قَالَ: فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ، قَالَ: وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ حَسَنُ الْوَجْهِ، حَسَنُ الثِّيَابِ، طَيِّبُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ: أَبْشِرْ بِالَّذِي يَسُرُّكَ، هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعَدُ، فَيَقُولُ لَهُ: مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيئُ بِالْخَيْرِ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ، فَيَقُولُ: رَبِّ! أَقِمْ السَّاعَةَ حَتَّى أَرْجِعَ إِلىٰ أَهْلِيْ وَمَالِيْ ... الخ". (رواه الإمام أحمد في مسنده، مشكوٰة: ١٤١ إلى ١٤٢، باب ما يقال عند من حضره الموت)

مؤمنین صالحین اور ابرار و متقین کی موت ان کی نہ صرف دُنیوی زندگی کا؛ بلکہ ان کی دُنیوی پریشانیوں اور بیماریوں کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے، ان کی بیماری اور پریشانی موت اور مشاہدۂ آخرت سے پہلے تک ہی رہتی ہے، موت کا مرحلہ شروع ہو کر جیسے ہی مشاہدۂ آخرت شروع ہوتا ہے تو ان کی ساری تکالیف ختم ہو جاتی ہیں، کیوں کہ حدیث پاک کے مطابق اس وقت ابرار اور نیک لوگوں کے پاس آسمان سے آفتاب کی طرح نہایت روشن چہرے والے فرشتے خوش خبری لے کر نازل ہوتے ہیں، قرآنِ پاک میں

اس کا بیان ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (فصلت : ۳۰)

موت کے وقت مؤمنین کو پانچ طرح کی خوش خبری دی جاتی ہے:

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ موت کے وقت ابرار و صالحین میں سے ہر ایک کو ان کے مرتبے و مقام کے مطابق فرشتے پانچ طرح سے خوش خبری سناتے ہیں:

(۱) عام مؤمنین کو کہا جاتا ہے: "لَا تَخَافُوْا": تمھیں دائمی عذاب سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے تمھاری دائمی عذاب سے حفاظت ہوگی۔ "وَلَا تَحْزَنُوْا": اور تمھیں ثواب کے ضائع ہونے کا غم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ": بالآخر تمھیں ابدی جنّت نصیب ہوگی۔

(۲) مؤمنین مخلصین سے کہا جائے گا: "لَا تَخَافُوْا". تمھیں اپنے اعمالِ صالحہ کے رد ہونے سے خوف نہ کرنا چاہیے، وہ اخلاص کے سبب مقبول ہیں، "وَلَا تَحْزَنُوْا". اور نہ تم ثواب کے ضائع ہونے کا غم کرو، بلکہ اخلاص کے سبب تمھیں دوگنا ثواب (بلکہ اس سے زیادہ اضعافاً مضاعفہ) دیا جائے گا۔ "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ".

(۳) تائبین سے کہا جائے گا: "لَا تَخَافُوْا". تم توبہ و تلافی کے بعد اپنے پچھلے گناہوں پر پکڑ کا خوف نہ کرو۔ "وَلَا تَحْزَنُوْا". اور نہ گناہوں کے سبب اعمالِ صالحہ کے ضائع ہونے کا غم کرو؛ کیوں کہ توبہ و تلافی کی وجہ سے تمھارے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔ "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ".

(۴) زاہدین (دُنیا سے کنارہ کش رہ کر آخرت کی تیاری کرنے والے) سے

کہا جائے گا: "لَا تَخَافُوْا". تم حشر کی پریشانی اور حساب کی سختی کا خوف نہ کرو۔ "وَلَا تَحْزَنُوْا". اور ثوابِ اعمال کے دوگنا نہ ہونے کا غم بھی نہ کرو۔ "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ".

(۵) علمائے عاملین و مخلصین سے کہا جائے گا: "لَا تَخَافُوْا": تم قیامت کی ہولناکی کا خوف نہ کرو۔ "وَلَا تَحْزَنُوْا": اب موت کے بعد تمھیں کسی بھی قسم کا غم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ (حق تعالیٰ نے تمھارے سینوں کو علوم سے اسی لیے منور فرمایا تھا کہ تمھیں غم آخرت سے نجات دیں) "وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ". اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ. آمین.

خوش خبری سنانے والے فرشتوں کے متعلّق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ان ملائکہ کے ہاتھ میں جنّتی کفن اور جنّتی خوشبو ہوتی ہے، اور وہ فرشتے آکر بندۂ مؤمن کے سامنے وہاں بیٹھ جاتے ہیں جہاں اس کی نظر پہنچتی ہے، پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پاک جان! اللہ ربّ العزت کی مغفرت اور اس کی رضا و رحمت تک پہنچنے کے لیے نکل!

قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝﴾ (الفجر : ۲۷ إلى ۳۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی ابرار اور نیک بندوں کی روح جسم سے بآسانی نکل جاتی ہے، جس طرح پانی کے مشکیزے سے پانی بآسانی ٹپک کر بہہ جاتا ہے، اس کے بعد ملک الموت اور دیگر ملائکہ بندۂ مؤمن کی مقدّس اور پاکیزہ روح کو جنّتی کفن میں لپیٹ کر جنّتی خوشبو سے معطر کر کے نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لے کر آسمان کی طرف بڑھتے ہیں اور فرشتوں میں اس کا بہترین تعارف کروا کر

اس کی روح کو دربارِ الٰہی میں پہنچا دیا جاتا ہے، تو حق تعالیٰ حکم فرماتے ہیں کہ اس روح کو عرشِ الٰہی کے نیچے (جنّت کا خاص مقام جسے علیین کہا جاتا ہے اس میں) رکھ دو۔

قرآنِ کریم نے اس کو بیان فرمایا:

﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝﴾ (المطففين : ١٨)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝﴾ (الانفطار : ١٣)

''بلاشبہ ابرار جنّت کی راحتوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔''

فجار کا اُخروی نقصان:

اس کے برعکس فجار و بدکار اور بے ایمان لوگوں کی موت نہ صرف ان کی دُنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے؛ بلکہ ان کی ظاہری دُنیوی عیش و عشرت اور خوش حالی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے اور مرتے ہی ان کی رُسوائی اور پریشانی شروع ہو جاتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے ایک مقام پر فرمایا کہ ملک الموت اپنی جماعت کے ساتھ روح قبض کرنے کے لیے اُن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور خوف ناک آواز میں اُن سے کہتے ہیں:

﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝﴾ (الأنعام : ٩٣)

''اپنی جانیں ہمارے حوالے کر دو، آج سے تمھیں ذلّت کی سزا دی جائے گی (اس سے عذابِ قبر کا برحق ہونا ثابت ہوتا ہے) اس وجہ سے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ناحق باتیں کیا کرتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے سرکشی کیا کرتے تھے۔''

حدیث پاک میں ہے:

"قَالَ: وَإِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ إِذَا كَانَ فِيْ انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا، وَإِقْبَالٍ

مِنْ الْآخِرَةِ نَزَلَ إِلَيْهِ مِنَ السَّمَاءِ مَلَائِكَةٌ سُودُ الْوُجُوهِ، مَعَهُمْ الْمُسُوحُ، فَيَجْلِسُونَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَجِيئُ مَلَكُ الْمَوْتِ، حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَيَقُولُ: أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيثَةُ! اخْرُجِي إِلٰى سَخَطٍ مِنَ اللهِ وَغَضَبٍ، قَالَ: فَتُفَرَّقُ فِي جَسَدِهِ، فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُّودُ مِنْ الصُّوفِ الْمَبْلُولِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِي يَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَجْعَلُوْهَا فِي تِلْكَ الْمُسُوحِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَنْتَنِ رِيحِ جِيفَةٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ، فَيَصْعَدُونَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّونَ بِهَا عَلٰى مَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوا: مَا هٰذَا الرُّوحُ الْخَبِيثُ؟ فَيَقُولُونَ: فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِأَقْبَحِ أَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانَ يُسَمّٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهِ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيُسْتَفْتَحُ لَهُ، فَلَا يُفْتَحُ لَهُ، ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: اُكْتُبُوا كِتَابَهُ فِي سِجِّينٍ فِي الْأَرْضِ السُّفْلٰى، فَتُطْرَحُ رُوحُهُ طَرْحًا، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ فَتُعَادُ رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ، وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ، لَا أَدْرِيْ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ، لَا أَدْرِيْ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ، لَا أَدْرِي، فَيُنَادِي مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: أَنْ كَذَبَ، فَأَفْرِشُوا لَهُ مِنَ النَّارِ، وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ، فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُومِهَا، وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ،

حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيهِ أَضْلَاعُهُ، وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ قَبِيحُ الْوَجْهِ، قَبِيحُ الثِّيَابِ، مُنْتِنُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ: أَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُوءُكَ، هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعَدُ، فَيَقُولُ: مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيءُ بِالشَّرِّ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيثُ، فَيَقُولُ: رَبِّ! لَا تُقِمِ السَّاعَةَ".

(مسند أحمد، مشكوٰة:١٤٣، باب ما يقال عند من حضره الموت)

جب فجار و بدکار اور بے ایمان بندوں کی موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے عذابِ الٰہی کے نہایت ڈراؤنے اور کالے چہرے والے فرشتے دوزخی ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور وہاں تک بیٹھ جاتے ہیں جہاں تک اس فاجر و بدکار بندے کی نظر پہنچتی ہے، پھر ملک الموت اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتے ہیں کہ اے ناپاک روح! چل نکل، تاکہ تجھے عذابِ الٰہی میں مبتلا کیا جائے۔ (العیاذ باللہ) یہ سنتے ہی اس فاجر و بدکار کی روح جسم میں پھیل جاتی ہے، تو ملک الموت اس کی روح کو نہایت سختی کے ساتھ نکالتے ہیں، پھر نہایت ذلّت کے ساتھ اسے دوزخ کے ٹاٹ میں لپیٹ کر آسمان کی طرف چلتے ہیں، فرشتوں میں بُرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور بدکار و فاجر کی روح میں سے نہایت بدترین قسم کی بدبو آتی ہے، اس کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ طورِ استدلال یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (الأعراف : ٤٠)

ظاہر ہے کہ جب آسمان کے دروازے ہی نہیں کھولے جائیں گے تو آسمانوں کے اوپر جنّت میں داخلہ کیسے ہو سکے گا؟ اس کے بعد ساتویں زمین کے نیچے جہنّم کے ایک خطرناک قید خانے میں جسے قرآنِ کریم نے سجین کہا ہے، اس فاجر بندے کی روح

کو ڈال دیا جائے گا۔

﴿كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ ۝٧﴾ (المطففین : ۷)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَإِنَّ ٱلْفُجَّارَ لَفِى جَحِيمٍ ۝١٤﴾ (الانفطار : ۱٤)

''یقیناً فجار و بدکار دوزخ کے قید خانے میں ہوں گے۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

موت کے بعد فجار کے احوال:

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ موت کے بعد قیامت سے پہلے تک مرنے والا جب وہ فاجر و بدکار ہوتا ہے تو پانچ حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے:

(۱) اس کی روح تو ملک الموت لے جاتے ہیں۔

(۲) اس کا دُنیوی مال و متاع ورثاء لے جاتے ہیں۔

(۳) اس کا گوشت قبر کے کیڑے مکوڑے کھا لیتے ہیں۔

(۴) اس کی ہڈّیاں قبر کی مٹّی کھا لیتی ہے۔

(۵) حقوق العباد میں اگر کوتاہیاں کی ہوں تو اس کی نیکیاں حقدار لے جاتے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآأُولِي الأَبْصَارِ!

دانائی و عقلمندی یہی ہے کہ موت سے پہلے ہم آج ہی اَبرار و صالحین کی طرح اچھّی طرح تیاری کر لیں۔

حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہمیں دارین میں صالحین و ابرار اور مقرّبین بندوں میں شامل فرما کر جہنّم سے محفوظ فرمائیں۔

صدیق مکرّم الحاج آصف بھائی میمن سے ہونے والے معاملے کو اللہ تعالیٰ خیر و برکت کا سبب بنا کر بقیہ نصف قسط کو آسان فرمائیں اور آج رات تراویح میں ہونے والے ختم قرآن کو ہم سبھی کے لیے اپنی رضا و رحمت اور سعادتِ دارین کا سبب بنائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

۲۶ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۹ رمئی ۲۰۲۱ء راتوار

(بمقام: بزمِ صدیقی بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۰)

روح کے احوال اور حقائق

اس مضمون سے متعلق حضرت مفتی شاہ محمد ملک صاحب کا تاثر

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، أَمَّا بَعْدُ.

اب مجھے چھوڑ کے تنہا تو کہاں جاتی ہے　　جسم نے روحِ رَواں سے یہ کہا تربت میں

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم مرا ترجماں نہیں ہے

روح ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کسی بھی فردِ بشر کو نہیں، نظروں سے پوشیدہ لیکن اس کا موضوع دل چسپ اور اہم ضرور ہے، خاص طور پر جب قرآن و حدیث اس کا محور ہو۔ ''روح کے احوال اور حقائق'' نامی موضوع پر پی ڈی ایف کی شکل میں زیرِ نظر مجموعہ اس سلسلے میں ایسا نایاب ذخیرہ ہے جس کو مشفق ومکرّم عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی مدظلہ نے انتہائی دل چسپی وعرق ریزی سے قرآنی آیات واحادیث مبارکہ سے مدلل ومزین کرکے اس موضوع سے متعلّق مواد جمع فرمایا، اب اُمّت مسلمہ کے فائدے کے لیے اسے عام کیا جارہا ہے، اس موضوع پر مرتّب

انداز سے یہ مختصر سا نادر مجموعہ انتہائی مفید معلوم ہوا، جس کی ضرورت نہ صرف طبقہ خواص وعلماء کو ہے؛ بلکہ محققین وحکماء، مدرّسین وطلبہ اور اُمّت کے دیگر طبقوں کی اس موضوع سے متعلّق تشنگی بھی اس کتاب سے بجھ جائے گی، روح کے ابتدائی مراحل سے آخری منازل تک کے تمام حالات خواہ وہ ''روحِ سعید'' ہو کہ اعلیٰ علیین میں اس کو ٹھکانہ نصیب ہو، یا ''روحِ شقی'' کہ اس کا ٹھکانہ جہنّم قرار پائے، ہر ایک کو مدلل ومحقق فرمایا ہے۔

اس مجموعے میں داعیانہ، خطیبانہ اور معلوماتی انداز نہایت مؤثّر اور مفید ہے، بڑی بات تو یہ ہے کہ اسے پڑھ کر انسانی زندگی کا مقصد مستحضر ہو جاتا ہے، جو ایمان کی تازگی کا باعث ہے۔

اللہ تعالیٰ اس مدلل مجموعے کو مصنّف کے حق میں ثوابِ جاریہ اور اُمّت کے حق میں نافع بنائے۔ آمین ثم آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

خاک پائے سیّد مرسلین

(مفتی) شاہ محمد ملک

فاضل دار العلوم دیوبند

چیرمین دار الافتاء والقضاء محکمۂ شرعیہ خیر المدارس

یونیورسٹی روڈ، بھدرواہ، جموں کشمیر

۲۱ رشوال المکرم ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲ رجون ۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِذَا خَرَجَتْ رُوْحُ الْمُؤْمِنِ تَلَقَّاهَا مَلَكَانِ يُصْعِدَانِهَا، قَالَ حَمَّادٌ: فَذَكَرَ مِنْ طِيْبِ رِيْحِهَا، وَذَكَرَ الْمِسْكَ، قَالَ: وَيَقُوْلُ أَهْلُ السَّمَاءِ: رُوحٌ طَيِّبَةٌ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ الْأَرْضِ، صَلَّى اللهُ عَلَيْكِ، وَعَلٰى جَسَدٍ كُنْتِ تَعْمُرِيْنَهُ، فَيُنْطَلَقُ بِهٖ إِلٰى رَبِّهٖ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ يَقُوْلُ: انْطَلِقُوا بِهٖ إِلٰى أَخِرِ الْأَجَلِ، قَالَ: وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا خَرَجَتْ رُوحُهٗ، قَالَ حَمَّادٌ: وَذَكَرَ مِنْ نَتْنِهَا، وَذَكَرَ لَعْنًا، وَيَقُوْلُ أَهْلُ السَّمَاءِ: رُوحٌ خَبِيْثَةٌ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ الْأَرْضِ، قَالَ: فَيُقَالُ: انْطَلِقُوا بِهٖ إِلٰى أَخِرِ الْأَجَلِ، قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَرَدَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَيْطَةً كَانَتْ عَلَيْهِ عَلٰى أَنْفِهٖ هٰكَذَا".

(رواه مسلم، مشكوٰة : ١٤٢، باب ما يقال عند من حضره الموت)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مؤمن کی روح نکلتی ہے تو اسے دو فرشتے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، (حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ جو اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ) اس روح سے مشک کی طرح بہترین خوشبو آتی ہے، جسے سونگھ کر آسمان کے فرشتے کہتے ہیں کہ پاک روح زمین سے آئی ہے، پھر وہ اس مؤمن کی روح سے کہتے ہیں کہ تجھ پر اور اس بدن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جس کو تو نے آباد رکھا تھا، پھر فرشتے اس مؤمن کی پاکیزہ روح کو اللہ تعالیٰ کے پاس (عرش پر) لے جاتے ہیں، تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے

لے جاؤ اور قیامت تک مہلت دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کافر کی روح نکلتی ہے تو حماد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روح سے بدترین بدبو آتی ہے اور لعنت برستی ہے، جس کی وجہ سے آسمان کے فرشتے کہتے ہیں کہ ناپاک روح زمین سے آئی ہے، پھر من جانب اللہ اس کے متعلّق فیصلہ ہوتا ہے کہ اسے بھی لے جاؤ اور قیامت تک مہلت دے دو، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر کا کونا اپنی ناک پر اس طرح رکھا۔ (جس طرح بدبو آنے پر رکھتے ہیں، کیوں کہ بطورِ معجزہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی بدبو کا احساس ہوا)۔ واللہ اعلم۔

جسم میں روح اصل ہے:

اللہ ربّ العزت والجلال نے ہر انسان وحیوان کو دو چیزوں سے مرکب کیا ہے، دو چیزوں سے جوڑ کر پیدا فرمایا ہے، ایک جسم اور دوسری روح، فرق اتنا ہے کہ جسم ظاہر ہے جو نظر آتا ہے، جب کہ روح ظاہر نہیں ہے، اس لیے وہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی، نہ کسی ٹیسٹ یا ایکسرے میں نظر آتی ہے اور نہ ہی سائنسی طور پر اس کے وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے، اس کے باوجود اس کے ہونے کا سبھی کو یقین ہے۔

دنیا کا ہر سمجھ دار انسان اتنا تو جانتا ہے کہ انسان کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے، البتہ انسان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے انسانی جسم کی حیثیت ایک ڈھانچے اور پتلے کی ہے اور روح اس میں اصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جسم انسانی مکان ہے تو روحِ انسانی اس کی مکین ہے، جیسے مکین کے بغیر مکان تو کیا عالی شان محل بھی بے کار ہے، ایسے ہی روح کے بغیر جسم بھی بے کار ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ

انسانی جسم ایک خود کار اور فرض شناس مشین ہے، جس میں آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ، پیر، دل، دماغ اور معدہ وغیرہ مختلف اعضاء واجزاء اس مشین کے مختلف شعبے اور حصے ہیں، ان میں سے ہر عضو بہ حکم الٰہی بڑی مستعدی کے ساتھ کسی حرج، خرچ اور شور کے بغیر اپنا کام مسلسل کرتا رہتا ہے، لیکن اس مشین کو جو چیز کنٹرول کرتی ہے وہ ہے روح، روح ہے تو جسم میں جان ہے، طاقت ہے اور صلاحیت ہے، روح ہے تو یہ آنکھیں دیکھتی ہیں، ناک سونگھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان بولتی اور چکھتی ہے، معدہ کھانا ہضم کرتا ہے، ہاتھ پکڑتے ہیں، پیر چلتے ہیں اور دل ودماغ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں، اگر جسم بظاہر مکمل اور سلامت ہو، لیکن روح نکل جائے، جو کہ اصل ہے، تو انسان اور اس کے اعضاء بے کار ہو جاتے ہیں، پھر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ چلتا پھرتا اور بولتا چلتا انسان، ہواؤں میں پرواز کر کے چاند تک پہنچنے والا انسان، جوہری بم، کمپیوٹر اور حیرت انگیز ٹیکنالوجی ایجاد کرنے والا انسان مٹّی کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور بعض صلحاء وشہداء کے علاوہ عموماً مرنے والے کا جسم گل سڑ کر مٹّی بن جاتا ہے۔ مرنے کے بعد اگرچہ روح باقی رہتی ہے؛ لیکن جسم بے کار ہو جاتا ہے، اسی کو اکبر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

قضا کے سامنے بیکار ہو جاتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں آنکھیں؛ مگر بینا نہیں ہوتیں

حقیقت روح کی جستجو:

الغرض انسانی جسم میں روح اصل ہے؛ لیکن اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ روح کی اصلیت اور حقیقت سے واقفیت حاصل کرنا سب کے بس کی بات نہیں،

حالانکہ آج کے ترقی یافتہ لوگوں ہی نے نہیں؛ بلکہ دورِ جاہلیت کے لوگوں نے بھی روح کی اصلیت وحقیقت جاننے کی کوشش کی، اس کے متعلّق حضور ﷺ سے سوال کیا، یہ سوال کرنے والے یا تو یہودِ مدینہ تھے، جیسا کہ بخاری ومسلم شریف کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یا پھر روح کے بارے میں سوال ان تین سوالوں میں سے ایک تھا جو مدینہ کے یہودیوں نے قریش مکہ کو سکھائے تھے، بہرحال سائل جو بھی ہو، اور روح سے مراد وحیٔ الٰہی ہو یا روحِ انسانی، سوال کا مقصد علم واستفادہ کم اور امتحان زیادہ تھا، اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (الإسراء : ۸۵)

''محبوبم! یہ لوگ آپ سے روح کے متعلّق سوال کرتے ہیں نا! آپ اُنھیں بتا دیجیے کہ روح کی حقیقت تو بس اتنی ہے کہ یہ میرے رب کا حکم ہے۔''

یہ کوئی مادّی چیز (Matter) نہیں؛ بلکہ یہ (Math Physical) چیز ہے، اسی سے انسان کی دُنیوی زندگی برقرار رہتی ہے اور اس کے نکل جانے سے دُنیوی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے سوال کے جواب میں جتنی بات بتانی ضروری تھی اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتی تھی وہی صرف بتائی، اور روح کی مکمّل حقیقت جس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا وہ اس لیے نہیں بتائی کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھی اور ان کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ سائل کا جواب اس کی ذہنی صلاحیت اور اپنی مصلحت کی رعایت کے ساتھ دینا چاہیے، نیز ہر سوال کا جواب دینا یا ہر سوال کی ہر شق کا جواب دینا بھی ضروری نہیں۔

اس موقع پر علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روح کی مکمّل حقیقت اس لیے نہیں بتائی گئی کہ انسان کو یہ پتا چل جائے کہ جب وہ اپنی ذات کی حقیقت جاننے سے

عاجز ہے تو خالق کائنات کی مکمّل معرفت حاصل کرنے سے تو بطریق اولیٰ عاجز ہوگا۔

(مستفاد از: انوار البیان: ۳/ ۳۷۸)

جسم میں روح کب اور کہاں ڈالی جاتی ہے؟

بہر کیف قرآنِ کریم نے روح کی حقیقت سے متعلّق اجمالی طور پر اِتنی بات بتا دی کہ وہ ''امر ربّ'' ہے، پھر قرآنِ پاک اور حدیث شریف کی مزید تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم انسانی میں یہ روح جو امر رب ہے وہ بہ حکم ربّانی بذریعۂ فرشتہ اس وقت پھونکی جاتی ہے جب انسان رحم مادر میں ہوتا ہے، جس کے بعد انسان زندہ ہوجاتا ہے، پھر جب تک حق تعالیٰ نے وقت مقرر کیا ہوتا ہے وہ روح جسم انسانی میں رہتی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے جب روح کو جسم سے نکال لیا جاتا ہے تو جسم انسانی مٹّی میں مل جاتا ہے؛ لیکن روح اپنے ٹھکانے پر پہنچادی جاتی ہے۔

قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ (المؤمنون: ۱۲ - ۱۳ - ۱۴)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یقیناً ہم نے انسان (اوّل) کو مٹّی سے (اور اس کی اولاد کو اس نطفے سے پیدا کیا جو مٹّی سے پیدا ہونے والی غذاؤں سے بنتا ہے) پھر اس نطفے کو رحم مادر میں ایک محفوظ ٹھکانے میں قرار دیا، پھر نطفے کو جما ہوا خون بنادیا، پھر جمے ہوئے خون کو گوشت کا ٹکڑا کردیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈّیاں بنادیں، پھر ہڈّیوں کو گوشت پہنا دیا، پھر ہم نے اسے دوسری (حسین) مخلوق بنادیا۔ (جسے انسان کہتے ہیں)۔

حدیث پاک میں ہے:

" إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ إِلَيْهِ مَلَكًا بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ، فَيَكْتُبُ رِزْقَهُ وَأَجَلَهُ وَعَمَلَهُ، وَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ، ثُمَّ يَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ". (متفق عليه عن أبي سعيد، مشكوٰة : ۲۰، باب الإيمان بالقدر)

ہر انسان کی پیدائش اس طرح ہوتی ہے کہ سب سے پہلے انسانی نطفہ (منی کا ناپاک قطرہ پیدا ہونے والے کی) ماں کے پیٹ میں چالیس دِن جمع رہتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں میں وہ جما ہوا خون بنتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں میں وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے (پھر جب جسم انسانی ماں کے پیٹ میں چار مہینے کے بعد مکمّل ہو جاتا ہے تب حق تعالیٰ کے حکم سے) اس کے متعلّق فرشتہ چار باتیں لکھ دیتا ہے، اس کا عمل (کیسا ہوگا؟) اس کی موت (کب اور کہاں ہوگی؟) اس کی روزی کتنی ہوگی؟ اور وہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت؟

حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے نیک بختی کی پانچ علامتوں کا تذکرہ فرمایا ہے: (۱) دِل کی نرمی (۲) اللہ تعالیٰ کے حضور آہ وزاری (۳) دنیا سے بے رغبتی (۴) بے جا امیدوں کا کم ہونا (۵) شرم وحیا۔

جب کہ دِل کی سختی، آنکھوں کی خشکی، دنیا کی رغبت، طولِ اَمل اور بے حیائی بد بختی کی علامتیں ہیں۔ (خزائن العرفان)

(غرض فرشتوں کا یہ لکھا ہوا عین اسی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے جو ہر انسان کے لیے لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے) اس کے بعد جسم انسانی میں بذریعۂ فرشتہ روح پھونکی جاتی ہے۔

ان حقائق سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ حق تعالیٰ نے پہلے انسانی جسم کا ڈھانچہ اور پتلا تیار کیا، اس کے بعد اس میں روح پیدا فرمائی۔ دوسری بات یہ کہ جسم

انسانی میں روح جہاں ڈالی جاتی ہے وہ ماں کا پیٹ ہے۔

روح کے چار ٹھکانے ہیں:

علّامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الروح'' میں فرمایا ہے کہ ارواحِ انسانی کے چار ٹھکانے ہیں، اور ہر دوسرا ٹھکانہ پہلے سے زیادہ بڑا اور وسیع ہے، پہلا ٹھکانہ رحم مادر ہے، جس کا حدیث پاک میں ذکر ہوا، روح کا یہ پہلا گھر اور ٹھکانہ نہایت تنگ وتاریک ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تین اندھیریوں سے گھرا ہوا ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (الزمر:٦)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین اندھیریوں اور پردوں میں مختلف مراحل سے گزار کر بنایا اور پیدا فرمایا، ایک تو ماں کے پیٹ کا اندھیرا، دوسرا رحم مادر کا اندھیرا اور تیسرا اُس جھلی کا جس میں بچّہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

علّامہ عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ وہ قرآنی حقائق ہیں جنھیں پڑھ کر الٰہ آباد کا ایک ہندو ڈاکٹر مسلمان ہو گیا تھا، اس نے کہا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کے لیے اس گہری طبی حقیقت سے واقف ہونا ناممکن تھا۔ قرآن پاک کی یہ آیت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام الناس نہیں؛ بلکہ کلام اللہ ہے۔ (مستفاد از تفسیر ماجدی)

شکم مادر کے بعد روح کا دوسرا ٹھکانہ عالم دنیا ہے، جہاں انسان خیر وشر اور شقاوت وسعادت کی کھیتی کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب انسان ماں کے پیٹ سے دنیا کے پیٹ میں آتا ہے تو روح کا یہ گھر اور ٹھکانہ شکم مادر سے بہت بڑا ہے، حق تعالیٰ نے روئے زمین کے متعلّق ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ﴾ (العنکبوت : ٥٦)

''میری زمین بہت کشادہ ہے۔''

روح کا تیسرا ٹھکانہ پہلے دونوں سے بہت زیادہ وسیع ہے اور وہ ہے عالم برزخ، دُنیوی زندگی میں موت سے لے کر قیامت تک کا جو عرصہ ہے اسے عالم برزخ کہا جاتا ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (المؤمنون : ١٠٠)

''موت کے بعد تو عالم برزخ ہی ہے قیامت قائم ہونے تک۔''

عاجز کا خیالِ ناقص اس سلسلے میں یہ ہے کہ عالم برزخ میں جانے والے ہر انسان اور اس کی روح کا عالم دُنیا سے رابطہ ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن اچھے بُرے عمل کا اثر محسوس ہونے لگتا ہے، تو موت کے بعد سے قیام ساعت تک کا جو وقفہ ہے اُسے برزخ کہتے ہیں، جو روحِ انسانی کا تیسرا مسکن اور ٹھکانہ ہے۔

اس کے بعد روح کا آخری، اصل اور چوتھا ٹھکانہ یا تو جنّت ہے، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ یا جہنّم ہے، العِیَاذُ بِاللهِ العَظِیْم. اسی کو قرآنِ کریم میں بیان فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝١٣ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝١٤﴾ (الانفطار: ١٣-١٤)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّيْنٍ ۝٧﴾ (المطففین : ٧)

''بدکاروں کے اعمال نامے جہنّم کے قید خانوں میں ہوں گے۔''

جب کہ نیک لوگوں کے اعمال نامے جنّت میں ہوں گے۔

﴿كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّيْنَ ۝١٨﴾ (المطففین : ١٨)

حدیث میں اعمال ناموں کے علاوہ روح کا بھی تذکرہ ہے۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ ۲: ۱۴۲)

مطلب یہ ہے کہ نیک لوگوں کی ارواح اپنے آخری مسکن علیین میں ہوں گی اور کفّار کی ارواح سجین میں ہوں گی۔ العیاذ باللہ العظیم۔

دُنیا میں حالات سے جسم متاثّر ہوتا ہے اور عالم برزخ میں روح:

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ ہر انسان کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے؛ لیکن دُنیوی حالات واثرات اور برزخی واُخروی حالات واثرات کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم اور روح کا باہمی تعلق اس دنیا میں اس طرح ہے کہ تکلیف، مصیبت یا راحت و لذت کی جو کیفیت یہاں آتی ہے وہ براہِ راست جسم پر آتی ہے اور روح اس سے تبعاً متاثّر ہوتی ہے، مثلاً انسان کو چوٹ لگتی ہے، وہ زخمی ہوتا ہے، یا کہیں آگ سے جل جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ چوٹ اور آگ کا تعلق براہِ راست اس کے جسم سے ہوتا ہے؛ لیکن اس کے اثر سے روح کو بھی درد ہوتا ہے، اسی طرح کھانے پینے کی جو لذت ہوتی ہے وہ بھی براہِ راست جسم ہی کو حاصل ہوتی ہے؛ لیکن روح بھی (تبعاً) اس سے لذت حاصل کرتی ہے، تو جس طرح دنیا کے اچھے بُرے حالات سے جسم براہِ راست متاثّر ہوتا ہے اور روح تبعاً متاثّر ہوتی ہے، اسی طرح عالم برزخ کے اچھے بُرے حالات سے روح براہِ راست متاثّر ہوتی ہے اور جسم تبعاً متاثّر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس دنیا میں نیند کو نمونہ بنادیا، کہ بندہ نیند کی حالت میں اچھے بُرے خواب بھی دیکھتا ہے؛ لیکن اس کی راحت وتکلیف براہِ راست جسم کو تو محسوس نہیں ہوتی، حتیٰ کہ خواب دیکھنے والے کے قریب بیٹھے ہوئے اور اسے دیکھنے والے کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا؛ لیکن خواب دیکھنے والے کی روح اس سے ضرور اثر لیتی ہے، کیوں کہ عالم

رؤیا یعنی دُنیوی خواب کی راحت ومصیبت کا براہِ راست اثر روح پر ہوتا ہے، جسم تبعاً اس سے متاثّر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عالم برزخ کی راحت ومصیبت سے بھی روح براہِ راست متاثّر ہوتی ہے، جسم روح کے واسطے سے تبعاً متاثّر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(مستفاد از معارف الحدیث: ۱/ ۱۸۸)

روحِ مؤمن کا اکرام:

عالم برزخ میں اصل معاملہ روح کے ساتھ ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ مؤمن بندے کی روح کے ساتھ اعزاز واکرام کا معاملہ ہوتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "المَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ، فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوْا: اُخْرُجِيْ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ! كَانَتْ فِيْ الجَسَدِ الطَّيِّبِ، اُخْرُجِيْ حَمِيْدَةً، وَأَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ، وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ، فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ". (مسند أحمد، الرقم: ٨٧٦٩)

جب کسی کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے تو مرنے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں، یہ فرشتے نہایت روشن اور خوب صورت چہرے والے بھی ہوتے ہیں اور نہایت تاریک اور بدصورت چہرے والے بھی ہوتے ہیں، رحمت والے بھی ہوتے ہیں اور عذاب والے بھی، دونوں طرح کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ (جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ مسند احمد، مشکوٰۃ: ۱۴۲) اگر مرنے والا مؤمن اور نیک ہوتا ہے تو روشن اور خوب صورت چہرے والے رحمت کے فرشتے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، مرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور جنّت کی خوش خبری سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے پاکیزہ روح! پاک جسم سے اس حالت میں نکل کہ تیری

تعریف ہورہی ہے، تجھے بشارت ہواس جنّت کی جس میں راحت اور پاکیزہ رزق ہے، اپنے رب کی ملاقات کے لیے چل جو تجھ پر مہربان ہے، ناراض نہیں ہے۔

قرآنِ کریم نے بھی اسے مختلف مقامات پر بیان فرمایا، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (فصلت : ۳۰)

دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر : ۲۷ إلیٰ ۳۰)

حدیث میں ہے کہ مؤمن بندے کی روح کو رحمت کے خوب صورت فرشتے مسلسل بشارت دیتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ ملک الموت آکر نہایت نرمی وآسانی سے اس طرح روح نکالتے ہیں جس طرح پانی کا قطرہ مشکیزے سے ٹپک پڑتا ہے۔

"كَمَا تَسِيْلُ الْقَطْرَةُ مِنَ السِّقَاءِ". (مسند أحمد، مشكوٰة : ۱۴۲)

پھر اس مؤمن بندے کی روح کو جنّتی قیمتی خوشبوؤں میں معطر کرکے جنّتی ریشمی کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ (ایضاً)۔

اس کے بعد رحمت والے فرشتے مؤمن بندے کی روح کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لے کر آسمان پر لے جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں مذکور ہے:

"إِذَا خَرَجَتْ رُوْحُ الْمُؤْمِنِ تَلَقَّاهَا مَلَكَانِ يُصْعِدَانِهَا".

اس روایت میں دو فرشتوں کا ذکر ہے؛ لیکن مشکوٰۃ کی اگلی روایت میں مختلف فرشتوں کا تذکرہ ہے۔ (مسند احمد، نسائی، مشکوٰۃ: ۱۴۲)

آسمان کے دروازے اس روحِ مؤمن کے اکرام میں کھول دیے جاتے ہیں، آسمانی فرشتے روحِ مؤمن کی بہترین اور پاکیزہ خوشبو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"رُوْحٌ طَيِّبَةٌ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ الْأَرْضِ، صَلَّى اللهُ عَلَيْكِ، وَعَلٰى جَسَدٍ كُنْتِ تَعْمُرِيْنَهٗ".

روئے زمین سے نہایت پاک روح آئی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے جسم پر رحمت نازل فرمائے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ روحِ مؤمن کا آسمان میں نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے کہ

"فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِأَحْسَنِ أَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانُوْا يُسَمُّوْنَهٗ بِهَا فِي الدُّنْيَا". (مسند أحمد، مشكوٰة : ١٤٢)

(مثلاً) یہ حضرت مولانا محمد صدیق بن حافظ نور محمد شاہ بھائی ہیں۔ اور ان شاء اللہ الرحمٰن اس عاجز کے لیے کہا جائے گا کہ یہ محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی ہیں۔ (رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة)۔

حدیث مذکور میں ہے کہ پھر اس روحِ مؤمن کو ربِ کریم کے عرشِ عظیم پر پہنچا دیا جاتا ہے، "فَيُنْطَلَقُ بِهٖ إِلٰى رَبِّهٖ". جہاں سے ارشادِ عالی اور فرمانِ شاہی ہوتا ہے کہ اسے قیامت تک مہلت دے دی جائے: "اِنْطَلِقُوْا بِهٖ إِلٰى أٰخِرِ الْأَجَلِ". جس کی وجہ سے روحِ مؤمن کو اپنے تیسرے ٹھکانے برزخ میں جنّت کے قریب یعنی سدرۃ المنتہیٰ میں عام ارواحِ مؤمنین کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔

"فَيَأْتُوْا بِهٖ إِلٰى أَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِيْنَ". (مسند أحمد، النسائي، مشكوٰة: ١٤٢)

کتاب وسنّت سے ثابت ہے کہ عالم برزخ میں اَرواح کا تعلق اپنے اَجسام

سے اس حد تک رہتا ہے کہ وہ راحت وتکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔

عالم برزخ میں اَرواح آپس میں ملاقات اور مذاکرہ کرتی ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں علیین والی یعنی راحت پانے والی اَرواح آپس میں ملاقات اور مذاکرہ بھی کرتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مرنے والے کی اس روحِ مؤمن کو برزخ میں موجود اَرواحِ مؤمنین کے پاس جب پہنچا دیا جاتا ہے تو انھیں اس کے آنے سے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے، جیسے کوئی سالوں بعد اپنا قریبی رشتے دار سفر سے گھر واپس لوٹتا ہے تو گھر والوں کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

"فَهُمْ أَشَدُّ فَرَحًا بِهِ مِنْ أَحَدِكُمْ بِغَائِبِهِ يَقْدَمُ عَلَيْهِ". (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة : ١٤٢)

مؤمنین کی اَرواح بعد میں آنے والے مؤمن سے بخوشی ملاقات کرنے کے بعد آپس میں مذاکرہ کرتی ہیں اور دنیا والوں کے احوال بھی پوچھتی ہیں کہ فلاں کا کیا ہوا؟ اور فلاں فلاں شخص کا کیا حال ہے؟ یعنی ان جان پہچان والوں کے متعلّق پوچھا جاتا ہے جنھیں چھوڑ کر وہ فوت ہو گئے تھے۔

حدیث میں ہے:

"فَيَسْأَلُوْنَهُ: مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ؟ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ؟" (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة المصابيح : ص١٤٢)

پھر جب یہ نووارِد روحِ مؤمن ارواحِ مؤمنین کے پوچھنے پر ان کے رشتے داروں کے متعلّق دین داری اور خوش حالی کی خبر دیتی ہے تو ارواحِ مؤمنین کو خوشی ہوتی ہے اور وہ ان کے لیے مزید استقامت کی دُعا کرتی ہیں، اور اگر وہ بے دینی اور بدحالی

میں ہوتے ہیں تو اسے سن کر ارواحِ مؤمنین غم زدہ ہوجاتی ہیں۔(مظاہر حق جدید:۹۹/۲)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''شرح الصدور'' میں علّامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برزخ میں زندہ لوگوں کے اَعمال اُن کے مُردہ آباء واَجداد اور خاص عزیزوں کو دِکھائے جاتے ہیں، اگر آدمی اس کا استحضار اور تصوّر کرے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میرے باپ یا اُستاذ یا پیر اور دوسرے بڑوں کے سامنے آئے گا تو وہ کیا کہیں گے؟ یہ تصوّر انسان کو بہت سی بُرائیوں اور گناہوں سے روک سکتا ہے۔'' (مجالس حکیم الامت،جلد:۲۴،صفحہ:۱۶۳)

اسی دوران خود روحیں آپس میں کہتی ہیں کہ

"دَعُوْهُ، فَإِنَّهُ كَانَ فِيْ غَمِّ الدُّنْيَا". (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة: ١٤٢)

اس نو وارِد روح کو چھوڑ دو، ابھی کچھ نہ پوچھو، اتنے جلدی جلدی اپنے رشتے داروں کے متعلّق سوال نہ کرو، کیوں کہ یہ ابھی ابھی غم دنیا سے نجات پا کر آئی ہے، یہ سفر دنیا کی سخت مشقتیں اور مصیبتیں جھیل کر آئی ہے، اسے کچھ آرام کر لینے دو، بعد میں پوچھتے رہنا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندۂ مؤمن جب انتقال کر جاتا ہے اور اس کی روح کو رحمت کے فرشتے جب عالم برزخ میں ارواحِ مؤمنین کے پاس پہنچا دیتے ہیں تو وہاں اس کی ملاقات پہلے پہنچنے والی روحوں سے ہوتی ہے اور وہ روحیں بقیہ دنیا والوں کے احوال معلوم کرتی ہیں، وہ اچھے احوال سے خوش اور بُرے اعمال سے غم زدہ ہوجاتی ہیں۔

مرنے والے صالحین کے ذریعے مرحومین کو سلام بھیجنا:

کتاب سنّت کے ان حقائق پر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وصلحاء کو کامل یقین تھا، اس لیے منقول ہے کہ جس وقت حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا آخری وقت تھا تو ان کے بیٹے

حضرت عبدالرحمٰن بن کعب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والد صاحب کے پاس اُم بشر آئیں اور اپنے والد حضرت براء بن معرور یا اپنے بیٹے بشر کے متعلّق کہنے لگیں کہ

"وَاقْرَأْ عَلَيْهِ مِنِّيْ السَّلَامَ". (ابن ماجه والبيهقي، مشكوٰة:١٤٣)

''جب آپ سے ان کی ملاقات ہو (علیین میں) تو میری طرف سے ان کو سلام پیش کر دینا۔'' جب حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی فکرِ آخرت کا اظہار کیا تو اُم بشر نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ تم صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمن کامل ہونے کے سبب بفضلہٖ تعالیٰ علیین ہی میں ہوں گے اور عالم برزخ میں تمھاری ملاقات میرے والد اور بیٹے سے ضرور ہوگی۔

اسی طرح مشہور تابعی حضرت محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلّق بھی منقول ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت حاضرِ خدمت ہو کر عرض کرنے لگے کہ

"اِقْرَأْ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّلَامَ". (ابن ماجه، مشكوٰة المصابيح : ص١٤٣)

''حضرت! (عالم برزخ میں جب آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو تو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا اسلام پیش فرما دیں۔''

نیز ابن کثیر کی ایک روایت میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آخری وقت میں اپنی جنّتی بیویوں (سیّدہ مریم بنت عمران، سیّدہ آسیہ اور اخت موسیٰ علیہ السلام سیّدہ کلثوم کے متعلّق فرمایا:

"يَا خَدِيْجَةُ! إِذَا لَقِيْتِ ضَرَائِرَكِ فَاقْرِئِيْهِنَّ مِنِّيْ السَّلَامَ". (ابن كثير:١٦٦٨)

معلوم ہوا کہ ہم بھی مرنے والے صالحین کے ذریعے اپنے مرحومین کو سلام بھیج

سکتے ہیں، کیوں کہ عالم برزخ میں ارواحِ صالحین ومؤمنین آپس میں ملاقات، مذاکرہ اور بات چیت کرتے ہیں۔

عالم برزخ کے بعد عالم آخرت میں قیامت کے بعد ارواح کو ان کے جسموں میں منتقل کردیا جائے گا، حدیث میں وارد ہے:

"حَتّٰى يُرْجِعَهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ يَوْمَ يَبْعَثُهٗ". (رواه مالك والنسائي والبيهقي، مشكوٰة : ١٤٣)

پھر ان کے آخری اور اصلی ٹھکانے علیین یا سجین پہنچادیا جائے گا۔

خلاصہ:

حق تعالیٰ نے انسان کو جسم اور روح سے جوڑ کر پیدا فرمایا، فرق یہ ہے کہ جسم خاکی ہے تو روح امر ربی اور اَفلاکی ہے، عالم دنیا میں جسم میں حس وحرکت بھی رکھی اور جسم کو نمایاں تو روح کو پوشیدہ رکھا، جس کی وجہ سے دنیا کی راحت وکلفت سے جسم براہِ راست متاثّر ہوتا ہے اور روح تبعاً۔

جب کہ عالم برزخ میں روح کو نمایاں اور جسم کو پوشیدہ رکھا، نیز وہاں حس تو ہے؛ مگر حرکت نہیں، جس کی وجہ سے وہاں کی راحت وکلفت سے روح براہِ راست متاثّر ہوتی ہے اور جسم تبعاً راحت ومصیبت کو محسوس تو کرتا ہے؛ مگر حرکت نہیں کرسکتا۔

البتہ اُخروی زندگی میں جسم اور روح دونوں کو نمایاں کیا جائے گا، پھر فجار وبدکار کی روح کو بدترین جسم میں منتقل کرکے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔ اور اَبرار وفرماں بردار بندوں کی روح کو بہترین جسم میں منتقل کرنے کے بعد دائمی جنّت میں داخل کردیا جائے گا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُم. آمین.

اس کے لیے ضرورت ہے کہ دُنیوی زندگی میں ایمان واعمالِ صالحہ اور اخلاص

واخلاقِ حسنہ کے ذریعے ہم اپنی روح کو سنوار لیں، تو یہ روح ہمارے جسم کو آسمان کے اوپر جنّت میں پہنچا دے گی، اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ کیا تو خطرہ ہے کہ یہ روح جسم کو زمین میں دھنسا کر سجین میں پہنچا دے گی۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ.

ربِ کریم! ہمارے تمام صغائر وکبائر کو مٹا کر ہمیں دارین میں ابرار وصالحین میں اپنے فضل خاص سے داخل فرما۔ آمین یاربّ العالمین۔

۸ رشوال المکرّم ۱۴۴۲ھ، بروز جمعہ

مطابق: ۲۱ رمئی ۲۰۲۱ء

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۱)

قبر و برزخ کے احوال وحقائق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "الْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى: ﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" نَزَلَتْ فِيْ عَذَابِ الْقَبْرِ، يُقَالُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّيَ اللهُ، وَنَبِيِّيْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٤، باب إثبات عذاب القبر)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت مسلمان سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، ارشادِ باری ﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ (إبراهيم:۲۷) کا یہی مطلب ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو قولِ ثابت (مراد کلمہ

توحید و شہادت) کے اقرار و اظہار اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے والے مسلمانوں کو قائم و ثابت رکھتے ہیں دُنیوی زندگی (کے ہر امتحان) میں بھی اور اُخروی زندگی (کے ہر امتحان) میں بھی۔ ایک روایت میں ہے کہ مذکورہ آیت عذابِ قبر کے بارے میں نازل ہوئی۔ (چنانچہ قبر میں) سوال کیا جاتا ہے کہ تمھارا رب کون ہے؟ بندہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

تمہید:

اللہ ربّ العزت والجلال نے ہر انسان کو عدم سے وجود عطا فرما کر دنیا میں جسم اور روح کے ساتھ پیدا فرمایا، دنیا میں آنے سے پہلے ہر انسان معدوم، غیر موجود ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝١﴾ (الدھر:۱) اور مُردہ تھا، پھر حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے شکم مادر میں جسم انسانی کو بنا کر اس میں روح ڈالی اور زندہ فرما کر دنیا میں خاص مقصد کے تحت معین اور مقرّر وقت کے لیے بھیجا۔ (دنیا میں مقصد زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے) دُنیوی زندگی کا خاتمہ تو موت پر ہو جاتا ہے، اور مرنے والے کو بحکم شرعی قبر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝٢١﴾ (عبس : ۲۱)

''پھر اُسے موت دی اور قبر میں لے آیا۔''

اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ موت کے بعد قبر سے دوسری اور دائمی زندگی شروع ہو جاتی ہے، جس کے بعد کبھی موت نہیں، اس زندگی میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی اور حساب و کتاب کے مراحل سے گزرنے کے بعد دُنیوی زندگی کے اچھے بُرے اعمال کی دائمی جزا و سزا کا معاملہ ہے، ابرار کے لیے اچھے اعمال پر جنّت اور کفّار و فجار کے لیے جہنّم ہے، قرآنِ کریم نے ان حقائق کو نہایت جامعیت کے ساتھ اس

طرح بیان فرمایا:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (البقرۃ : ۲۸)

برزخ و قبر کی زندگی اور حقائق:

دُنیوی زندگی میں موت کے بعد قبر سے جو دوسری اور دائمی زندگی ہے اس کے دو حصے ہیں، پہلا حصّہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہو کر صورِ اسرافیل پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصّہ صورِ اسرافیل یعنی قیامت کے بعد شروع ہو کر کبھی ختم نہیں ہوگا، موت کے بعد دوسری اور دائمی زندگی کے پہلے حصے کو برزخ اور قبر کی زندگی کہتے ہیں، جب کہ دوسرے حصے کو آخرت کی زندگی کہتے ہیں، جس طرح دنیا کی زندگی عارضی ہے اسی طرح برزخ اور قبر کی زندگی بھی عارضی ہے، دُنیوی زندگی موت پر ختم ہوتی ہے تو برزخ اور قبر کی زندگی قیامت پر ختم ہوگی، اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کہ برزخ اور قبر کی زندگی دُنیوی زندگی کا تو تکملہ ہے، البتہ اُخروی زندگی کا مقدّمہ اور پیش خیمہ ہے، کیوں کہ موت کے بعد دُنیوی زندگی کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے؛ لیکن اُخروی زندگی کا آغاز برزخ اور قبر کی زندگی ہی سے ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد عالم دنیا اور عالم آخرت کے درمیان مرنے والے کا جس مقام پر قیام رکھا ہے اس کا نام (ویٹنگ روم) برزخ اور قبر ہے۔

پھر قبر سے مراد زیر زمین تنگ و تاریک گڑھا ہی نہیں؛ بلکہ اس سے مراد عالم برزخ ہے، قبر تو عالم برزخ تک پہنچنے کی ایک ظاہری، فطری اور شرعی شکل ہے۔

برزخ و قبر میں روح اور جسم کا تعلق اور حقائق:

موت کے بعد مرنے والے کا جسد خاکی جہاں بھی ہو، وہ بظاہر زمین کے اندر

ہو، یا باہر سمندروں کے پانی میں ہو یا درندوں کے پیٹ میں، اسے ہسپتالوں میں چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو یا نذرِ آتش کر کے اس کی راکھ کو ہواؤں میں بکھیر دیا ہو، بہر حال مرنے والا اپنی روح کے ساتھ عالم برزخ و قبر میں ہوتا ہے، مرنے والا اگر مؤمن اور نیک ہے تو عالم برزخ میں اس کی روح جنّت کے قریب سدرۃ المنتہیٰ میں عام اَرواحِ مؤمنین کے ساتھ ہوتی ہے۔ (اَللّٰھم اجعلنا منھم. آمین)

اور اگر مرنے والا کافر و فاجر ہے تو اس کی روح جہنّم کے قید خانے سجین میں ہوتی ہے۔ (اَللّٰھم احفظنا منه)

غرض مرنے والے کا جسم اور روح جہاں بھی ہوں، برزخ اور قبر میں ان کا آپسی تعلق ضرور باقی رہتا ہے، جیسے سورج تو آسمانوں میں ہوتا ہے؛ لیکن اپنی کرنوں کے ذریعے اس کا تعلق زمین بلکہ اس کے ذرّات سے بھی قائم رہتا ہے، اسی طرح مرنے والے کی روح سدرۃ المنتہیٰ میں ہو یا سجین میں، اس کا تعلق اپنے جسم کے اصلی اجزاء بلکہ ذرّات سے قائم رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ روح کے ساتھ برزخ میں جو معاملہ ثواب یا عذاب کا کیا جاتا ہے اس سے مرنے والے کا جسم ضرور متاثّر ہوتا ہے، جیسے اچھے بُرے خواب کی اصل راحت و تکلیف تو روح کو ہوتی ہے؛ لیکن روح کے ساتھ جسم بھی اس سے ضرور متاثّر ہوتا ہے، یہی معاملہ ہے برزخ کے ثواب و عذاب کا کہ روح کے ساتھ جسم بھی متاثّر ہوتا ہے۔

برزخ و قبر میں ثواب اور حقائق:

قبر میں جاتے ہی ہر کوئی اپنے اچھے بُرے اعمال کے انجام سے آگاہ ہو جائے گا، جیسا کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢﴾ [التکاثر: ۱-۲]

''تم کو کثرتِ مال کی مقابلہ آرائی نے غافل رکھا، حتیٰ کہ تم قبروں میں چلے گئے۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ مرنے والا مؤمن نیک ہے تو موت کے بعد برزخ و قبر میں اس کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والا مؤمن صالحین میں سے ہے تو موت کے بعد برزخ و قبر میں اظہارِ محبّت کے طور پر اسے دبایا جاتا ہے، جس سے ظاہری طور پر تکلیف بھی ہوتی ہے تو باطنی طور پر مسرّت و لذت حاصل ہوتی ہے، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے متعلّق حدیث پاک میں وارد ہے:

"لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً، ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ". (رواه النسائي، مشكوٰة : ٢٦)

اس کے تحت محدثین نے فرمایا ہے کہ قبر میں اَخیار و اَبرار کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ (تو اس کا مقصد اظہارِ محبّت ہے)۔ (مستفاد از: توضیحات: ۱/۳۶۷)

اس کے بعد مرنے والے کی روح کو اس کے جسم میں لوٹایا جاتا ہے اور دو فرشتے آ کر اسے بٹھا کر سوال کرتے ہیں۔

"فَتُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهٖ، وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهٖ، فَيَقُوْلَانِ لَهٗ: "مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّيَ اللهُ، فَيَقُوْلَانِ لَهٗ: مَا دِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ: دِيْنِيَ الإِسْلَامُ، فَيَقُوْلَانِ لَهٗ: مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ: هُوَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَقُوْلَانِ لَهٗ: وَمَا عِلْمُكَ؟ فَيَقُوْلُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللهِ فَآمَنْتُ بِهٖ، وَصَدَّقْتُ". (رواه أحمد، مشكوٰة : ١٤٢، باب ما يقال عند من حضره الموت)

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ و قبر میں مرنے والے نیکوکار کے جسم میں جیسے ہی روح لوٹائی جاتی ہے وہ آنکھوں کو ملتا ہوا اُٹھ بیٹھتا ہے، اُس وقت اُس

پر نہ کوئی خوف ہوتا ہے نہ گھبراہٹ، اس کے سامنے غروبِ آفتاب کا وقت پیش کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے دُنیوی زندگی میں بہر حال نماز کی فکر کرنے والا پابند اور مخلص نمازی آنے والے فرشتوں سے کہتا ہے:

"دَعُوْنِيْ أُصَلِّيْ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة : ٢٦، باب إثبات عذاب القبر)

''مجھے چھوڑ دو، تا کہ میں نماز پڑھ لوں۔'' سوال و جواب بعد میں کرنا، پہلے مجھے نماز پڑھنے دو، اس پر فرشتے کہتے ہیں کہ اب عمل کا وقت ختم اور اَجر و نتیجے کا وقت شروع ہوگیا، لہٰذا نماز کے بجائے ہمارے سوالات کے جوابات دیجیے۔

سوالات کرنے والے یہ فرشتے مرنے والا جیسے ہی برزخ و قبر میں پہنچتا ہے فوراً حاضر ہو جاتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ مُردے کو دفن کرنے والے ابھی تو واپس لوٹ ہی رہے ہوتے ہیں کہ فرشتے آ کر مرنے والے سے سوالات کرتے ہیں، حتیٰ کہ مرنے والا دفن کر کے لوٹنے والوں کی جوتیوں کی آواز بھی سن رہا ہوتا ہے۔

"إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ، وَتَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهٗ، إِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَتَاهُ مَلَكَانِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٤)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں سوالات کرنے والے فرشتے اس قدر جلدی آجاتے ہیں کہ ابھی تو مُردہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور فرشتے آجاتے ہیں۔ (مستفاد از: توضیحات: ۱/۳۵۶)

یہاں محدثین کے مابین سماعِ موتیٰ یعنی مُردوں کے سننے یا نہ سننے کی علمی بحث چھڑ گئی، اس مسئلے میں عہد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اب تک اختلاف ہے، اور یہ اختلاف حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ میں ہے، انبیاء علیہم السلام کے سماع میں سبھی کا اتفاق ہے، ان کے علاوہ میں ایک طبقہ سماع کا قائل ہے تو دوسرا طبقہ عدمِ سماع کا،

دونوں کے دلائل کتاب وسنّت سے ہیں، اس سلسلے میں راجح اور معتدل موقف یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو مُردے زندوں کا سلام یا کلام سن لیتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے تو نہیں سنتے۔ واللہ اعلم۔ (مستفاد از: توضیحات: ۱/ ۳۷۴، ۱/ ۳۷۵)

پھر سوالات کے لیے آنے والے ان دونوں فرشتوں کے متعلّق منقول ہے کہ ان کی ہیئت وصورت بڑی خطرناک اور بھیانک ہوتی ہے، حدیث میں ہے:

"إِذَا أُقْبِرَ الْمَيِّتُ أَتَاهُ مَلَكَانِ أَسْوَدَانِ أَزْرَقَانِ، يُقَالُ لِأَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ، وَلِلْآخَرِ النَّكِيرُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٢٥)

کالے رنگ کے نیلی آنکھوں والے دو فرشتے آتے ہیں، جنھیں منکر ونکیر کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ منکر ونکیر دو فرشتے ہی نہیں؛ بلکہ فرشتوں کا ایک مستقل محکمہ وشعبہ ہے، جن کے ذمّے مرنے والوں سے سوال کرنا ہے، اس شعبے کے فرشتوں کو منکر ونکیر کہتے ہیں۔ (توضیحات: ۱/ ۳۵۳)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ کفّار وفجار کی قبر میں سوالات کرنے والے فرشتوں کو منکر ونکیر کہتے ہیں، جب کہ مؤمن ونیکوکار کی قبر میں سوال کرنے والے فرشتوں میں سے ایک کو "بشیر" اور دوسرے کو "نذیر" کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (توضیحات: ۱/ ۳۶۰)

سوالات کرنے والے فرشتے مرنے والے سے ایک سوال تو یہ کرتے ہیں کہ "مَنْ رَبُّكَ؟" تمھارا رب کون ہے؟ اب جس نے دُنیوی زندگی میں رب کو پہچانا اور اس کے احکام پر عمل کیا ہوگا وہ تو بڑی آسانی سے جواب میں کہہ دے گا کہ "رَبِّيَ اللهُ". دوسرا سوال ہوگا کہ "مَا دِيْنُكَ؟" تمھارا دین کونسا ہے؟ دین اسلام پر زندگی گزارنے والا بڑی آسانی سے جواب میں کہے گا کہ "دِيْنِيَ الإِسْلَامُ". میرا دین اسلام ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلّق پوچھا جائے گا کہ "مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ

بُعِثَ فِيْكُمْ؟" حق تعالیٰ نے جس شخصیت کو تمھارے درمیان بھیجا تھا ان کے متعلّق تمھارا کیا خیال ہے؟ تو جس بندے نے ساری زندگی حضور ﷺ کی شریعت وسنّت پر عمل کیا ہوگا وہ بآسانی کہہ دے گا: "هُوَ رَسُوْلُ اللهِ". وہ تو اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق ہیں۔ اس پر فرشتے سوال کریں گے کہ تمھیں کیسے پتا چلا؟ تو بندۂ مؤمن کہے گا: "قَرَأْتُ كِتَابَ اللهِ". میں نے کتاب اللہ پڑھی (سنی) اس پر ایمان لایا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی۔

صاحبو! تعلیم قرآنِ کریم کی برکتیں اور فضیلتیں دنیا میں ظاہر ہوں نہ ہوں، برزخ اور قبر میں جاتے ہی ظاہر ہو جائیں گی۔ پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ برزخ وقبر کے ان سوالات کے جوابات میں ان ہی کے لیے آسانی ہوگی جو کلمہ اسلام اور اس کے احکام پر ثابت قدم رہے ہوں گے، حق تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے دارین میں ثابت قدمی کی ذمّے داری لی ہے۔ جس کو قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ (ابراھیم: ۲۷)

حدیث مذکور میں بھی آپ ﷺ نے آیت کا یہی مطلب ومفہوم بیان فرمایا کہ مؤمن مخلص کو حق تعالیٰ برزخ وقبر کے سوالات میں ثابت قدمی عطا فرماتے ہیں۔

سچ کہا ہے کہ

جس وقت جس نے بھی تیرا نام لیا　　بڑھ کر تیری رحمت نے اُسے تھام لیا

جب بندہ تمام سوالات کے صحیح جوابات دے دیتا ہے تو حق تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے آسمان میں اس کی کامیابی کا اعلان فرماتے ہیں کہ "أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ" میرے بندے نے بالکل سچ کہا، لہٰذا اس کے لیے برزخ وقبر میں جنّت کا بستر بچھا دو،

جنّتی لباس پہنادو، جنّت کا دروازہ کھول دو اور اس کی قبر کو تا حد نظر وسیع کر دو۔

"فَأَفْرِشُوْهُ مِنَ الجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ الجَنَّةِ، وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا إِلَى الجَنَّةِ، قَالَ: فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ".

حدیث پاک میں ہے کہ اس کے بعد قبر میں نہایت ہی خوب صورت چہرے والا، نہایت خوب صورت لباس میں ملبوس، بہترین خوشبو سے معطر ایک شخص حاضر ہوتا ہے اور اُس مؤمن مخلص کو جنّت کی خوش خبری سناتا ہے۔

"قَالَ: وَيَأْتِيْهِ رَجُلٌ حَسَنُ الوَجْهِ حَسَنُ الثِّيَابِ طَيِّبُ الرِّيْحِ يَقُوْلُ: أَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُرُّكَ، هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ".

برزخ وقبر میں جنّت اور اس کی اَبدی راحت کی بشارت سن کر بندۂ مؤمن بڑے تعجب سے پوچھے گا کہ تم کون ہو؟ جواب ملے گا کہ میں تیرا نیک عمل ہوں، جسے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت ورحمت سے مثالی صورت میں تیری تسلی اور دل جوئی کے لیے بھیجا ہے۔ اب وہ بندہ دُعا کرنے لگے گا کہ اے اللہ! قیامت جلدی قائم فرما! تا کہ میں اپنے دُنیوی وجنّتی اہل وعیال سے جاملوں۔

"رَبِّ! أَقِمِ السَّاعَةَ، رَبِّ! أَقِمِ السَّاعَةَ، حَتّٰى أَرْجِعَ إِلٰى أَهْلِيْ وَمَالِيْ". (رواه أحمد، مشكوٰة: ١٤٢، باب ما يقال عند من حضره الموت)

بعض روایتوں میں ہے کہ مرنے والا مؤمن مخلص برزخ وقبر میں من جانب اللہ اعزاز واکرام کو دیکھتا ہے تو اس کی چاہت ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے اہل وعیال کے پاس جا کر انھیں برزخ وقبر میں ہونے والے اعزاز واکرام اور بہترین احوال سے باخبر کر دے، وہ فرشتوں سے اس کی درخواست بھی کرتا ہے، حدیث میں ہے:

"فَيَقُوْلُ: أَرْجِعُ إِلٰى أَهْلِيْ، فَأُخْبِرُهُمْ".

ظاہر ہے کہ یہ بات حکمت الٰہی اور مشیت خداوندی کے خلاف ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی؛ بلکہ فرشتے اس کے بعد مرنے والے کی اپنے اہل و عیال سے توجہ ہٹانے اور میٹھی نیند سلانے کے لیے کہیں گے کہ

"نَمْ كَنَوْمَةِ العَرُوْسِ الَّذِيْ لَا يُوْقِظُهُ إِلَّا أَحَبُّ أَهْلِهٖ إِلَيْهِ، حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ". (الترمذي، مشكوٰة : ۲۵، باب إثبات عذاب القبر)

دُلہن کی طرح سو جایئے! جسے اس کا محبوب ہی جگاتا ہے، اب تمھیں بھی قیامت میں تمھارا محبوب رب ہی جگائے گا۔ اس کے بعد برزخ و قبر میں مرنے والے کو پُرسکون جنّتی ماحول میں قیامت تک کے لیے سُلا دیا جاتا ہے۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

فکر دنیا تجھ کو صبح و شام ہے — اُس سے غفلت ہے جو اصلی کام ہے
کچھ دِنوں سہہ لے مشقت دین کی — پھر تو بس آرام ہی آرام ہے

برزخ و قبر میں عذاب اور حقائق:

اس کے برخلاف اگر مرنے والا کافر و منافق اور فاجر و بدکار ہوتا ہے تو برزخ و قبر ہی سے اس پر عذاب شروع ہو جاتا ہے، العیاذ باللہ العظیم۔

سب سے پہلے اس کے پاس نہایت ڈراونی شکل والے دو فرشتے سوالات کے لیے آتے ہیں جنھیں منکر و نکیر کہا جاتا ہے، وہ اس سے پوچھتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ اب دنیا میں اس نے اپنے حقیقی خالق و مالک کو پہچانا ہی نہ ہوگا، ایک رب کو چھوڑ کر ہر کنکر کو شنکر اور معبود بنایا ہوگا، وہ بد بخت نہایت حسرت سے کہے گا: "هَاهْ، هَاهْ! لَا أَدْرِيْ" ہائے افسوس! مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں، وہ کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے سکے گا، اس کے لیے آسمان سے یہ آواز آئے گی کہ اس جھوٹے (کافر، فاجر) کی قبر میں

جہنّم کا بستر بچھا دو، اسے جہنّم کا لباس پہناؤ اور جہنّم کا دروازہ کھول دو، تاکہ وہاں سے سخت گرم لپٹیں اور جھلسا دینے والی ہوائیں اس کے پاس آئیں، نیز وہاں کے خطرناک مناظر اسے نظر آئیں۔ حدیث میں ہے:

"فَأَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ، وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا مِنَ النَّارِ".

نیز اس کی قبر اس قدر تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں آپس میں مل جاتی ہیں اور جسم کچل کر رہ جاتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ (آیت: ۱۲۴) میں "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کی ایک تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے عذابِ قبر مراد ہے۔ (معارف القرآن)

"وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ، حَتّٰى تَخْتَلِفُ فِيْهِ أَضْلَاعُهُ". (رواه أحمد وأبوداود، مشكوٰة المصابيح / باب إثبات عذاب القبر، ص۲۶)

اس سے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا؛ بلکہ حدیث پاک میں ہے کہ اس کی قبر میں ایک نہایت ہی بدصورت اور خطرناک بدبو دار لباس پہن کر ایک شخص حاضر ہوتا ہے اور برزخ و قبر کے بعد جہنّم کے دائمی خطرناک عذاب کی خبر دیتا ہے، جس سے اس کی تنگی و تکلیف مزید بڑھ جاتی ہے۔

"وَيَأْتِيْهِ رَجُلٌ قَبِيْحُ الوَجْهِ قَبِيْحُ الثِّيَابِ مُنْتِنُ الرِّيْحِ".

وہ گھبرا کر پوچھتا ہے: ارے بھائی! تم کون ہو؟ وہ کہتا ہے: میں تیرا بُرا عمل ہوں۔ "أَنَا عَمَلُكَ الخَبِيْثُ". قبر کا یہ عذاب تو عذابِ جہنّم کی ایک معمولی سی جھلک ہے، اصل عذاب تو عذابِ جہنّم ہے۔

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (السجدة : ۲۱)

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ آیت کریمہ میں عذابِ ادنیٰ سے مراد

عذابِ قبر ہے۔ واللہ اعلم۔ (قرطبی)

غالباً یہی وجہ ہے کہ برزخ و قبر میں جہنّم کے عذابِ اکبر سے قبل عذابِ ادنیٰ کو دیکھ لے گا تو وہ کہے گا:

"رَبِّ! لَا تُقِمِ السَّاعَةَ". (رواه أحمد، مشكوٰة : ص۱۴۳)

اے میرے رب! قیامت قائم مت کیجیے، کیوں کہ قیامت کے بعد تو اور بھی خطرناک عذاب ہیں۔

احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ و قبر میں اور بھی خطرناک عذابات میں اس کافر و بدکار کو مبتلا کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کافر و فاجر اور بدکار کے لیے برزخ و قبر میں سوالات کے بعد عذاب دینے کے لیے ایک خطرناک اندھا بہرا فرشتہ مسلط کر دیا جاتا ہے، جو نہ کچھ دیکھے گا، نہ سنے گا، اس کے پاس لوہے کا ایک خطرناک گرز (یا ہتھوڑا) ہوگا، جس کی ایک ضرب اگر پہاڑ پر لگائی جائے تو وہ بھی مٹّی کا ڈھیر بن کر رہ جائے، وہ فرشتہ اسے مسلسل مارتا رہے گا، چوں کہ وہ فرشتہ اندھا اور بہرا ہوتا ہے اس لیے نہ وہ مُردے کو دیکھتا ہے نہ اس کی چیخ و پکار سنتا ہے، بس مارتا رہتا ہے۔

"ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ أَعْمٰى أَصَمُّ، مَعَهٗ مِرْزَبَةٌ مِنْ حَدِيْدٍ، لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا، قَالَ: فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً". (رواه أحمد وأبوداود، مشكوٰة المصابيح / باب إثبات عذاب القبر)

اس عذاب سے مُردے کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ چیختا چلاتا ہے، حدیث میں ہے کہ اس کے چلانے کی آواز انسان اور جنات کے علاوہ مشرق سے مغرب تک تمام مخلوق سنتی ہے۔

"يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، إِلَّا الثَّقَلَيْنِ". (رواه أبوداود،

وأحمد، مشکوٰۃ المصابیح : ص۲۶)

بات یہ کہ وہ فرشتے قبر میں کس طرح آتے ہیں؟ تو یاد رکھیے کہ فرشتوں کو کہیں بھی آنے جانے کے لیے کسی دروازے یا کھڑکی کی ضرورت نہیں، وہ گوشت پوست سے بنی ہوئی مخلوق نہیں ہے، وہ ایک نورانی اور نہایت لطیف مخلوق ہے، وہ اپنے وجود کی لطافت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کے سبب پتھروں سے بھی پار ہو جاتے ہیں، جس طرح ہماری نگاہیں اور سورج کی شعاعیں پار ہو جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں برزخ کے ان تمام احوال کا تعلق ایمان بالغیب سے ہے، جس پر بہر حال ایمان ضروری ہے۔

احوالِ برزخ وقبر کو ہم سے پوشیدہ رکھنے کا راز:

حق تعالیٰ کو بے شک اس پر قدرت ہے کہ دیگر مخلوقات کی طرح ہم پر بھی احوالِ برزخ وقبر کو ظاہر فرما دے، ہمیں بھی برزخ وقبر کے ثواب وعذاب کا مشاہدہ کرا دے اور قبر کے مناظر دِکھا دے؛ لیکن حق تعالیٰ نے ہم پر یہ سب مخفی اور پوشیدہ رکھا، تا کہ ان امور پر ایمان بالغیب کے سبب ہمارے ایمان میں اضافہ ہو اور دنیا کا نظام قائم رہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم دنیا ہی میں عذابِ برزخ وقبر کا مشاہدہ کر لیتے اور ایمان بالغیب نہ رہتا، تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، ہمارا جینا اور کوئی کام کرنا مشکل ہو جاتا، جس طرح ہمارے سامنے ہمارا کوئی عزیز وقریب نہایت سخت تکلیف میں ہوتا ہے تو اس وقت ہمارے لیے کوئی بھی کام مشکل ہو جاتا ہے، یہی حال احوالِ برزخ وقبر پر مطلع ہونے کے بعد ہمارا ہوتا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خچر پر سوار ہو کر بنی نجار کے باغ سے گزر رہے تھے، اچانک خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

گرا دیتا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنبھل گئے؛ مگر وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانچ چھ قبریں نظر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبر والوں کے بارے میں دریافت کیا تو کسی نے بتایا کہ یہ چند کفّار و مشرکین کی قبریں ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو من جانب اللہ ان قبروں میں ہونے والے عذاب کا جو علم دیا گیا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مطلع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"فَلَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ أَسْمَعُ مِنْهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۵)

''اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مُردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے، تو میں ضرور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا کہ وہ تم کو (بھی) عذابِ قبر (کی آواز اور چیخ و پکار) سنا دے۔''

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّت کو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً عذابِ جہنّم، عذابِ قبر اور تمام ظاہری و باطنی، محسوس و غیر محسوس، دینی و دُنیوی، انفرادی و اجتماعی، چھوٹے بڑے، حتیٰ کہ دجال کے فتنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَمِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. آمين. (أيضًا)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ترغیب و تعلیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ عذابِ برزخ و قبر کو دیکھنے، سننے اور جاننے کے بجائے اس سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلّقین و مرحومین کو بچانے کی فکر کی جائے، جس کے لیے سچّی پکّی توبہ اور ایمانی اعمال کا اخلاص و استقامت کے ساتھ اہتمام ضروری ہے، نیز اپنے مرحومین کے لیے دُعائے مغفرت اور دائرۂ شریعت میں رہ کر ایصالِ ثواب کا التزام کیا جائے، علاوہ ازیں حسبِ موقع و

توفیق بہ نیت عبرت قبرستان جایا جائے۔

جا! گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت:

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

جا! گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت — کھل جائے گی تجھ پہ دنیا کی حقیقت
عبرت کے لیے ڈھونڈ کسی شاہ کی تربت — پھر پوچھ کہاں ہے وہ تیری شانِ حکومت

سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے من جانب اللہ جنّتی ہونے کی بشارت دی، ان کا یہ حال تھا کہ جب کبھی قبرستان تشریف لے جاتے تو احوالِ برزخ و قبر کو یاد کر کے اس قدر روتے کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک تر ہو جاتی، آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ جنّت و جہنّم کے ذکر سے اتنا نہیں روتے جتنا قبر کو یاد کر کے روتے ہیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قبرستان آکر یا کسی قبر سے گزر کر مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان یاد آجاتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ، فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح / باب إثبات عذاب القبر، ص۲۶)

قبر آخرت کی منازل میں پہلی منزل و اسٹیشن ہے، اگر اس میں نجات مل گئی اور قبر باغ بن گئی، تو بعد کی ساری منزلیں آسان ہیں؛ لیکن اگر۔ العیاذ باللہ العظیم۔ قبر میں پکڑ ہو گئی، اس میں آگ لگائی گئی تو بعد کی منازل اور بھی شدید ہیں۔

نیز آپ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ

"مَا رَأَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ إِلَّا وَالْقَبْرُ أَفْزَعُ مِنْهُ". (رواه الترمذي وابن ماجه، مشكوٰة المصابيح: ص۲۶)

''قبر کے منظر سے زیادہ خوفناک منظر کوئی نہیں۔'' اگر ہم بھی عبرت کی نیت سے قبرستان جائیں تو ہمیں بھی عبرت ناک مناظر نظر آسکتے ہیں۔

ہم نے دیکھے ہیں ایسے ہزاروں کہ جن کا معطر بدن تھا، مزین کفن تھا
مگر جب قبر کہن ان کی کھودی تو نہ عضو بدن تھا، نہ تارِ کفن تھا

حق تعالیٰ قبر و حشر کی تمام منازل اپنے فضل سے ہمارے لیے آسان فرما دے۔ آمین یاربّ العالمین۔

۲۲ر شوال المکرم ر ۱۴۴۲ھ
مطابق: ۴ر جون ر ۲۰۲۱ء
بروز: جمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۲)

قیامت وآخرت کے اَحوال وحقائق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ، وَمَنْ أَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ، فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى". (رواه أحمد، شعب الإيمان، مشكوٰة:٤٤١، كتاب الرقاق)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دنیا سے (اس قدر محبّت رکھتا ہے جو اس کے لیے اپنے اللہ، اپنے اَنجام اور آخرت سے غفلت کا سبب بن جائے) تو (دنیا کی اس محبّت سے) وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے (وجہ یہ ہے کہ اس کے پیش نظر عموماً دُنیا ہی کا نفع ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ آخرت کے نقصانِ عظیم کی بھی پرواہ نہیں کرتا، اس کے برعکس) جو شخص آخرت سے محبّت (ورغبت) رکھتا ہے وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے (کیوں کہ

اس کے پیش نظر آخرت اور اس کا نفع ہوتا ہے، جس کے حصول کی خاطر وہ دنیا کے نقد نفع ونقصان کی فکر نہیں کرتا۔ یہی دراصل دانائی وسمجھ داری ہے کہ آدمی آخرت کی بہتری کی فکر کرے) تمھیں چاہیے کہ جو چیز فنا ہونے والی (یعنی دنیا) ہے اس پر باقی رہنے والی (یعنی آخرت) کو ترجیح دو۔

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝﴾ (الأعلی: ۱۷)

دنیا وآخرت کی حقیقت:

اللہ ربّ العزت والجلال نے جس طرح عالم دنیا کو بنایا ہے، اسی طرح دنیا کے مکمّل خاتمے کے بعد بالکل اخیر میں ایک دوسرا عالم بنائیں گے جسے آخرت کہتے ہیں، ''آخرت'' ایک جامع لفظ ہے، جس کا اطلاق مختلف ایسے امور پر ہوتا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے، مثلاً حق تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم دنیا میں مختلف مراحل سے گزار کر ہمیں پیدا فرمایا ہے اسی طرح دنیا کے خاتمے کے بعد قبر و برزخ کے مراحل سے گزار کر عالم آخرت میں ہمیں دوبارہ پیدا فرمائیں گے۔ قرآنِ پاک میں فرمایا کہ آخرت میں خالق مطلق کے لیے اپنی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنا پہلے سے زیادہ آسان ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (الروم : ۲۷)

جس طرح یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا ہر انسان مرنے والا ہے اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر مرنے والے کو آخرت میں دوبارہ زندہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور دُنیوی زندگی کے حساب وکتاب اور جزا وسزا کے لیے حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت:۵۷)

حق تعالیٰ نے دنیا کو دارالعمل اور آخرت کو دارالجزاء بنایا ہے، آج عمل کا موقع ہے، حساب نہیں، کل قیامت میں حساب ہوگا، عمل کا موقع نہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

"فَإِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِيْ دَارِ الْعَمَلِ، وَلَا حِسَابَ، وَأَنْتُمْ غَدًا فِيْ دَارِ الْحِسَابِ، وَلَا عَمَلَ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة / كتاب الرقائق، ص٤٤٤)

دنیا کا قیام ونظام اور یہاں کا نفع ونقصان نقد، حاضر اور موجود ہونے کے باوجود محدود، عارضی اور بالآخر فانی ہے، جب کہ آخرت کا قیام ونظام اور وہاں کا نفع و نقصان اُدھار وغائب ہونے کے باوجود لامحدود، یقینی وحقیقی ہے، حدیث میں ہے:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ". (السنن الكبرٰى للبيهقي)

دنیا ایک ناپائدار چیز ہے۔ جسے جابہ جا قرآنِ کریم نے متاعِ قلیل فرمایا:

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ (النساء : ٧٧)

آخرت ایک یقینی حقیقت ہے، جس کا سچا وعدہ خود ربّ العالمین نے فرمایا، اس کا ذکر حدیث پاک میں بھی ہے:

"وَإِنَّ الْآخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ". (أخرجه أبونعيم في الحلية، مشكوٰة : ص٤٤٥)

ان حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر حال میں ہر اعتبار سے دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیں، دنیا کی کامیابی سے زیادہ آخرت کی اصلاح وکامیابی کی فکر کریں، حدیث مذکور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو اسی کی ترغیب وتاکید فرمائی کہ

"وَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى".

قرآنِ کریم نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ (الأعلٰى : ١٧)

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا کہ

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الآخِرَةِ فَاغْفِرْ لِلأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ

(متفق علیه، مشکوٰة : ٤٠٩)

''بہترین زندگی تو بس آخرت ہی کی ہے (ابرار ومتقین کے لیے، نہ کہ فجار و کفّار کے لیے) لہٰذا اے اللہ! آپ انصار ومہاجرین کی مغفرت فرما دیجیے۔''

آخرت کی زندگی یا تو بہترین ہے یا بدترین ہے:

کتاب وسنّت کی روشنی میں اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ آخرت کی زندگی یا تو بہترین ہے، یا بدترین ہے، جنھوں نے دُنیوی زندگی میں رہ کر آخرت کی اصلاح و کامیابی کی فکر کی، دنیا پر آخرت کو ہر حال میں ترجیح دی، دنیا سے دھوکہ کھا کر آخرت سے غافل نہیں ہوئے، من چاہی زندگی کے مقابلے میں رب چاہی زندگی کو اختیار کیا، جنھوں نے خواہشاتِ نفسانی کو مرضیاتِ ربّانی پر قربان کیا، ایسے مؤمنین مخلصین اور ابرار ومتقین کے لیے عالم آخرت بہترین ہے۔

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى﴾ (النساء : ٧٧)

اس کے برخلاف جنھوں نے دنیا ہی کو اپنا مقصد بنالیا تھا اور آخرت سے مکمّل غافل ہو گئے تھے، دنیا ہی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور آخرت کو پس پشت ڈال دیا، تو ان کے لیے آخرت کی دائمی زندگی بدترین ہے، وہاں انھیں مختلف شدید ترین اور بدترین مراحل سے گزار کر دائمی طور پر دوزخ میں داخل کر دیا جائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

مؤمنین کے لیے قبر سے اُٹھنے کے اَحوال وحقائق:

آخرت کے احوال ومراحل میں سب سے پہلا مرحلہ قبر سے اُٹھنے کا ہے،

قرآنِ پاک میں فرمایا کہ مرنے والا جہاں کہیں ہوگا اُسے حق تعالیٰ وہاں سے دوبارہ زندہ فرما کر اُٹھائیں گے۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝﴾ (الحج : ۷)

حتیٰ کہ اگر کوئی پانی میں ڈوب گیا ہوگا یا مرنے والے کو پانی میں ڈال دیا گیا ہوگا تو وہ پانی سے اُٹھایا جائے گا، کسی کو آگ میں جلا کر راکھ کر دیا ہوگا تو اسے راکھ سے جمع کر کے اُٹھایا جائے گا، کسی کو جانور نے کھالیا ہوگا تو اسے جانور کے پیٹ سے اُٹھایا جائے گا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَىٰ حَمْزَةَ يَوْمَ أُحُدٍ، فَوَقَفَ عَلَيْهِ، فَرَاٰهُ قَدْ مُثِّلَ بِهٖ، فَقَالَ: "لَوْلَا أَنْ تَجِدَ صَفِيَّةُ فِيْ نَفْسِهَا لَتَرَكْتُهٗ، حَتّٰى تَأْكُلَهُ العَافِيَةُ، حَتّٰى يُحْشَرَ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ بُطُوْنِهَا". (الترمذي : ۱/ ۸۱۱، أبواب الجنائز، باب ما جاء في قتلىٰ أُحُدٍ وذكر حمزة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ اُحُد کے دِن حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس تشریف لائے اور دیکھا کہ ان کا مثلہ کیا گیا ہے، تو ارشاد فرمایا کہ اگر صفیہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن) اپنے دِل میں ناگواری محسوس نہ کرتیں تو میں حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسی حالت میں رہنے دیتا، تاکہ اسے جانور کھا لیں اور وہ قیامت کے دِن ان کے پیٹوں سے اُٹھیں۔

قبر سے اُٹھنے کا مرحلہ اس وقت پیش آئے گا جب حق تعالیٰ کے حکم سے حضرت اسرافیل علیہ السلام دوبارہ صور پھونکیں گے، قرآن کہتا ہے کہ صورِ اسرافیل علیہ السلام سے قبر کے مُردے فوراً اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴾ (یٰس:۵۱)

"أَجْدَاث" یہ "جَدث" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں ایسی قبر جو بوسیدہ ہو چکی ہو، جس کا نام ونشان مٹ گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کے صورِ اوّل سے تو سب مرجائیں گے؛ لیکن صورِ ثانی سے سب زندہ ہوکر قبر سے باہر نکل آئیں گے، خواہ وہ اپنی قبروں میں ہزاروں سال سے پڑے ہوں۔

حدیث پاک میں ہے کہ سب سے پہلے حضور ﷺ اپنی قبر اطہر سے اُٹھیں گے، آپ ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام اپنی قبروں سے اُٹھیں گے۔ رہی بات اُمتیوں کی، تو ان میں سب سے پہلے سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، ان کے بعد سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، پھر دیگر حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، بالخصوص مدینہ طیبہ کے قبرستانِ بقیع میں مدفون، پھر اہل مکہ اور اُمّت کے دیگر صلحاء واہل ایمان اُٹھیں گے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَنَا أَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْأَرْضُ، ثُمَّ أَبُوْبَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ، ثُمَّ آتِيْ أَهْلَ الْبَقِيْعِ، فَيُحْشَرُوْنَ مَعِيَ، ثُمَّ أَنْتَظِرُ أَهْلَ مَكَّةَ، حَتّٰى أُحْشَرَ بَيْنَ الْحَرَمَيْنِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ص۵۵۶/ باب مناقب أبي بكر)

چوں کہ اہل ایمان موت کے بعد اُخروی زندگی پر ایمان ویقین رکھتے تھے اور دُنیوی زندگی میں اس کی تیاری کیے ہوئے تھے، اس لیے قبروں سے اُٹھنے کے بعد اُنھیں کوئی خوف اور گھبراہٹ نہیں ہوگی، وہ لوگ قبروں سے اُٹھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تعریف کررہے ہوں گے، کہیں گے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ (فاطر:۳۴)

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔''

حدیث پاک میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"لَيْسَ عَلٰى أَهْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْشَةٌ فِيْ الْمَوْتِ، وَلَا فِيْ النُّشُوْرِ، وَلَا فِيْ الْقُبُوْرِ، كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلَيْهِمْ عِنْدَ الصَّيْحَةِ يَنْفُضُوْنَ رُؤُوْسَهُمْ مِنَ التُّرَابِ يَقُوْلُوْنَ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان / باب في الإيمان بالله عز وجل، الرقم : ١٠٠)

(کلمہ طیبہ) لا الٰہ الا اللہ (پڑھنے) والے (مؤمنین) پر نہ موت کے وقت وحشت ہوگی، نہ قبر سے اُٹھتے وقت اور نہ قبروں میں، گویا کہ میں ان کو (قبروں سے اُٹھنے کی) چیخ کے وقت دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے سروں سے مٹّی جھاڑ رہے ہیں اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ" پڑھ رہے ہیں۔

حدیث پاک میں یہ بھی ہے کہ جو مسلمان جس حالت میں مرا ہوگا قیامت کے دِن اسی حالت میں اسے اس کی قبر سے اُٹھایا جائے گا۔

"يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَا مَاتَ عَلَيْهِ". (مسلم، مشكوٰة : ٤٥٧)

''ہر آدمی کو اسی حالت میں اُٹھایا جائے گا جس میں وہ فوت ہوا تھا۔''

حالت ایمان پر مرنے والا ایمان کے ساتھ اور کفر پر مرنے والا کفر کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔'' العیاذ باللہ العظیم۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والا مخلص مجاہد اپنی شہادت کے تازہ بہتے ہوئے خوشبودار خون کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔

"جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ، وَالرِّيْحُ رِيْحُ الْمِسْكِ". (رواه

البخاري، باب من يجرح في سبيل الله عزّ وجل)

حالت احرام میں فوت ہونے والا مخلص حاجی لبیک پکارتے ہوئے اُٹھے گا۔

"فَإِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا". (رواه النسائي)

علاوہ ازیں حدیث پاک میں یہ بھی وارد ہے کہ مؤمنین مخلصین اور ابرار وصلحاء جب اپنی قبروں سے اُٹھیں گے تو ان کے چہروں پر نہ ڈاڑھی ہوگی، نہ مونچھیں، ان کی آنکھیں بھی نہایت سرگیں ہوں گی اور ان کی عمریں تیس سال کی ہوں گی، یعنی نہایت حسین وجمیل نوجوان ہوکر اپنی قبروں سے اُٹھیں گے۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يُبْعَثُ الْمُؤْمِنُوْنَ يَوْمَ القِيَامَةِ جُرْدًا مُرْدًا مُكَحَّلِيْنَ بَنِيْ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً". (رواه أحمد، مجمع الزوائد، الجزء العاشر، رقم الحديث : ١٨٣٤٦، ومثله في مشكوٰة المصابيح / باب صفة الجنة وأهلها، ٤٩٨)

اسی پر اکتفا نہ ہوگا؛ بلکہ جیسے ہی اہل ایمان اپنی قبروں سے اُٹھیں گے من جانب اللہ ان کے پاس رحمت کے فرشتے بشارت لے کر حاضر ہوں گے، جس طرح موت کے وقت اور قبر میں حاضر ہوئے تھے، وہ کہیں گے: ''آخرت کے احوال کا خوف نہ کرو، نہ دنیا کے چھوڑنے کا غم کرو، آخرت کی اس دائمی زندگی میں تمھارا ٹھکانہ جنّت ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم دنیا میں جس طرح تمھارے رفیق وساتھی تھے آخرت میں بھی رہیں گے۔''

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (فصلت : ٣٠)

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے اس

آیت کی تلاوت فرما کر عرض کیا کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ مؤمن جس وقت اپنی قبر سے اُٹھے گا تو دو فرشتے (کراماً کاتبین) جو دنیا میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے وہ (نہایت حسین وجمیل شکل وصورت کے ساتھ) ملیں گے اور ان کو کہیں گے کہ تم خوف وغم نہ کرو؛ بلکہ جنّت کی بشارت سنو، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ان کا کلام سن کر مؤمن کو اطمینان ہوجائے گا۔ (تفسیر مظہری، از: معارف القرآن)

کفّار کے لیے قبر سے اُٹھنے کے احوال وحقائق:

اہل ایمان کے بعد فجار وکفّار اپنی قبروں سے اپنے اعمال کے مطابق اُٹھائے جائیں گے۔ ان میں بعض لوگوں کو اندھا بنا کر اُٹھایا جائے گا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى﴾ (طٰهٰ: ۱۲٤)

ایمان، قرآن اور نبی کے فرمان سے روگردانی کرنے والے کافر کو قیامت کے دِن اَندھا اُٹھایا جائے گا۔ بعض لوگ گونگے، بہرے اور اَندھے بنا کر اوندھے منھ اُٹھائے جائیں گے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا﴾ (الإسراء:۹۷)

دنیا میں دینِ حق وہدایت سے اندھے، بہرے اور گونگے رہنے والے واقعی قیامت میں اسی طرح اُٹھائے جائیں گے، ان کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

بعض کفّار ومتکبرین کو چیونٹیوں کی شکل میں اُٹھایا جائے گا، جن کو لوگ اپنے پیروں تلے روندتے ہوں گے، پوچھا جائے گا کہ یہ کون ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ یہ دنیا میں تکبّر کیا کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يَبْعَثُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَاسًا فِيْ صُوَرِ الذَّرِّ يَطَؤُهُمُ النَّاسُ

بِأَقْدَامِهِمْ، فَيُقَالُ: مَا بَالُ هٰؤُلَاءِ فِيْ صُوَرِ الذَّرِّ؟ فَيُقَالُ: هٰؤُلَاءِ الْمُتَكَبِّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا". (الترغيب والترهيب : ٤ / ١٩٤)

چوں کہ کفّار وفجار کو موت کے بعد اُخروی زندگی کا یقین نہیں تھا، نہ اس کے لیے اُنھوں نے کوئی فکر وتیاری کی تھی، اس لیے مرنے کے بعد جب انھیں دوبارہ قبروں سے اُٹھا کر زندہ کیا جائے گا تو وہ اس غیر متوقع زندگی میں اپنے خوف ناک اور بھیانک انجام کو دیکھ کر شدید خوف وگھبراہٹ کے عالم میں کہیں گے:

﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (يٰس: ٥٢)

''ہائے ہماری بدبختی! ہمیں کس نے ہماری قبروں اور خوابگاہوں سے اُٹھایا؟''

حالانکہ موت کے بعد وہ لوگ قبر میں بھی مبتلائے عذاب ہی تھے؛ لیکن عذابِ آخرت کے مقابلے میں عذابِ قبر اُنھیں کالعدم محسوس ہوگا۔

یا پھر رئیس المفسرین سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول پہلے صور کے بعد سے دوسرے صور کے درمیان چالیس سال کا عرصہ کفّار پر بھی ایسا گزرے گا جس میں حق تعالیٰ ان سے عذابِ قبر کو ہٹالیں گے اور اُنھیں سلادیں گے، اس لیے جب دوسرے صور کے بعد اچانک اُنھیں قبروں سے اُٹھا کر دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو وہ گھبرا کر کہیں گے:

﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (يٰس: ٥٢) (تفسير الخازن)

اس کے جواب میں فرشتے یا اہل ایمان یا کفّار خود ہی جب حقیقت کھل جائے گی اور ان کے سامنے دُنیوی زندگی کے رنگین گناہوں کے سنگین نتائج رونما ہوں گے تو وہ کہیں گے:

﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (يٰس : ٥٢)

''ارے! یہ تو وہی دِن ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔''

عربی شاعر نے کہا ہے:

سَوْفَ تَرىٰ إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ أَ فَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارُ

''عن قریب جب غبار چھٹ جائے گا تب تجھے نظر آجائے گا کہ تو گھوڑے پر سوار تھا یا گدھے پر؟''

ظاہر ہے کہ قیامت کے دِن حقائق سے باخبر ہونے کا کوئی فائدہ بھی انھیں نہیں ہوگا۔ مزید برآں کفّار وفجار جیسے ہی اپنی قبروں سے نکلیں گے تو ان کے سامنے ایک شخص نہایت خوف ناک اور بھیانک صورت میں آئے گا، جس کے جسم سے نہایت خطرناک بدبو آرہی ہوگی، جس سے ان کی دہشت ووحشت میں اور اضافہ ہوجائے گا، وہ اس سے پوچھیں گے کہ بھائی! تم کون ہو؟ وہ کہے گا کہ میں تمھارا بُرا عمل ہوں۔ (ابن کثیر)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح قبر سے اُٹھنے کے بعد نیک عمل خوب صورت شکل میں مؤمن بندے کا استقبال کرے گا اسی طرح بُرا عمل بدصورت شکل میں کافر وفاجر بندے کو خوب ڈرائے گا۔

ان کفّار وفجار کے کفر وشرک اور کبائر کا بوجھ ان کی پشتوں پر ڈال دیا جائے گا۔ اسی کو قرآنِ کریم میں بیان فرمایا:

﴿وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾﴾ (الأنعام:٣١)

نیز قیامت کے دِن نہایت گھبراہٹ کے عالم میں اپنی قبروں سے اُٹھنے کے بعد جب کفّار وفجار کو اپنا بھیانک اَنجام نظر آئے گا تب وہ بھاگنے اور چھٹکارا پانے کی ناکام کوشش کریں گے تبھی فرشتے فوراً آکر اُنھیں دبوچ لیں گے۔

اس کو قرآنِ کریم نے بیان فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٥١﴾﴾ (سبأ:٥١)

محشر کے احوال وحقائق مؤمنین وکفّار کے لیے:

قیامت کے دِن جب تمام لوگ اپنی قبروں سے زندہ ہو کر اُٹھیں گے تو مؤمنین مطمئن اور کفّار غمگین ہوں گے، مؤمنین کے پاس ان کے نیک اعمال حسین شکل میں موجود ہوں گے، جب کہ کفّار کے پاس ان کے بُرے اعمال بدصورت شکل میں ہوں گے، مؤمنین کو رحمت کے فرشتے بشارت دے رہے ہوں گے، جب کہ کفّار کو عذاب کے فرشتے اپنی پکڑ میں لیے ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام بحکم خداوندی لوگوں کو دُنیوی زندگی میں کیے ہوئے اعمال کی جزا وسزا کے لیے میدانِ محشر کی طرف بلائیں گے۔ (معارف القرآن)

اس کا تذکرہ حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا کہ قیامت کے دِن تمھیں تمھارے اور تمھارے باپ کے نام سے پکارا جائے گا، اس لیے اپنے نام اچھے رکھا کرو:

"تُدْعَوْنَ يَوْمَ القِيَامَةِ بِأَسْمَائِكُمْ وَأَسْمَاءِ أَبَائِكُمْ، فَأَحْسِنُوْا أَسْمَاءَكُمْ". (رواه أحمد وأبوداود، مشكوٰة المصابيح : ص۴۰۸، باب الأسامي)

اعلان سنتے ہی اہل ایمان برضا ورغبت اپنی قبروں سے میدانِ محشر کی طرف اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہوئے روانہ ہوں گے، قرآنِ کریم نے اس منظر کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ﴾ (الإسراء : ۵۲)

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ محشر کی طرف روانہ ہونے والوں میں گنہگار مسلمان تو پیدل چل کر جائیں گے؛ لیکن مؤمنین کاملین اور اَبرار وصالحین کے لیے ان کی پسندیدہ اور بہترین قسم کی سواریاں لائی جائیں گی، جن پر سوار ہو کر وہ

جائیں گے، فرمایا:

"يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةَ أَصْنَافٍ، صِنْفًا مُشَاةً، وَصِنْفًا رُكْبَانًا"... الخ (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٨٤، باب الحشر)

اسی کو قرآنِ کریم نے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (مريم : ٨٥)

میدانِ محشر میں مؤمنین متقین کو رحمٰن کا مہمان بنا کر نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ لایا جائے گا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ.

جب کہ کفّار ومجرمین کو نہایت ذلّت کے ساتھ بھوکے پیاسے جانوروں کی طرح منھ کے بل گھسیٹ کر اوّلاً میدانِ محشر میں، پھر جہنّم میں لایا جائے گا۔

"وَقَوْمًا تَسْحَبُهُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ وَتَحْشُرُهُمُ النَّارُ". (رواه النسائي، مشكوٰة : ٤٨٤، باب الحشر)

قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا﴾ (مريم : ٨٦)

بعض کفّار ومجرمین کو آگ میدانِ محشر تک ہانک کر لے جائے گی، وہ جہاں کہیں تھک ہار کر رُکیں گے آگ بھی رُک جائے گی، اور جہاں چلنا شروع کریں گے آگ بھی چلنے لگے گی، حتیٰ کہ آگ ان کو میدانِ محشر میں پہنچا دے گی۔

حدیث میں ہے:

"وَتَحْشُرُ بَقِيَّتَهُمُ النَّارُ، تَقِيْلُ مَعَهُمْ حَيْثُ قَالُوْا، وَتَبِيْتُ مَعَهُمْ حَيْثُ بَاتُوْا"...الخ. (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٣)

میدانِ محشر سرزمین شام میں قائم ہوگا، حدیث پاک میں وارد ہے کہ شام ہی

اِکٹھے ہونے اور بکھرنے کی جگہ ہے۔

عَنْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "الشَّامُ أَرْضُ المَحْشَرِ وَالنَّشْرِ". (رواه أحمد)

قرآنِ پاک نے کہا کہ میدانِ محشر کے زمین وآسمان موجودہ عالم دنیا کے زمین وآسمان کے علاوہ ہوں گے۔

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (ابرٰهم: ٤٨)

''اس روز (موجودہ) زمین کے علاوہ کوئی دوسری زمین ہوگی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سارے لوگ اللہ واحد قہار کے سامنے حاضر ہوجائیں گے۔''

میدانِ محشر کی نئی تخلیق شدہ زمین نہایت صاف ستھری اور بالکل ہموار ہوگی (ظلم وگناہ سے بھی بالکل صاف ہوگی) اس میں تمام اوّلین وآخرین کو ربّ العالمین کے روبہ روجزاوسزا کے لیے جمع کردیا جائے گا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا﴾ (الكهف : ٤٧)

''اور جس دِن ہم پہاڑوں کو چلادیں گے (ان کی جگہ سے ہٹادیں گے) اور تو زمین کو بالکل صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کو ہم اِکٹھا کریں گے، ان میں سے ایک کو بھی باقی نہیں چھوڑیں گے۔''

جب تمام لوگ میدانِ محشر میں جمع ہوجائیں گے تو قبر سے حشر تک تمام لوگ ٹڈیوں کی طرح ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے:

﴿خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ﴾ (القمر:٧)

مگر اب اُنھیں علیحدہ کر دیا جائے گا، من جانب اللہ یہ اعلان کیا جائے گا:

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ (یٰس : ۵۹)

''اے مجرمو! آج تم الگ ہو جاؤ!''

چنانچہ مؤمنین کو کفّار سے، متقین کو مجرمین سے اور مخلصین کو منافقین سے الگ کر کے ان کے عقائد واعمال کے مطابق مختلف گروہ میں تقسیم کر دیا جائے گا، مثلاً اہل ایمان میں علماء کو علماء کے ساتھ، صلحاء کو صلحاء کے ساتھ، شہداء کو شہداء کے ساتھ ملا کر الگ الگ گروہ بنا دیے جائیں گے۔ اسی طرح اہل کفر وشرک میں چاند وسورج کی پوجا کرنے والوں کا گروہ الگ، بتوں اور قبر پرستوں کا گروہ الگ اور منافقین ومرتدین کا گروہ الگ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماں بردار قیامت میں فرماں بردار لوگوں کے ساتھ ہوں گے تو نافرمان لوگ نافرمانوں کے ساتھ، انصاف کرنے والے انصاف کرنے والوں کے ساتھ تو ظالم ظالموں کے ساتھ، امین امینوں کے ساتھ تو خائن خائنوں کے ساتھ، نمازی نمازیوں کے ساتھ تو بے نمازی بے نمازیوں کے ساتھ، نیک لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے والے اور ان سے محبّت کرنے والے نیک لوگوں کے ساتھ تو بُرے لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے والے اور ان سے محبّت کرنے والے بروں کے ساتھ، صالح صالحین کے ساتھ تو فاسق فاسقین کے ساتھ ہوں گے۔

صاحبو! یہ آیت کریمہ: ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ (یٰس:۵۹) ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے، ہم اپنے متعلّق غور وفکر سے کام لیں، اس آیت کریمہ کا مراقبہ کریں اور سوچیں کہ میدانِ محشر میں اس اعلان کے بعد ہمارا شمار کن لوگوں میں ہوگا؟ متقین وصالحین میں یا العیاذ باللہ مجرمین وفاجرین میں؟ یا اللہ! تجھے تیری وسیع رحمت کا واسطہ، اپنے فضل وکرم سے تو ہمیں دارین میں اَبرار وصالحین میں شامل فرما، محروم نہ فرما،

مایوس نہ فرما۔آمین یاربّ العالمین۔

حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام تو میدانِ محشر میں نور کے منبروں پر جلوہ اَفروز ہوں گے، ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر سب سے زیادہ نورانی اور بلند ہوگا، حدیث میں ہے:

"عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْبَرًا مِنْ نُوْرٍ، وَإِنِّيْ لَعَلٰى أَطْوَلِهَا وَأَنْوَرِهَا". (رواه ابن حبان)

حضراتِ انبیائے کرام ورسل علیہم السلام کے علاوہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء، علماء اور ائمہ وغیرہ بھی میدانِ محشر میں نور کے منبر پر ہوں گے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سے بعض ایسے ہوں گے جو نہ انبیاء ہوں گے، نہ شہداء؛ لیکن قیامت کے دِن حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام اور شہداء بھی ان کی تعریف کریں گے ان کے اس درجے اور مقام کی وجہ سے جو انھیں من جانب اللہ عطا ہوگا۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہمیں بتائیں کہ وہ خوش نصیب لوگ کون ہیں؟ فرمایا:

"هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللهِ"...الخ. (رواه أبوداود)

جو ایک دوسرے سے کلام اللہ ہی کی بہترین تلاوت اور اس کی کسی طرح کی خدمت کی وجہ سے خالص محبّت کرتے تھے، کسی رشتے داری یا مالی لین دین اور منافع کے بغیر۔اللہ کی قسم! ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر فروکش ہوں گے، جس وقت لوگ خوف میں مبتلا ہوں گے انھیں کوئی خوف نہیں ہوگا اور جب لوگ غم زدہ ہوں گے تو اُنھیں کوئی غم نہ ہوگا۔پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ

تلاوت فرمائی:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس:۶۲)

''سنو! اولیاء اللہ کو کوئی خوف وغم نہیں ہوگا۔''

نیز سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دِن تین قسم کے لوگ کستوری اور مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے، اُنھیں کوئی خوف نہ ہوگا:

(۱) وہ شخص جو لوگوں کا اِمام تھا اور لوگ اس کی اِمامت سے راضی تھے۔

"رَجُلٌ أَمَّ قَوْمًا، وَهُمْ بِهٖ رَاضُوْنَ".

(۲) وہ شخص جو روزانہ پانچوں وقت کی اَذان دیتا تھا۔

"وَرَجُلٌ يُؤَذِّنُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ لِخَمْسِ صَلَوَاتٍ".

(۳) وہ غلام وخادم جس نے اللہ تعالیٰ کا حق اس کی عبادت کی شکل میں ادا کیا اور اپنے آقا کا حق اس کی خدمت کر کے ادا کیا۔

"وَعَبْدٌ أَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ". (رواه الترمذي)

جہاں تک تعلق ہے حفاظِ کلام اللہ کا، تو کتاب وسنّت سے ان کی تین عظیم فضیلتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) قیامت میں قرآنِ کریم کا ماہر (یعنی قرآنِ کریم کا حافظ، عالم، عامل اور خادم) معزز اور مقرّب فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔

"اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ١٨٤ / كتاب فضائل القرآن)

یعنی عرشِ الٰہی میں جہاں وی وی آئی پی لوگ ہوں گے وہاں قرآنِ کریم کا ماہر

بھی ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلنَا مِنْھُم. آمین.

(۲) اس دِن مؤمنین کاملین کے سوا ہر شخص کو ایسی فکر لاحق ہوگی جو اُسے دوسروں سے بے پرواہ کردے گی، جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ﴾ [عبس : ۳۷]

لیکن حافظ قرآن کی شان یہ ہوگی کہ وہ اس نفسی نفسی کے عالم میں اپنے والدین کو تلاش کرے گا، تاکہ اُنھیں جنّت کا تاج پہنایا جائے، اور اپنے اعزّہ اور رِشتے داروں کو تلاش کرے گا، تاکہ ان کی شفاعت کرے۔ حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ، وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهٰذَا". (مسند أحمد، أبوداود، مشكوٰة : ۱۸٦ / كتاب فضائل القرآن)

یعنی جو بندہ قرآنِ کریم پڑھے اور اس کے احکام پر عمل بھی کرے۔ (یہاں "مَنْ قَرَأَ" سے مراد بقول حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ایسا حافظ قرآن ہے جو عامل بالقرآن بھی ہو۔ (توضیحات: ۷۰۱/۳) اس کا جو مرتبہ ومقام ہوگا وہ تو اپنی جگہ ہے) اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے والدین کو قیامت میں ایسا تاج پہنائیں گے جس کی روشنی سورج سے زیادہ ہوگی۔

دوسری روایت میں ہے کہ قیامت کے دِن حافظ قرآن اپنے دس اہل ایمان رِشتے داروں کے حق میں شفاعت کرے گا جو اپنے گناہوں کے سبب دوزخ کے حق دار ہوں گے، حق تعالیٰ حافظ قرآن کی شفاعت سے اُنھیں جنّت میں داخل فرمائیں گے۔

"وَشَفَّعَهُ فِيْ عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ".

(مسند أحمد، الترمذي، مشكوٰة : ۱۸۷)

(۳) حافظ قرآن کو بلا حساب وعذاب بآسانی جنّت کے اعلیٰ درجات تک پہنچا دیا جائے گا۔ حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ: اقْرَأْ، وَارْتَقِ، وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا". (مسند أحمد، الترمذي، أبوداود، النسائي، مشكوٰة: ١٨٦ / كتاب فضائل القرآن)

قیامت کے دِن صاحب قرآن (بقول ابن حجر و ملّا علی قاری رحمہما اللہ حافظ قرآن، توضیحات: ۶۹۶/۳) سے کہا جائے گا کہ قرآنِ کریم کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا جا، جیسا کہ تو دُنیا میں پڑھتا تھا، اور جنّت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ (حضرات محدثین فرماتے ہیں کہ قیامت کے دِن قرآنِ کریم پڑھنا امر تکلیفی نہیں ہوگا، بلکہ امر تکوینی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح فرشتوں کے لیے تسبیح اور انسانوں کے لیے سانس لینا آسان ہے، اسی طرح قیامت میں حافظ قرآن کے لیے تلاوت کرنا آسان ہوگا۔ (توضیحات: ۶۹۶/۳) حافظ قرآن سے کہا جائے گا کہ جنّت میں تیری آخری منزل اُس آخری آیت پر ہوگی جسے تو پڑھے گا۔

حضرت اقدس والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اس موقع پر فرماتے تھے کہ معلوم ہوا کہ جنّت کی اتنی منزلیں اور درجے ہیں جتنی قرآنِ کریم کی آیات ہیں۔ اور صاحب مظاہر حق کے قول کے مطابق ان کی تعداد چھ ہزار دو سو سینتیس ہے۔

رہی بات مؤمنین مخلصین اور اَبرار و صالحین کی، تو وہ بھی میدانِ محشر کی گھبراہٹ سے محفوظ و مطمئن ہوں گے، کیوں کہ سب کچھ ان کی توقع کے مطابق ہو رہا ہوگا، اور وہ ایمان واَعمالِ صالحہ کا ذخیرہ لیے ہوئے دنیا سے رُخصت ہوئے تھے، قرآنِ

کریم نے اُن ہی کے متعلّق ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (الأنبياء : ۱۰۳)

''وہ بڑی گھبراہٹ بھی اُنھیں غمگین نہ کر سکے گی اور فرشتے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے، ان کا استقبال کرتے ہوئے اُنھیں بشارت سنائیں گے کہ یہی وہ دِن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

آیت مبارکہ میں جس بڑی گھبراہٹ کا ذکر ہے اس کے متعلّق علّامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اَقوال نقل فرمائے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اس سے نفخۂ ثانیہ مراد ہے، یعنی جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور لوگ قبروں سے نکل کر میدانِ محشر کی طرف روانہ ہوں گے اس وقت کی گھبراہٹ مراد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جس وقت دوزخیوں کو دوزخ میں جانے کا حکم ہوگا اس وقت کی گھبراہٹ مراد ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ جس وقت موت کو مینڈھے کی شکل میں جنّت وجہنّم کے درمیان ذبح کیا جائے گا، اس وقت جو کیفیت ہوگی اُسے "اَلْفَزَعُ الْأَكْبَرُ" یعنی بڑی گھبراہٹ سے تعبیر فرمایا ہے۔

درحقیقت ان اَقوال میں کوئی تعارض نہیں، جن حضرات کے لیے اللہ تعالیٰ نے طے فرمادیا ہے کہ ان کے لیے خوبی ہی خوبی ہے، دوزخ سے دوری ہے اور دخولِ جنّت ضروری ہے، انھیں کوئی بھی گھبراہٹ رنجیدہ نہ کرے گی۔ (انوار البیان: ۵۸۱/۳)

اِتنا ہی نہیں؛ بلکہ یہ لوگ نور کی کرسیوں پر بادلوں کے سایے میں آرام سے

بیٹھیں گے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالُوْا: "أَيْنَ الْمُؤْمِنُوْنَ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: تُوْضَعُ لَهُمْ كَرَاسِيُّ مِنْ نُوْرٍ، وَيُظَلَّلُ عَلَيْهِمُ الْغَمَامُ، يَكُوْنُ ذٰلِكَ اليَوْمُ أَقْصَرَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ سَاعَةٍ مِنْ نَهَارٍ". (رواه الطبراني وابن حبان)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! قیامت کے روز مؤمنین کہاں ہوں گے؟ فرمایا: ان کے لیے نور کی کرسیاں رکھی جائیں گی، بادل ان پر سایہ فگن ہوں گے، اہل ایمان کے لیے حشر کا دِن (طویل ہونے کے باوجود) دن کے ایک حصے کے برابر ہوگا۔

جب کہ کفّار ومجرمین کے لیے میدانِ محشر کا دِن نہایت سخت ہوگا؛ بلکہ حشر کی سختی وہولناکی موت اور قبر کی ہولناکی وسختی سے کہیں زیادہ ہوگی، تمام مرد وعورتیں بالکل برہنہ بدن، بغیر ختنہ کے اور ننگے پاؤں ہوں گے؛ لیکن خوف ودہشت کی وجہ سے کسی کو دوسرے کی طرف دیکھنے کا ہوش بھی نہیں ہوگا، حدیث میں ہے:

"الأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يَنْظُرَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ". (متفق عليه، مشكاة:٤٨٣)

سورج اپنے پورے جلال اور گرمی کے ساتھ بالکل قریب کردیا جائے گا، جس سے ان کی ہولناکی اور پریشانی میں اور اِضافہ ہوگا۔

"تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنَ الخَلْقِ، حَتّٰى يَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ، فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ"...الخ (مسلم)

سورج ایک میل کے فاصلے سے آگ برسا رہا ہوگا۔ (آج تو سورج کا ہماری زمین سے فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے، اس کے باوجود جون اور جولائی کے مہینے میں زمین اس قدر گرم ہوجاتی ہے کہ ایک منٹ کے لیے اس پر ننگے پاؤں کھڑے ہونا

مشکل ہوتا ہے، غور کیجیے کہ اس وقت کیا ہوگا جب زمین کا درجۂ حرارت آج کے مقابلے میں ۹ کروڑ گنا زیادہ ہوگا) زمین دہک رہی ہوگی، جسم سورج کی آگ میں جل رہے ہوں گے، دور دور تک کوئی سایہ نہ ہوگا، لوگ اپنے عقائد واعمال کے برابر پسینے میں غرق ہوں گے، کوئی ٹخنوں تک، کوئی پنڈلی تک، کوئی گھٹنوں تک، کوئی زانوں تک، کوئی کمر تک، کوئی سینے تک، کوئی گردن تک، تو بعض پسینے میں غوطے کھا رہے ہوں گے، محشر کی ہولناکی وسختی، سورج کی گرمی اور پسینے کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف میں کفّار وفجار مبتلا ہوں گے، پھر مرتکبین کبائر، پھر مرتکبین صغائر ان سے کم۔ البتہ اہل ایمان میں گنہگار کو میدانِ محشر کی تکلیف زُکام جیسی محسوس ہوگی، جب کہ کفّار وفجار کو موت کی غشی جیسی محسوس ہوگی۔

"فَالخَلْقُ مُلْجَمُوْنَ فِيْ الْعَرَقِ، فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَهُوَ عَلَيْهِ كَالزُّكْمَةِ، وَأَمَّا الكَافِرُ فَيَتَغَشَّاهُ المَوْتُ". (رواه أحمد في مسنده)

پھر جس جگہ یہ لوگ کھڑے ہوں گے وہ اتنی تنگ ہوگی کہ بمشکل دو قدم رکھے جا سکیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الزہد'' میں حضرت علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے:

"لَا يَكُوْنُ لِأَحَدٍ مِنَ البَشَرِ إِلَّا مَوْضِعُ قَدَمَيْهِ". (التذكرة للقرطبي، أبواب الموت، باب: أين يكون الناس)

محشر کا یہ سخت دِن مؤمنین صالحین کے لیے جس قدر مختصر ہوگا کفّار ومجرمین کے لیے اسی قدر طویل ہوگا، حدیث پاک میں ہے کہ مؤمنین کے لیے یہ دِن اتنا مختصر ہوگا جتنے وقت میں ایک فرض نماز پڑھی جاتی ہے۔

"أَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ المَكْتُوْبَةِ يُصَلِّيْهَا فِيْ الدُّنْيَا". (رواه

البيهقي، مشكوٰة : ٤٨٧)

اور کفّار کے حق میں یا تو ایک ہزار سال کے برابر ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ (الحج : ٤٧)

یا پھر پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج : ٤)

حضرات علمائے محققین فرماتے ہیں کہ قیامت کے دِن کا مختصر یا طویل ہونا لوگوں کے اعمال واحوال کے اعتبار سے ہوگا، بعض لوگوں پر وقت کی یہ تخفیف کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے ہوگی، یعنی واقعۃً اوقات مختصر بھی ہوجائیں گے اور وہ اسے محسوس بھی کریں گے۔ اور بعض لوگوں کے لیے اس دِن کے اوقات تو مختصر نہیں کیے جائیں گے، دِن لمبا ہی ہوگا؛ مگر وہ اسے مختصر محسوس کریں گے، جس طرح آدمی راحت میں ہوتا ہے تو اوقات مختصر لگتے ہیں، گویا وہ دِن ان کے لیے کیفیت میں مختصر ہوگا، کمیت میں نہیں۔ جب کہ بعض کے لیے کمیت میں مختصر ہوگا؛ لیکن کیفیت میں طویل ہوگا، وہ لوگ قیامت کی ہولناکی اور سورج کی گرمی وغیرہ سے اس دِن کو انتہائی طویل محسوس کریں گے۔ واللہ اعلم۔ (مستفاد از: توضیحات: ۷/ ۶۱۵)

حوضِ کوثر کے اَحوال وحقائق:

اس دِن ہر کسی کو شدّت سے بھوک اور پیاس کا احساس ہوگا، اس دِن حق تعالیٰ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو پانی کا ایک حوض عطا فرمائیں گے، جن سے وہ اپنی اُمّت کے فرماں بردار لوگوں کو پانی پلائیں گے، تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اُمّت کی کثرت پر باہمی فخر کریں گے، حدیث میں ہے:

"إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوْضًا، وَإِنَّهُمْ لَيَتَبَاهَوْنَ أَيُّهُمْ أَكْثَرُ وَارِدَةً؟ وَإِنِّيْ لَأَرْجُوْ أَنْ أَكُوْنَ أَكْثَرَهُمْ وَارِدَةً". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٩٣)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حوض ملے گا وہ سب سے بڑا ہوگا، اس پر ازدحام بھی سب سے زیادہ ہوگا، اس کا نام حوضِ کوثر ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۝١﴾ (الکوثر : ١)

اس کی مزید تفصیلات حدیث میں ہیں کہ میرے حوض کا طول وعرض اتنا زیادہ ہے کہ اس کی ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ایک ماہ کی مدّت درکار ہے اور اس کے گوشے لمبائی وچوڑائی میں برابر ہیں، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی خوشبو مشک سے بھی عمدہ ہے، اس کے آبخورے اور لوٹے اس قدر ہیں جتنے آسمان کے ستارے، جو اس میں سے ایک مرتبہ پی لے گا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ (اور جو محروم رہ جائے گا وہ کبھی سیراب نہ ہوگا۔ العیاذ باللہ العظیم)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "حَوْضِيْ مَسِيْرَةُ شَهْرٍ، وَزَوَايَاهُ سَوَاءٌ، مَاءُهُ أَبْيَضُ مِنَ اللَّبَنِ، وَرِيْحُهُ أَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ، وَكِيْزَانُهُ أَكْثَرُ مِنْ نُجُوْمِ السَّمَاءِ، مَنْ يَشْرَبْ مِنْهَا فَلَا يَظْمَأُ أَبَدًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٧)

نیز حدیث میں ذکر ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، اس کا پانی جنّت کی نہر کوثر سے سونے چاندی کے دو پرنالوں سے جاری ہوگا، وہاں سے پانی آتا رہے گا اور اُمّت کے فرماں برداروں کو سیراب کرتا رہے گا۔

"أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، وَأَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ، يَغُتُّ فِيْهِ مِيْزَابَانِ، يَمُدَّانِهِ مِنَ الْجَنَّةِ، أَحَدُهُمَا مِنْ ذَهَبٍ، وَالْآخَرُ مِنْ وَرِقٍ". (رواه مسلم،

مشکوٰۃ : ٤٨٧)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور! دیگر اُمتوں میں سے اُس دِن آپ اپنی اُمّت کے مؤمنین صالحین کو کیسے پہچانیں گے؟ فرمایا: تمھارے اعضائے وضو کی چمک اور روشنی سے پہچان لوں گا۔

"لَكُمْ سِيْمَا لَيْسَتْ لِأَحَدٍ مِنَ الْأُمَمِ، تَرِدُوْنَ عَلَيَّ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوْءِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٨٧)

سب سے پہلے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں فقراء مہاجرین حوضِ کوثر سے سیراب ہوں گے۔

"إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ وُرُوْدًا عَلَيْهِ الْفُقَرَاءُ الْمُهَاجِرُوْنَ". (الترمذي)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں جب لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو انھیں نہایت شدّت سے پیاس لگی ہوگی، اس وقت بعض مؤمنین صالحین کو فوراً حوضِ کوثر کا جام پیش کیا جائے گا، جب کہ کمزور مسلمانوں کو ان کے گناہوں کے سبب دیر سے ملے گا، حتیٰ کہ بعض کو پلِ صراط سے گزرنے کے بعد پلایا جائے گا۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/ ۵۴)

(اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الوَارِدِيْنَ عَلٰى حَوْضِ نَبِيِّكَ. آمين)

ہو نصیب جامِ کوثر، یہ شفیق کی دُعا ہے مگر ایک حسین تمنا کہ خود حضور پلائیں

(آمین)

حوضِ کوثر پر کفّار، مجرمین، مرتدین ومنافقین بھی آئیں گے؛ لیکن انھیں رد کر دیا جائے گا، پانی سے محروم کر دیا جائے گا، نیز دین میں تبدیلی کرنے والے مبتدعین (بدعتیوں) کو بھی حوضِ کوثر سے محروم کر دیا جائے گا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ جھوٹے اور ظالم حکمرانوں کی مدد کرنے والے مجرمین بھی حوضِ کوثر کے پانی سے محروم کر

دیے جائیں گے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

"مَنْ صَدَّقَهُمْ بِكِذْبِهِمْ، وَأَعَانَهُمْ عَلٰى ظُلْمِهِمْ، لَمْ يَرِدْ عَلَيَّ الحَوْضَ". (رواه الطبراني) العياذ باللهِ العظيم.

اس سے ان کی پریشانی اور ہولناکی بہت زیادہ بڑھ جائے گی، لوگ تنگ آ کر دُعا کریں گے کہ یا اللہ! ہمیں حشر سے نجات دے، خواہ جہنّم ہی میں بھیج دے، حالانکہ اس کا عذاب حشر سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ کفّار کہیں گے:

'يَا رَبِّ! ارِحْنِيْ، وَلَوْ إِلَى النَّارِ". (رواه الطبراني)

شفاعت کے اَحوال وحقائق:

میدانِ محشر میں طویل مدّت تک بھوکے پیاسے، شدید گرمی اور بدبودار پسینے میں شرابور ہوکر جب لوگ لاچار ہوجائیں گے تو ایک دوسرے سے کہیں گے:

"أَلَا تَنْظُرُوْنَ مَنْ يَشْفَعُ لَكُمْ إِلٰى رَبِّكُمْ؟" (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٩، باب الحوض والشفاعة)

تم کسی ایسے شخص کو تلاش کیوں نہیں کرتے جو تمھارے پروردگار سے تمھاری سفارش کرے، اس کے بعد تمام لوگ یکے بعد دیگرے اکابر انبیائے کرام علیہم السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر اللہ تعالیٰ کے حضور حساب وکتاب شروع کرانے کی درخواست کریں گے؛ مگر از آدم تا عیسیٰ علیہما السلام تمام اکابر انبیاء انکار کردیں گے، کسی کو ہمت نہ ہوگی، بالآخر لوگ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی پر سیّد الانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر التجا کریں گے تو آپ ﷺ قبول فرمالیں گے کہ ہاں،

آج روزِ شفاعت کے لائق میں ہی ہوں۔

"فَأَقُوْلُ: أَنَا لَهَا، فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ، فَيُؤْذَنُ لِيْ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٨، باب الحوض والشفاعة)

پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ربّ العالمین کے حضور شفاعت کی اجازت طلب فرمائیں گے، کیوں کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرة : ٢٥٥)

اجازت ملنے کے بعد شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ محشر سے بذریعۂ براق شفاعت کی بلند ترین جگہ پہنچا دیا جائے گا، جسے مقامِ محمود کہتے ہیں، یہ جگہ جنّت میں عرشِ الٰہی کے نیچے ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (الإسراء : ٧٩)

''عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں پہنچائے گا۔''

یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوگا۔ مقامِ محمود پر پہنچنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ ربِ ذوالجلال میں سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ یہاں محققین کے مابین یہ بحث چھڑ گئی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ فرمائیں گے تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوضو ہوں گے؟ ایک قول ہے کہ جی ہاں، کیوں کہ غسل موت کی طہارت باقی ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آخرت احکامِ شریعت کا مقام نہیں، وہ دار العمل نہیں، دار الجزا ہے، اس لیے اس سجدے کے لیے وضو کی ضرورت نہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

"قَالَ: فَأَنْطَلِقُ، فَآتِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَأَقَعُ سَاجِدًا لِرَبِّيْ، ثُمَّ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيَّ مِنْ مَحَامِدِهٖ، وَحُسْنِ الثَّنَاءِ عَلَيْهِ شَيْئًا لَمْ يَفْتَحْهُ اللّٰهُ لِأَحَدٍ

قَبْلِيْ..." (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٩)

حق تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب اطہر پر اپنی حمد وثنا اور آداب حضور کے وہ الفاظ القاء فرمائیں گے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئے؛ بلکہ اس سے پہلے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ان الفاظ کا القاء نہ ہوا ہوگا، اس پر غضب الٰہی کم ہوگا اور رحمت الٰہی کو جوش آئے گا تو ارشادِ الٰہی ہوگا: پیارے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! سر اُٹھایئے، سوال کیجیے! پورا کیا جائے گا، سفارش کیجیے! قبول کی جائے گی۔

"يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ، وَسَلْ تُعْطَهْ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٩)

اس موقع پر ہمارے شاہ صاحب علّامہ سیّد عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ''غور کیجیے! یہ نہیں کہا جائے گا کہ سر اُٹھایئے اور جو چاہیں کیجیے، "وَافْعَلْ مَا شِئْتَ" اختیار تو سارا آپ ہی کے ہاتھ میں ہے، تکلّف کیوں کرتے ہو؟ نا! فرمایا: آپ سوال کیجیے! آپ سے بہتر کوئی سائل نہیں اور مجھ سے بہتر کوئی داتا نہیں، اس لیے کہ آپ سوال کرتے ہوئے اچھے لگتے ہیں اور میں دیتا ہوا اچھا لگتا ہوں۔''

اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حساب وکتاب شروع کرنے کی سفارش فرمائیں گے، جسے منظور کرلیا جائے گا، یہی شفاعت کبریٰ ہے، جو شفاعت کی پہلی اور بنیادی قسم ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری انسانیت کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

اس کے علاوہ شفاعت کی دوسری قسم وہ بھی ہے جسے شفاعت صغریٰ کہتے ہیں، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمّت کے مختلف گروہوں کے لیے شفاعت فرمائیں گے، شفاعت صغریٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام بھی فرمائیں گے، حتیٰ کہ علماء وشہداء وغیرہ بھی فرمائیں گے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَشْفَعُ يَوْمَ القِيَامَةِ ثَلَاثَةٌ : الأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ العُلَمَاءُ، ثُمَّ الشُّهَدَاءُ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة : ٤٩٥)

لیکن شفاعت کبریٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی نہیں کر سکے گا، شفاعت کبریٰ کی منظوری ملنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ محمود سے میدانِ محشر میں واپس تشریف لائیں گے، اس کے بعد ہی حق تعالیٰ اپنی شان کے مطابق فرشتوں کی معیت میں نزولِ اجلال فرمائیں گے اور عدالت الٰہی قائم ہوگی۔

عدالت الٰہی کے اَحوال وحقائق:

حق تعالیٰ کے نزولِ اجلال کے وقت ساتوں آسمان یکے بعد دیگرے کھل جائیں گے، فضا میں ہر طرف نورانی بادل پھیل جائیں گے، جن کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی، پھر اولاً فرشتے تسبیح پڑھتے ہوئے میدانِ محشر میں اُتر کر تمام انسانوں کو اپنے اِحاطے میں لے لیں گے، قرآنِ کریم نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝﴾ (الفرقان:۲۵)

''جس دِن آسمان بادل سمیت پھٹ (کھل) جائے گا اور فرشتے لگاتار اُتارے جائیں گے۔''

تمام فرشتے اطراف وجوانب میں صف بستہ کھڑے ہوں گے، ہر آسمان کے فرشتوں کی صف الگ ہوگی، کل سات صفیں ہوں گی، جو اس زمین کو گھیر لیں گی، پھر اسی دوران آٹھ عظیم الشان فرشتے عرشِ الٰہی کو اُٹھائے ہوئے حاضر ہوں گے۔

﴿وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝﴾ (الحاقة:۱۷)

''اور جب (آسمان کھل جائے گا تو آسمان کے) فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے اور آٹھ خصوصی فرشتے عرشِ الٰہی کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔''

جب عرشِ الٰہی کو میدانِ محشر میں لاکر رکھ دیا جائے گا تو ہر باعمل مؤمن مخلص کو اس کے سایے میں جگہ دی جائے گی، اس کے بعد حق تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اس پر اس طرح جلوہ اَفروز ہوں گے کہ فرشتے صف در صف موجود ہوں گے اور اپنی پوزیشن سنبھالیں گے۔ قرآنِ پاک میں یہ منظر بیان ہوا ہے:

﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر : ۲۲)

''اور تمھارا رب اس طرح جلوہ فرما ہوگا کہ فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے۔'' اس وقت زمین اپنے پروردِگار کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾ (الزمر : ٦٩)

''اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہوجائے گی۔''

اس وقت مؤمنین مخلصین رب کے حضور خود بہ خود سجدہ ریز ہوجائیں گے، البتہ کفّار ومجرمین اس کی قدرت نہیں پائیں گے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۸۴/ باب الحشر) جس سے مؤمنین وکافرین کا فرق واضح ہوجائے گا۔ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ (القلم:۴۲)

یاد رکھو! یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات اور احوال وواقعات کا تعلق متشابہات سے ہے، مطلب یہ ہے کہ انسانی عقل وشعور ان کی حقیقت وکیفیت سمجھنے سے قاصر ہے، اس کا صحیح اور حقیقی معنیٰ اور مطلب اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، ان مباحث میں غور وخوض کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ اجازت، بلکہ اجمالی طور پر ان باتوں پر ایمان ویقین ضروری ہے۔

عدالت الٰہی قائم ہونے کے بعد لوگوں کے اعمالِ زندگی کو پیش کیا جائے گا، فرمایا: ﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ﴾ اور کتاب رکھ دی جائے گی۔ یعنی اعمال نامے عرشِ الٰہی کے نیچے مقام علیین سے لاکر سرِ محشر پیش کر دیے جائیں گے، اس کے علاوہ حق وانصاف کے ساتھ آخری فیصلہ کرنے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور دیگر گواہوں کو بھی لایا جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۝۶۹﴾ [الزمر:۶۹]

''اور نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا، پھر لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کر دیے جائیں گے اور ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

حضرت والد ماجد مولانا محمد صدیق شاہ بھائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں یا تو فضل ہوگا یا عدل ہوگا، ظلم بالکل بھی نہیں ہوگا۔

اس کے بعد عدالت الٰہی میں حاضری کے لیے لوگوں کو اپنے اچھے بُرے لیڈروں کے ساتھ بلایا جائے گا، اَبرار ومتقین، صدیقین اور صالحین کو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ بلایا جائے گا، جب کہ فجار ومجرمین کو ضالین، فاجرین اور شیاطین کے ساتھ بلایا جائے گا۔ فرمایا:

﴿یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ﴾ (الإسراء : ۷۱)

''ذرا اُس دِن کا بھی خیال کرو جس دِن تمام لوگوں کو ان کے (اچھے بُرے) پیشواؤں اور اِماموں (یا ان کے اچھے بُرے اعمال ناموں) کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی عدالت میں حاضر کیا جائے گا۔''

عدالت الٰہی میں حاضری وپیشی سے نہ تو کوئی فردِ بشر باقی رہے گا اور نہ کسی کے احوال واعمال مخفی رہیں گے۔ فرمایا:

﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ (الحاقة : ۱۸)

''اُس دِن تم سب اپنے رب کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، تمھارا کوئی بھی راز پوشیدہ نہیں رہے گا۔''

البتہ اہل ایمان کو عدالت الٰہی میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ بڑے عزّت واحترام کے ساتھ مہمانوں کی طرح پیش کیا جائے گا۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (مریم : ۸۵)

میدانِ محشر میں ہم مؤمنین متقین کو معزز مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حضور اس کی عدالت میں پیش کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اہل ایمان عدالت الٰہی میں رحمٰن کے مہمان ہوں گے، اُنھیں اس بات کا اطمینان ہوگا کہ آج ہمیں نیک اعمال کا بہترین بدلہ مل جائے گا۔

جب کہ کفّار ومجرمین کو جب پیش کیا جائے گا تو عدالت الٰہی میں ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ ذلت وندامت کے باعث اپنے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (السجدة:۱۲)

تقسیم نامۂ اعمال کے احوال وحقائق:

عدالت الٰہی قائم ہوجانے کے بعد آگے کی کاروائی شروع کی جائے گی، جس میں سب سے پہلے بندوں کے نامۂ اعمال تقسیم کیے جائیں گے، نامۂ اعمال کا مطلب ہے دُنیوی زندگی میں جس بندے نے جب بھی، جہاں بھی، جو بھی اچھّا یا بُرا عمل کیا من جانب اللہ فرشتوں نے اسے ایک صحیفے میں محفوظ کرلیا، اس کو نامۂ اعمال کہتے ہیں، دُنیوی زندگی میں نامۂ اعمال ہر وقت ہر جگہ ہر ایک کے ساتھ بلکہ گلے کا ہار بنا رہتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اسے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ (الإسراء : ۱۳)

''ہر انسان کی بھلائی و بُرائی کو ہم نے اس کے گلے لگا دیا ہے۔''

مرنے کے بعد اس نامۂ اعمال کو بند کر کے علیین یا سجین میں محفوظ کر دیا جاتا ہے، پھر وہاں سے میدانِ محشر میں قائم عدالت الٰہی میں لا کر ہر ایک کو اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا، تاکہ خود پڑھ کر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ وہ ثواب وانعام کا مستحق ہے یا عذاب وسزا کے لائق ہے۔ فرمایا:

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا﴾ (الإسراء : ۱۳)

''اور بروزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامۂ اعمال نکالیں گے، جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔''

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم اعمال نامہ کے وقت حق تعالیٰ ایک قسم کی ہوا چلائیں گے۔

"فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْمَوْقِفِ بَعَثَ اللهُ رِيْحًا فَتُطَيِّرُهَا بِالأَيْمَانِ وَالشَّمَائِلِ، أَوَّلُ خَطٍّ فِيْهَا: اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْهِ حَسِيْبًا".

(التذكرة في أحوال الموتىٰ وأمور الأخرة للقرطبي : ۴۹۰/۹)

یہ ہوا نامۂ اعمال کو اُڑا کر ان کی جگہوں سے عدالت الٰہی میں لوگوں کے سامنے پہنچا دے گی، پھر فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ہر ایک کو اس کا نامۂ اعمال تقسیم کر دو، چنانچہ مؤمنین کو ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ فرمایا:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (الانشقاق : ۷)

(اس وقت) جس کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا (یہ اس کی خوش

نصیبی اور کامیابی کی نشانی ہوگی)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں مؤمنین کا حال بیان فرمایا ہے کہ ان کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ (معارف القرآن)

اور مسند احمد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اُمّت محمدیہ کے مؤمنین کی تین علامتیں ہوں گی، جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیگر امم میں اپنی اُمّت کو بآسانی پہچان لیں گے:

(۱) ان کے اعضائے وضو روشن ہوں گے۔

"هُمْ غُرٌّ مُحَجَّلُوْنَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوْءِ".

(۲) اُن کے نامۂ اعمال خاص اعزاز کے ساتھ اُن کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ "أَنَّهُمْ يُؤْتَوْنَ كُتُبَهُمْ بِأَيْمَانِهِمْ".

(۳) ان کی بچپن میں انتقال کر جانے والی اَولاد نہایت خوشی و بے فکری کے ساتھ اُن کے سامنے کھیلتی دوڑتی ہوگی۔

"تَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ ذُرِّيَّتُهُمْ". (رواه أحمد:۱۹۹/۵، مشكوٰة المصابيح: صـ۴۰ / كتاب الطهارة)

اس کے برخلاف کفّار ومشرکین کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ (الانشقاق : ۱۰)

جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا (یہ اس کے بدنصیب اور ناکام ہونے کی نشانی ہوگی)۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بدنصیب اس بات سے تو پہلے

ہی مایوس ہوگا کہ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے؛ کیوں کہ وہ اپنے کرتوتوں سے خوب واقف ہوگا، اسے یقین ہوگا کہ مجھے اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملنے والا ہے، جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے ہاتھ پیچھے کرلے گا؛ مگر اس تدبیر سے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ اپنا کچا چٹھا اپنے ہاتھ میں لینے سے بچ جائے، وہ تو بہر حال اُسے پکڑا ہی دیا جائے گا، خواہ وہ ہاتھ آگے بڑھالے یا پیٹھ کے پیچھے چھپالے، چنانچہ فرشتے اُسے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ پکڑادیں گے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس بدنصیب کے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے ہوں، اس لیے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

تقسیم نامۂ اعمال کے بعد ہر ایک سے کہا جائے گا، یا پھر ہر ایک کے نامۂ اعمال کے شروع میں لکھا ہوا ہوگا:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝﴾ (الإسراء:١٤)

تمھاری کتابِ زندگی کا ہر ہر ورق اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ تمھارے سامنے موجود ہے، اب خود ہی پڑھ کر اپنا حساب کرلو، تمھارا اعمال نامہ گویا قدرتی چپس (Chips) ہے، جس میں تمھاری زندگی بھر کی فلم موجود ہے، دُنیوی زندگی کا تمام ڈیٹا پوری تفصیل کے ساتھ اس میں محفوظ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوتا، اس لیے ہر کوئی پڑھ بھی نہیں سکتا، خصوصاً عربی زبان سب کو پڑھنا نہیں آتی؛ لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دِن ہر انسان خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر، اُمّی ہو یا غیر اُمّی، عربی ہو یا عجمی، ہر ایک بندہ اعمال نامہ پڑھ لے گا، یہی وجہ ہے کہ اعمال نامے پر نظر ڈالتے ہی ہر بندے کے سامنے اس کی ساری زندگی کا کچا چٹھا سامنے آجائے گا، ماضی کی بھولی بسری ساری

یادیں تازہ ہوجائیں گی۔

البتہ یہاں بھی مؤمنین وکفّار میں فرق ہوگا، مؤمن بندہ جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا، وہ جب دیکھے گا کہ اس کے اعمال نامے میں جتنی نیکیاں ہیں وہ بفضلہٖ تعالیٰ قبول ہوگئیں، اور جتنے گناہ ہیں وہ دُنیوی آزمائش ومصائب اور اَمراض و آفات کی وجہ سے، یا پھر سچّی توبہ یا بہ فضل الٰہی معاف کر دیے گئے ہیں، اکثر اہل ایمان کا یہی حال ہوگا، اس لیے اب اعمال نامے میں نیکیاں ہی نیکیاں ہیں، گناہ نہیں ہیں، تو وہ بندہ بے حد خوش ہو جائے گا اور جوشِ مسرّت میں ہر ملنے والے سے کہتا پھرے گا کہ آؤ! میرا اعمال نامہ دیکھو، پڑھو!

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۱۹﴾﴾ (الحاقۃ:۱۹)

وہ بندہ کہے گا: لو! میرا اعمال نامہ پڑھو۔ مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ قیامت کے دِن حساب وکتاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے، اس لیے میں دُنیوی زندگی میں اپنے رب سے ڈرتا رہا، نیکیاں کرتا رہا، اگر گناہ ہوگیا تو اس کی معافی تلافی کرتا رہا، جس کا ثمرہ آج میرے سامنے ہے۔

﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۰﴾﴾ (الحاقۃ : ۲۰)

''مجھے اپنے حسابِ زندگی سے دو چار ہونے کا یقین تھا۔'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمن بندہ اپنے رب سے حسن ظن رکھتا ہے، اسی لیے وہ اچھا عمل بھی کرتا ہے۔ (قرطبی)

ایک بزرگ سے کسی دیہاتی نے پوچھا کہ حساب کون لے گا؟ فرمایا: اللہ، یہ سن کر وہ دیہاتی خوش ہوکر کہنے لگا: ''ربِ کعبہ کی قسم! پھر تو ہم (اہل ایمان) نجات ہی پالیں گے۔'' یہ ہے اپنے رَب کے ساتھ حسن ظن۔

اسی طرح منقول ہے کہ ایک مسلمان نوجوان حالت نزع میں تھا، اس کی ماں قریب میں بیٹھی رونے لگی، اُس نوجوان نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر سوال کیا: ''اَمّی! میرا حساب اگر آپ کے حوالے کر دیا جائے تو آپ میرے ساتھ کیا معاملہ کریں گی؟ ماں نے کہا کہ میں تجھ پر رحم کرتے ہوئے معاف کر دوں گی، اِس پر وہ نوجوان کہنے لگا: ''اَمّی! اللہ تعالیٰ تو آپ سے بھی بڑا رحیم ہے، پھر اس کے پاس بھیجتے ہوئے یہ رونا کیوں؟'' سبحان اللہ! کتنا بہترین گمان ہے اپنے رَب سے۔

﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٢١﴾ (الحاقة : ٢١)

اب وہ پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔ اسے اب ایسی دائمی زندگی عطا ہوگی جس میں ہر طرح کی رضا ہی رضا ہوگی۔ اَللّٰھم اجعلنا منھم. آمین.

اس کے برعکس کافر ومشرک جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اعمال نامے پر نظر پڑتے ہی اس کے ہوش اُڑ جائیں گے، وہ نہایت پریشان وپشیمان ہوکر کہے گا:

﴿وَيَقُولُونَ يَوَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ﴾ (الكهف : ٤٩)

یہ لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے لرزاں وترساں ہوں گے، ان کے اعمال ناموں میں کوئی نیکی نہیں ہوگی، کیوں کہ دُنیوی زندگی میں کیے ہوئے نیک اعمال کا بدلہ اُنھیں دنیا ہی میں دولت، حکومت، عزّت وشہرت وغیرہ کی شکل میں مل گیا تھا، اس لیے اب اعمال نامے میں صرف بُرائیاں ہی ہوں گی، اب وہ نہایت حسرت و ندامت سے کہے گا:

﴿فَيَقُولُ يَٰلَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝٢٥﴾ (الحاقة : ٢٥)

''کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ جاتا۔''

﴿وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ﴾ (الحاقة: ٢٦)

''اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟۔''

جس موت سے دنیا میں بہت گھبراتا تھا آج وہ اس کی آرزو کرنے لگے گا کہ

﴿يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ﴾ (الحاقة: ٢٧)

''کاش! موت ہی نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا۔''

تا کہ آخرت کی اس دائمی زندگی میں رُسوائی کا سامنا نہ ہوتا، اس وقت نہ کوئی دولت وحکومت کام آئے گی، نہ عزّت وشہرت۔

﴿مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ﴾ (الحاقة: ٢٨)

''میرا مال بھی مجھے کچھ کام نہ آیا۔''

﴿هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ﴾ (الحاقة: ٢٩)

''میرا غلبہ (اقتدار واختیار) بھی مجھ سے جاتا رہا۔'' اس وقت ہر مشرک ومجرم بے بس ولاچار کھڑا ہوگا اور اپنے دِفاع میں کسی کو نہ پائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حساب وکتاب اور سوال وجواب کے احوال وحقائق:

اعمال ناموں کی تقسیم کے بعد حساب وکتاب اور سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوگا۔ حضرات علماء نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دِن حساب وکتاب اور سوال وجواب کا سلسلہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور ملائکہ کی موجودگی میں ہوگا، جیسا کہ ارشادِ الٰہی سے معلوم ہوتا ہے:

﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ﴾ (الزمر: ٦٩)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر اُمّت کا حساب وکتاب اس کے نبی کے سامنے

ہوگا، نیز اعمال نامہ لکھنے والے فرشتے بھی وہاں موجود ہوں گے، پھر ہر ایک کو عدالت الٰہی میں حساب وکتاب اور سوال وجواب کے لیے تنہا لایا جائے گا۔ فرمایا:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (مریم : ۹۵)

''سارے لوگ قیامت کے روز اللہ کے حضور تنہا حاضر ہوں گے۔''

کیوں کہ اُس دِن ہر فرد کا محاسبہ اس کی ذاتی حیثیت سے ہوگا، اجتماعی طور پر نہیں، اس لیے عذاب بھی جنھیں ہوگا فرداً فرداً ہوگا، اجتماعی طور پر نہیں، حق تعالیٰ کا جو اجتماعی عذاب قوموں پر آتا ہے وہ عالم دنیا کے ساتھ مخصوص ہے، عالم آخرت میں ایسا نہیں ہوگا، وہاں جب حساب وکتاب اور سوال وجواب ہر ایک سے الگ الگ ہوگا تو جزا وسزا کا معاملہ بھی اسی طرح ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حساب وکتاب لیتے ہوئے حق تعالیٰ ہر شخص سے بغیر کسی ترجمان اور بغیر حجاب کے براہِ راست سوال وجواب کریں گے۔ حدیث پاک میں ہے:

"لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ حِجَابٌ وَلَا تَرْجُمَانٌ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۴۸۵)

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ یوں فرمایا:

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الحجر : ۹۲)

''تیرے رب کی قسم! ہم ان (کے اوّلین وآخرین) سے ضرور باز پرس کریں گے۔''

﴿عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الحجر : ۹۳)

''ان اعمال وافعال کی جو وہ کرتے رہے۔''

یہ سوال وحساب بطورِ محاسبہ ومؤاخذہ ہوگا، نہ بطورِ استفسار وحصولِ خبر۔ نیز یہ سوال وحساب بغیر حساب جنّت میں داخل ہونے والوں سے نہ ہوگا۔

(كما ذكر في التذكرة للقرطبي)

ان کے علاوہ ہر ایک سے کچھ ضروری سوالات کیے جائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴾ (الصٰفٰت: ۲۴)

''ان کو ٹھہراؤ! ان سے سوالات کیے جائیں گے۔''

اب کیا پوچھا جائے گا؟ تو اس سلسلے میں کتاب وسنّت میں مختلف سوالات کا ذکر ہے، مثلاً ایک حدیث میں وارد ہے کہ ہر شخص سے قیامت کے دِن پانچ سوال ضرور کیے جائیں گے:

"عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا أَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا أَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهٗ؟ وَفِيْمَا أَنْفَقَهٗ؟ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ". (الترمذي، مشكوٰة: ٤٤٣)

''زندگی کیسے گزاری؟ جوانی کہاں اور کس طرح گزاری؟ مال کن طریقوں اور ذریعوں سے کمایا تھا؟ پھر کن جگہوں میں خرچ کیا؟ اور جو کچھ جانتے تھے اس پر کیا عمل کیا؟''

حتیٰ کہ ہر انسان کی ظاہری زندگی وجوانی کے ظاہری اعمال کے علاوہ پوشیدہ اعمال اور ان کے اغراض ومقاصد کے متعلّق بھی پوچھا جائے گا۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾ (الطارق: ۹)

''اس دن (سے ڈرو جس میں) پوشیدہ باتوں (کاموں، نیتوں اور رازوں) وغیرہ کی جانچ پڑتال ہوگی۔''

یعنی بند کمروں اور تنہائیوں کے وہ بُرے اقوال وافعال واعمال، معاملات اور تعلقات جو دُنیوی زندگی میں ایک راز بن کر رہ گئے تھے قیامت کے دِن ان کے متعلّق بھی حساب اور سوال ہوگا۔

جسے کوئی نہیں جانتا اُسے رَب جانتا ہے
راز کو راز نہ سمجھو! وہ سب جانتا ہے
اگر مانگنا ہی ہے تو اُس رَب سے مانگو
زبان پر آنے سے پہلے جو دِل کی تڑپ جانتا ہے

نیز زندگی بھر حق تعالیٰ کی جو بے شمار نعمتیں استعمال کیں اُن کے متعلّق بھی پوچھا جائے گا۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨﴾ (التکاثر : ۸)

''پھر اُس دِن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کا سوال ہوگا۔''

علّامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نعمتوں کے متعلّق یہ سوال وحساب کافروں اور ناشکروں سے تو ہوگا ہی، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کافروں اور ناشکروں میں سے ایک شخص کو قیامت کے دِن اس حال میں لایا جائے گا کہ گویا وہ بھیڑ کا بچّہ ہے (یعنی ذلّت کی حالت میں لایا جائے گا) اسے حق تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور سوال ہوگا کہ میں نے تجھے نعمتیں دی تھیں اور تجھ پر انعام کیا تو تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اے میرے رب! میں نے مال جمع کیا اور خوب بڑھایا اور اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا پہلے تھا، آپ مجھے واپس لوٹا دیجیے، تاکہ میں سارا مال لے کر آؤں، ارشاد ہوگا کہ مجھے وہ دِکھا جو تو نے پہلے بھیجا تھا، ابن آدم پھر وہی بات کہے گا، اس لیے بالآخر اس کے لیے دوزخ کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ "فَيُمْضىٰ بِهٖ إِلَى النَّارِ". (سنن الترمذي، مشكوٰة: ص٤٤٣)

آیت کریمہ کے عمومی اَلفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دِن بہت سے اہل ایمان سے بھی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا، جیسا کہ حدیث پاک میں مذکور

ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے باغ میں تشریف لے گئے، انھوں نے کھجور اور ٹھنڈے پانی سے میزبانی فرمائی، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں تم سے ان نعمتوں کے متعلّق بھی سوال ہوگا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب کا اِظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوں تو ہر نعمت کے متعلّق سوال ہوگا، سوائے تین چیزوں کے: (۱) بقدرِ ضرورت کپڑا (۲) بقدرِ ضرورت کھانا (۳) بقدرِ ضرورت مکان۔

"ثُمَّ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَئِنَّا لَمَسْؤُوْلُوْنَ عَنْ هٰذَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالَ: نَعَمْ، إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: خِرْقَةٍ لَفَّ بِهَا الرَّجُلُ عَوْرَتَهُ، أَوْ كِسْرَةٍ سَدَّ بِهَا جَوْعَتَهُ، أَوْ حَجَرٍ يَتَدَخَّلُ فِيْهِ مِنَ الحَرِّ وَالقَرِّ". (رواه أحمد، والبيهقي في شعب الإيمان مرسلا، مشكوٰة المصابيح / باب الضيافة : ص۳۶۹)

معلوم ہوا کہ ضرورت کے بقدر روٹی، کپڑا اور مکان وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلّق قیامت میں سوال نہیں ہوگا، ان کے علاوہ تمام ظاہری و باطنی، دینی و دُنیوی، محسوس اور غیر محسوس نعمتوں کے متعلّق سوال ہوگا۔ اس کے علاوہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ہونے والی کمی وکوتاہی کے متعلّق بھی حساب وسوال کیا جائے گا۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کے متعلّق حساب وسوال ہوگا۔

"إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلٰوتُهُ... الخ". (رواه الترمذي، مشكوٰة / باب التطوع : ص۱۱۷)

اور حقوق العباد میں سب سے پہلے قتل ناحق کا حساب ہوگا۔

"وَأَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ القِيَامَةِ الدِّمَاءُ". (رواه البخاري،

مشکوٰۃ المصابیح / کتاب القصاص : ص۲۹۹

حقوق العباد کے سلسلے میں مقتول کو قاتل سے، مظلوم کو ظالم سے، مغصوب کو غاصب سے، مجبور کو جابر سے اور محکوم کو حاکم سے اس کا حق دِلوایا جائے گا، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، حدیث میں وارد ہے کہ کسی نے پیلو کی ٹہنی کے برابر بھی کسی کا حق غصب کیا ہوگا (یا کسی کی بے عزّتی کی ہوگی) تو اس کا بدلہ حق تعالیٰ دِلوائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا:

"قَالَ: وَإِنْ كَانَ قَضِيْبًا مِنْ أَرَاكٍ". (رواه مسلم)

اگر کسی نے جانور پر بھی ظلم کیا ہوگا تو اس کا بدلہ بھی دِلوایا جائے گا، حتیٰ کہ اگر کسی ایک جانور نے دوسرے جانور پر ظلم کیا ہوگا تو ان کو بھی ایک دوسرے کے حقوق دِلوانے کے لیے زندہ کیا جائے گا اور مظلوم جانور کو ظالم جانور سے بدلہ دِلوا کر مٹّی بنا دیا جائے گا۔ حدیث میں ہے:

"يَقْتَصُّ الْخَلْقُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ، حَتّٰى الجَمَّاءُ مِنَ القَرْنَاءِ، وَحَتّٰى الذَّرَّةُ مِنَ الذَّرَّةِ". (رواه أحمد / مسند أبي هريرة)

مخلوق کا ایک دوسرے سے قصاص (وحساب) لیا جائے گا، حتیٰ کہ بغیر سینگ کی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لے گی اور چیونٹی سے چیونٹی بدلہ لے گی۔

پھر وہاں چوں کہ مال کے بجائے نیک اعمال کا چلن ہوگا اس لیے حقوق کی ادائیگی نیکیوں سے کی جائے گی، غاصب وظالم نے مغصوب ومظلوم پر جس قدر ظلم کیا ہوگا اس کے برابر اس کی نیکیاں لے کر مغصوب ومظلوم کو دی جائیں گی، اور اگر غاصب وظالم کے نامۂ اعمال میں نیکیاں نہیں ہوں گی تو مظلوم کے گناہ ظالم کے سر ڈال دیے جائیں گے۔ حدیث پاک میں ہے:

"إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ، فَحُمِلَ عَلَيْهِ". (رواه البخاري، مشكوٰة المصابيح / باب الظلم : ص۴۳۵)

عوام میں یہ جو مشہور ہے کہ ایک روپیے (ایک دانق درہم کا چھٹا حصّہ) کے بدلے میں سات سو مقبول نمازیں دینی پڑیں گی صحیح احادیث میں موجود نہیں۔ واللہ اعلم۔

مؤمنین وکافرین کے حساب وکتاب اور سوال وجواب کا فرق:

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ دُنیوی زندگی کے اچھے بُرے اعمال و اَحوال کے متعلّق قیامت کے دِن بے حساب جنّت وجہنّم میں جانے والوں کے علاوہ ہر ایک سے حساب وکتاب اور سوال و جواب ہوں گے۔ البتہ مؤمنین اور کافرین کے حساب وکتاب اور سوال و جواب کے انداز میں نمایاں فرق ہوگا، اکثر اہل ایمان کا حساب آسان ہوگا، جب کہ بے ایمان کا حساب نہایت مشکل ہوگا۔

قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝﴾
(الانشقاق:۸-۷)

''جس (مؤمن) کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دایا جائے گا اس کا حساب تو بڑی آسانی سے لیا جائے گا۔''

عدالت الٰہی میں ایسے بندوں کی صرف پیشی ہوگی، پوچھ تاچھ نہیں ہوگی۔ اور جن کا حساب سخت ہوگا ان سے مناقشہ ہوگا کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ جس بندے کا محاسبہ اللہ تعالیٰ فرمائیں تو اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

"فَقَالَ: إِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ؛ وَلٰكِنْ مَنْ نُوقِشَ فِي الْحِسَابِ

يَهْلِكُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٤، باب الحساب والقصاص والميزان)

مؤمنین وکافرین کے حساب وکتاب اور سوال وجواب میں آسانی وسختی کی مزید تفصیلات وکیفیات کا تذکرہ مختلف احادیث میں منقول ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کا پس پردہ آسان حساب لیا جائے گا اور اسے گناہ بتائے جائیں گے؛ لیکن ان گناہوں پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اہل ایمان میں سے ایک شخص کو بلایا جائے گا، پھر اس پر دامن رحمت ڈال کر خلق خدا سے پردہ کرلیا جائے گا۔

"إِنَّ اللهَ يُدْنِيْ الْمُؤْمِنَ، فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهُ، وَيَسْتُرُهُ".

پھر حق تعالیٰ اسے پوچھیں گے کہ کیا تو نے فلاں گناہ کیا تھا؟ کیا تجھے اپنا فلاں گناہ یاد ہے؟

"فَيَقُوْلُ: أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟"

وہ بندہ اپنے گناہوں کا اعتراف واِقرار کرے گا۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں حق تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کا اِقرار کرتے ہوئے معافی طلب کرتے ہیں وہ عالم آخرت میں بھی فوراً اعتراف واقرار کرلیں گے، اور جو بندے اپنے گناہوں کا اعتراف واِقرار نہیں کرتے وہ کل قیامت کے دِن بھی نہیں کریں گے۔ (العیاذ باللہ العظیم)۔

حدیث میں ہے کہ بندۂ مؤمن سے تمام گناہوں کا اِقرار کروالیں گے تو بندہ سوچے گا کہ اب تو وہ ضرور ہلاک ہوگا۔

"وَرَأَىٰ فِيْ نَفْسِهِ أَنَّهُ هَلَكَ".

تبھی حق تعالیٰ فرمائیں گے میں نے جس طرح دُنیا میں تیرے گناہوں پر

پردہ ڈال رکھا تھا اسی طرح آج بھی اُن پر پردہ ڈال رہا ہوں۔

"قَالَ: سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ".

پھر اس بندے کے نامۂ اعمال سے گناہوں کو مٹا کر نیکیوں کو باقی رکھ کر اسے اس کا دفتر دے دیا جائے گا۔

"فَيُعْطَىٰ كِتَابَ حَسَنَاتِهِ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح / باب الحساب والقصاص والميزان : ص۴۸۵)

وہ کونسے گناہ ہیں جنھیں بندۂ مؤمن کے ساتھ ہونے والی اس سرگوشی میں مٹا کر معاف کر دیا جائے گا؟ اس سلسلے میں چار اَقوال ہیں:

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ یہ وہ گناہ ہوں گے جن کا مؤمن بندے نے دل میں ارادہ تو کیا ہوگا؛ لیکن گناہ کی ہمت نہ ہوئی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے آیت قرآنیہ:

﴿وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ (البقرۃ:۲۸۴)

''تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔''

کی یہی تفسیر مراد لی ہے، ان کے نزدیک یہ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ صغیرہ گناہ ہوں گے جو اجتناب عن الکبائر کے سبب معاف ہو گئے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (النساء : ۳۱)

''اگر تم کبائر سے اجتناب کرو گے تو صغائر معاف کر دیے جائیں گے اور ہم تمھیں معزز ٹھکانے میں داخل کریں گے۔''

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ (یہ شرک کو چھوڑ کر) وہ کبائر ہوں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اس کا بھی ربّ العالمین نے وعدہ فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸)

(۴) چوتھا قول یہ ہے کہ یہ وہ گناہ ہیں جن سے بندے نے توبہ کرلی تھی۔

ان شاء اللہ عموماً اہل ایمان کا حساب حق تعالیٰ آسان لیں گے۔ اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَسِيرًا. آمین. جب کہ کفّار ومنافقین کا حساب آسان نہیں ہوگا، ان سے ساری مخلوق کے سامنے کفر وشرک کی باز پرس کی جائے گی، جب یہ لوگ کفر وشرک اور اپنی بداعمالیوں کا صاف انکار کردیں گے تو ان پر ملائکہ اور ان کے اعضاء وغیرہ کو ان کے خلاف بطورِ گواہ پیش کیا جائے گا، بالآخر اُنھیں ذلیل ورُسوا کردیا جائے گا۔

حدیث میں ہے:

"وَأَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيُنَادىٰ بِهِمْ عَلٰى رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ: هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ، أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٥)

میزان کے اَحوال وحقائق:

حساب وکتاب سوال وجواب اور ادائے حقوق کے بعد تمام انسانوں کے نامۂ اعمال اپنی آخری شکل میں وَزن کے لیے تیار ہوجائیں گے، تو اِتمامِ حجت کے لیے میزان قائم کیا جائے گا، حالانکہ حق تعالیٰ ہر انسان کے اچھے بُرے اعمال بخوبی جانتے ہیں، وہ اگر اپنے اسی علم کے مطابق فیصلہ فرمادیں تو بھی عین عدل ہے؛ لیکن حق تعالیٰ قیامت میں اِظہارِ فضل وعدل کے لیے میزانِ عدل قائم فرمائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (الأنبياء : ٤٧)

''قیامت کے دِن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے۔''

یہاں ''موازین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو ''میزان'' کی جمع ہے، اس سے بعض مفسرین نے فرمایا کہ قیامت میں وزنِ اعمال کے لیے بہت سی میزان ہوں گی، مثلاً ہر اُمّت کی میزان الگ ہوگی، یا ہر فرد کی میزان علیحدہ ہوگی، یا ہر عمل کی میزان جدا ہوگی۔ مگر جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ میزان تو ایک ہی ہوگی؛ لیکن وہ اِتنی بڑی ہوگی کہ تمام انسانوں کے تمام اعمال تولنے کے لیے وہی ایک کافی ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دِن وزنِ اعمال کے لیے جو میزان قائم کی جائے گی وہ اِتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اس میں ساتوں آسمان اور زمین سما جائیں۔

"يُوْضَعُ الْمِيْزَانُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَلَوْ وُزِنَ فِيْهِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ لَوَسِعَتْ". (أخرجه الحاكم في المستدرك في كتاب الأهوال : ٤ / ٥٩٦)

اس کی عظمت شان کو بیان کرنے کے لیے ''موازین'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اب یہ سوال کہ وزن کی کیا صورت ہوگی؟ تو اس سلسلے میں چار اَقوال ہیں:

(۱) فرشتوں کے لکھے ہوئے صحائف اعمال تولے جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث بطاقہ (رواه الترمذي وابن ماجه، مشكوٰة المصابيح / باب الحساب والقصاص والميزان: ٤٨٦) سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

(۲) خود عمل کرنے والوں کو تولا جائے گا۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی پنڈلیاں اگرچہ پتلی ہیں؛ لیکن اللہ کی قسم! میزانِ عمل میں ان کا وزن اُحُد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا، جب کہ بعض موٹے تازے (یعنی بڑے عہدے اور منصب والے) لوگ میزانِ عمل کے پاس لائے جائیں گے؛ لیکن ان کا وزن اللہ

تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے برابر بھی نہیں ہوگا، پھر آپ ﷺ نے بطورِ ثبوت یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (الكهف : ١٠٥)

یعنی قیامت کے دِن ہم اُن کا کوئی وزن قرار نہیں دیں گے۔

(متفق عليه، مشكوٰة المصابيح / باب الحشر : ٥٤٨٤)

(۳) اعمال کو اجسام کی شکل دے کر اُنھیں تولا جائے گا۔ اچھے اعمال کو اچھی شکل دی جائے گی اور بُرے اعمال کو بُری، ہر انسان اپنے اچھے بُرے اعمال کو مجسم شکل میں دیکھے گا، جس کا اشارہ آیت کریمہ میں ہے:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال : ٨-٧)

اسی طرح معتبر احادیث میں ہے کہ میدانِ محشر میں مؤمن کے اعمالِ صالحہ اس کی سواری بن جائیں گے اور بُرے اعمال بوجھ بنا کر اس کے سر پر لاد دے جائیں گے، وغیرہ۔ جمہور علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۴) عین اَعمال ہی تولے جائیں گے۔ اور یہ قادرِ مطلق ذات کی قدرت سے قطعاً بعید نہیں، آج کے دور میں سائنسی ایجادات کے بعد انسانوں کے لیے اگر ایسی چیزوں کا وزن کرنا ممکن ہو گیا جو نظر نہیں آتیں، مثلاً بخار، گرمی، ہوا وغیرہ، تو انسانوں کے خالق و مالک اور قادرِ مطلق ذات کے لیے عین اعمال کو تولنا کیا مشکل ہے؟

بہر حال قیامت میں وزنِ اعمال حق ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ﴾ (الأعراف : ٨)

خواہ وزنِ اعمال کی شکل جو بھی ہو۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام اَقوال

صحیح ہیں، کبھی اعمال ناموں کو تولا جائے گا تو کبھی انسانوں کو، اور کبھی اعمال کو اجسام دے کر تولا جائے گا تو کبھی عین اعمال کو۔ واللہ اعلم۔

واقعہ یہ ہے کہ میزان اور وزنِ اعمال کی مکمّل اور حتمی کیفیت وحقیقت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

وزنِ اعمال کی یہ ذمّے داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دی جائے گی۔ (قرطبی)

نیز اس سلسلے میں مختلف آیات وروایات کے پیشِ نظر حضرات علماء نے فرمایا ہے کہ وزنِ اعمال دو مرتبہ ہوگا، پہلی مرتبہ ایمان اور کفر کو تولا جائے گا، اِس وزن میں مؤمن کے پلڑے میں ایک طرف ایمان رکھا جائے گا تو دوسرا پلڑا کفر کا خالی ہوگا، اس لیے ایمان والا پلڑا بھاری ہو جائے گا، جب کہ کافر کے ایک پلڑے میں کفر رکھا جائے گا اور دوسرا پلڑا ایمان سے خالی ہوگا، اس لیے کفر والا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝﴾ (الأعراف:۹-۸)

جس بندے کی نیکی کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جس کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ ناکام ہوگا۔ الحمدللہ! مؤمن کامیاب اور کافر ناکام ہوکر جدا ہو جائیں گے، اس طرح یہاں بھی مؤمنین اور کفّار میں فرق ہو جائے گا۔

اس کے بعد دوسری مرتبہ صرف ایمان والوں کے لیے وزنِ اعمال ہوگا، جس میں ایک طرف نیکیاں اور دوسری طرف بُرائیاں رکھی جائیں گی، اگر نیکیاں غالب رہیں گی تو جنّت اور خدانخواستہ اگر بُرائیاں غالب ہوئیں تو دوزخ، اور اگر دونوں برابر

ہوئے تو اعراف، پھر خواہ رحمت الٰہی سے یا شفاعت نبوی سے دخولِ جنّت نصیب ہوگا۔
(مستفاداز: انوارالبیان: ۲/ ۳۰۴، معارف القرآن: ۳/ ۵۲۲)

ان شاء اللہ اکثر اہل ایمان کے لیے نیکیوں کا پلڑا ہی بھاری ہوگا، اگر کسی کے لیے بُرائیوں کا پلڑا وزنی ہوا بھی تو رحمت الٰہی جوش میں آئے گی اور کسی بھی عمل کو بہانہ بنا کر اسے بھاری کر دیا جائے گا۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ میدانِ محشر میں ایک شخص حاضر ہوگا، جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ نیک عمل کو بہت کم پا کر گھبرائے گا (یا نیکیوں کا وزن ہلکا پا کر گھبرائے گا) کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اُڑ کر آئے گی اور اس کے نیک اعمال کے پلڑے میں گر جائے گی (جس سے نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا، وہ تعجب کرے گا تو) اسے بتایا جائے گا کہ یہ تیرے تعلیم دین کا ثمرہ و بدلہ ہے، تو نے دین کے احکام لوگوں کو بتائے اور یہ سلسلہ آگے چلا تو جس نے بھی تیرے بتانے سے عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا بھی حصّہ جوڑا گیا۔ (تفسیر مظہری، عن ابن مبارک، معارف القرآن)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب مؤمن بندے کی نیکیاں کم ہوں گی تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کے پورے کے مثل کاغذ کا ٹکڑا نکالیں گے اور اسے میزانِ عمل کے دائیں پلڑے میں ڈال دیں گے، جس میں اس کی نیکیاں ہوں گی، اسے ڈالتے ہی نیکیوں کا پلڑا وزنی ہوجائے گا، وہ بندہ حیران ہوکر عرض کرے گا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کون ہیں؟ جواب ملے گا:

"أَنَا مُحَمَّدٌ نَبِيُّكَ، وَهٰذِهِ صَلَوَاتُكَ الَّتِيْ كُنْتَ تُصَلِّيْ عَلَيَّ...الخ".

میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرا نبی ہوں، اور یہ تیرے وہ درود شریف ہیں جو تو نے مجھ پر (خلوص سے) پڑھے تھے (جو قبول ہو گئے)۔ اسے علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ (تفسیر کبیر: ۱۳/ ۲۷، از: قرطبی)

اسی طرح طبرانی نے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ جناب محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان (مؤمن) کی میزانِ عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا (جس سے نیکیوں کا وزن بڑھ جائے گا) وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے اور ان کی (جائز) ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

(البدور السافرۃ: ۹۸۰، از: معارف القرآن: ۳/ ۵۲۳)

مؤمنین کے مقابلے میں کفّار ومشرکین کے ڈھیروں بلکہ پہاڑوں کے مانند اعمال ہوں گے تب بھی وہ بے وزن ہوں گے، جیسا کہ اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا:

﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (الکھف : ۱۰۵)

مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال بظاہر بڑے بڑے نظر آئیں گے؛ مگر میزانِ حساب میں ان کا کوئی وزن نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ اعمال کفر وشرک کی وجہ سے بیکار اور بے وزن ہو جائیں گے۔ (معارف القرآن: ۵/ ۶۵۹)

پل صراط کے احوال وحقائق:

میزانِ اعمال کے مراحل سے فارغ ہونے کے بعد سب سے آخری اور مشکل ترین مرحلہ پل صراط سے گزرنے کا ہوگا، یہ ایک خطرناک اور ہولناک پل ہے، جو جہنّم کے اوپر قائم کیا جائے گا، حدیث پاک میں ہے:

"يُضْرَبُ الصِّرَاطُ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ جَهَنَّمَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٠، باب الحوض والشفاعة)

یہ پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔

"إِنَّ الْجِسْرَ أَدَقُّ مِنَ الشَّعْرَةِ، وَأَحَدُّ مِنَ السَّيْفِ". (رواه مسلم، كتاب الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين في الأخرة ربهم)

اوّلین وآخرین میں سے ہر ایک کو پل صراط سے گزرنے کا حکم ہوگا۔ جیسا کہ

قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝﴾ (مریم:۷۱)

''تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا اس (پل صراط) سے گزر نہ ہو، یہ حق تعالیٰ کا طے شدہ فیصلہ ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمّے ہے۔''

البتہ اکثر اہل ایمان کے لیے تو یہ ورود عبوراً ہوگا، جب کہ کفّار و بدبختوں کے لیے دخولاً ہوگا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اس کو قرآنِ کریم میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝﴾ (مریم : ۷۲)

کتاب وسنّت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پل صراط سے گزرنے کا مرحلہ آئے گا تو پورے میدانِ محشر میں ہر طرف مکمّل تاریکی چھا جائے گی، پل صراط کو بآسانی اور صحیح سلامت پار کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوگی، تبھی حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تمام اہل ایمان کو ان کے ایمان واعمال کے بقدر روشنی عطا فرمائیں گے، قرآنِ کریم نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ (الحدید:۱۲)

''جس روز تم دیکھو گے مؤمن مَردوں اور عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہوگا اُن کے سامنے اور ان کے دائیں طرف۔''

حدیث پاک میں ہے کہ کسی کا نور اس قدر تیز ہوگا کہ مدینہ طیبہ سے عدن تک کی مسافت کے برابر پہنچ رہا ہوگا، اور کسی کا نور مدینہ طیبہ سے صنعاء تک اور کسی کا نور اس سے کم، یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا جس کا نور اُس کے قدموں سے آگے نہیں

بڑھے گا۔ (ٹارچ کی طرح ہوگا) (ابن جریر)

اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس کی ذات سے عالم دُنیا میں جس قدر نیکی و بھلائی پھیلی ہوگی عالم آخرت میں پل صراط سے عبور اور مرور کے وقت اس کا نور اتنا ہی دور تک پھیلا ہوگا۔ اس کے برخلاف جس کے ایمان و اعمال میں جس قدر کوتاہی و کمزوری ہوگی اس کا نور بھی اتنا ہی کم اور کمزور ہوگا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں اپنی اُمّت کے مؤمنین صالحین کو اُن کے اُس نور سے پہچانوں گا جو اُن کے آگے اور دائیں بائیں دوڑ رہا ہوگا۔

"أَعْرِفُهُمْ بِنُوْرِهِمْ الَّذِيْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ". (رواه الحاكم، وابن أبي حاتم، وابن مردويه)

حق تعالیٰ دنیا کے اعمالِ صالحہ کو اس وقت نور میں بدل دیں گے۔ احادیث مبارکہ میں بعض اعمال کے متعلّق خصوصیت کے ساتھ یہ تصریح وارد ہوئی ہے کہ حق تعالیٰ ان مخصوص اعمال کو قیامت میں نور بنادیں گے، مثلاً نماز کے متعلّق فرمایا:

"الصَّلٰوةُ نُوْرٌ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٨)

مطلب یہ ہے کہ جس بندے نے دنیا میں نماز کی پابندی کی ہوگی آخرت میں یہی اس کے لیے نور ثابت ہوگی، بالخصوص مغرب، عشاء اور فجر کی نماز جو اندھیرے میں پڑھی جاتی ہے، اس وقت مساجد میں جانے والے مَردوں اور خواتین میں بھی جو اپنے گھروں میں ان کا اہتمام کرتی ہیں انھیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے لیے قیامت میں مکمّل روشنی ہوگی۔

"بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِيْ الظُّلَمِ إِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح / باب المساجد ومواضع الصلوٰة : ٦٩٠)

اسی طرح ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کے بالوں کی سفیدی قیامت میں روشنی کا فائدہ دے گی، چنانچہ حکم ہے کہ

"لَا تَنْتِفُوْا الشَّيْبَ؛ فَإِنَّهٗ نُوْرُ الْمُسْلِمِ". (أبوداود، مشكوٰة:٣٨٢، باب الترجل)

''تم سفید بال مت اُکھاڑو، کیوں کہ وہ مؤمن بندے کا نور ہے۔'' (جو پل صراط سے گزرنے کے وقت کام دے گا)۔

قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک کی روشنی سے دوسرے کو کوئی نفع اور فائدہ بالکل نہیں ہوگا، کفّار، مشرکین ومنافقین اس نور سے محروم رہیں گے، اہل ایمان جنھیں نور ملے گا وہ پل صراط سے گزرتے وقت یہ دُعا کریں گے کہ یا اللہ! ہمارا نور اخیر تک قائم رکھنا، تاکہ ہم بآسانی پل صراط سے پار ہوجائیں۔ قرآنِ پاک میں اس کا تذکرہ موجود ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (التحريم:٨)

''اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کردے اور ہمیں بخش دے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ پل صراط سے عبور اور مرور کا مرحلہ اتنا کٹھن ہوگا کہ قریب ترین اعزاء واقرباء بھی ایک دوسرے کو بھول جائیں گے، حدیث پاک میں ہے کہ تین مواقع ایسے ہیں جہاں کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا: (۱) میزان کے وقت (۲) تقسیم نامۂ اعمال کے وقت (۳) پل صراط کے جہنّم کے اوپر رکھے جانے کے وقت۔

"أَمَّا فِيْ ثَلَاثَةِ مَوَاطِنَ فَلَا يَذْكُرُ أَحَدٌ أَحَدًا، عِنْدَ الْمِيْزَانِ، حَتّٰى يَعْلَمَ أَيَخِفُّ مِيْزَانُهٗ أَوْ يَثْقُلُ؟ وَعِنْدَ الْكِتَابِ حِيْنَ يُقَالُ: ﴿هَاؤُمُ

اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ﴾ حَتّٰى يَعْلَمَ أَيْنَ يَقَعُ كِتَابُهٗ؟ أَفِيْ يَمِيْنِهٖ أَمْ فِيْ شِمَالِهٖ أَمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ؟ وَعِنْدَ الصِّرَاطِ إِذَا وُضِعَ بَيْنَ ظَهْرَيْ جَهَنَّمَ". (ابوداود، مشکوٰۃ:۴۸۶)

پل صراط کے پاس ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی، ہر طرف سناٹا اور خاموشی چھائی ہوئی ہوگی، پیغمبروں کے علاوہ کسی کو کسی سے بات کرنے کی ہمت وجرأت نہیں ہوگی، خود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدّس زبانوں پر بھی پل صراط سے گزرتے وقت یہ دُعا ہوگی کہ یا اللہ! سلامت رکھیے! سب سے پہلے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمّت پل صراط کو عبور کرے گی، بعد میں دیگر انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی اُمتیں عبور کریں گی۔

حدیث میں ہے:

"فَأَكُوْنَ أَوَّلَ مَنْ يَجُوْزُ مِنَ الرُّسُلِ بِأُمَّتِهٖ، وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ إِلَّا الرُّسُلُ، وَكَلَامُ الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ: اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ، سَلِّمْ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۹۰)

پل صراط سے گزرنے والوں میں اہل ایمان اپنے اپنے عمل کی روشنی کے مطابق تیزی یا سست رفتاری سے گزریں گے، بعض اہل ایمان پلک جھپکنے کی طرح گزریں گے، بعض بجلی کی طرح تیزی کے ساتھ گزریں گے، بعض تیز ہواؤں کی طرح گزریں گے، بعض پرندوں کی طرح جلدی سے گزر جائیں گے، بعض تیز رفتار گھوڑوں اور تیز رفتار سواریوں کی طرح گزریں گے، بعض خیر و عافیت سے صحیح وسالم پار ہو جائیں گے، بعض گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے زخمی ہوکر گزریں گے، تو بعض ایسے بھی ہوں گے کہ پل صراط سے پھسل کر جہنّم میں ڈال دیے جائیں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ جن کا قدم عالم دُنیا میں صراطِ مستقیم سے پھسل گیا ہوگا عالم آخرت میں بھی عموماً ان کا قدم پل صراط سے پھسل جائے گا۔ اور جو بندہ یہاں

صراطِ مستقیم پر بہر حال قائم رہے گا اس کے لیے وہاں پل صراط سے گزرنا آسان ہوگا۔

حدیث پاک میں ہے:

"فَيَمُرُّ الْمُؤْمِنُوْنَ كَطَرْفِ الْعَيْنِ، وَكَالْبَرْقِ، وَكَالرِّيْحِ، وَكَالطَّيْرِ، وَكَأَجَاوِيْدِ الْخَيْلِ وَالرِّكَابِ، فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ، وَمَخْدُوْشٌ مُرْسَلٌ، وَمَكْدُوْسٌ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٠)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پل صراط (سے گزرنے کے بعد اس) کے قریب کھڑے ہوکر اپنی اُمّت کے لیے دُعا فرمائیں گے کہ میرے رب! اُمّت کو بچا لیجئے۔

حدیث پاک میں ہے:

"وَنَبِيُّكُمْ قَائِمٌ عَلَى الصِّرَاطِ يَقُوْلُ: "رَبِّ! سَلِّمْ، سَلِّمْ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٩٥)

پل صراط کے دونوں طرف خودکار کُنڈے (Hooks) لگے ہوں گے، جو بحکم الٰہی بعض کمزور ایمان والوں کو چلنے میں صرف رُکاوٹ ڈالیں گے، بعض کو پل صراط کے اوپر ہی گرائیں گے اور بعض کو کھینچ کر پل صراط سے جہنّم کی گہرائیوں میں پھینک دیں گے، اور جہنّم کی گہرائی ستر سال کی مسافت کے برابر ہے۔

"قَالَ: وَفِيْ حَافَتَيِ الصِّرَاطِ كَلَالِيْبُ مُعَلَّقَةٌ مَأْمُوْرَةٌ، تَأْخُذُ مَنْ أُمِرَتْ بِهٖ، فَمَخْدُوْشٌ نَاجٍ، وَمَكْدُوْسٌ فِيْ النَّارِ، وَالَّذِيْ نَفْسُ أَبِيْ هُرَيْرَةَ بِيَدِهٖ، إِنَّ قَعْرَ جَهَنَّمَ لَسَبْعِيْنَ خَرِيْفًا". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٩٥)

تمام کفّار اور مشرکین پل صراط سے گرا کر ہمیشہ کے لیے جہنّم میں ڈال دیے جائیں گے۔

قنطرہ اور دخولِ جنّت کے احوال وحقائق:

پلِ صراط سلامتی، سست رفتاری یا کسی بھی طرح پار کرنے والے اہل ایمان کو دخولِ جنّت سے پہلے ''قنطرہ'' کے پاس جو پلِ صراط کا آخری حصّہ، یا دوسرا پل یا پھر ایک جگہ کا نام ہے، روک دیا جائے گا، پھر جن کے درمیان غلط فہمیاں، ناراضیاں اور گلے شکوے تھے انھیں دور کر دیا جائے گا، پھر سبھی جنتیوں کو پاک وصاف دِل والے بنا کر جنّت میں داخل کر دیا جائے گا، حق تعالیٰ کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ طہارتِ قلب کے بغیر اپنے مہمانوں کو جنّت میں داخل کریں، اسی کو قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (الأعراف : ٤٣)

''جو کچھ ان کے دِلوں میں (کینہ) تھا ہم اس کو دور کر دیں گے۔'' (اس کے بعد جنّت میں داخل کریں گے)

وہاں جنّتی اپنے ٹھکانے کو دُنیوی مکان اور ٹھکانے سے جلدی پہچان لے گا۔

حدیث پاک میں ہے:

"يُخَلَّصُ الْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النَّارِ، فَيُحْبَسُوْنَ عَلٰى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الجَنَّةِ وَالنَّارِ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ٤٩٣)

دخولِ جنّت کے بعد حضور ﷺ کو اپنی اُمّت کے اُن اہل ایمان کی فکر ہوگی جنھیں اُن کے گناہوں کے سبب جہنّم میں ڈال دیا گیا، تب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور سر بہ سجود ہوں گے، ان کی نجات اور بخشش کی درخواست کریں گے، تو حکم ہوگا:

"مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، فَأَخْرِجُوْهُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٠)

جن کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے اسے بھی جہنّم سے

نکالو۔ چنانچہ انھیں بھی جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اِتنا ہی نہیں؛ بلکہ خود اہل جنّت بھی دخولِ جنّت کے بعد اپنے بہت سے ملنے جلنے والے اہل ایمان کو نہیں پائیں گے تو اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے:

"رَبَّنَا! كَانُوْا يَصُوْمُوْنَ مَعَنَا، وَيُصَلُّوْنَ، وَيَحُجُّوْنَ".

''یا اللہ! (ہمارے وہ مسلمان بھائی بہن جو دنیا میں) ہمارے ساتھ روزہ رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، حج کرتے تھے۔'' (لیکن آج وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنّم میں ڈال دیے گئے، اے اللہ! انھیں بھی جنّت میں داخل فرما دیں۔ ان کی سفارش پر حکم ہوگا کہ)

"أَخْرِجُوْا مَنْ عَرَفْتُمُوْهُ، فَيُحَرَّمُ صُوَرُهُمْ عَلَى النَّارِ، فَيُخْرِجُوْنَ خَلْقًا كَثِيْرًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٠)

جن لوگوں کو تم پہچانتے ہو انھیں دوزخ سے نکال لو، تو ان کی پہچان یہ ہوگی کہ ان کے چہروں کو آگ پر حرام کر دیا ہوگا (اور بعض روایتوں میں ہے کہ اعضائے سبعہ پیشانی، دو ہاتھ، دو زانو اور دو پیر جن کے ذریعے سجدہ کیا جاتا تھا انھیں جہنّم نہیں جلائے گی، جس کی وجہ سے انھیں بآسانی پہچان کر جہنّم سے نکالا جائے گا) ایک بڑی تعداد اہل ایمان کی جنّت میں داخل کر دی جائے گی۔

معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کی صحبت اور تعلق قیامت میں ضرور کام آئے گا۔ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، شہداء اور صلحاء وغیرہم کی شفاعت سے بہت سے اہل ایمان کو جہنّم سے نکال کر جنّت میں داخل کر دیا جائے گا، جو بچ جائیں گے انھیں خود حق تعالیٰ اپنی رحمت سے جہنّم سے نکال کر جنّت میں داخل فرمائیں گے۔

جب تمام اہل ایمان خواہ وہ کامل ہوں یا ناقص جنّت میں داخل ہوجائیں گے تب انھیں اپنے اعزاء و اقرباء سے ملنے کی تمنّا ہوگی، حق تعالیٰ یہ تمنّا بھی پوری فرما دیں گے، اور کم درجے والی اولاد کو اعلیٰ درجے والے والدین کے ساتھ تو کم درجے والے والدین کو اعلیٰ درجے والی اولاد کے ساتھ کردیں گے اور تمام اہل ایمان کے اہل و عیال کو جنّت میں ہمیشہ کے لیے ساتھ کردیا جائے گا۔

قرآنِ کریم میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (الطور:۲۱)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ تو ہم ملادیں گے ان کے ساتھ ان کی اس اولاد کو۔''

اخیر میں جب تمام اہل ایمان جنّتی جنّت میں اور تمام بے ایمان جہنّم میں داخل کردیے جائیں گے تو سب کو جمع ہونے کے لیے آواز دی جائے گی، اس پر اہل جنّت جنّت کے کنارے اور اہل جہنّم جہنّم کے کنارے آجائیں گے، اس کے بعد جنّت و جہنّم کے درمیان والی جگہ اعراف میں موت کو ایک سفید مینڈھے کی شکل میں لاکر ذبح کردیا جائے گا اور یہ اعلان کردیا جائے گا کہ

"يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! لَا مَوْتَ، وَيَا أَهْلَ النَّارِ! لَا مَوْتَ".

''جنتیو! اب جنّت میں تمھارے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے، کبھی موت نہیں، اور جہنمیو! تمھارے لیے بھی جہنّم میں اب ہمیشہ کے لیے زندگی ہے، موت نہیں۔''

"فَيَزْدَادُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَرَحًا إِلٰى فَرَحِهِمْ، وَيَزْدَادُ أَهْلُ النَّارِ حُزْنًا إِلٰى حُزْنِهِمْ" (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٣)

''جنتیوں کی خوشی میں اضافہ ہوجائے گا اور جہنمیوں کے غم میں۔''

آخرت کی اس دائمی زندگی میں دوزخ سے حفاظت اور دخولِ جنّت کے لیے دُنیا کی اس عارضی زندگی میں ایمان اور ایمانی زندگی ضروری ہے، حق تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ہماری اب تک کی زندگی میں ہونے والی کمیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما کر آئندہ زندگی کو سراپا بندگی بنادیں اور ایمان پر ہمیں خاتمہ نصیب فرما کر قیامت و آخرت کے تمام مراحل سے بآسانی گزار کر جنّت الفردوس میں اپنے نیک بندوں اور اہل وعیال کے ساتھ ملادیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران : ۱۹۳-۱۹۴) آمین بحرمة سيّد المرسلين صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۲۰ر ذوالقعدہ ر ۱۴۴۲ھ

مطابق: ۲ر جولائی ر ۲۰۲۱ء

بروز جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

(۲۳)

اُمّتِ مسلمہ کے وہ خوش نصیب جو بلاحساب جنّت میں جائیں گے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "وَعَدَنِيْ رَبِّيْ أَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِيْ سَبْعِيْنَ أَلْفًا لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ وَلَا عَذَابَ، مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعُوْنَ أَلْفًا وَثَلَاثُ حَثَيَاتٍ مِنْ حَثَيَاتِ رَبِّيْ". (رواه أحمد والترمذي وابن ماجه، مشكوٰة: ٤٨٩، باب الحساب والقصاص والميزان)

ترجمہ: حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ میرے رب نے مجھ سے (از راہِ کرم) یہ وعدہ فرمایا کہ وہ میری اُمّت کے ستر ہزار لوگوں کو بلاحساب وعذاب جنّت میں داخل کرے گا، ان میں ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار لوگ ہوں گے، ان کے علاوہ میرے رب کے لپوں میں سے تین لپ۔ كَمَا يَلِيْقُ بِشَأْنِهٖ تَعَالٰى۔ بھر کر (یعنی بہت ہی کثرت سے) لوگوں کو جنّت میں داخل کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اُمّت:

اللہ ربّ العالمین نے جس طرح رحمۃ للعالمین ﷺ کو تمام انبیاء ورُسل میں سے چن لیا اسی طرح آپ ﷺ کی اُمّت کے مسلمانوں کو بھی تمام اُمتوں میں سے چن لیا، آپ ﷺ تمام انبیائے کرام علیہم السلام میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں، تو آپ ﷺ کی اُمّت تمام اُمتوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے، آپ ﷺ مجتبیٰ ومصطفی ہیں، تو آپ ﷺ کی اُمّت بھی مجتبیٰ ومصطفی ہے، اگرچہ لفظ "اِجْتَبَیْنَا" اور "اِصْطَفَیْنَا" (جن سے مجتبیٰ ومصطفی بنا ہے) دونوں قریب المفہوم الفاظ ہیں؛ لیکن لغوی اعتبار سے ان دونوں میں ایک لطیف اور باریک فرق بھی ہے، وہ یہ کہ "اجتباء" کہتے ہیں کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کرنے کو، جب کہ "اصطفاء" کہتے ہیں اپنے ذوق وچاہت کے مطابق منتخب کرنے کو۔

مجتبیٰ ومصطفیٰ کا فرق آپ اس طرح سمجھیں جیسے کسی نے آم کا بکس آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ پورے باغ سے یہ آم خاص آپ کے لیے چنے ہیں، تو یہ آم کا بکس مجتبیٰ ہوا اور اس میں سے کچھ آم آپ نے اپنی چاہت اور ذوق کے مطابق پسند کر لیے تو یہ مصطفیٰ ہوئے، حق تعالیٰ نے اُمّت محمدیہ کو ساری اُمم میں سے چنا اس لیے اُمّت محمدیہ کے مسلمان مجتبیٰ ہیں۔ اور چوں کہ محبوب نبی کے اُمتی ہونے کے ساتھ کلام اللہ کے وارث بھی ہیں اس لیے مصطفیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی خاص پسندیدہ اُمّت ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ﴾ (الفاطر : ۳۲)

"پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب (عظیم قرآنِ کریم) کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اُمّت محمدیہ کے مسلمان ہیں۔ (ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ)

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ الحمدللہ ہم لوگ بائی چانس (By Chance) اتفاقی طور پر نہیں؛ بلکہ بائی چوئیس (By Choice) اللہ تعالیٰ کی جانب سے منتخب مسلمان ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بغیر الیکشن کے ہمارا سلیکشن فرمایا، عملی طور پر اُمّت محمدیہ کے مسلمان سب برابر تو نہیں، جیسے ٹرین کے سارے کوچ (ڈبے) برابر نہیں ہوتے، کوئی اے۔سی۔کوچ ہے تو کوئی سلیپر کوچ اور کوئی جنرل کوچ ہے؛ لیکن ٹرین تو ایک ہی ہے، اسی طرح اگرچہ عملی طور پر اُمّت محمدیہ کے مسلمان برابر تو نہیں؛ لیکن مجموعی طور پر ساری اُمّت اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی تین قسمیں:

عملی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اُمّت کی تین قسمیں ہیں: (۱) ظالم (۲) مقتصد (۳) سابق۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الفاطر : ۳۲)

''اُمّتِ مسلمہ میں سے بعض تو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض متوسط اور درمیانی راہ چلنے والے ہیں اور بعض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقّی کرنے والے ہیں۔''

آیت میں ظالم کو سب سے پہلے اس لیے بھی بیان کیا گیا کہ ظالموں کی تعداد ہر جگہ ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے، مقتصد ان سے کم ہیں اور سابق سب سے کم ہیں۔

گناہ کرے ہر کوئی، نیکی کرے کوئی کوئی　　فیشن کرے ہر کوئی، سنّت پہ چلے کوئی کوئی
اَذان سنے ہر کوئی، نماز پڑھے کوئی کوئی　　اچھّی بات کرے ہر کوئی، عمل کرے کوئی کوئی

اب سوال یہ ہے کہ "ظَالِم، مُقْتَصِدْ" اور "سَابِق" سے مراد کون لوگ ہیں؟ تو ان کی تعیین، تشریح اور تفصیل میں حضرات مفسرین کے تقریباً تینتالیس (۴۳) اَقوال منقول ہیں۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۷/۳۴۶)

جن کی قدرے تفصیل اس طرح ہے:

اُمّتِ مسلمہ کی تینوں قسموں کی تفصیلات:

"ظَالِمٌ لِنَفْسِه" سے مراد اُمّتِ محمدیہ کے وہ مسلمان ہیں جو قرآنِ کریم پر ایمان تو رکھتے ہیں، کبھی کبھی اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں؛ لیکن عملی زندگی میں قرآن اور صاحبِ قرآن کی پیروی میں بڑی کوتاہی کے مرتکب ہیں، قرآنِ پاک میں ان ہی جیسے لوگوں کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ (الشوریٰ:۱۴)

''اور بلا شبہ جن لوگوں کو ان (حضرات اَنبیاء علیہم السلام) کے بعد کتاب دی گئی وہ اُلجھن آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔''

ان لوگوں کا قرآنِ کریم پر ایمان تو ہے؛ لیکن یقین کامل نہیں، اسی لیے تو قرآن اور صاحبِ قرآن کی پیروی میں یہ لوگ کوتاہی کرتے ہیں، یہ ظالم ہیں۔

اور "مُقْتَصِد" سے مراد اُمّتِ محمدیہ کے وہ مسلمان ہیں جو قرآنِ کریم پر ایمان تو رکھتے ہیں، بڑی حد تک قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کرتے ہیں، نیز قرآن اور صاحبِ قرآن کے احکام پر عمل بھی کرتے ہیں؛ لیکن کبھی کبھی بدعملی کا شکار بھی ہوجاتے ہیں، اس طرح ان کی زندگی اچھے اور بُرے اعمال کا مجموعہ بن جاتی ہے، قرآنِ کریم

میں ان ہی جیسے لوگوں کے متعلّق ارشادِ ربّانی ہے:

﴿خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (التوبۃ : ۱۰۲)

''اُنھوں نے اچھے بُرے اعمال کو گڈمڈ کر دیا۔'' یہ لوگ مقتصد ہیں۔

اور "سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ" اُمّت محمدیہ کے وہ مسلمان ہیں جو قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے کے ساتھ اس کی تلاوت اور اس کے احکام پر عمل کا حتی الامکان اہتمام کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرآنی علوم کے حصول کی فکر و کوشش میں لگے رہتے ہیں، یہ خواصِ اُمّت ہیں جو نیکیوں اور بھلائیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اِن ہی جیسے مؤمنین صالحین کے متعلّق ارشاد فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُونَ﴾ (المؤمنون:٦١)

عملی زندگی میں ان کی بھاگ دوڑ نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے ہوا کرتی ہے، وہ اِس میدان میں ہمیشہ آگے بڑھنے کی فکر و کوشش میں لگے رہتے ہیں، یقیناً یہ لوگ ''سابق بالخیرات'' کے مصداق ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ میں ظالم، مقتصد اور سابق کون ہیں؟

ایک قول یہ بھی ہے کہ ''ظالم'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اذان و اقامت کے بعد جس وقت جماعت کھڑی ہو جاتی ہے تب مسجد میں آتے ہیں۔ اور ''مقتصد'' وہ لوگ ہیں جو اذان کے بعد اقامت سے پہلے مسجد میں آجاتے ہیں۔ جب کہ ''سابق بالخیرات'' وہ ہیں جو اذان سے پہلے مسجد میں آجاتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''ظالم'' وہ ہے جو خود تو انصاف چاہتا ہے؛ لیکن اپنے نفس کے ساتھ، اپنے رب کے ساتھ اور سب کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اور ''مقتصد'' وہ ہے جو انصاف چاہتا ہے اور کرتا بھی ہے۔ جب کہ ''سابق'' وہ ہے جو خود تو

دوسروں کے ساتھ انصاف کرتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا۔

نیز یہ بھی منقول ہے کہ ''ظالم'' وہ ہے جو دُنیوی آزمائش ومصائب میں صبر وتحمل سے کام لینے کے بجائے جزع وفزع اور شکوے شکایت کرتا ہے۔ اور ''مقتصد'' وہ ہے جو جزع وفزع کے بجائے صبر وضبط سے کام لیتا ہے۔ جب کہ ''سابق'' وہ ہے جو آزمائش ومصائب میں صبر وتحمل سے کام لینے کے علاوہ راضی برضائے مولیٰ رہتا ہے، اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ سراپا خیر ہے۔

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾﴾ (آل عمران : ٢٦)

اس لیے وہ بندہ ہر حال میں نظر اللہ تعالیٰ ہی پر رکھتا ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اچھّا گمان رکھتا ہے۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے تو فرمایا تھا:

دوست کی جانب سے جو پہنچے جفا　　وہ جفا ہرگز نہیں، وہ ہے اُن کا کرم

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے دنیا میں پہنچنے والی بلاؤں اور مصیبتوں کے ذریعے اپنے پیاروں کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے، یا پھر جنّت کے درجات ان کے لیے بلند فرماتا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ (مشکوٰۃ:۱۳۶-۱۳۷)

اِمام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی نقل فرمایا کہ ''ظالم'' سے مراد اصحابِ مشئمہ (بائیں سمت والے) ہیں، ''مقتصد'' سے مراد اصحابِ میمنہ (دائیں سمت والے) ہیں اور ''سابق'' سے مراد اہل ایمان میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کا اجمالی تذکرہ سورۂ واقعہ میں کیا ہے کہ کل قیامت کے دِن ساری انسانیت تین جماعتوں میں تقسیم ہوگی، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝﴾ (الواقعة)

(مستفاد از: تفسیر قرطبی)

یہاں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے روز تمام لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک قوم عرش کی دائیں جانب ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب سے پیدا ہوئے، ان کے اَعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے اور ان کو عرش کی دائیں جانب میں جمع کر دیا جائے گا، یہ سب لوگ جنّتی ہیں۔

دوسری قوم عرش کی بائیں جانب جمع ہوگی، جو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب سے پیدا ہوئی اور جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں دیے گئے ہوں گے، ان سب کو بائیں جانب جمع کر دیا جائے گا، یہ سب لوگ جہنّمی ہیں۔ (نعوذ باللہ)

اور تیسری قسم سابقین کی ہوگی، جو ربّ العالمین کے سامنے خصوصی امتیاز اور قرب کے مقام میں ہوں گے، جن میں حضرات انبیائے کرام و رُسُلِ عظام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین ہوں گے، ان کی تعداد بہ نسبت اصحاب الیمین کے کم ہوگی۔

(معارف القرآن)

اِمام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ظالم'' سے مراد وہ بندہ ہے جس کا ظاہر اچھا ہو اور باطن خراب ہو، خوب صورت تو ہو؛ لیکن بدسیرت ہو۔ ''مقتصد'' سے مراد وہ بندہ ہے جس کا ظاہر و باطن قریب قریب برابر ہو۔ اور ''سابق'' وہ بندہ ہے جس کا باطن اس کے ظاہر سے بھی اچھا ہو۔

نیز یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ''ظالم'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود ساری زندگی کبائر کے مرتکب رہے اور توبہ کیے بغیر مر گئے۔ اور ''مقتصد'' سے

مراد وہ لوگ ہیں جو مرتکب کبائر تو ہوئے؛ لیکن موت سے پہلے توبہ کر چکے تھے۔ جب کہ ''سابق'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے زندگی میں صرف صغائر ہی سرزد ہوتے تھے، اگر کبھی کوئی کبیرہ گناہ ہو بھی جاتا تو وہ فوراً توبہ کا اہتمام کرتے تھے۔ (تفسیر ماجدی)

اُمّتِ مسلمہ کے لیے جنّت کی بشارت:

الغرض اُمّتِ محمدیہ کے مسلمانوں کی عملی اعتبار سے تین قسمیں تو ہیں؛ لیکن مجموعی طور پر ساری اُمّت اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہے، اسی لیے حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّتِ مسلمہ کی تینوں قسموں کے لیے یہ بشارت دی کہ سبھی کو اپنے اپنے وقت پر جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ﴾ قَالَ: "كُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ". (البيهقي، مشكوٰة: ص۴۰۸ / باب سعة رحمة الله)

ظاہر ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی ان تینوں قسموں کے لیے جنّت کی بشارت ربِ کریم کا فضل کبیر ہی ہے۔

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ (الفاطر: ۳۲)

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر مسلمان کا اکرام ضروری ہے، خواہ وہ مرتکب کبائر ہی کیوں نہ ہو، ان کے گناہوں پر نظر کرنے کے بجائے اُن کے ساتھ ربِ کریم کے فضل کبیر کو بھی دیکھیں جس نے اُنھیں منتخب اور پسندیدہ بنایا ہے، جس کی وجہ سے حق تعالیٰ قیامت کے دِن اُمّتِ مسلمہ کے ہر ہر فرد کو یا تو بلا عذاب یا بعد عذاب اپنی رحمت سے یا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے جنّت میں داخل فرمائیں گے۔

اُمّت مسلمہ کے جنتیوں کی تین قسمیں:

البتہ اُمّت مسلمہ کی ان تینوں قسموں میں جو ''ظالم لنفسہ'' ہیں روزِ قیامت دربارِ الٰہی میں ان کا حساب بھی ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ان کے گناہوں کے بقدر انھیں عذاب بھی دیا جائے گا؛ لیکن وہ عذاب نہ دائمی ہوگا، نہ شدید ہوگا، بلکہ وقتی اور معمولی ہوگا، جیسا کہ حضراتِ محدثین نے اس حدیث پاک کے تحت فرمایا ہے:

"لَيْسَ عَلَيْهَا عَذَابٌ فِيْ الْأٰخِرَةِ". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ٤٦٠)

مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفّار کو تو دوزخ میں شدید اور دائمی عذاب ہوگا:

﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝﴾ (الأعلیٰ : ١٣)

''نہ مرسکیں گے، نہ جی سکیں گے۔''

دوزخ میں ان کی زندگی موت سے بدتر ہوگی، لیکن گنہگار مسلمانوں کا حال یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ دوزخ میں ان پر ایک طرح کی موت یا بیہوشی طاری فرمادیں گے۔

"فَأَمَاتَهُمُ اللهُ تَعَالىٰ إِمَاتَةً".

تاکہ انھیں عذابِ جہنّم کا احساس نہ ہو، جیسے آپریشن کے وقت مریض کے جسم میں چیر پھاڑ کی جاتی ہے؛ مگر بے ہوشی کے سبب اسے کوئی احساس نہیں ہوتا، تقریباً وہی حال جہنّم میں گنہگار مؤمنین کا ہوگا، پھر حق تعالیٰ عذاب کی میعاد ختم ہونے کے بعد یا اپنی خاص رحمت یا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی برکت سے انھیں جہنّم سے نکال کر جنّت میں داخل فرمادیں گے۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: أَمَّا أَهْلُ النَّارِ الَّذِينَ هُمْ أَهْلُهَا، فَإِنَّهُمْ لَا يَمُوْتُوْنَ فِيْهَا وَلَا يَحْيَوْنَ، وَلٰكِنْ نَاسٌ أَصَابَتْهُمُ النَّارُ

بِذُنُوبِهِمْ، أَوْ قَالَ: بِخَطَايَاهُمْ، فَأَمَاتَهُمْ إِمَاتَةً، حَتّٰى إِذَا كَانُوْا فَحْمًا، أُذِنَ بِالشَّفَاعَةِ، فَجِيْئَ بِهِمْ ضَبَائِرَ ضَبَائِرَ، فَبُثُّوْا عَلٰى أَنْهَارِ الجَنَّةِ، ثُمَّ قِيلَ: يَا أَهْلَ الجَنَّةِ! أَفِيضُوْا عَلَيْهِمْ، فَيَنْبُتُونَ نَبَاتَ الحِبَّةِ تَكُوْنُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ القَوْمِ: كَأَنَّ رَسولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ كَانَ بِالبَادِيَةِ". (رواه مسلم، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار)

حدیث پاک کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان میں جن گنہگاروں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو حق تعالیٰ اُن پر ایک طرح کی موت طاری فرمادیں گے، حتیٰ کہ وہ آگ میں جل کر کوئلہ ہو جائیں گے، پھر انھیں حق تعالیٰ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی شفاعت کی برکت سے گروہ در گروہ دوزخ سے نکال کر جنّت کی نہر میں ڈالیں گے، خود جنّتی بھی اُن پر پانی ڈالیں گے، جس سے وہ اِس طرح جی اُٹھیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے اور کیچڑ سے دانہ اُگ آتا ہے۔

اور جو بندے "مقتصد" ہیں قیامت کے دِن دربارِ الٰہی میں ان کی پیشی تو ہوگی، حساب بھی ہوگا؛ لیکن ان کا حساب آسان ہوگا، انھیں ان کے گناہ پس پردہ صرف دِکھائے اور گنوائے جائیں گے، اقرار بھی کروایا جائے گا؛ لیکن ان گناہوں پر ان کی پکڑ نہیں ہوگی، یعنی محاسبہ تو ہوگا؛ مؤاخذہ نہیں ہوگا، حدیث پاک میں اسی کو "حِسَابًا يَسِيْرًا" کہا گیا ہے۔

"اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَسِيْرًا، وَلَا تُحَاسِبْنَا حِسَابًا عَسِيْرًا". (آمین)

حق تعالیٰ انھیں حساب کے بعد بغیر عذاب کے محض اپنی رحمت یا پیارے نبی کی شفاعت سے جنّت میں داخل فرمادیں گے؛ لیکن جو لوگ سابق بالخیرات ہیں انھیں بروزِ قیامت بلاحساب وعذاب جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔ جس طرح آج دُنیا میں

یہ لوگ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں بالکل اسی طرح کل قیامت کے دِن دخولِ جنّت میں بھی یہ لوگ پیش پیش رہیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر و معارف القرآن: ۷/ ۳۴۷)

اُمّتِ مسلمہ کے لیے ربّ العالمین کا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ:

پھر یہ یقینی حقیقت ہے کہ آج دنیا میں اَسبابِ معاصی چوں کہ بہ کثرت موجود ہیں اس لیے آج تو ہر جگہ ''ظالم لنفسہ'' کی تعداد زیادہ ہے، جب کہ ان کے مقابلے میں ''مقتصد'' بندوں کی تعداد کم اور ''سابق'' کی تعداد سب سے کم ہے، لیکن کل قیامت کے دِن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کبریٰ کے بعد ربّ العالمین کا دریائے رحمت جوش میں آئے گا اور حدیث پاک:

"وَأَخَّرَ اللهُ تِسْعًا وَّتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٠٧)

کے مطابق جب بقیہ ننانوے رحمتوں کا ظہور ہوگا تو اہل ایمان کو معمولی بہانوں سے بخش دیا جائے گا، پھر اُن میں جو سابق بالخیرات ہوں گے انھیں تو بلا حساب و عذاب جنّت میں داخل کر دیا جائے گا، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا کہ "وَعَدَنِيْ رَبِّيْ... الخ".

اس روایت میں تو ستر ہزار کا ذکر ہے، جب کہ دوسری روایت میں چار لاکھ کا بھی تذکرہ موجود ہے:

"أَرْبَعُ مِائَةِ أَلْفٍ بِلَا حِسَابٍ...الخ" (شرح السنة، مشكوٰة : ٤٩٤)

لیکن ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت مسلمہ الحمدللہ آج دُنیا میں بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہے اور کل قیامت کے دِن بھی دیگر اُمم کے مقابلے میں اُمّت

مسلمہ کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، اس لیے ستر ہزار اور چار لاکھ میں تو اُمّت مسلمہ کے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تابعین، تبع تابعین اور صالحین کی تعداد بھی مکمّل نہیں ہوسکتی، تو ماوشما کا کیا ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فکر کو بھی دور فرمادیا: "مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعُوْنَ أَلْفًا". ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار ہوں گے۔

جس کی وجہ سے بلاحساب وعذاب جنّت میں داخل ہونے والی اُمّت مسلمہ کی تعداد بڑھ جائے گی، لیکن اب بھی بڑی تعداد رہ گئی تھی، اس لیے آگے مزید فرمایا کہ ربّ العالمین اس گنتی پر اکتفا نہیں فرمائیں گے؛ بلکہ ان کے علاوہ لوگوں کو ربّ العالمین گنتی کے بغیر اپنی تین لپیں بھر کر اُمّت مسلمہ کو جنّت میں بلاحساب وعذاب داخل فرمائیں گے۔

"وَتِلْكَ حَثَيَاتٌ مِّنْ حَثَيَاتِ رَبِّيْ".

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قسم اللہ تعالیٰ کی ایک ہی لپ میں صرف ساری اُمّت مسلمہ ہی نہیں؛ بلکہ ساری مخلوق سما سکتی ہے۔ چنانچہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ إِنْ شَاءَ أَنْ يُّدْخِلَ خَلْقَهُ الْجَنَّةَ بِكَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ".

اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو ایک ہی لپ سے ساری مخلوق کو جنّت میں داخل کر سکتے ہیں۔ اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولِ فاروقی کی تصدیق فرمائی:

"فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "صَدَقَ عُمَرُ". (شرح السنة، مشكوٰة : ٤٩٤، باب الحوض والشفاعة)

غور کیجیے کہ جب ربّ العالمین کی ایک ہی لپ میں اِتنی وسعت ہے کہ ساری مخلوق کے لیے کافی ہے تو اس کی تین لپوں کی وسعت کس قدر ہوگی؟ اور جب ربّ العالمین رحمۃ للعالمین کی اُمّت مسلمہ کو تین لپ بھر کر بلا حساب وعذابِ جنّت میں داخل فرمائیں گے تو اس سے واضح ہوگیا کہ قیامت کے دِن اُمّت مسلمہ کی بڑی تعداد

(دیگر اُمتوں کے مقابلے میں) بلاحساب وعذاب جنّت میں جائے گی۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ بِمَنِّكَ وَفَضْلِكَ وَكَرَمِكَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ! يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ! وَيَا أَكْرَمَ الْأَكْرَمِيْنَ! (آمین)

بلاحساب جنّت میں جانے والوں کے اَوصاف:

بعض روایتوں میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا حساب وعذاب جنّت میں داخل ہونے والے اُمّت مسلمہ کے اَفراد کے مخصوص اَوصاف بھی بیان فرمائے ہیں، مثلاً ایک حدیث پاک میں ارشاد فرمایا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِيْ سَبْعُوْنَ أَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ".

''میری اُمّت کے ستر ہزار اَفراد بغیر حساب کے جنّت میں جائیں گے۔''

ان کے مخصوص اَوصاف میں یہ بات ہے کہ

"وَهُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ، وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ٤٥٢، باب التوكل والصبر)

''وہ ایسے لوگ ہیں جو خلافِ شرع جھاڑ پھونک نہیں کرتے اور نہ کبھی بدفالی لیتے ہیں؛ بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔''

دیگر روایات میں تہجد کا اہتمام کرنے والوں کے لیے بھی یہ بشارت منقول ہے کہ وہ قیامت کے دِن بلاحساب وعذاب جنّت میں داخل کردیے جائیں گے۔

(بیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ: ۴۸۷، باب الحساب والقصاص والمیزان)

صاحبو! اگر واقعی ہماری یہ چاہت ہے کہ بروزِ قیامت حق تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ہمیں بھی بلا حساب و عذاب جنّت میں داخل فرما دیں تو خلافِ شرع جھاڑ پھونک اور بدفالی سے بچتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر توکّل اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے تہجد پڑھنے کے اہتمام کے ساتھ سابق بالخیرات والے اَوصاف پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرما کر بلاحساب وعذاب جنّت الفردوس میں داخل فرمادیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

یومِ عرفہ/ ۱۴۴۲ھ
مطابق: ۲۰/جولائی/ ۲۰۲۱ء
بروز منگل (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۴)

قرآنِ کریم ناقابلِ ترمیم ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: "مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللهِ، ثُمَّ اتَّبَعَ مَا فِيْهِ، هَدَاهُ اللهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِيْ الدُّنْيَا، وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ". وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ: "مَنِ اقْتَدَىٰ بِكِتَابِ اللهِ لَا يَضِلُّ فِيْ الدُّنْيَا، وَلَا يَشْقَىٰ فِيْ الْاٰخِرَةِ". ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الآيَةَ: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ﴾ (رواه رزين، مشكوٰة المصابيح : ص۳۱، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا، پھر اس (کتاب اللہ میں بیان کردہ احکام ومضامین) کی پیروی کی تو حق تعالیٰ اُسے دُنیا میں ضلالت سے ہٹا کر ہدایت نصیب فرمائے گا اور قیامت میں سخت حساب سے بچائے گا۔ (یعنی اُسے بلا حساب وعذاب ہی جنّت میں داخل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ یہ قرآنِ کریم کا عالم بھی تھا اور اس پر عامل بھی تھا۔ اور اگر عملی کوتاہی کے سبب حساب ہوا بھی تو عذاب نہ ہوگا، صرف محاسبہ ہوگا، مؤاخذہ نہ ہوگا) ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کو اپنا مقتدیٰ بنالیا وہ دُنیا میں گمراہی اور

آخرت میں بدبختی سے محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد رئیس المفسرین سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بطورِ دلیل یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ : ۱۲۳)

''جس نے میری ہدایت کی پیروی کی (مراد قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے) وہ نہ (دُنیا میں) بھٹکے گا، نہ (آخرت میں اجرِ عظیم سے) محروم ہوگا۔''

قرآنِ کریم کیا ہے؟

اللہ ربّ العزت والجلال کے اِرشادات اور پیغامات کے مجموعے وگلدستے کا نام ہے قرآنِ کریم۔ اس کی عظمت شان کے لیے اِتنی بات ہی کافی ہے کہ قرآنِ کریم کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ اَحکام و مضامین تو من جانب اللہ ہیں ہی، اس کے الفاظ بھی من جانب اللہ ہیں، از اوّل تا آخر اس میں جو کچھ بیان ہوا بلا شبہ وہ سب کا سب ربّ العالمین کی جانب سے نازل شدہ کلام ہے، جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (السجدۃ : ۲)

''بلا شبہ یہ کتاب ربّ العالمین کی طرف سے نازل کی ہوئی ہے۔''

ذاتِ باری سے جب کلام نکلا تو اوّلاً ایک خاص مقام پر منتقل اور محفوظ کر دیا گیا، قرآن نے اُسے "أُمِّ الْكِتٰبِ" (الرعد:۳۹) "كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ" (الواقعة:۷۸) "صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ" (عبس: ۱۳) اور "لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" (البروج : ۲۲) جیسے مختلف ناموں سے بیان فرمایا، پھر وہاں سے نقل شدہ حصّہ حسب ضرورت وموقع سیّد الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے سیّد الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب

اطہر پر نازل کیا گیا، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الشعراء : ۱۹۲ إلى : ۱۹۵)

یہاں قرآنِ کریم سے متعلّق سب سے پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ یہ کسی مخلوق کی کتاب یا کسی مصنّف کی تصنیف نہیں کہ ہر نئے ایڈیشن میں ترمیم وتبدیل کی ضرورت پیش آئے؛ بلکہ یہ قرآن ربّ العالمین کا مقدّس ومحفوظ کلام ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرآنِ کریم کو بلا کسی ترمیم وتبدیل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر جبرئیل امین علیہ السلام جیسے محافظ فرشتے نے من جانب اللہ پہنچایا۔

تیسری بات یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی ہے تو قرآنِ کریم کو بھی عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ نیز قرآنِ کریم کو لانے والے عظیم فرشتے کی صفت بھی امین ہے اور جس پر قرآنِ کریم نازل ہوا اُس مقدّس نبی کی صفت بھی امین ہے، جس کی وجہ سے قرآنِ کریم از اوّل تا آخر نہایت امانت داری کے ساتھ نازل ہوا، پھر جس نبی سے دنیا نے درسِ امانت سیکھا اس محمد الامین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآنِ کریم کو بلا کسی ترمیم و تبدیل کے نہایت امانت داری کے ساتھ ہم تک پہنچایا۔

علّامہ جزری رحمہ اللہ نے اُسے یوں فرمایا: ع

لِأَنَّهُ بِهِ الإِلٰهُ أَنْزَلَا وَهٰكَذَا مِنْهُ إِلَيْنَا وَصَلَا

نَشْهَدُ أَنَّكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ، وَأَدَّيْتَ الْأَمَانَةَ، وَنَصَحْتَ الْأُمَّةَ، وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ، فَجَزَاكَ اللهُ عَنَّا وَعَنْ جَمِيْعِ الْأُمَّةِ. آمين يَا رَبَّ العَالَمِيْنَ.

قرآنِ کریم ناقابلِ ترمیم کیوں؟

صاحبو! قرآن اور صاحبِ قرآن کے متعلق یہ صرف ہماری عقیدت ہی نہیں؛ بلکہ واقعی حقیقت بھی ہے کہ نزولِ قرآن سے لے کر آج تک اور قیامت تک قرآنِ کریم میں کسی قسم کی نہ ترمیم ہوئی ہے نہ ہوگی، نہ کسی کو اس کا حق ہے اور نہ ہی اس کی قطعاً ضرورت ہے۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں قرآنِ کریم کے ناقابلِ ترمیم ہونے کی تین بنیادی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم چوں کہ کلامِ ربّ العالمین ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا محافظ ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ (الحجر : ۹)

جس قرآن کے محافظ خود اللہ تعالیٰ ہوں اُس میں ترمیم وتبدیل ممکن ہی نہیں، حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بنیادی انتظام تو یہ فرمایا کہ اُسے لوحِ محفوظ میں منتقل فرما کر ہمیشہ کے لیے محفوظ فرمادیا، جیسا کہ فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۝۲۲﴾ (البروج : ۲۱ - ۲۲)

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سب سے پہلے محافظ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حق تعالیٰ نے بغیر محنت ومشقت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حفظِ قرآن کی نعمت سے مالامال فرمایا۔

ابتدا میں نزولِ قرآنِ کریم کے وقت جب جبرئیل امین علیہ السلام کلامِ الٰہی کی وحی لے کر تشریف لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ جلدی

جلدی پڑھنا اور وحیٔ الٰہی کو دہرانا شروع فرما دیتے، تاکہ کلامِ الٰہی کو اچھّی طرح یاد کر لیں؛ لیکن چوں کہ وحیٔ الٰہی کو ایک ہی وقت میں سننا، سمجھنا اور دہرانا ذرا مشکل تھا تو حق تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗۚ۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗؕ۱۹﴾ (القیامة : ١٦ إلی ١٩)

''پیارے! نزولِ قرآن کے وقت تمھیں اپنی زبان کو حرکت دینے کی بھی ضرورت نہیں، قرآن کو پڑھوا کر آپ کی زبان سے اس کے احکام بیان کروانا بھی ہماری ذمّے داری ہے، رہی بات حفظ قرآن کی، تو اس کی بھی فکر نہ کریں:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓىۙ۶﴾ (الأعلیٰ : ٦)

''ہم آپ کو قرآن اس طرح پڑھائیں گے کہ پھر آپ کبھی نہیں بھولیں گے۔''

اس بشارت کے بعد جب کبھی حضرت جبرئیل علیہ السلام وحیٔ الٰہی لے کر آتے تو آپ ﷺ نہایت اطمینان سے سنتے، پھر نزولِ وحی کے بعد آپ ﷺ کے قلب اطہر میں وحی کا وہ حصّہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو سب سے پہلے صاحبِ قرآن ﷺ کے قلب اطہر میں محفوظ فرمایا، اس کے بعد ایک قدرتی نظام کے تحت دنیا بھر کے صحیفوں اور مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے سینوں میں اُسے محفوظ فرما دیا۔

اسی کا یہ ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ نزولِ قرآنِ کریم سے لے کر اب تک مختلف پروپیگنڈوں اور لا حاصل کوششوں کے باوجود آج تک اس نسخۂ ہدایت میں کوئی ادنیٰ ترمیم وتبدیل ہو سکی ہے نہ ہو سکے گی۔

قرآنِ کریم کے تعلق سے سچّی اور پکّی حقیقت یہ ہے کہ

ہے قولِ محمد قولِ خدا، قرآن نہ بدلا جائے گا
بدلے گا زمانہ لاکھ، مگر قرآن نہ بدلا جائے گا

ایک واقعہ:

اِمام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس سلسلے میں سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ عباسی خلیفہ مامون بن ہارون رشید اپنے دورِ خلافت میں ایک سالانہ علمی مجلس اور سیمینار منعقد کرتے، جس میں علمی بحث ومباحثے اور مذاکرے کے لیے ہر مذہب کے اہل علم کو شرکت کی اِجازت تھی۔

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم حاضر مجلس ہوا اور اپنی فصیح وبلیغ گفتگو سے شرکائے مجلس کو متاثر کر دیا، اختتامِ مجلس پر مامون نے اسے بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، تو مامون نے آزمانے کے لیے اس سے کہا کہ اگر تم مسلمان اور محمدی بن جاؤ تو ہم تمھارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے، اس نے صاف انکار کر دیا اور چلا گیا، بات آئی گئی ہوگئی۔

اگلے سال اس نے پھر حاضر ہو کر فقہ اسلامی پر اپنی بہترین تحقیقات پیش کیں، مجلس کے بعد مامون نے اسے پوچھا کہ آپ وہی ہو نا جو سالِ گذشتہ تشریف لائے تھے؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں؛ لیکن بحمد اللہ اب میں اسرائیلی نہیں، محمدی ہوں، خلیفہ نے تعجب کرتے ہوئے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: قرآنِ کریم کی ایک آیت میری زندگی میں صالح اِنقلاب اور تبدیلی کا سبب بنی، وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ قرآنِ کریم کو ہم ہی نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے اصل محافظ ہیں۔

میں نے اس سچائی کو آزمانے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ میں ایک خوش خط اور

بہترین کاتب بھی ہوں، اپنے اس فن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے اوّلاً تورات کے تین خوب صورت کتابت والے نسخے تیار کیے؛ لیکن ہر ایک میں بڑے سلیقے سے کہیں کہیں تحریف وترمیم کردی، پھر انھیں لے کر میں یہودیوں کے عبادت خانوں میں گیا، جہاں انھوں نے تورات کے نسخوں کو بخوشی خرید لیا، کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، پھر میں نے اُسی ترتیب سے اِنجیل کے بھی تین نسخے لکھے اور انھیں عیسائیوں کی عبادت گاہ میں لے گیا، تو انھوں نے بھی بڑی رغبت ومحبّت سے انھیں خرید لیا، کسی نے کسی بھی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اس کے بعد یہی معاملہ میں نے قرآنِ کریم کے ساتھ بھی کیا کہ تین خوب صورت نسخے قدرے تحریف وترمیم کے ساتھ تیار کیے، کہیں اوپر کا نقطہ نیچے تو کہیں نیچے کا نقطہ اوپر لکھ دیا اور حسبِ معمول انھیں لے کر مسلمانوں کے پاس گیا، انھوں نے پڑھتے ہی ان کی تحریف وتبدیل کو پکڑ لیا، ساتھ ہی مجھے بھی پکڑ لیا، قریب تھا کہ میں اُن کے غصّے اور عتاب کا شکار ہوجاتا، میں نے حقیقت حال بیان کردی، تب مجھے اُن سے نجات ملی اور اسی کے ساتھ الحمدللہ میں کفر وشرک سے بھی نجات پا گیا، مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی کلامِ الٰہی میں ترمیم وتبدیل ناممکن ہے؛ کیوں کہ اس کا اصل محافظ خود ربّ العالمین ہے، اور جس کلام کی حفاظت خود ربّ العالمین فرمائے اس میں تبدیل کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سچائی کا عملی تجربہ کرنے کے بعد الحمدللہ آج میں مسلمان ہوں۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۵/ ۲۸۲)

دوسری وجہ:

قرآنِ کریم کے ناقابل ترمیم ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم چوں کہ کلامِ الٰہی ہے، اور کلامِ الٰہی کے متعلّق ضابطۂ الٰہی یہ ہے:

﴿وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ (الأنعام : ٣٤)

''اللہ تعالیٰ کے کلمات (کلام) کو کوئی بدل نہیں سکتا۔''

یہ آسمانی اور قرآنی چیلنج ہے، آج تک اس قرآنی چیلنج کو نہ کوئی قبول کر سکا اور نہ کر سکے گا، نہ کسی میں اس کی صلاحیت ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا حق و اختیار ہے، کوئی امتی تو درکنار، خود نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حق اور اختیار نہیں دیا گیا، چنانچہ جس طرح آج بعض شر پسند معاندین اپنی غلط فہمی، ضد یا گمراہی کے سبب قرآنِ کریم میں تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں بالکل اسی طرح نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں بھی بعض شر پسند معاندین اور کفّار و مشرکین نے بھی صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا تھا:

﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ (یونس : ١٥)

''آپ اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لائیں۔ (جس میں ہمارے معبودانِ باطلہ کا بے حقیقت و بے حیثیت ہونا بیان نہ کیا گیا ہو، نیز اس میں ہمارے لیے جاہلانہ و مشرکانہ رسوم و خرافات کی گنجائش دی گئی ہو) یا پھر آپ اِس قرآن میں (ہماری مرضی کے مطابق کچھ آیات مثلاً جن میں کفّار و ظالمین کے لیے جہاد و عذاب کا ذکر ہے انھیں نکال دیجیے، اس طرح آپ) ترمیم و تبدیل کر دیجیے۔'' تب ہم اس کو قبول کریں گے۔ جہالت و ضلالت کے بیماروں کو ان بیہودہ مطالبات پر دوٹوک جواب دیا گیا:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآيِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝١٥﴾ (یونس:١٥)

''محبوبا! کہہ دیجیے کہ میرے لیے گنجائش ہی نہیں کہ میں اپنی جانب سے قرآنِ کریم میں ذرّہ برابر بھی تبدیلی کر سکوں، کیوں کہ یہ میرا نہیں؛ ربّ العالمین کا کلام ہے،

رہی بات میری تو واقعہ یہ ہے کہ میں تو وحی الٰہی کا پابند ہوں، کلامِ الٰہی کو بعینہٖ تم تک پہنچانا میری ذمّے داری ہے، اس میں کسی بھی قسم کی ترمیم وتبدیل کا مجھے قطعاً اختیار نہیں۔ میں اگر اپنے رَب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی بڑے دِن کے عذاب کا خوف ہے۔''

تیسری وجہ:

اسی کے ساتھ قرآنِ کریم کے ناقابل ترمیم ہونے کی تیسری بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں تبدیل کی ضرورت نہ پہلے جاہلیت قدیمہ میں تھی اور نہ آج جاہلیت جدیدہ میں ہے، اور نہ کبھی ہوگی، کیوں کہ قرآنِ کریم کے متعلّق ہمارا یہ کھلا چیلنج پہلے بھی تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا کہ قرآنِ کریم کے تمام فرامین از اوّل تا آخر دُنیائے انسانیت کے لیے سراپا رحمت و ہدایت ہیں، بشرطیکہ قرآن کے احکام و ہدایات کو عصبیت کی عینک اتار کر صحیح پڑھا اور سمجھا جائے، پھر ان احکام پر عمل کیا جائے، ایسے ہی لوگوں کے لیے کتاب وسنّت میں یہ بشارت دی گئی:

﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ : ۱۲۳)

اور حدیث مذکور میں فرمایا:

"مَنِ اقْتَدَى بِكِتَابِ اللهِ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا، وَلَا يَشْقَى فِي الْأٰخِرَةِ". (رواہ رزین، مشکوٰۃ : ۳۱)

صاحبو! یہ یقینی حقیقت ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن کا واقعی اقتدا کرنے والوں کو ربّ العالمین مقتدیٰ بنا دیتے ہیں، قرآن اور صاحب قرآن کی واقعی اور حقیقی تابعداری سے زندگی میں بہترین تبدیلی آتی ہے، ضرورت زندگی میں تبدیلی لانے کی ہے، قرآنِ کریم میں نہیں، کیوں کہ اس کی ہدایات تو آج بھی سورج کی طرح نہایت ہی روشن اور واضح ہیں، کلامِ الٰہی کی کوئی ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی بے قصور

انسان کے لیے بلاوجہ عدل کے خلاف کوئی حکم دیا گیا ہو۔

قرآنِ کریم میں مجرمین کے لیے یا تو فضل کا حکم ہے یا عدل کا:

جہاں تک تعلق ہے انسان اور انسانیت کے دُشمنوں، باغیوں، مجرموں اور ظالموں کا، تو قرآنِ کریم میں ان کے متعلّق بھی یا تو فضل کا حکم دیا گیا ہے یا عدل کا، ظلم کا حکم تو قرآنِ کریم میں مجرمین کے لیے بھی نہیں ہے، پھر معصومین اور غیر مجرمین کے لیے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب ہم قرآنِ کریم کا سچائی اور پوری اَمانت داری کے سے مطالعہ کریں گے تو مجرمین کے تعلق سے قرآنِ کریم میں پہلا بنیادی حکم یہی پائیں گے کہ انھیں معاف کر دیا جائے:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾﴾ (المائدۃ : ۱۳)

''ان کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کیا جائے، یہی بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔'' صاحب قرآن ﷺ نے مجرمین پر غلبہ پانے کے بعد فتح مکہ کے موقع پر بلکہ ساری زندگی اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

لیکن اگر اس معافی والے رویے کی وجہ سے اُن مجرمین کے جرائم مزید بڑھ جانے کا واقعی خطرہ و اندیشہ ہو اور مجرمین سے ان کی پچھلی زندگی کی طرح آئندہ بھی کسی خوبی یا بھلائی کی کوئی اُمید نہ ہو تو ایسے اِنسانیت کے دُشمنوں، باغیوں، مجرموں اور ظالموں کو ان کے جرائم کی سزا دینا سماج کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں قرآنِ کریم نے دوسرا بنیادی حکم ان کے لیے یہ دیا کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے، انھیں ان کے جُرم کے بقدر سزا دی جائے، جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۖ﴾ (الشوریٰ : ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ ایسے مجرمین کو بھی ان کے جرم سے زیادہ سزا دینے کی

اِجازت نہیں، اس لیے کہ یہ ظلم ہے، اب اگر وہ مجرم کسی انسان یا انسانیت کا قاتل ہے تو قصاصاً اسے بھی قتل کرنا عین عدل ہے، اِس کارروائی کو ظلم کہنا ظلم ہے، قرآنِ کریم نے تو اس عدل کو انسانی معاشرہ اور سوسائٹی کے لیے زندگی قرار دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۹]

کیوں کہ ایسے بے باک مجرموں اور قاتلوں کو قتل کرنے سے معاشرے کے بے شمار امن پسند لوگ قتل و غارت گری سے محفوظ ہو جائیں گے، رحم قاتل پر نہیں؛ بلکہ امن پسند عوام پر کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم کی جن آیات میں حق تعالیٰ نے جہاد و قتال یا عدم رواداری اور آخرت میں عذابِ دائمی کا ذکر کیا ہے وہ اسی پس منظر میں ہے، نیز وہ احکام ہنگامی و جنگی حالات کے ہیں، عام حالات میں عام لوگوں سے متعلّق نہیں ہیں، لہٰذا جہاں یہ فرمایا گیا کہ انھیں جہاں کہیں پاؤ تو پکڑو اور قتل کردو۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ (النساء : ۸۹)

اس قسم کے احکام صلح پسند غیر مسلموں کے لیے قطعاً نہیں ہیں؛ بلکہ یہ ان فساد پسند اور شر انگیز مشرکین و منافقین کے لیے ہیں جنھیں بار بار آگاہ کرنے کے باوجود وہ اپنے جرائم سے باز آنے کو تیار نہیں، پھر ایسے انسان اور انسانیت دُشمن مجرموں کے لیے اسلامی حکومت میں یہی حکم ہے کہ ان سے جہاد و قتال کیا جائے، اُن سے رواداری اور دِلی دوستی نہ رکھی جائے، مرنے کے بعد یہی لوگ آخرت کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حق تعالیٰ ہمیں قرآنِ کریم کا صحیح فہم عطا فرما کر اس سے کامل وابستگی نصیب فرمائیں اور قرآنِ کریم کی خیر و برکات سے دارین میں مالا مال فرمائیں۔ آمین۔

۲۶ رذی الحجہ ر ۱۴۴۲ھ
مطابق: ۶ ر اگست ر ۲۰۲۱ء
بروز: جمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

نورِ فطرت، نورِ حق، نورِ خدا قرآن ہے
ہر دو عالم کے لیے وجہِ بقا قرآن ہے
جنّتِ روح ونظر ہے، رونقِ محراب و در
زاہدوں کی زندگی کا آسرا قرآن ہے
چھوٹنے پائے نہ ہرگز دامن اس کا ہاتھ سے
خلد میں جانے کا سیدھا راستہ قرآن ہے
رات کا پچھلا پہر ہے اور ہے راز و نیاز
عابد و معبود کا ایک رابطہ قرآن ہے
صادق و مصدوق نے اِرشاد فرمایا ہے یوں
تم میں بہتر وہ ہے جس کا مشغلہ قرآن ہے
اُس کے ہر اِک حرف پر دس نیکیوں کا اَجر ہے
عرش کے مالک کا فضل بے بہا قرآن ہے
جب ذرا گردن جھکائی ان کی سیرت دیکھ لی
سبز گنبد کے مکیں کا آئینہ قرآن ہے
چھانتے ہو کیوں مریضو! در بہ در کی خاک تم؟
دردِ دِل کے واسطے کامل شفا قرآن ہے
"رَتِّلِ الْقُرآنَ تَرتِیلاً" سے ظاہر ہو گیا
سب کتابوں میں حسیں تر خوش نما قرآن ہے
عرش بھی اس کا ہے شمسیؔ فرش بھی اس کے لیے
جس کے قائد مصطفےٰ ہیں، رہنما قرآن ہے

(۲۵)
صراطِ مستقیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا سَبِيْلُ اللهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ، وَقَالَ: هٰذِهٖ سُبُلٌ، عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ إِلَيْهِ، وَقَرَأَ: ﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ (رواه أحمد والدارمي والنسائي، مشكوٰة : ۳۰، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں اور ساری اُمّت کو سمجھانے کے لیے) ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، پھر اس خط کے دائیں بائیں کئی (یعنی سات چھوٹے بڑے) خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ وہ مختلف خطوط اور راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان (انسان کو گمراہ کرنے کے لیے) بیٹھا ہے، اور (اُن گمراہ کن) راستوں کی

طرف بلاتا ہے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (الأنعام : ۱۵۳)

''اور یہ کہ یہی (شریعت) میرا سیدھا راستہ ہے، سو تم اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستوں پر نہ چلو، ورنہ وہ (راستے) تمھیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے، یہی وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمھیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

صراطِ مستقیم کی اہمیت:

اللہ ربّ العزت والجلال نے قرآنِ کریم میں کم از کم تیس مقامات پر مختلف انداز وعنوان سے ''صراطِ مستقیم'' کا تذکرہ فرما کر اپنے بندوں کو اس کی ترغیب دی ہے، قرآنِ کریم میں کسی چیز کا تذکرہ تعریف کے انداز میں ایک مرتبہ آجانا بھی اس کی اہمیت کے لیے کافی ہے، پھر اگر کسی چیز کا تذکرہ بار بار کیا جائے تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، ''صراطِ مستقیم'' کی بھی یہی شان ہے۔

نیز اس کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانا شیطان کا بنیادی مشن ہے، چنانچہ اس ملعون کو جس وقت اس کے کبر وکفر کے سبب راندۂ درگاہ کر دیا گیا تھا تب اس نے یہ چیلنج کیا تھا کہ (اے اللہ!) میں تیرے بندوں کو تیرے راستے سے ہٹانے اور بھٹکانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (الأعراف:۱۶)

''اس (ابلیس) نے کہا: پس اس وجہ سے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اُن کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔'' (تاکہ انھیں صراطِ

مستقیم سے گمراہ کرسکوں)۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانا شیطان کا بنیادی مشن ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلانا اور لانا یہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا بنیادی مشن ہے، قرآنِ کریم نے اُسے یوں بیان کیا:

﴿وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝٧٣﴾ (المؤمنون : ٧٣)

''یقیناً آپ انھیں صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے ہیں۔''

صراطِ مستقیم کی حقیقت:

صراطِ مستقیم کے معنیٰ ہیں سیدھا راستہ، جس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ ربّ العزت تک پہنچنے کا راستہ، یعنی اس کی رضا و رحمت اور حصولِ جنّت کا جو سیدھا راستہ کتاب وسنّت اور شریعت نے ہمیں اور قیامت تک کی انسانیت کو بتایا ہے اُسے ''صراطِ مستقیم'' کہتے ہیں، اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَهَٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا﴾ (الأنعام : ١٢٦)

''اور یہی (کتاب وسنّت میں بیان کردہ راستہ ہی) تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے۔'' کتاب وسنّت پر چلنا اور عمل کرنا صراطِ مستقیم پر چلنا ہے، ربِ کریم صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو ہی ملے گا، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝٥٦﴾ (هود : ٥٦)

''بالیقین میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔''

لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کو پانا ہے، اس کی رضا و رحمت اور مقامِ رحمت یعنی جنّت کو پانا ہے تو وہ صراطِ مستقیم ہی پر ہے، صراطِ مستقیم پر چلے بغیر نہ اپنے رب کو پاسکو گے، نہ اس کی رضا و رحمت کو پاسکو گے، نہ جنّت کو حاصل کرسکو گے۔

صراطِ مستقیم سب سے بڑی نعمت:

جب یہی حقیقت ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے اور عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور جنّت ملتی ہے تو اس سے واضح ہوگیا کہ صراطِ مستقیم سب سے بڑی نعمت اور ہماری سب سے اہم ضرورت ہے۔ اور حق تعالیٰ کی سنّت یہ ہے کہ ضرورت کی ہر نعمت کو سب کے لیے عام اور آسان فرمادیتے ہیں، مثلاً: ہوا، پانی اور روشنی وغیرہ سبھی کی نہایت اہم اور عام ضرورت ہے تو حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان چیزوں کو سب کے لیے عام اور آسان فرمادیا، صراطِ مستقیم بھی ہم سب کی نہایت اہم ضرورت ہے، تو حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اُسے بھی نہایت عام اور آسان فرمادیا۔

صراطِ مستقیم کے پانچ اَوصاف:

جیسا کہ خود لفظ ''صراطِ مستقیم'' سے اس کا پتا چلتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ لفظ ''صراط'' کے لغوی معنیٰ ہیں راستہ، تو قرآنِ کریم میں ''راستے'' کے لیے لفظ صراط کے علاوہ کبھی ''سبیل'' تو کبھی ''طریق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اگرچہ تینوں کے معنیٰ راستہ ہی ہیں، لیکن علّامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ''صراط'' اس راستے کو کہتے ہیں جس میں پانچ اَوصاف پائے جائیں:

(۱) وہ راستہ بالکل سیدھا ہو۔

(۲) آسان بھی ہو، یعنی مختصر ہو۔

(۳) عام ہو، یعنی اس پر چلنے میں کسی کے لیے ممانعت یا رُکاوٹ نہ ہو۔

(۴) کشادہ اور وسیع ہو، یعنی تمام لوگ بہ یک وقت اس پر چلنا چاہیں تو سب کے لیے وسعت اور گنجائش ہو۔

(۵) اس پر چلنے والا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

"وَالصِّرَاطُ: مَا جَمَعَ خَمْسَةَ أَوْصَافٍ: أَنْ يَكُوْنَ طَرِيْقًا مُسْتَقِيْمًا، سَهْلًا، مَسْلُوْكًا، وَاسِعًا، مُوْصِلًا إِلَى المَقْصُوْدِ". (بدائع الفوائد)

صاحبو! واقعہ یہی ہے کہ صراطِ مستقیم کی یہی شان ہے، حق تعالیٰ نے کتاب و سنّت اور شریعت کی اس شاہ راہ (صراطِ مستقیم) کو اتنا آسان بنایا کہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں کے لیے اس پر چلنا اور صراطِ مستقیم پر عمل کرنا آسان ہے، یہ خیال غلط ہے کہ صراطِ مستقیم پل صراط کی طرح بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، صحیح یہ ہے کہ جو خوش نصیب بندہ دُنیا میں صراطِ مستقیم پر چلے گا قیامت میں اس کے لیے پل صراط پر چلنا آسان ہو جائے گا، اور حق تعالیٰ کی منشا بھی یہی ہے، اسی لیے شریعت اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہر کسی کے لیے آسان بنا دیا؛ کیوں کہ فطری بات ہے کہ جو راستہ، سیدھا، عام اور کشادہ ہونے کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہو وہ اگر مشکل ہو تب بھی مطلوب بلکہ محبوب ہوتا ہے، جب صراطِ مستقیم میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں اور اس پر چلنا بھی مشکل نہیں تو وہ بدرجۂ اولیٰ مطلوب و محبوب ہونا چاہیے۔

غالباً اسی لیے حدیث مذکور میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراطِ مستقیم کو نہایت عام فہم انداز میں سمجھا کر اس کی ترغیب دی۔ سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر بنائی، پھر اس کے دائیں بائیں مختلف لکیریں بنا کر فرمایا: "هٰذَا سَبِيْلُ اللهِ". یہ سیدھی لکیر اللہ تعالیٰ کا راستہ اور صراطِ مستقیم ہے، مگر اس کے دائیں بائیں جو لکیریں ہیں وہ شیطانی راستے ہیں، شیطانِ رجیم صراطِ مستقیم پر ڈیرا ڈالے بیٹھا ہوا ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو دائیں بائیں موڑنا چاہتا ہے، صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّت کو ترغیب و تاکید فرمائی کہ صراطِ مستقیم

سے ہرگز مت ہٹنا، شیطانی چال اور جال میں مت پھنسنا، ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الأنعام : ۱۵۳)

صراطِ مستقیم پر ایک علمی نکتہ:

یہاں حضراتِ علمائے کرام نے صراطِ مستقیم پر ایک علمی نکتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ صراطِ مستقیم کے لیے تو ''سبیل'' یعنی لفظ واحد لایا گیا، جب کہ صراطِ مستقیم کے علاوہ شیطانی راستوں کے لیے ''سُبُل'' یعنی جمع کا لفظ لایا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ ضلالت اور گمراہی کے راستے تو مختلف اور متعدد ہیں؛ لیکن ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے، اور وہ ہے صراطِ مستقیم۔ جس طرح ہمارا رب ایک ہی ہے، ہمارے نبی ایک ہی ہیں، ہمارا قبلہ ایک ہی ہے، اسی طرح صراطِ مستقیم بھی ایک ہی ہے، لہٰذا اُسی پر چلو، کتاب و سنّت میں صراطِ مستقیم کی اس ترغیب وتاکید کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر صراطِ مستقیم پر چلنے کی سچّی اور پکّی طلب پیدا کریں، پھر اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگ کر ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے ارادے واختیار سے کتاب وسنّت پر عمل کرنا شروع کردیں تو بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

دو گام چل کے کوئی اس راہ پر تو دیکھے کتنی حسین ہیں راہیں، کتنی حسین ہے منزل

صراطِ مستقیم کی دُعا:

حق تعالیٰ کی منشا اور مرضی بھی یہی ہے کہ میرا ہر بندہ صراطِ مستقیم پر چل کر مجھے پالے، میری رضا ورحمت اور جنّت حاصل کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ جو کہ قرآنِ

کریم کا خلاصہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراطِ مستقیم کی دُعا نہ صرف سکھائی گئی بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی کہ روزانہ کم از کم پانچ مرتبہ جب تم میرے حضور نیازمندی و بندگی کے لیے حاضری دو تو اس وقت صراطِ مستقیم کی دُعا کیا کرو۔ چنانچہ رب کے وفادار اور فرماں بردار بندے دِن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ نماز کی ہر ہر رکعت میں صراطِ مستقیم کی دُعا مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴾ (الفاتحة : ٥)

''ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔''

مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! دین، دُنیا اور آخرت کے جتنے امور و مراحل ہیں ان سب میں جو سب سے سیدھا راستہ ہے اس کی ہمیں رہنمائی فرما، یعنی عبادت، اطاعت، خدمت، معاشرت، تجارت، علاج و معالجہ وغیرہ میں جو سیدھا، سچا اور اچھا راستہ ہے اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ عطا فرما۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں یہ دُعا نہایت جامع ہے، دین، دنیا اور آخرت کے تمام اُمور میں سیدھا راستہ اس میں طلب کیا گیا ہے، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے جو بندے صراطِ مستقیم کی ہدایت سے محروم اور دور ہیں اُن کے حق میں تو یہ طلب ہدایت کی دُعا ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنے فضل و کرم سے صراطِ مستقیم دِکھا۔ اور قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی بندہ ہدایت کا سچا طالب ہوتا ہے حق تعالیٰ اُسے ضرور ہدایت عطا فرماتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ﴾ (النحل : ٩)

''اور اللہ ہی کے ذمے سیدھا راستہ بتا دینا ہے۔ اور بعض راستے ٹیڑھے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ حق اور ہدایت کے سچے طالب کو حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم

سے صراطِ مستقیم دِکھا ہی دیتے ہیں۔ سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ہدایت کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ:

حضرت سلمان (الخیر ابوعبداللہ بن اسلام) فارسی رضی اللہ عنہ جن کی عمر متفق علیہ قول کے مطابق ڈھائی سو سال سے متجاوز تھی۔ (سیرۃ مصطفی: ۱/ ۴۱۹)

انھیں صراطِ مستقیم اور دین متین کی سچّی طلب تھی تو حق تعالیٰ نے انھیں دولت ہدایت سے نواز ہی دیا۔ ان کے اسلام لانے کا عبرت آموز واقعہ جو خود انھوں نے سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان فرمایا اس کی تفصیل اس طرح ہے:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ملک فارس میں قریہ ''جیّ'' کا باشندہ تھا، میرے والد اپنے شہر کے چودھری تھے اور میں اُن کا بہت زیادہ محبوب تھا، جس طرح کنواری لڑکیوں کی حفاظت کرتے ہیں اس طرح میری حفاظت کرتے تھے اور مجھے گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے، ہم مذہباً مجوسی تھے، میرے باپ نے مجھے آتش کدے کا محافظ اور نگہبان بنا رکھا تھا کہ کسی بھی وقت آگ بجھنے نہ پائے۔

ایک مرتبہ میرے والد تعمیر کے کام میں مشغول تھے، اس لیے مجبوراً مجھے کسی زمین اور کھیت کی خبر گیری کے لیے بھیجا اور یہ تاکید کی کہ دیر نہ کرنا، میں گھر سے نکلا، راستے میں ایک گرجا پڑتا تھا، اندر سے کچھ آواز سنائی دی، میں دیکھنے کے لیے اندر گھسا، دیکھا تو نصاریٰ کی ایک جماعت نماز میں مشغول تھی، مجھے اُن کی یہ عبادت پسند آئی اور میں نے دِل ہی دِل میں کہا کہ یہ دین ہمارے دین سے بہتر ہے، میں نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ اس دین کی اصل کہاں ہے؟ اُن لوگوں نے کہا کہ ملک شام میں، اسی گفتگو کے درمیان آفتاب غروب ہو گیا۔

والد نے انتظار کر کے تلاش میں قاصد دوڑائے، جب گھر واپس آیا تو والد نے دریافت کیا کہ بیٹے! تو کہاں تھا؟ میں نے پورا واقعہ بیان کر دیا، والد نے کہا کہ اس دین (یعنی نصرانیت) میں کوئی خیر نہیں، تیرے ہی باپ دادا کا دین (یعنی آتش پرستی) بہتر ہے۔

میں نے کہا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم! نصرانیوں کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔ والد نے میرے پیر میں بیڑیاں ڈال دیں اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا، جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ﴾ (الشعراء : ۲۹)

''اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں سے کر دوں گا۔''

جیسا کہ عام اہل باطل کا طریقہ ہے۔ میں نے پوشیدہ طور پر نصاریٰ سے کہلا بھیجا کہ جب کوئی قافلہ شام کی طرف جائے تو مجھے اطلاع کرنا، چنانچہ انھوں نے مجھے ایک موقع پر اطلاع دی کہ نصاریٰ کے تاجروں کا ایک قافلہ شام واپس جانے والا ہے، میں نے موقع پا کر بیڑیاں اپنے پیر سے نکال پھینکیں اور گھر سے نکل کر ان کے ساتھ ہو گیا۔

شام پہنچ کر دریافت کیا کہ عیسائیوں کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ لوگوں نے ایک پادری کا نام بتایا، میں اُس کے پاس پہنچا اور اُس کے سامنے اپنا تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میں آپ کی خدمت میں رہ کر آپ کا دین سیکھنا چاہتا ہوں، مجھے آپ کا دین مرغوب اور پسند ہے، آپ اجازت دیں تو آپ کی خدمت میں رہوں اور دین سیکھوں اور آپ کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہوں، اس نے کہا: بہتر ہے۔

لیکن چند روز کے بعد تجربہ ہوا کہ وہ آدمی اچھا نہیں تھا، بڑا ہی حریص اور طامع تھا، دوسروں کو صدقات و خیرات کا حکم دیتا اور جب لوگ روپیہ لے کر آتے تو جمع کر کے رکھ لیتا اور فقراء و مساکین کو نہ دیتا، اسی طرح اس نے اَشرفیوں کے سات مٹکے جمع کر

لیے تھے، جب وہ مر گیا اور لوگ حسن عقیدت کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کے لیے جمع ہوئے تو میں نے لوگوں کے سامنے اس کا حال بیان کیا اور وہ سات مٹکے دِکھائے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر کہا کہ خدا کی قسم! ہم ایسے شخص کو ہرگز دفن نہیں کریں گے، بالآخر اس پادری کو سولی پر لٹکا کر سنگسار کر دیا اور اُس کی جگہ کسی اور عالم کو بٹھایا۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وقت تک اس سے بڑھ کر کوئی عالم، عابد، زاہد، دنیا سے بے تعلق اور آخرت کا شائق و طلبگار نمازی اور عبادت گزار کسی کو نہیں دیکھا تھا اور جس قدر مجھے اس عالم سے محبّت ہوئی اس سے پیشتر کبھی کسی سے اس قدر محبّت نہیں ہوئی، میں مسلسل اس عالم کی خدمت میں رہا، جب اُن کا اخیری وقت آ گیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے وصیت کیجیے اور بتایئے کہ آپ کے بعد میں کسی کی خدمت میں رہوں؟ کہا: موصل میں ایک عالم ہے، تم اس کے پاس چلے جانا، چنانچہ میں اُن کے پاس گیا اور اُن کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق نصیبین میں ایک عالم کے پاس جا کر رہا، پھر اُن کی وفات کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق شہر عموریہ میں ایک عالم کے پاس رہا، جب اُن کا بھی انتقال ہونے لگا تو میں نے اُن سے کہا کہ میں فلاں فلاں عالم کے پاس رہا، اب آپ بتائیں کہ میں کہاں جاؤں؟ اس عالم نے کہا: میری نظر میں اس وقت کوئی ایسا عالم نہیں ہے جو صحیح راستے پر ہو جس کا میں تمھیں پتا بتا سکوں، البتہ ایک نبی کے ظہور کا زمانہ قریب آ گیا ہے، جو دین ابراہیمی پر ہوگا، عرب کی سرزمین میں اس کا ظہور ہوگا، ایک نخلستانی زمین کی طرف ہجرت کرے گا، اگر تمھارے لیے وہاں پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچنا، ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ صدقے کا مال نہیں کھائیں گے، ہدیہ قبول کریں گے، دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی، جب تم اُن کو دیکھو گے تو پہچان لو گے۔

اس اَثنا میں میرے پاس کچھ گائیں اور بکریاں بھی جمع ہوگئی تھیں، اتفاق سے ایک عرب کا قافلہ مجھے مل گیا جو جانے والا تھا، میں نے اُن سے کہا کہ تم لوگ مجھے ساتھ لے چلو، میں یہ ساری گائیں اور بکریاں تمھیں دے دوں گا، ان لوگوں نے قبول کیا اور مجھے ساتھ لے لیا، جب وادیٔ قریٰ میں پہنچے تو انھوں نے میرے ساتھ یہ بدسلوکی کی کہ مجھے غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھوں فروخت کر دیا، جب اس کے ساتھ آیا تو کھجور کے درخت دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید یہی وہ سرزمین ہو؛ لیکن ابھی پورا اِطمینان نہیں ہوا تھا کہ بنی قریظہ میں سے ایک یہودی اس کے پاس آیا جو مجھے اس سے خرید کر مدینہ لے آیا۔

"حَتّٰى قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ، فَوَ اللهِ مَا هُوَ إِلَّا أَنْ رَأَيْتُهَا فَعَرَفْتُهَا بِصِفَةِ صَاحِبِيْ، وَأَيْقَنْتُ أَنَّهَا هِيَ الْبَلْدَةُ الَّتِيْ وُصِفَتْ لِيْ".

''جب میں مدینہ پہنچا تو اللہ کی قسم! مدینہ کو دیکھتے ہی میں نے اُسے اُن اَوصاف سے پہچان لیا جو میرے ساتھی نے پہلے بیان کیے تھے، اور میں نے یقین کرلیا کہ یہ وہی شہر ہے جو مجھے بتایا گیا ہے۔''

صحیح بخاری میں خود حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اس طرح دَس مرتبہ سے زیادہ فروخت ہوا ہوں۔ (لوگوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو بار بار بے رغبتی کے ساتھ دراہم معدودہ میں خریدا؛ لیکن ان کی اصل قیمت کو کسی نے نہیں پہچانا) میں مدینہ میں اس یہودی کے پاس رہا اور میں بنی قریظہ میں اس کے درختوں کا کام کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں مبعوث فرمایا؛ مگر مجھے غلامی اور خدمت کی وجہ سے مطلق علم نہ ہوا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور قباء میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اس وقت میں کھجور کے ایک درخت پر چڑھ کر کام کر رہا تھا اور میرا آقا درخت کے نیچے بیٹھا تھا، اسی

درمیان ایک یہودی آیا جو میرے آقا کا چچازاد بھائی تھا، وہ کہنے لگا: اللہ بنی قیلہ کو ہلاک کرے، وہ لوگ قباء میں ایک شخص کے اردگرد جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شخص نبی اور پیغمبر ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فَوَ اللهِ إِنْ هُوَ إِلَّا أَخَذَتْنِيْ الْعُرَوَاءُ، حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنِّيْ سَأَسْقُطُ عَلٰى صَاحِبِيْ".

''اللہ کی قسم! یہ سننا تھا کہ مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا اور مجھے یہ لگا کہ میں کپکپی کی وجہ سے اپنے آقا پر گر پڑوں گا۔''

(بشیر ونذیر کی آمد کی بشارت نے سلمان رضی اللہ عنہ کو ایسا بےخود اور وارفتہ بنادیا تھا کہ اگر "لَوْلَا أَنْ رَبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا" کا مضمون نہ ہوتا تو وہ درخت سے گر ہی پڑتے)

وہ دونوں یہودی ان کی اس حالت اور کیفیت کو دیکھ کر سخت متعجب تھے اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی زبانِ حال یہ شعر پڑھ رہی تھی:

خَلِيْلَيَّ! لَا وَاللهِ مَا أَنَا مِنْكُمَا إِذَا عَلَمٌ مِنْ آلِ لَيْلٰى بَدَا لِيَا

''اے میرے دوستو! اللہ کی قسم اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، جب کہ مجھے دیارِ لیلیٰ کا کوئی پہاڑ نظر آگیا۔''

مدّتے بود کہ مشتاقِ لقایت بودم لاجرم روئے ترا دیدم واز جاں رفتم

بہرحال دِل کو تھام کر درخت سے اُترا اور اُس آنے والے یہودی سے پوچھنے لگا: بتاؤ تو سہی! تم کیا بیان کرتے تھے؟ وہ خبر ذرا مجھے بھی تو سناؤ! یہ دیکھ کر میرے آقا کو غصّہ آگیا اور اس نے زور سے مجھے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کہا: تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو اپنا کام کر۔

جب شام ہوئی اور کام سے فراغت ہوئی تو جو کچھ میرے پاس جمع تھا وہ ساتھ

لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قباء میں تشریف فرما تھے، میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور آپ کے رُفقاء کے پاس کچھ نہیں ہے، آپ سب حضرات حاجت مند ہیں اس لیے میں آپ کے لیے اور آپ کے رُفقاء کے لیے صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ مطہر کے لیے صدقہ قبول کرنے سے انکار فرمادیا اور یہ فرمایا کہ میں صدقہ نہیں کھاتا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اِجازت دی کہ تم لے لو۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دِل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ اُن تین علامتوں میں سے ایک ہے۔ پھر میں واپس ہوگیا، پھر کچھ جمع کرنا شروع کردیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میں پھر حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ میرا دِل چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں کچھ پیش کروں، صدقہ تو آپ قبول نہیں فرماتے، یہ ہدیہ لے کر حاضر ہوا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور خود بھی اُس میں سے تناول فرمایا اور صحابہ کو بھی کھلایا۔ میں نے اپنے دِل میں کہا کہ یہ دوسری علامت ہے۔

پھر میں واپس آ گیا اور دو چار روز بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک جنازے کے ہمراہ بقیع میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں تشریف فرما تھے، میں نے سلام کیا اور سامنے سے اُٹھ کر پیچھے آ بیٹھا، تاکہ مہرِ نبوت دیکھوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے اور پشت مبارک سے چادر اُٹھادی، میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اُٹھ کر مہرِ نبوت کو بوسہ دیا اور رو پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سامنے آؤ! میں سامنے آیا اور اے ابن عباس! جس طرح آپ کے سامنے میں نے اپنا یہ واقعہ بیان کیا اسی طرح میں نے یہ تمام واقعہ تفصیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

سامنے آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بھی بیان کیا تھا اور اُسی وقت مشرف بہ اسلام ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت مسرور ہوئے۔

اُس کے بعد میں اپنے آقا کی خدمت میں مشغول ہوگیا، اِسی وجہ سے میں غزوۂ بدر اور اُحد میں شریک نہیں ہوسکا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے سلمان! اپنے آقا سے کتابت کرلو! حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے آقا سے کہا، تو اُس نے یہ جواب دیا کہ اگر تم چالیس اوقیہ سونا ادا کردو اور کھجور کے تین سو درخت لگادو، پھر جب وہ بارآور ہو جائیں تو تم آزاد ہو، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اسے قبول کرلیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ سلمان کی کھجور کے پودوں سے اِمداد کریں، چنانچہ کسی نے تیس پودوں سے، کسی نے بیس پودوں سے، کسی نے پندرہ سے اور کسی نے دَس پودوں سے اِمداد کی، جب پودے جمع ہوگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے سلمان! ان کے لیے گڑھے تیار کرو، جب گڑھے تیار ہوگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے ان تمام پودوں کو لگایا اور برکت کی دُعا فرمائی، ایک سال گزرنے نہ پایا تھا کہ سب کو پھل آگیا اور کوئی پودا ایسا نہیں تھا جو خشک ہوگیا ہو، سب کے سب سرسبز وشاداب ہوگئے اور سب کو پھل آگیا۔

درختوں کا قرض تو ادا ہوگیا، اب صرف دراہم باقی رہ گئے۔ ایک روز ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک بیضہ کی مقدار سونا لے کر آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مسکین مکاتب (یعنی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ) کہاں ہے؟ اس کو بلاؤ! میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ بیضہ کی مقدار سونا عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کو لے جاؤ، اللہ تعالیٰ تمھارا قرض ادا فرمائے گا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ سونا بہت تھوڑا ہے، اس سے میرا قرض کہاں ادا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جاؤ! اللہ تعالیٰ اُسی سے تمھارا

قرض ادا کر دے گا۔ چنانچہ میں نے اس کو تولا تو پورا چالیس اوقیہ تھا، میرا کل قرض ادا ہو گیا اور غلامی سے آزاد ہوا اور آپ ﷺ کے ساتھ غزوۂ خندق میں شریک ہوا، اس کے بعد کے تمام غزوات میں بھی آپ ﷺ کے ہم رِکاب رہا۔ (سیرۃ مصطفیٰ ﷺ، بحوالہ: سیرۃ ابن ہشام رجلد: ۱/ ۷۳)

الغرض حق و ہدایت کے سچّے طالب کو حق تعالیٰ محروم نہیں فرماتے، ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرماتے ہیں۔ اور جن طالبین کو حق تعالیٰ نے صراطِ مستقیم دِکھا دیا ان کے حق میں یہ دُعا ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنے فضل و کرم سے صراطِ مستقیم پر چلا۔ اور جن عاملین مخلصین کو حق تعالیٰ نے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرما دی اُن کے حق میں یہ ہدایت پر استقامت کی دُعا ہے کہ اے اللہ! جب آپ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں صراطِ مستقیم دِکھا کر اس پر چلا بھی دیا تو اب موت تک اسی پر جمائے رکھیے۔ اور ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ خود چاہتے ہیں کہ بندے مجھ سے صراطِ مستقیم کی جامع دُعا مانگیں تو حق تعالیٰ بندوں کی مانگی ہوئی اس دُعا کو ضرور قبول فرماتے ہیں۔

صراطِ مستقیم کی طلب میں مانگی ہوئی دُعا قبول ہوتی ہے:

ایک حدیث قدسی کا مضمون ہے، جس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

"قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ".

میں نے نماز کو اپنے اور (اپنے وفادار اور طلب گار) بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی ہے (اس طرح کہ حمد و ثنا میرے لیے ہے اور دُعا بندے کے لیے ہے) "وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ" اور بندہ جو کچھ (طلب صادق کے ساتھ) مانگتا ہے وہ اُسے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب بندہ کہتا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ" میرے بندے نے میری تعریف بیان کی۔

جب بندہ کہتا ہے: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي" میرے بندے نے میری ثنا بیان کی۔ جب بندہ کہتا ہے: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ" میرے بندے نے میری تعظیم و بڑائی کا اظہار کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ" یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ (یعنی عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے اور طلب نصرت بندے کے لیے، اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ ملے گا، اب بندے نے صراطِ مستقیم کی ہدایت مانگی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

''اے اللہ! آپ اپنے فضل وکرم سے ہمیں صراطِ مستقیم دِکھایئے اور اس پر چلا کر موت تک اسی پر جما دیجیے! کیوں کہ صراطِ مستقیم پر چلنے والے حضرات انبیاء ومرسلین علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین پر دارین میں آپ نے اپنی رحمت و رضا اور ظاہری و باطنی انعامات کی بارش برسائی ہے، لہٰذا جن پر آپ نے اپنے فضل وکرم سے انعام نازل فرمایا ان کے راستے پر چلا دیجیے اور اپنے مغضوب بندوں کے راستے پر چلنے سے بچا لیجیے۔''

حدیث قدسی میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں طالب صراطِ مستقیم کی دُعا کو قبول کرتا ہوں۔

"وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ۷۸، باب القراءة في الصلوٰة)

غور کیجیے کہ اس میں طالب صراطِ مستقیم کو حق تعالیٰ نے "عَبْدِيْ" فرمایا، گویا من جانب اللہ عبدیت کا سرٹیفکٹ ملا، جو بہت بڑا انعام ہے، پھر ان کی دُعا قبول

کرنے کا وعدہ بھی فرمایا، اور جب حق تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے تو یقینی بات ہے کہ صراطِ مستقیم کے طالبین کو ہدایت ضرور ملے گی۔

حدیث پاک میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہدایت اور صراطِ مستقیم کی دُعا اس طرح فرماتے:

"اَللّٰهُمَّ إِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيَنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ، لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا، فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ بِنَا فَكُنْ أَنْتَ وَلِيَّنَا، وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ".
(حلية الأولياء : ٨ / ٣٦٧)

''اے اللہ! بے شک ہمارے دِل، پیشانیاں اور ہمارے اعضاء (ہر چیز) تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں، تو نے ہمیں ان میں سے کسی بھی چیز کا مالک نہیں بنایا (سب کچھ تیرے ہی اختیار میں ہے) جب یہی بات ہے تو تو اپنے کرم سے ہمارا کارساز بھی بن جا اور ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت بھی عطا فرما۔ آمین۔

صراطِ مستقیم ملنے کی علامت:

اب رہی یہ بات کہ طالبین صراطِ مستقیم کو ملنے والی ہدایت کی علامت کیا ہے؟ تو قرآنِ کریم نے اس پیچیدہ سوال کا جواب بھی عطا کر دیا:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ (الأنعام : ١٢٥)

''حق تعالیٰ جسے صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام (اور اس کے احکام کو سمجھنے اور ان پر عمل) کے لیے کھول دیتے ہیں۔''

سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صراطِ مستقیم کے حصول کی جو بنیادی علامت شرحِ صدر ہے اس کی تفسیر دریافت کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ النُّوْرَ إِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَحَ". (شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ٤٤٦)

شرحِ صدر کا مطلب نورِ ایمان کا سینے میں من جانب اللہ داخل ہوجانا ہے۔ اور حق تعالیٰ جب طالب ہدایت کے سینے میں نورِ ایمان داخل فرمادیتے ہیں تو اس کا دِل حق اور ہدایت کو فراست ایمانی سے دیکھنے، سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کھل جاتا ہے، جس کے بعد وہ بندہ حق و ہدایت کو بآسانی قبول کرلیتا ہے، اس کی ساری رغبتیں حق اور ہدایت کی طرف ہوجاتی ہیں اور خلافِ حق و ہدایت سے اُسے نفرت ہوجاتی ہے، اس کی برکت سے اُسے دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی رغبت نصیب ہوتی ہے اور موت سے قبل اُس کی تیاری کی توفیق ملتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِالإِيْمَانِ، وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلإِسْلَامِ. آمين.

''اے اللہ ہمارے دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرما اور ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دے۔''

یہ تو صراطِ مستقیم کی ہدایت کا نقد اور دُنیوی نفع ہے، اُخروی نفع تو الگ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الأنعام:١٢٧)

''صراطِ مستقیم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے والوں کے لیے اُن کے رب کے پاس (آخرت میں) دار السلام (سلامتی کا گھر جنّت) ہے اور اللہ ہی اُن کا حامی ہے اُن اعمال (صالحہ) کے سبب جو وہ کیا کرتے تھے۔''

حق تعالیٰ ہم میں صراطِ مستقیم کی سچّی اور پکّی طلب پیدا فرما کر اپنے لطف خاص سے صراطِ مستقیم دِکھا کر اُسی پر چلائے، اور موت تک اس پر استقامت نصیب فرما کر دارین میں اپنی رضائے کامل عطا فرمائے۔ آمین۔

کچھ یادگار مبارک لمحات:

لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد بحمداللہ مرشدی شیخ الزمان حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب الٰہ آبادی مدّظلہ العالی مادامت النہار واللیالی کا عرفانی ونورانی سفر گجرات ہوا، حضرت اقدس والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر حضرت شیخ نے ہمارے گھر بغرضِ تعزیت تشریف آوری کا ارادہ فرمالیا تھا، حسب وعدہ سفر کی صعوبت اور ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود مؤرّخہ: ۲۷ر صفر ۱۴۴۳ھ مطابق: ۵ر اکتوبر ۲۰۲۱ء منگل کا دِن ختم ہوکر رات بارہ بج کر پانچ منٹ کو ''بزمِ صدیقی'' بڑودا میں رونق افروز ہوئے، اس موقع پر خادم زادہ عزیزم حافظ محمد خلیق سلّمہٗ نے اپنے حفظ کی تکمیل کی، جس کے بعد حضرت نے دُعا فرمائی۔ اس کے بعد ۲۹ر صفر ۱۴۴۳ھ مطابق: ۷ر اکتوبر ۲۰۲۱ء جمعرات کا دِن ختم ہوکر شب جمعہ میں دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر کی وسیع مسجد میں خواہرزادہ حافظ محمد صادق بن حافظ ضیاء الدین سلّمہٗ نے بھی اپنے رُفقاء کے ہمراہ حضرت شیخ الزمان اور دیگر صالحین کے اجتماع میں تکمیل حفظ کی سعادت حاصل کی۔ حق تعالیٰ شرفِ قبول عطا فرما کر ہم سبھی کو دارین میں اپنی محبّت ومحبوبیت نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

یکم ربیع الاول ر ۱۴۴۳ھ
۸ر اکتوبر ر ۲۰۲۱ء، قبل الجمعہ
نزیل: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

نبی ﷺ کا لب پر جو ذکر ہے بے مثال آیا، کمال آیا
جو ہجر طیبہ میں یاد بن کر خیال آیا، کمال آیا

تری دُعاؤں ہی کی بدولت عذابِ رب سے بچے ہوئے ہیں
جو حق میں اُمّت کے تیرے لب پر سوال آیا، کمال آیا

غرور حوروں کا توڑ ڈالا لگا کے ماتھے پہ تِل خدا نے
جو کالے رَنگ کا غلام تیرا بلال رضی اللہ عنہ آیا، کمال آیا

نبی ﷺ کی آمد سے نور پھیلا، فضائے شب پر نکھار آیا
چمن میں کلیوں کے رُخ پہ حسن وجمال آیا، کمال آیا

عمر کی جرأت پہ جاؤں قرباں کہ جس سے شیطان بھی ہے لرزاں
عمر رضی اللہ عنہ کے آنے سے کفر پر جو زوال آیا، کمال آیا

نبی تو سبھی ہیں، اعلیٰ ہیں رُتبے سب کے عظیم و بالا
مگر جو آخر میں آمنہ رضی اللہ عنہا کا وہ لال ﷺ آیا، کمال آیا

(۲۶)

علمائے کرام کا مقام اور اُن کی ذمّے داریاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ قَتَادَةَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى قَالَ: "خَلَقَ اللهُ تَعَالٰى هٰذِهِ النُّجُوْمَ لِثَلَاثٍ: جَعَلَهَا زِيْنَةً لِلسَّمَاءِ، وَرُجُوْمًا لِلشَّيَاطِيْنِ، وَعَلَامَاتٍ يُهْتَدٰى بِهَا، فَمَنْ تَأَوَّلَ فِيْهَا بِغَيْرِ ذٰلِكَ أَخْطَأَ، وَأَضَاعَ نَصِيْبَهٗ، وَتَكَلَّفَ مَا لَمْ يَعْلَمْ".

(رواه البخاري تعليقًا، مشكوٰة : ٣٩٤، باب الكهانة)

ترجمہ: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ستاروں کو تین اہم مقاصد کے لیے پیدا فرمایا، ایک یہ کہ اُن کو آسمانوں کی زینت بنایا ہے۔ اور دوسرے شیاطین (وجنات) کو مارنے کے لیے اور تیسرے علامات کے لیے کہ لوگ اُن کے ذریعے (جنگلوں اور سمندروں میں) اپنا راستہ پاسکیں۔ لہٰذا جس شخص نے ان ستاروں کے متعلق کوئی اور بات بیان کی (مثلاً ستاروں کو کسی حادثے اور واقعے کے لیے بطورِ علت پیش کیا کہ فلاں ستارے سے یہ ہوگیا اور فلاں سے وہ ہوگیا) تو اس نے خطا کی

اور اپنا حصّہ (زندگی کا) ضائع کیا، اور اس چیز کا تکلّف کیا جسے وہ نہیں جانتا۔ (جس چیز کو وہ جانتا ہی نہیں اور نہ جان سکتا ہے خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑا)۔

اہل ایمان اور علماء کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انعام ہے:

اللہ ربّ العزت والجلال نے ہر زمانے وعلاقے کے انسانوں میں مخصوص بندوں کا انتخاب فرما کر انھیں ایمان کی دولت سے نوازا، پھر اہل ایمان میں سے مخصوص بندوں کا انتخاب فرما کر انھیں اپنی معرفت، احکامات، مرضیات اور کتاب وسنّت کے علوم سے نوازا، انتخابِ الٰہی کا یہ زرّیں سلسلہ ہر زمانے وعلاقے میں رہا ہے اور رہے گا۔

ظاہر ہے کہ عام انسانوں میں دولت ایمان کے لیے اہل ایمان کا انتخاب اور اہل ایمان میں اہل علم کا انتخاب یہ اللہ ربّ العزت والجلال کا عظیم الشان انعام ہے۔ پھر حق تعالیٰ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ فرمایا: اہل ایمان اور اُن میں خصوصی طور پر اہل علم کو ہم مزید انعامات اور بلندیٔ درجات سے نوازتے ہیں اور آئندہ بھی نوازیں گے، قرآنِ کریم میں اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (المجادلة:۱۱)

''اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے درجات بلند فرمادے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھیں علم سے نوازا گیا۔''

معلوم ہوا کہ عام انسانوں میں اہل ایمان اور اہل ایمان میں اہل علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا ورحمت، مخصوص انعامات اور بلندیٔ درجات کے لیے منتخب فرمالیا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اونچا مقام علماء کا ہے:

جس طرح عام انسانوں میں اہل ایمان اور بے ایمان برابر نہیں ہیں اسی طرح

اہل ایمان میں اہل علم اور بے علم بھی مرتبے اور مقام کے اعتبار سے برابر نہیں، اس حقیقت کا اعلان قرآنِ کریم نے اس طرح فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر : ۹)

''فرما دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے (سب) برابر ہو سکتے ہیں؟''

ایمان و اِخلاص اور اعمال و اخلاق میں اہل علم اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد اہل ایمان میں اہل علم کے ایمان و اخلاص اور اعمال و اخلاق کی سطح بہت اونچی ہوتی ہے اور ہونی ہی چاہیے، یہی وجہ ہے کہ شیطان کے لیے ایک ہزار عبادت گزار کو بہکانا آسان ہے؛ لیکن ایک عالم دین اور فقیہ کو بہکانا اِتنا آسان نہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

"فَقِيْهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ". (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ۳٤)

کیوں کہ جو محض عابد ہے وہ شیطان کے مکر و فریب سے واقف نہیں؛ اس لیے بہت جلدی اُس کے جال میں پھنس جاتا ہے، جب کہ عالم و فقیہ اس کے مکر و فریب سے واقف ہوتا ہے اس لیے خود بھی اس کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔

ایک سبق آموز حکایت:

چنانچہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ شیطان کسی عابد کے پاس گیا جو نماز میں مشغول تھا، جب وہ فارغ ہوا تو شیطان نے پوچھا: کیا تمھارا رب ساری دُنیا کو ایک اَنڈے میں بند کر سکتا ہے؟ تو عابد نے کہا: نہیں۔ اس انکار سے اس نے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو

عاجز ثابت کر دیا، جو کفر کا سبب ہے۔

اس کے بعد شیطان کسی عالم وفقیہ کے پاس گیا اور یہی سوال دہرایا، تو اس عالم نے کہا کہ میرا رب اس پر قادر ہے، شیطان نے کہا: کس طرح؟ عالم نے کہا کہ میرے رب کی شان یہ ہے کہ

﴿إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝٨٢﴾ (یٰسٓ : ۸۲)

''جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو لفظ ''کن'' کہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔''

شیطان اس جواب سے لاجواب ہو گیا۔ یہ ہے عابد و عالم میں فرق۔

(مستفاد از: جامع بیان العلم وفضلہ: ۴۲)

غالباً یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اونچا مقام حضرات علمائے کرام کو عطا فرمایا، حدیث پاک میں وارد ہے:

"وَأَنَّ فَضْلَ العَالِمِ عَلَى العَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ البَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ". (رواه أحمد والترمذي وأبوداود وابن ماجه والدارمي، مشكوٰة:٣٤، كتاب العلم)

مطلب یہ ہے کہ حضرات علمائے کرام کی فضیلت صرف عام مسلمانوں ہی پر نہیں؛ بلکہ عبادت گزاروں پر بھی ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے۔

یہ ایک نہایت جامع تشبیہ ہے، اس میں ایک اشارہ تو یہ ہے کہ جس طرح چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے مستفاد ہے اسی طرح علماء کے علم کی روشنی بھی آفتاب نبوت کی روشنی سے مستفاد ہے۔

اس تشبیہ میں دوسرا اِشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح چاند کے ہوتے ہوئے

ستاروں کی کوئی خاص حیثیت نہیں، اور سورج کی موجودگی میں چاند بے حیثیت ہو جاتا ہے، اسی طرح علماء کے ہوتے ہوئے عوام الناس کی کوئی خاص حیثیت نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے سامنے علماء کے علم کی کوئی حیثیت نہیں۔

تیسرا اِشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح سورج کے بعد چاند کا مقام نہایت بلند ہے، اسی طرح حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد حضرات علمائے کرام کا مقام بھی نہایت بلند ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث مرسل میں ہے:

عَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ مُرْسَلًا قَالَ: "قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ، يُحْيِيْ بِهِ الْإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ". (رواه الدارمي، مشكوٰة : ٣٦)

''جس شخص کی موت اس حال میں آئی کہ وہ احیائے اسلام اور دین کی سربلندی کے لیے حصولِ علم میں مشغول تھا تو اُس کے اور نبیوں کے درمیان جنّت میں صرف ایک ہی درجے کا فرق ہوگا۔'' یعنی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو اُن کی نبوت کے سبب جنّت میں علمائے اُمّت پر ایک درجہ مزید بلند ملے گا۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد تو علماء ہی کا درجہ اور مقام ہوگا۔

جتنا بڑا مقام اُتنی بڑی ذمّے داری:

خلاصہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد عنداللہ سب سے اونچا مقام حضرات علماء کا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک یقینی حقیقت ہے کہ جس کا مقام جتنا اونچا اور بڑا ہوتا ہے اُس کی ذمّے داری بھی اِتنی ہی بڑی اور اہم ہوتی ہے، جب اہل ایمان میں علماء کا مقام حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے بلند و بالا ہے تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد ہر زمانے و علاقے کے علماء کی

ذمّے داریاں بھی سب سے بلند و بالا اور اہم ہیں، جن سے غفلت بلا شبہ دارین میں ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

علمائے کرام کی تین ذمّے داریاں:

جہاں تک تعلق ہے ذمّے داریوں کا تو کتاب وسنّت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی اور بنیادی طور پر حضرات علمائے کرام کی تین ذمّے داریاں ہیں:

(۱) علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کے لیے زینت بنیں۔

(۲) علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کی حفاظت کا ذریعہ بنیں۔

(۳) علمائے کرام اُمّت کے لیے دین حق کی ہدایت کا ذریعہ بنیں۔

کیوں کہ ایک حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علمائے کرام کو ستاروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

"إِنَّ مَثَلَ الْعُلَمَاءِ فِيْ الْأَرْضِ كَمَثَلِ النُّجُوْمِ فِيْ السَّمَاءِ".

(رواه أحمد : ۳ / ۱۵۷)

''زمین میں علمائے کرام کی مثال ایسی ہے جیسے آسمانوں میں ستارے ہیں۔''

عاجز کے خیالِ ناقص میں حضرات علمائے کرام کو ستاروں کے ساتھ تشبیہ دینے کی بظاہر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمانوں میں جن تین بڑے اور اہم مقاصد وفوائد کے تحت ستاروں کو وجود عطا فرمایا ہے اُن ہی تین بڑے اور اہم مقاصد وفوائد کے تحت زمین میں حضرات علمائے کرام کو وجود عطا فرمایا، غالباً اسی لیے انبیائے کرام علیہم السلام کے وارثین کو ستاروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کے لیے زینت بنیں:

کتاب وسنّت کے بیان کے مطابق ستاروں کی تخلیق کا پہلا بڑا اہم مقصد اور

فائدہ یہ ہے کہ "جَعَلَهَا زِيْنَةً لِلسَّمَاءِ" ستاروں کو آسمان کی زینت بنایا۔ جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ﴾ (الصٰفٰت : ٦)

''بے شک ہم نے آسمانِ دُنیا کو ستاروں سے آراستہ کردیا۔''

تو صاحبو! آسمان کی زینت ستاروں سے ہے اسی طرح زمین کی زینت علماء اور انبیائے کرام علیہم السلام کے وارثین سے ہے، چنانچہ فرمایا:

"إِنَّ مَثَلَ الْعُلَمَاءِ فِي الْأَرْضِ كَمَثَلِ النُّجُوْمِ فِي السَّمَاءِ."

(رواه أحمد : ٣ / ١٥٧)

یہ عاجز کہتا ہے:

علمائے ربّانی ایسے ہیں جہاں میں — جیسے روشن ستارے ہیں آسماں میں

اگر دُنیا فلمی اداکاروں کو اسٹار سمجھتی ہے تو اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ علمی لوگوں کو اپنا اسٹار سمجھیں، اس لیے کہ انسانیت کا زیور علم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرات علماء کو زیورِ علم سے آراستہ فرمایا، جس کی وجہ سے وہ اُمّت کے لیے زینت بنے اور اُن کا باطن ظاہر سے زیادہ مزین اور خوب صورت ہے، یہ ہونا ہی چاہیے، اس کے بغیر وہ تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ قلوب کی ذمّے داری کو کما حقہ نبھا نہیں سکتے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے براہِ راست شاگرد حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بنیادی وصف بھی یہی تھا: "أَبَرَّهَا قُلُوْبًا."

(رزین، مشکوٰۃ: ٣٢)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''علماء میں دو چیزیں ہوں تو وہ (بھی دِلوں کے بے تاج) بادشاہ ہیں: ایک استعداد اور ایک استغناء۔'' ایک عین اور ایک غین۔ مطلب یہ ہے کہ علمی اعتبار سے استعداد ہو، تاکہ اُمّت کو نفع پہنچا سکیں، اور عملی اعتبار سے استغناء ہو، تاکہ سورج کی طرح بے غرض ہو کر ہر ایک کو ہر جگہ اپنے نورِ علم

سے نفع پہنچائیں۔

اور واقعہ یہی ہے کہ علمائے کرام اُمّت کا دِل اور زینت اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ خود اُن کا دِل مزین اور خوب صورت ہو، وہ ظاہر سے زیادہ باطن کو مزین اور خوب صورت رکھنے کی فکر کریں، اُن کا دِل حبِّ جاہ، حبِّ باہ، حسد، بغض، کینہ، عداوت اور منافقت وغیرہ سے پاک وصاف ہو، اس کے بغیر حضرات علمائے کرام اُمّت کے لیے زینت نہیں بن سکتے اور نہ ہی اُن کی دینی، علمی، دعوتی واصلاحی کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

علمائے کرام دین وشریعت اور اُمّت کے لیے حفاظت کا ذریعہ بنیں:

ستاروں کی تخلیق کا دوسرا اہم مقصد اور فائدہ یہ ہے کہ وہ "رُجُوْمًا لِلشَّیَاطِیْنِ" ہیں، حق تعالیٰ نے ستاروں کو سرکش شیاطین سے حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝﴾ (الملك : ٥)

''اور ہم نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور انھیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا اور ہم نے اُن شیاطین کے لیے جہنّم کا عذاب بھی تیار کیا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آسمانوں یا اُن کے نیچے خلاؤں میں حق تعالیٰ نے اُن ستاروں میں ایسے قدرتی میزائل نصب فرمادیے ہیں جو غیب کی خبروں کی ٹوہ میں عالم بالا کی طرف جانے والے سرکش شیاطین کو نشانہ بناتے ہیں، جن کی وجہ سے شیطانی کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں۔ تو جس طرح ستارے آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کے سپاہی ہیں، جو شیطانوں سے حفاظت کا ذریعہ ہیں اسی طرح حضرات علمائے کرام زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے سپاہی ہیں، جو شیطانی کوششوں اور دھوکوں سے حفاظت کا ذریعہ ہیں،

آسمانوں میں ستاروں کے ذریعے شیطانی کوششیں ناکام ہوتی ہیں تو زمینوں میں حضرات علمائے حقّانی ور بّانی کے ذریعے شیطانی کوششیں ناکام ہوتی ہیں۔

حق تعالیٰ نے ہر زمانے و علاقے میں حضرات علمائے کرام کی انفرادی و اجتماعی کوششوں کے ذریعے بہت سے فتنوں اور شیطانی کوششوں کو ناکام فرمایا ہے اور آئندہ بھی فرمائیں گے۔ اس سلسلے میں تازہ مثال پڑوسی ملک میں فتح طالبان در افغانستان کی ہے۔

تنظیمِ طالبان کی ابتدا کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ چمن شہر کے قریب ایک مسجد کے اِمام ملّا محمد عمر اَخوند رحمۃ اللہ علیہ چند سالوں قبل ایک رات اپنے گھر میں مطالعہ و کتب بینی میں مشغول تھے کہ ایک بیوہ اُن کے گھر آئی اور بھرّائی ہوئی آواز میں فریاد کرنے لگی: ''مولانا! آپ مطالعہ اور اِمامت و خطابت میں مصروف ہیں، جب کہ دوسری طرف اُمّت مسلمہ کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت دری ہو رہی ہے؟ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلات دریافت کیں تو کہنے لگی: ''چھ ماہ قبل ظالموں نے میرے شوہر کو قتل کر دیا اور اب چند دِن ہوئے کہ وہ ظالم میری دو جوان بیٹیوں کو اُٹھا کر لے گئے، حضرت! ہم کس کے پاس جا کر فریاد کریں؟ یہ سن کر ملّا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی غیرتِ ایمانی جوش میں آ گئی، فرمانے لگے: ''آپ تسلّی رکھیں، ہم محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سرزمینِ افغانستان میں دہرائیں گے۔'' آپ رحمۃ اللہ علیہ اسی عزم کے ساتھ محوِ خواب ہوئے تو رات میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ''اُٹھو! افغانستان کو مظالم سے پاک کرو۔'' پھر کیا تھا؟ بس صبح نئے عزم کے ساتھ بیدار ہوئے اور کام کا آغاز تیس مجاہدین کو لے کر فرمایا، جن کے پاس صرف چھ کلاشنکوف تھیں، سب سے پہلا حملہ چمن کے قریب افغانستان کے شہر

اسپین بولاک میں پائے جانے والے غنڈوں پر کیا، جو مجاہدین کے بھیس میں راہ گیروں کو لوٹ رہے تھے، پہلے ہی حملے میں اُن پر قابو پالیا اور اُن کے اسلحے پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد تنہا جانب منزل چلنے والے ملّا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کا قافلہ بڑھتا گیا اور بنتا گیا۔ (اور اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو دِکھادیا کہ دُنیا کی بڑی بڑی شیطانی حکومتیں اور اپنے آپ کو سوپر پاوَر (Super Power) کہنے والی جرائم پیشہ طاقتیں اپنے غلط ارادوں اور کوششوں میں ناکام ہوکر رہ گئیں) (التجائے مسافر: ۸۰، سنہرے اَوراق: ۱۶۸)

صاحبو! قرآن وسنّت سے واضح ہوتا ہے کہ دین کی حفاظت کا عظیم الشان کارنامہ علمائے حقانی وربانی کی اصل پہچان ہے، دعوت کا کام تو عوام بھی کرسکتے ہیں؛ لیکن دین کی حفاظت کا کام علماء ہی کرسکتے ہیں۔

علمائے کرام اُمّت کے لیے دین کی ہدایت کا ذریعہ بنیں:

ستاروں کے وجود کا تیسرا اہم مقصد اور فائدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انھیں لوگوں کی رہنمائی اور رہبری کا ذریعہ بنایا ہے، حدیث پاک میں ہے: "وَعَلَامَاتٍ يُهْتَدىٰ بِهَا." لوگ رات کی تاریکی میں سفر کے دوران سمندروں اور صحراؤں میں ستاروں کے ذریعے راہ پاتے ہیں اور منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں، قرآنِ کریم نے اُسے یوں بیان فرمایا:

﴿وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ (النحل : ۱۶)

جس طرح آسمان کے ستاروں سے رہنمائی حاصل کرکے مسافر منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے تو حضرات علمائے کرام بھی زمین میں اللہ تعالیٰ کے ستارے ہیں، اُن سے بھی رہنمائی حاصل کرکے دُنیا کا مسافر اپنی منزلِ مقصود رضائے الٰہی حاصل کرسکتا ہے۔ ستارے ظاہری راستے کی رہنمائی کا ذریعہ ہیں تو حضرات علمائے کرام صراطِ مستقیم

اور دین حق کی جانب رہنمائی کا ذریعہ ہیں، لوگوں کی صراطِ مستقیم کی طرف رہبری کرنا حضرات علمائے کرام کی بنیادی ذمّے داری ہے۔ جس طرح ستارے بلا کسی امتیاز اور بلا کسی غرض کے ہر ایک کے لیے صحیح رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح حضرات علمائے کرام کو بھی بلا کسی فرق و امتیاز اور بلا کسی غرض پورے اِخلاص و اعتدال کے ساتھ ہر ایک کے لیے صحیح رہنمائی کی ذمّے داری ادا کرنی چاہیے، خواہ حالات اور حکومتیں موافق ہوں یا مخالف۔

حق تعالیٰ نے اپنے آخری رسول، محبوبِ کل، ہادیٔ سبل صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الأنعام : ۹۰)

''محبوبم! یہ حضراتِ انبیائے (کرام علیہم السلام) کا وہ مقدّس گروہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی، آپ بھی اُن کی ہدایت کا اتباع کیجیے۔''

حضرات مفسرین کے بیان کے مطابق یہاں سے ایک اصول یہ واضح ہوا کہ جب تک قرآن وسنّت میں سابقہ شریعت کے کسی حکم کی نفی نہ ہو وہ حکم اسلامی شریعت میں برقرار رہتا ہے، مثلاً رجم کی سزا قرآنِ کریم میں مذکور نہیں، یہ سابقہ شریعت کی سزا ہے، جس کو برقرار رکھا گیا ہے، وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

صاحبو! آیت قرآنی میں جب حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی ہدایت کی اتباع کا حکم امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تو یہ حکم اور ہدایت حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے وارثین و نائبین علمائے دین کو بھی ضرور ہے۔ حضرات علمائے کرام صراطِ مستقیم اور شریعت کی ہدایت کا اتباع کریں تب ہی وہ ہدایت کا ذریعہ بنیں گے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ انھیں دارین میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد کا درجہ عطا فرمائیں گے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور ہمیں حضراتِ علمائے حقّانی و ربّانی میں شامل فرما کر ادائے ذمّے داری کے لیے شرفِ قبولیت سے نوازیں۔ آمین۔

مؤرخہ: ۱۱ ربیع الآخر ۱۴۴۳ھ

مطابق: ۱۷ نومبر ۲۰۲۱ء، بروز بدھ

بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۷)

خود پسندی کی مذمّت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أَبِيْ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَتْ: "سُمِّيْتُ "بَرَّةَ"، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ، اللهُ أَعْلَمُ بِأَهْلِ البِرِّ مِنْكُمْ، سَمُّوْهَا "زَيْنَبَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٠٧، باب الأسامي)

ترجمہ: حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا نام (پہلے) ''برّۃ'' رکھا گیا تھا (جس کا مطلب ہے نیکوکار اور پاک باز) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو مناسب نہ سمجھا، اس لیے (کہ اس میں صورۃً اظہارِ خود پسندی اور دعوائے پارسائی ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے نفس کی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ تم میں سے واقعی متقی اور نیک کون ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''برّۃ'' کے بجائے ''زینب'' نام رکھنے کا حکم فرمایا۔

تمہید:

اللہ ربّ العزت والجلال اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، یہ اسی کا ثمرہ و

نتیجہ ہے کہ اُس نے تمام ہی مکلّف بندوں کی ہدایت کے لیے قرآنِ کریم نازل فرمایا:

﴿اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (البقرۃ : ۱۸۵)

قرآنی احکامات، ہدایات، تعلیمات اور واقعات کا اصل مقصد دنیائے انسانیت کی ہدایت ہی ہے۔ اور ہدایت کی حقیقت یہ ہے کہ مہربانی کے ساتھ منزلِ مقصود (رضائے الٰہی) تک رہنمائی کردی جائے۔

تو واقعہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے مہربانی فرما کر قرآنِ کریم کے ذریعے اُن تمام باتوں کی طرف ہماری رہنمائی فرمادی جو ہدایت کے لیے لازم اور ضروری ہیں، جن پر عمل کرنے والا بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اب یہ ہماری ذمّے داری ہے کہ قرآنِ کریم کی ہدایات وتعلیمات پر عمل کر کے راہ یاب اور کامیاب بنیں۔ یقین مانیے کہ قرآنی ہدایات وتعلیمات پر عمل کرنے میں ہمارا نفع اور اُس سے اعراض وروگردانی میں نقصان ہی ہے۔ قرآنِ کریم کے ہر حکم میں حکمت بھی ہے اور ہدایت بھی، خواہ اس کا تعلق مامورات سے ہو یا ممنوعات سے، سچّی اور پکّی بات یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اُن ہی باتوں کا حکم فرمایا ہے جن میں ہمارا دینی و دُنیوی، اُخروی، انفرادی اور اجتماعی نفع ہے، اور اُن ہی باتوں سے منع فرمایا ہے جن میں ہمارا دینی، دُنیوی، اُخروی، انفرادی یا اجتماعی نقصان ہے۔

خود پسندی کی حقیقت:

حق تعالیٰ نے منزلِ مقصود تک بآسانی رسائی کے لیے بعض باتوں کا حکم فرمایا تو بعض باتوں سے منع فرمایا، جن باتوں سے منع فرمایا ہے اُن میں سے ایک خود پسندی بھی ہے، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

''اپنے نفس کی اچھائی، پاکبازی و پارسائی کا اظہار نہ کرو۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خود پسندی کی ممانعت فرمائی، جس کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کسی کو علمی، عملی، ظاہری اور باطنی خوبی سے نوازا تو وہ بندہ اس خوبی کی وجہ سے خود کو دوسروں کے مقابلے میں اعلیٰ واَرفع، اچھا اور پسندیدہ سمجھے اور اپنی بڑائی و برتری کے لیے اس خوبی کا اظہار کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی علمی، عملی، ظاہری یا باطنی خوبی اور نیکی کی وجہ سے اس کی نظر خود پر ہو، خدا پر نہ ہو، اسے اپنا کمال سمجھے، خدا کا کرم نہ سمجھے تو یہ خود پسندی ہے۔

خود پسندی کی ممانعت:

قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے خود پسندی کی ممانعت فرمائی ہے:

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

اس ممانعت کی حقیقی حکمت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، البتہ کتاب وسنّت میں غور وفکر کے بعد بحمداللہ عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق اس ممانعت کی تین وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) خود پسندی ربِ کریم کی ناراضی اور گمراہی کا سبب ہے۔

(۲) خود پسندی رِیاکاری وبڑائی کا سبب ہے۔

(۳) خود پسندی کمالِ بندگی کے خلاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ اسباب اور وجوہات نہ ہوں اور بندہ اپنی کسی علمی، عملی، ظاہری یا باطنی خوبی ونیکی کا اظہارِ شکرِ نعمت یا بوقت ضرورت اظہارِ حقیقت کے طور پر کرے تو اس کی اجازت ہے۔ جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلّق ایک موقع پر فرمایا:

"وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلهِ، وَأَتْقَاكُمْ بِهِ". (متفق علیه / مشکوٰۃ:۴۷)

خود پسندی ربِ کریم کی ناراضی اور گمراہی کا سبب ہے:

لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود پسندی ربِ کریم کے منشا کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی ناراضی کا سبب ہے، بلکہ حضرات علمائے محققین نے خود پسندی کو ان بُرائیوں میں شامل فرمایا ہے جن سے اعمال کا اجر ضائع ہوجاتا ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عبرت آموز واقعہ نقل فرمایا کہ ایک تُرکی بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے سر پر ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کو گئے تو حج کے بعد یہ کیفیت بڑھنے کے بجائے ختم ہوگئی، اپنے مُرشد مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا: (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ) حج سے پہلے تمھارے اندر تواضع وانکسار تھا، اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے اِلحاح وزاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے ہو، یہ حج ہی تمھارے لیے (خود پسندی اور) غرور کا سبب بن گیا اور وہ کیفیت زائل ہوگئی۔ (معارف القرآن)

واقعہ یہ ہے کہ خود پسندی اور دیگر معاصی سے نیکیوں کے ضائع ہونے کے بجائے ہمارے اپنے اکاؤنٹ سے پیسے ضائع ہوتے اور کٹتے تو کوئی نہ خود پسندی میں مبتلا ہوتا، نہ دیگر معاصی میں؛ لیکن افسوس کہ آج ہمیں عموماً نیکیوں کے ضائع ہونے کی کوئی فکر ہے نہ یقین۔ اَللّٰھم احفظنا منه.

اگر خود پسندی کا علاج نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ یہ گمراہی کا سبب بن جاتی ہے، حدیث پاک میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گمراہی کے تیں اسباب بیان فرمائے ہیں: (۱) اتباعِ شہوت (۲) اتباعِ بخل (۳) خود پسندی۔ فرمایا: یہ ہلاکت وگمراہی کا سب سے خطرناک ذریعہ ہے۔

"وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ، وَهِيَ أَشَدُّهُنَّ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ٤٣٤، باب الغضب والكبر)

صاحبو! خود پسندی گمراہی کا وہ جال ہے جس میں اچھے اچھے لوگ بآسانی پھنس جاتے ہیں، شیطان کی ہلاکت و گمراہی کا ایک سبب بعض علماء نے خود پسندی بتایا ہے۔ (معارف القرآن: ۱/ ۱۳۲)

اللہ پاک نے شیطان کو علم و اجتہاد کی صلاحیت اور خوبی سے نوازا تھا، جس کی وجہ سے وہ خود پسندی میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے اپنے علم و اجتہاد کا تو غرور تھا؛ لیکن اپنے غرور کا علم نہ تھا، اُس نے حضرت آدم علیہ السلام سے خود کو بہتر سمجھا اور ﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ (الأعراف:۱۲) کا نعرہ لگایا، اس کی نظر خودی پر تھی، حکم خدا پر نہ تھی، اس کی یہ خودی ہی اس کی گمراہی کا سبب بن گئی۔

اسی طرح اہل کتاب اولادِ انبیاء اور نسل انبیاء ہونے کے باوجود ہلاک اور گمراہ کیوں ہوئے؟ "المَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّالِّيْنَ" کیوں قرار دیے گئے؟ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کی گمراہی بھی اُن کی خود پسندی ہی کے سبب تھی، وہ لوگ اولادِ انبیاء ہونے کے سبب اپنے آپ کو مقدّس اور سب سے افضل سمجھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدة : ١٨)

''ہم تو اللہ کے بیٹے (کی طرح) اور اس کے چہیتے ہیں۔''

"We are the Chosen people of the God."

خود پسندی کے سبب اُن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ جنّت کے حقدار ہم ہی ہیں، ہمارے علاوہ کوئی جنّت کا حقدار ہے ہی نہیں۔

﴿وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ (البقرۃ:۱۱۸)

ان کی اس خود پسندی پر ربّ العالمین نے ناگواری کا اِظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾ (النساء : ۴۹)

''کیا آپ نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو خود کو پاک ظاہر کرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے پاک فرماتا ہے اور ان پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

محض اولادِ انبیاء اور نسل انبیاء ہونے کی وجہ سے کوئی مقدّس نہیں بن جاتا، لہٰذا یہود و نصاریٰ کو اس بنیاد پر خود کو دوسروں سے مقدّس، اعلیٰ و اَرفع سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔

اور صاحبو! یہی حکم ان شہزادوں، سیّد زادوں، پیر زادوں اور مہتمم زادوں کے لیے بھی ہے جو خود کو دوسروں سے مقدّس، اعلیٰ اور اَرفع سمجھتے ہیں، اگر وہ بھی خود پسندی کی اِس بُرائی سے تائب نہ ہوئے تو سخت اندیشہ و خطرہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح وہ بھی خود پسندی کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔ العیاذ باللہ۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

شیطان بسا اَوقات بڑے سمجھے جانے والوں کو اسی بُرائی میں مبتلا کر کے گمراہ کرنا چاہتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے کہ شیطان ایک مرتبہ ایک عارف باللہ بزرگ کے پاس آ کر انھیں وسوسے ڈالنے لگا اور کہنے لگا کہ اگر آپ کا اِس بات پر پختہ ایمان و یقین ہے کہ اِس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، تو تم اِس پہاڑ سے چھلانگ لگا دو، پھر دیکھو کہ تم بچتے ہو یا مرتے ہو؟ ان بزرگ نے جواب میں

عجیب بات بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں امتحان کے لیے پیدا فرمایا ہے، اس لیے حق تعالیٰ تو ہمارا امتحان لے سکتے ہیں؛ لیکن ہم اپنے رب کا امتحان نہیں لے سکتے، ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ پہاڑ سے چھلانگ لگا کر، آگ میں کود کر، یا اسبابِ رزق چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا امتحان لیں کہ دیکھیں حق تعالیٰ ہمیں بچاتے اور روزی پہنچاتے ہیں یا نہیں!

حضرت کے اس جواب لا جواب سے بھی شیطان مایوس نہ ہوا؛ بلکہ دوسرا حملہ کرتے ہوئے کہنے لگا: حضرت! آپ اپنے علم کے سبب آج مجھ سے بچ گئے! اس پر حضرت نے فرمایا: مردود! دور ہو، میں اپنے علم کے سبب نہیں؛ بلکہ اپنے رب کے فضل وکرم سے بچا ہوں۔ اسی طرح کا جواب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ شیطان کا یہ دوسرا حملہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا، کیوں کہ اس کے ذریعے وہ خود پسندی میں مبتلا کر کے گمراہ کرنا چاہتا تھا، لیکن ان بزرگوں کی نظر خودی پر نہیں، فضل خدا پر تھی اور حق تعالیٰ یہی چاہتے ہیں، اس لیے خود پسندی کی ممانعت فرمائی:

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

خود پسندی، ریا کاری وبڑائی کا سبب:

اس ممانعت کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عموماً خود پسندی اپنی پارسائی ونیکی اور علمی وعملی خوبی کا اظہار، ریا کاری اور اپنی بڑائی کے لیے ہی کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ کارنامہ انجام دیا، میری محنت و دعوت سے یہ ہوا، اور وہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے کارناموں کا دعویٰ، خوبی، نیکی اور پارسائی کا اظہار وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دامن نیکیوں سے اور دِل تقویٰ سے خالی ہوتا ہے، مثل مشہور ہے: ''تھوتھا چنا باجے گھنا'' ایسے ہی لوگوں کو اپنی نیکیوں اور کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

پھر اس طرح خود پسندی کے سبب ایسے لوگ جانے انجانے میں رِیا کاری اور بڑائی میں مبتلا ہوجاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، کیوں کہ رِیا کاری تو شرکِ اصغر ہے، جس سے اعمالِ صالحہ کا اجر وثواب ضائع ہوجاتا ہے، جب کہ بڑائی اور کبر کفر کا سبب ہے، شیطان کبر ہی کے سبب کفر میں مبتلا ہوا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (صٓ : ٧٤)

اسی طرح قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے بھی دعوت اور توحید کا اِنکار کبر ہی کے سبب کیا، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت:٣٥)

غالباً یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نہ صرف رِیا کاری اور کبر و بڑائی سے منع فرمایا؛ بلکہ ہر اس چیز سے بھی منع فرمادیا جو رِیا کاری اور بڑائی کا ذریعہ ہے، مثلاً ہر اُس لباس سے منع فرمادیا جس کے پہننے کا مقصد رِیا کاری و بڑائی ہو، حدیث پاک میں ایسے لباس پہننے والوں کے لیے وعید بیان ہوئی ہے کہ جو بندہ دُنیا میں رِیا وشہرت کے لیے لباس پہنے گا قیامت کے دِن اُسے ذلیل کیا جائے گا۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا، أَلْبَسَ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (رواه أبوداود، مشكوٰة المصابيح : ٣٧٥)

یاد رکھو! کہ جو مَرد وزَن لباسِ فاخرہ کسی بھی موقع پر اس مقصد سے پہنتے ہیں کہ دوسروں پر اپنی بَرتری اور بڑائی کا اِظہار ہو تو وہ اسی ممانعت و مذمّت میں داخل ہیں؛ بلکہ اس حدیث پاک کے تحت حضرات محدثین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو بندہ حضرات علماء وصوفیاء کی طرح لباس اور دستار وغیرہ پہنتا تو ہے؛ لیکن اتباعِ شریعت اور

علماء وصوفیاء کی مشابہت کی نیت سے نہیں؛ بلکہ اپنی شہرت اور اس حوالے سے لوگوں میں نام اور مقام حاصل کرنے کی نیت سے۔ العیاذ باللہ۔ تو وہ بندہ بھی اس وعید میں شامل ہے۔ واللہ اعلم۔ (مستفاد از: توضیحات: ۶/ ۴۵۲)

اور حدیث مذکور سے واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسا نام بھی پسند نہیں تھا جس میں صورۃً اِظہارِ بڑائی ہو، چنانچہ سیّدہ زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کا نام اُن کے والدین نے ''برّہ'' رکھا تھا، جس کے معنیٰ ہیں نیکوکار، بظاہر اس نام میں خود کی بڑائی و پارسائی کا اِظہار ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ جب کبھی اُن سے پوچھا جائے گا کہ تم کون ہو؟ تمھارا کیا نام ہے؟ تو کہیں گی کہ "أَنَا بَرَّة"، میں پاکباز اور نیکوکار ہوں۔ اگرچہ اس جواب دیے جانے میں خود کی بڑائی و پارسائی کا اظہار حقیقۃً مقصود نہیں ہوتا؛ لیکن غیر ارادی طور پر بھی اِظہارِ بڑائی وخود پسندی کا شُبہ ہے، جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو بدل کر ''زینب'' رکھ دیا۔

یہ ممانعت ابتدا میں تھی، بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو حرج اور مشقت سے بچانے کے لیے اس قسم کے ناموں کی اِجازت دے دی؛ لیکن اس میں سبق ہے کہ جب ایسا نام بھی پسندیدہ نہیں جس میں غیر ارادی طور پر اِظہارِ بڑائی و پارسائی ہو تو ایسے کام اور کارناموں کو کیسے پسند کیا جائے گا جن کو بندہ حقیقۃً ریاکاری اور دوسروں پر اپنی برتری و بڑائی ثابت کرنے کے لیے بیان کرتا ہو۔ حق تعالیٰ نے ممانعت فرمادی:

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

حتیٰ کہ اگر کوئی بندہ تواضع و عاجزی کا اِظہار لوگوں میں اپنا اعتقاد بڑھانے کے لیے کرے، مثلاً اپنے نام کے ساتھ "العبد الضعيف، العبدالعاصي" یا ''عاصی پرمعاصی، سیاہ کار، ذرّۂ بے مقدار، ناکارہ'' وغیرہ اِس نیت سے لکھے کہ لوگ یہ

سمجھیں کہ واقعی حضرت بہت متواضع شخصیت ہیں۔العیاذ باللہ۔تو یہ بھی ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا أَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم:۳۲) کی ممانعت میں داخل ہے۔(مستفاداز: انوارالبیان:۶ ۲۳۶)

کیوں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ایسے نام پسند نہیں فرمائے جن میں اظہارِ خود پسندی و پارسائی ہو، اسی طرح ایسے نام بھی پسند نہیں فرمائے جن میں گناہ کے معنیٰ ہوں، حدیث پاک میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی کا نام ''عاصیہ'' تھا، جس کے معنیٰ ہیں گنہگار، نافرمان، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو بدل کر ''جمیلہ'' رکھ دیا۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ بِنْتًا كَانَتْ لِعُمَرَ يُقَالُ لَهَا: "عَاصِيَةُ"، فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : "جَمِيْلَةَ". (مسلم، مشكوٰة : ٤٠٧)

الغرض ہر وہ عمل، نیکی یا خوبی جس کا مقصد خود پسندی و اظہارِ بڑائی ہو تو حق تعالیٰ نے اُس سے منع فرمادیا:

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا أَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

خود پسندی کمالِ بندگی کے خلاف ہے:

اس ممانعت کی تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود پسندی کمالِ بندگی کے بھی خلاف ہے، بندگی کا تقاضا تو یہ ہے کہ بندہ بڑے بڑے اعمال اور کارنامے انجام دے کر بھی اپنی نفی کرے کہ اے اللہ! میں نے کچھ نہیں کیا؛ بلکہ تیرے فضل و کرم سے یہ کام میرے ذریعے ہوا۔

﴿وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ إِلَّا بِاللهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ﴾ (هود : ۸۸)

کاملین کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے کارناموں اور اعمال کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ثمرہ و نتیجہ سمجھتے ہیں، اور یہی حقیقت بھی ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ ﴾ (النور:۲۱)

''اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بندہ کبھی بھی طہارتِ قلبی اور پارسائی کا مقام حاصل نہ کر پاتا، لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے پاک فرما دیتا ہے۔''

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
یہ قدم اُٹھتے نہیں، اُٹھائے جاتے ہیں

اس لیے کاملین بڑے بڑے کارنامے اور اعمال کر کے اپنی نفی کرتے ہیں، وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ پتا نہیں ہمارا عمل اللہ تعالیٰ کے حضور قابل قبول ہوگا بھی یا نہیں، جس کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا:

﴿وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (المؤمنون : ٦٠)

اسی لیے عارفین کاملین اعمالِ صالحہ کے بعد بھی استغفار کا اہتمام کرتے ہیں، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور عمل بھی یہی تھا، حدیث پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد تین مرتبہ استغفار فرماتے تھے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهٖ اِسْتَغْفَرَ ثَلَاثًا". (مسلم، مشكوٰة : ٨٨، باب الذكر بعد الصلوٰة)

معصوم و مغفور ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کی کثرت کیوں فرماتے تھے؟

یہاں سوال یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آپ کو تو من جانب اللہ مغفرت کی بشارت دی گئی، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کا اہتمام کیوں فرماتے تھے؟ حتیٰ کہ حدیث پاک میں تو یہاں تک مروی ہے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک دِن میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار فرماتے تھے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَاللهِ إِنِّيْ لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ فِيْ الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً". (البخاري، مشكوٰة : ۲۰۳، باب الاستغفار والتوبة)

حضرات علمائے محققین نے اس کی مختلف وجوہات بیان فرمائی ہیں:

(۱) استغفار اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ حکم ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

﴿وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ (النساء : ۱۰۶)

''اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔'' اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔

(۲) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبی تعلق ہمہ وقت اپنے رب کے ساتھ رہتا تھا؛ لیکن کبھی کبھی مباح اور جائز چیزوں و چاہتوں مثلاً ماکولات، مشروبات، منکوحات، مرغوبات (کھانے پینے اور اہل خانہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے) کے سبب اختیاری یا غیر اختیاری طور پر تعلق مع اللہ کی اُس کیفیت میں فرق آجاتا، یہ چیزیں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ربّ العالمین کے درمیان ایک طرح حائل ہوجاتیں، جس کو حدیث شریف میں اس طرح فرمایا:

" إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِي." (مسلم، مشكوٰة : ۲۰۳)

''میرے دِل پر معمولی سا دُھواں یا دُھندلا پن آجاتا ہے۔'' جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔ (صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کو ''قبض'' کہتے ہیں) تاکہ وہ کیفیت ختم ہوجائے۔ (مستفاد از: توضیحات: ۸۸/۴)

(۳) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ کثرت استغفار اپنے لیے نہیں؛ بلکہ اُمّت کے

گناہوں کی معافی اور مغفرت کے لیے تھا، اس کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ایک رات آپ ﷺ نمازِ تہجد میں ایک ہی آیت کریمہ بار بار پڑھتے رہے، حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاٰيَةٍ، حَتّٰى أَصْبَحَ يُرَدِّدُهَا، وَالْاٰيَةُ: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (المائدة:۱۱۸) (النسائي، ابن ماجه، مشكوٰة:۱۰۷، باب صلاة الليل)

جس کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! اگر آپ اُن کو (جو کفر پر مرے، کما فی القرطبی) عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر آپ اُن کی مغفرت فرما دیں (جو موت سے قبل توبہ کر چکے، کما فی القرطبی) تو آپ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔''

گویا آیت کریمہ میں اللہ پاک کے سامنے بندوں کی عاجزی و بے بسی کا اِظہار بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہونے کا بیان بھی، پھر ان دونوں باتوں کے حوالے سے عفو و مغفرت کی التجا بھی ہے، ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا ساری رات صبح تک اس آیت کریمہ کو تلاوت فرما کر معافی طلب کرنا اُمّت کے لیے تھا۔

(۴) آپ ﷺ خشیت الٰہی کے غلبے کی وجہ سے بہ کثرت استغفار فرماتے تھے، حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا کوئی نہیں تھا، آپ ﷺ سب سے زیادہ اللہ پاک سے ڈرتے تھے۔

"وَاللهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ، وَأَتْقَاكُمْ لَهُ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۲۷ / باب الاعتصام بالكتاب السنة)

''میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں۔'' اسی وجہ سے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔

(۵) استغفار میں اُن فرشتوں کے ساتھ مشابہت ہے جو حاملین عرشِ الٰہی ہیں۔ لقولہٖ تعالیٰ:

﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (غافر : ۷)

''اس آیت کریمہ میں حاملین عرش اور اس کے گرد طواف کرنے والے فرشتوں کا معمول بیان کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اہل ایمان کے لیے استغفار کا اہتمام کرتے ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطورِ تواضع حاملین عرش فرشتوں کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔

(۶) استغفار کی اہمیت، عظمت اور فضیلت کے اظہار کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔

(۷) اُمّت کی تعلیم و تاکید کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ کثرت استغفار فرماتے تھے۔

نماز کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل اِن ہی وجوہات کے سبب تھا۔

اعمالِ صالحہ کے بعد اہتمامِ استغفار:

بہر کیف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل یا تو تواضعاً تھا، یا تعلیم اُمّت کے لیے تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل میں نصیحت و ہدایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامل نماز کے باوجود اُسے بطورِ تواضع اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے استغفار فرماتے تھے، تو ہمیں بدرجۂ اولیٰ اس کا اہتمام کرنا چاہیے؛ کیوں کہ ہمارا عمل نیت کی خرابی یا کسی نہ کسی کوتاہی کے سبب کامل نہیں ہوسکتا، اس لیے عمل صالح کے بعد بھی استغفار کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی تعلیم و ترغیب بھی دیتے تھے، چنانچہ اس اُمّت کے سب سے کامل فرد سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللهِ! عَلِّمْنِيْ دُعَاءً أَدْعُوْ بِهٖ فِيْ صَلَاتِيْ، قَالَ: "قُلْ: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۸۷ / باب الدعاء في التشهد)

''حضور! مجھے کوئی ایسی دُعا بتا دیجیے جسے میں نماز میں پڑھوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو دُعا سکھائی وہ یہ ہے کہ "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ...الخ"

غور کیجیے کہ پڑھی ہے نماز، اور وہ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے؛ لیکن نماز کے اخیر میں جو دُعا بتائی جا رہی ہے اس کے شروع میں اپنے گناہ کا اقرار و اعتراف ہے کہ میں نے بہت ظلم کیا ہے، مجھے معاف فرما دیجیے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت و تعلیم کے پیشِ نظر عارفین کاملین فرماتے ہیں کہ ہر نیکی اور اچھے عمل کے اخیر میں استغفار کر لینا چاہیے، یہ جہاں گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے وہاں اعمالِ صالحہ میں ہونے والی کمی و کوتاہی کی تلافی کا بھی ذریعہ ہے۔

عارفین کاملین کا طریقہ یہی رہا ہے جس کی گواہی قرآنِ کریم نے اس طرح دی کہ وہ شب بیداری کے بعد آہِ سحر گاہی کا اہتمام کرتے ہیں۔

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾﴾

(الذّٰریٰت : ۱۸-۱۷)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیکیاں کر کے بھی اِتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرائیاں کر کے بھی اُتنے نہیں ڈرتے۔ (قرطبی)

صبح توبہ ہے، شام توبہ ہے، ہر وقت اہتمامِ توبہ ہے
با اثر ہے یا بے اثر تو جان، اپنے کرنے کا کام توبہ ہے

ایسے لوگ ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنا پیارا اور پسندیدہ بنانے کے لیے خود پسندی کی ممانعت فرمادی۔

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ﴾ (النجم : ۳۲)

حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے خود پسندی اور تمام شرور و فتن سے بچا کر ہمیں ایسا بنادیں کہ ہم اُسے پسند آجائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

مؤرّخہ: ۲۷ ربیع الآخر ۱۴۴۳ھ
مطابق: ۳ دسمبر ۲۰۲۱ء
بروز جمعہ، بعد الفجر
بزمِ صدیقی بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

(۲۸)

مال ومرتبے کی حرص وہوس ہلاکت کا سبب ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنِ ابْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكِنِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ."

(رواه الترمذي والدارمي، مشكوٰة : ٤٤١، كتاب الرقاق)

ترجمہ: حضرت ابن کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہما اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا کہ مسلمان کے دین کو اس کی مال ومرتبے کی حرص وہوس سے نقصان ہوتا ہے۔''

حرص وہوس دینی اُمور میں محمود تو دُنیوی اُمور میں مذموم ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی فطرت وطبیعت کچھ اس طرح بنائی ہے کہ

ایک چیز کو حاصل کرنے کے بعد اُس کے دِل میں اور زیادہ کی خواہش، حرص و ہوس اور لالچ رہتی ہے، عموماً کسی ایک چیز سے اُس کا جی بھرتا نہیں ہے، دِل میں ہر وقت "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" کی خواہش رہتی ہے۔

کسی بھی چیز سے جی نہ بھرنے اور ہمیشہ زیادتی کی خواہش رکھنے کو عربی میں ''حرص'' اور اُردو میں ''لالچ'' کہتے ہیں، یہ انسان کی فطری اور پیدائشی خصلت ہے۔ انسان کی اس خصلت وفطرت کو حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ." (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٥٠)

''اگر انسان کے پاس مال و دولت سے بھری ہوئی دو وادیاں (پہاڑوں کے درمیان کی جگہ) ہوں تب بھی وہ تیسری کی تلاش میں رہے گا، اور انسان کے پیٹ کو (قبر کی) مٹّی کے علاوہ اور کوئی چیز بھر نہیں سکتی، اور جو بندہ (حرص سے) توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔''

ولید بن مغیرہ سے متعلّق قرآنِ کریم میں منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اُسے مال و اولاد اور زمین و جائداد سے خوب نوازا تھا، اس کے باغات مکّہ مکرّمہ سے طائف تک پھیلے ہوئے تھے، سالانہ آمدنی ایک کروڑ دینار تھی، پھر بھی وہ تمنّا کرتا تھا کہ اس کے مال و جائداد اور بڑھ جائیں، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بیان فرمایا: ﴿ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيْدَ﴾ (المدثر:١٥) اسی کو حبّ دنیا، طمع، حرص اور لالچ کہتے ہیں۔

آزاد لکھنوی نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ

بھر نہیں سکتا کبھی لالچ کا پیٹ دَھنستا رہتا ہے گڑھا پاٹا ہوا

حرص و ہوس اور لالچ دینی اُمور میں تو محمود اور نافع بلکہ نجات کا ذریعہ ہے، جب کہ دُنیوی اُمور میں مذموم اور بُری چیز ہے، ہلاکت کا سبب ہے۔ حرص و ہوس اور لالچ ہی کے سبب درِندے اور پرندے پنجروں میں اور مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے اور خود انسان بھی مختلف گناہوں اور بُرائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ ''لالچ بُری بلا ہے۔'' بلکہ بہت ہی بُری بلا ہے۔ مرشدی حضرت شیخ الزمان مدظلہ العالی نے فرمایا کہ ورع (تقویٰ) بہترین چیز ہے تو طمع (لالچ) بدترین۔

مال و مرتبے کی حرص و ہوس سے ہونے والی ہلاکت کی مثال:

اس حقیقت کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معجزانہ اُسلوب و انداز میں ایک نہایت ہی بلیغ و بہترین مثال کے ذریعے سمجھایا کہ بھیڑیا جو کہ ایک خونخوار اور اندھا دھند حملہ کرنے والا درندہ ہے، بالخصوص جس وقت وہ بھوکا ہوتا ہے تو حملہ کرنے میں بالکل پاگل ہوجاتا ہے، اور اگر ایسے بھیڑیے ایک نہیں بلکہ دو ہوں اور وہ بکریوں کے کسی ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو اُن دونوں بھوکے بھیڑیوں کی جوڑی سے جس طرح کوئی بکری محفوظ و سلامت نہیں رہ سکتی اسی طرح مال و مرتبے کی حرص کو بھی دو بھوکے بھیڑیے سمجھ لو۔ جب ایک مسلمان مال و مرتبے کی حرص و ہوس میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر اس سے اس کے دین و ایمان کا اس سے بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے جتنا کہ بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑنے سے ہوتا ہے، جس طرح دو بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے تو کوئی بکری شاید ہی سلامت رہ سکتی ہے اسی طرح جس بندے میں مال و مرتبے کی حرص و ہوس پیدا ہوجائے وہ شاید ہی ہلاکت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

نیز دو بھوکے بھیڑیوں سے جو نقصان ہوگا وہ دُنیوی ہوگا، جب کہ مال و مرتبے

کی حرص و ہوس سے ہونے والا نقصان دینی اور اُخروی ہوگا، ایسا بندہ قیامت کے دِن کف افسوس ملتے ہوئے کہے گا:

﴿مَآ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَهۡ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَهۡ ۚ﴿۲۹﴾﴾ (الحاقة : ۲۸ - ۲۹)

''مجھے میرا مال کام نہ آیا، میرا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔''

حرصِ مال کی پہلی قسم: بخل میں مبتلا ہونا:

ہمارے علمائے محدثین و محققین نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں جہاں تک تعلق ہے حرصِ مال کا تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ حرصِ مال کی پہلی قسم یہ ہے کہ بندہ مال کی شدید محبّت میں مبتلا ہوجائے، انسان کی اس سرشت کو قرآنِ کریم میں بیان کیا گیا:

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ۚ﴿۸﴾﴾ (العادیات : ۸)

''اور بے شک انسان مال کی محبّت میں بڑا سخت ہے۔''

مال کی یہ حرص و ہوس اور شدید محبّت حریص بندے کو بخیل بھی بنا دیتی ہے، پھر وہ کمانے میں تو بڑا چست ہوتا ہے لیکن خرچ کرنے میں نہایت سست ہوتا ہے، کمانے کا کوئی جائز اور مباح موقع چھوڑتا نہیں، کمانے میں وہ ایسا مشغول رہتا ہے کہ گویا یہی زندگی کا اہم اور بنیادی مقصد ہو۔

ظاہر ہے کہ مال کی یہ حرص و ہوس تو مذموم ہے ہی؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس سے کم درجے کے حرص کو بھی پسند نہیں فرمایا، چنانچہ حدیث مذکور کے شانِ ورود میں منقول ہے کہ حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے خیبر کی زمین میں سے سو حصے (جو مجاہدین میں تقسیم ہوئے تھے) خرید لیے، (ظاہر ہے کہ مالِ حلال سے اس طرح خریدنا ناجائز تو نہیں ہے؛ لیکن اس میں حرصِ مال کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لیے) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

اس کی اطلاع ملی تو آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر بکریوں کا مالک بکریوں سے جدا ہو، پھر ان بکریوں میں دو خونخوار بھیڑیے جا پہنچیں، تو وہ انھیں اِتنا تباہ نہیں کر سکتے جتنا مسلمان کے دین کو مال ومرتبے کی حرص وہوس ہلاک کر دیتی ہے۔ (طبرانی)

صاحبو! حرصِ مال کی اس پہلی قسم میں اگر کوئی اور خرابی اور بُرائی نہ ہو تب بھی یہی مصیبت کیا کم ہے کہ انسان اپنی عمرِ گراں مایہ اور اپنے راحت وآرام کو دُنیائے فانی کے اموال کی طلب وجستجو میں ضائع کر دے، کیوں کہ یہ تو حقیقت ہے کہ "اَلرِّزْقُ مَقْسُوْمٌ، وَالحَرِیْصُ مَحْرُوْمٌ". روزی اللہ تعالیٰ نے تقسیم فرما دی ہے، ہر ایک کی روزی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے، اس سے زیادہ تو کسی کو ملنے والی نہیں ہے، خواہ بندہ کتنے ہی ہاتھ پیر مارلے، اور جب تقدیر برحق ہے تو حرص وہوس ناحق ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حرصِ مال کے سبب اس کی تلاش اور جستجو میں مشغول رہنے والا حریص عمر عزیز کی مسرّت وآرام سے محروم رہ جاتا ہے، بالآخر زندگی بھر کا کما کر جمع کیا ہوا مالِ حلال بھی یہیں رہ جاتا ہے جس سے بعد والے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ لیکن مال کا حساب اُس حریص بندے کی گردن پر رہ جاتا ہے، اس لیے کہ مال کا مآل (انجام) یہی ہے کہ اس کے حلال میں حساب اور حرام میں عذاب ہے۔ العیاذ باللہ۔

حرصِ مال کی دوسری قسم "شُح" میں مبتلا ہونا:

حرصِ مال کی دوسری قسم یہ ہے کہ بندہ مال کی حرص وہوس اور شدید محبّت میں حد سے تجاوز کر جائے، تحصیل مال میں نہ حلال کی فکر کرے نہ حرام کا خیال، نہ جائز کی پرواہ ہو نہ ناجائز کی۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

نہ حلال کی فکر، نہ حرام کی پرواہ　　بس جدھر سے آئے اُدھر سے لا

یاد رکھو! سود کی روٹی اور سُور کی بوٹی (حرام ہونے میں) برابر ہیں۔

پھر حصولِ مال کے بعد واجب الذمّہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور خودغرضی و ناشکری میں مبتلا ہوجائے، حرصِ مال کی اس کیفیت کو ''شُح'' کہتے ہیں، جو کہ بخل کا اعلیٰ درجہ ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''شُح'' ایسے بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص و ہوس بھی ہو۔ (قرطبی) اس کا مطلب یہ ہے کہ حرصِ مال کی اس دوسری قسم یعنی شُح میں مبتلا ہونے والے کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ خود کے پاس جو کچھ مال ہے اس میں تو وہ بخل سے کام لیتا ہے، واجب الذمّہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، جہاں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں بھی خرچ نہیں کرتا، پھر دوسروں کے مال میں بھی لالچ رکھتا ہے کہ وہ مال بھی میرے پاس کیسے آجائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت ہی بدترین درجے کی خرابی اور بُرائی ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "شَرُّ مَا فِي رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ." (أبوداؤد، مشكوٰة: ص۱۶۵، باب الإنفاق وكراهية الإمساك)

''انسانی خصلتوں اور عادتوں میں سے دو عادتیں بدترین ہیں: (۱) شُح یعنی انتہائی درجے کی بخیلی (۲) انتہائی درجے کی نامردی۔''

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حرصِ مال کی دوسری قسم ''شُح'' بدترین درجے کی بُرائی و خرابی اس لیے بھی ہے کہ یہ مختلف بُرائیوں کی بنیاد اور جڑ ہے، عموماً اِس بُرائی میں مبتلا ہونے والا شخص واجب الذمّہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی، ناشکری، خودغرضی، قطع تعلق، ظلم و زیادتی بلکہ خون ریزی جیسی مہلک خرابیوں اور بُرائیوں میں مبتلا ہوکر ہلاک اور تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ اس لیے حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اِتَّقُوا الظُّلْمَ؛ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاتَّقُوا الشُّحَّ؛ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ، وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ١٦٤)

''لوگو! ظلم سے بچو؛ کیوں کہ ظلم قیامت کے دِن بہت سی تاریکیوں کا سبب ہوگا۔ (جن میں ظالم بندہ بھٹکتا رہے گا) نیز ''شُح'' سے بھی بچو؛ کیوں کہ شُح نے تم سے پہلے والے لوگوں کو ہلاک کر دیا، اسی شُح کے سبب وہ لوگ خون ریزی اور حرام خوری میں مبتلا ہو گئے۔''

ایک سبق آموز واقعہ:

اس سلسلے میں ایک سبق آموز واقعہ حدیث پاک میں منقول ومشہور ہے کہ بنی اسرائیل میں تین شخص تھے، جن میں سے ایک تو ''اَبرص'' یعنی کوڑھی تھا، دوسرا ''اَقرع''، یعنی گنجا (ٹکلا نہیں، دونوں میں فرق ہوتا ہے، ٹکلا وہ ہوتا ہے جس نے سر کے بال منڈوا دیے ہوں، یا جس کے سر کے بال غائب ہو گئے ہوں، جب کہ گنجا اُسے کہتے ہیں کہ بچپن میں جس کے سر میں پھوڑے پھنسیوں کی بیماری ہو جانے کی وجہ سے پورے سر کے بال اُکھڑ جائیں اور کھال بھی متاثّر ہو جائے، سر سے بدبو بھی اُٹھتی رہتی ہو، بعض اوقات یہ بیماری بلوغ کے بعد تک رہتی ہے۔ توضیحات: ۵۱۶/۳) اور تیسرا ''اَعمیٰ''، یعنی اندھا تھا۔

حق تعالیٰ نے انھیں (مال کی نعمت سے مالا مال فرما کر) آزمانا چاہا (کہ یہ نعمت مال کا شکر ادا کرتے ہیں یا نہیں) چنانچہ اُن کے پاس انسانی شکل میں ایک فرشتہ مسکین فقیر بن کر آیا (سابقہ امتوں میں ایسا ہوتا تھا، اس اُمّت میں یہ سلسلہ باقی نہیں

رکھا گیا)۔

انسانی شکل میں یہ فرشتہ سب سے پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوڑھ کے اس مرض سے نجات مل جائے اور خوب صورت شکل نصیب ہو۔ یہ سن کر فرشتے نے اس کوڑھی کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو بفضلہٖ تعالیٰ اس کا یہ مرض ختم ہو گیا، اسے بہترین رنگ و روپ اور کھال عطا کر دی گئی۔ پھر فرشتے نے اُس سے پوچھا کہ بتاؤ! تمھیں کونسا مال پسند ہے؟ اس نے کہا: اونٹ، تو فرشتے نے فوراً اُسے حاملہ اونٹنی دے کر یہ دُعا دی کہ اللہ پاک تمھارے اس مال میں خیر و برکت عطا فرمائیں۔

پھر یہ فرشتہ گنجے کے پاس گیا اور اس سے بھی وہی سوال کیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس گنجے پن سے نجات مل جائے اور میرے سر پر بہترین بال آجائیں۔ فرشتے نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو بفضلہٖ تعالیٰ اس کا گنجا پن دور ہو گیا اور اُسے بہترین قسم کے بال عطا کر دیے گئے۔ پھر فرشتے نے اس سے پوچھا کہ تمھیں مال میں سے کیا پسند ہے؟ اس نے کہا: گائے، چنانچہ اُسے ایک حاملہ گائے دے کر فرشتے نے دُعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اس مال میں خیر و برکت عطا فرمائیں۔

اس کے بعد یہ فرشتہ اَندھے شخص کے پاس آیا، اس سے بھی پوچھا کہ تمھیں کیا پسند ہے؟ اس نے کہا: یہی کہ اللہ تعالیٰ میری بینائی واپس لوٹا دیں، تاکہ میں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ فرشتے نے اُس پر بھی ہاتھ پھیرا، تو بفضلہٖ تعالیٰ اُسے بینائی مل گئی۔ پھر فرشتے نے پوچھا کہ تمھیں کونسا مال پسند ہے؟ اس نے کہا: بکری، تو اُسے ایک حاملہ بکری عنایت فرما کر برکت کی دُعا دی۔

(اس کے کچھ عرصے بعد) پھر کوڑھی، گنجے اور اندھے کے مویشیوں نے بچّے

دیے اور ان کا سلسلہ چلا، بڑھا، یہاں تک کہ کوڑھی کے اونٹوں سے ایک جنگل بھر گیا، گنجے کی گایوں سے بھی ایک جنگل بھر گیا، نیز اندھے کی بکریوں سے بھی ایک جنگل بھر گیا۔ (اب ان تینوں کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے)

اس کے بعد پھر فرشتہ کوڑھی کے پاس اپنی اُسی پہلے والی شکل میں فقیر، مسکین بن کر حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں ایک مسکین ہوں، میرا تمام سامانِ سفر دورانِ سفر ضائع ہو گیا ہے، اس لیے آج منزل تک پہنچنے کے لیے مجھے تمھاری ضرورت ہے، جس رب نے تمھیں یہ سب کچھ دیا ہے اُسی کے واسطے سے میں تم سے ایک اونٹ کا سوال کرتا ہوں؛ تا کہ اس کے ذریعے میں اپنا سفر پورا کر سکوں۔ (مال و دولت کی کثرت کے باوجود وہ کوڑھی حریص و لالچی بن گیا تھا، لہٰذا جنگل بھر کر اونٹ ہونے کے باوجود اللہ کی راہ میں ایک اونٹ دینے کو تیار نہ ہوا اور حیلے بہانے بنانے لگا) تو وہ کہنے لگا: "اَلْحُقُوْقُ كَثِيْرَةٌ" میرے ذمّے بہت سارے حقوق ہیں، اس لیے فی الحال تو ایک بھی اونٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ فرشتے نے جواب میں کہا کہ میں تجھے پہچانتا ہوں، کیا تم وہی کوڑھی نہیں جس سے لوگ گھن کرتے تھے اور اُس وقت تم نہایت قلاش اور محتاج تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تمھاری اُس بدحالی کو خوش حالی میں بدل دیا؟

یہ سن کر کوڑھی مُکر گیا اور کہنے لگا: نا جی نا! یہ خوش حالی تو مجھے پیدائشی طور پر وراثت میں ملی ہے، فرشتے نے کہا کہ تو جھوٹا ہے، سچ وہی ہے جو میں نے کہا؛ لیکن حرصِ مال نے تجھے خود غرض، لالچی اور ناشکرا بنا دیا ہے، اب میری بددُعا ہے کہ اللہ تجھے تیری سابقہ حالت پر لوٹا دے۔

پھر یہ فرشتہ گنجے کے پاس گیا اور اُس سے بھی وہی کہا جو کوڑھی سے کہا تھا، تو گنجے نے بھی وہی جواب دیا جو کوڑھی نے دیا تھا، اُسے بھی فرشتے نے آئینہ دِکھا دیا اور اس کے

حق میں بددعا کردی کہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی اسی حالت پر لوٹا دے جس پر تو پہلے تھا۔

اس کے بعد وہ فرشتہ اَندھے شخص کے پاس آیا اور وہی باتیں دُہرائیں، تو جواب میں اَندھے نے پوری خوش دِلی اور جذبۂ شکر گزاری کے ساتھ کہا کہ بلا شبہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میرا کمال نہیں؛ بلکہ وہ تو مولیٰ کا کرم ہے، اب جب تم نے اسی کے نام پر ایک بکری مانگی ہے تو ایک کیا، سب حاضر ہیں، جس قدر چاہو لے جاؤ، اس پر فرشتے نے کہا: نہیں بھائی! مجھے کوئی بکری نہیں چاہیے، تمھارا سارا مال تمھیں مبارک ہو، بس تمھارا امتحان مقصود تھا جو ہوگیا، میں تمھیں خوش خبری سناتا ہوں کہ

"فَإِنَّمَا ابْتُلِيتُمْ، فَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنْكَ، وَسَخِطَ عَلٰى صَاحِبَيْكَ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ١٦٥، باب الإنفاق و كراهية الإمساك)

تم نے اس امتحان میں کامیابی، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کی ہے، (جو کامیابی کی بنیاد ہے) اور تمھارے دونوں ساتھی اس امتحانِ الٰہی میں ناکام ہو کر اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد بن گئے۔ (جو تباہی و بربادی کی بنیاد ہے)۔

ظاہر ہے کہ اُن کی اس تباہی کا سبب حرصِ مال بنا، اس لیے بھی حدیث پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرصِ مال کو ہلاکت کا سبب قرار دیا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے حرصِ مال سے احتراز کرنے والے کے لیے کامیابی کی ضمانت کا اعلان فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (التغابن : ١٦)

''اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچالیا جائے سو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

مرتبے کی حرص و ہوس مال سے زیادہ مہلک ہے:

جس طرح مال کی حرص و ہوس ہلاکت کا سبب ہے اسی طرح مرتبے کی حرص و

ہوس بھی ہلاکت کا سبب ہے، حدیث پاک میں ارشاد ہے: "وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ". حدیث مذکور میں اوّلاً مال کا ذکر ہے، پھر مرتبے کا ذکر ہے، تو عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عموماً حصولِ مال کے بعد حریص کی حرص ختم نہیں ہوجاتی؛ بلکہ مزید بڑھتی ہے، مال حاصل ہوجانے کے بعد بندے کی چاہت اور حرص ہوتی ہے کہ اب اُسے کوئی دُنیوی، دینی، سرکاری یا غیر سرکاری چھوٹا بڑا عہدہ ومرتبہ بھی مل جائے، تاکہ لوگوں میں اس کی فوقیت، عزّت اور وجاہت وچاہت پیدا ہوجائے، پھر یہ مال و مرتبے کا حریص ولالچی مرتبے کے حصول کی خاطر بسا اوقات مال کا سہارا لیتا ہے، یعنی جائز یا ناجائز طریقے سے مال خرچ کرکے، رِشوتیں دے کر، خوشامد کرکے، اہلِ حق و حقدار کو نظر انداز کرکے، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرکے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرکے، غرض جس طرح بھی ممکن ہو مال کے ذریعے مرتبے ومنصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور کبھی تو حصولِ منصب ومرتبہ کے لیے علم وعمل اور تقویٰ تک کا سہارا لیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے علم وعمل، فضل وکمال اور تقویٰ کی تشہیر کرتا ہے، تاکہ لوگوں میں فوقیت، عزّت اور وجاہت وچاہت اور خاص مقام ومرتبہ حاصل ہو جائے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حاصل یہ کہ حریص اگر صاحبِ مال ہے تو حصولِ مرتبہ کے لیے بسا اوقات مال کا سہارا لیتا ہے۔ اور اگر وہ صاحبِ علم وتقویٰ ہے تو بعض اوقات حصولِ مرتبہ کے لیے اپنے علم وعمل اور تقویٰ کا سہارا لیتا ہے۔ اس اعتبار سے تو واقعی مرتبے کی حرص وہوسِ مال سے زیادہ تباہ کن اور مہلک ہے۔

مرتبے کی حرص قارون کی ہلاکت کا سبب بنی:

قرآنِ کریم میں قارون کا عبرت ناک واقعہ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا

ہے کہ مرتبے کی حرص ہی اس کی ہلاکت کا سبب بنی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ﴾ (القصص : ٧٦)

''قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اور برادری سے تھا، جس نے اپنی قوم کے خلاف سرکشی کی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ روح المعانی میں محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ قارون تورات کا حافظ تھا اور غیر معمولی مال ودولت کا مالک تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق قارون سونا بنانے کی صنعت یعنی کیمیا گری سے واقف تھا۔ (قرطبی)

لیکن مرتبے کی حرص نے اُسے باغی بنا دیا تھا، کیوں کہ تمام بنی اسرائیل کی سیادت وقیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی، اور آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے وزیر اور شریک نبوت تھے، جس کی وجہ سے قارون کو (یہ حرص و) حسد پیدا ہوا کہ میں بھی تو ان کی برادری کا فرد اور قریبی رشتے دار ہوں، میرا اِس سیادت وقیادت میں کوئی حصّہ کیوں نہیں؟ چنانچہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس بارے میں شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، میرا اس میں کوئی دخل نہیں؛ مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حسد رکھنے لگا اور بالآخر ہلاک ہوگیا۔ (معارف القرآن)

مرتبے ومنصب کے طالب وحریص کو منصب نہ دینا:

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ مال ومرتبے کے حریص کو مال ومرتبہ مل بھی جائے تو ایسا شخص کبھی بھی ملک وملّت کا سچا اور اچھّا خادم بن ہی نہیں سکتا، اگر وہ کسی طرح کسی مرتبے یا عہدے پر فائز ہو بھی جائے تو اس سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

غالباً اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے شخص کو کسی بھی مرتبے ومنصب کا اہل اور حقدار نہیں سمجھا جو بلا وجہِ شرعی از خود حرص کے سبب کسی مرتبے ومنصب کا طالب بن کر اس پر فائز ہونا چاہتا ہو، روایت میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دِن میں اور میرے دو چچازاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! "أَمِّرْنَا عَلٰى بَعْضِ مَا وَلَّاكَ" اللہ تعالیٰ نے آپ کو (تمام مسلمانوں اور روئے زمین کا گویا) والی وحاکم بنایا ہے، تو آپ مجھے کسی کام ومقام پر حاکم بنا کر مقرر فرما دیجیے، دوسرے نے بھی اسی طرح حصولِ مرتبہ و منصب کی خواہش ظاہر کی، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّا وَاللهِ لَا نُوَلِّيْ عَلٰى هٰذَا الْعَمَلِ أَحَدًا سَأَلَهٗ، وَلَا أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ." (متفق علیه، مشکوٰۃ المصابیح / کتاب الإمارۃ والقضاء : ص۳۲۰)

''اللہ کی قسم! ہم (دین وشریعت کے) اِن امور میں کسی بھی ایسے شخص کو والی (امیر اور ذمّے دار) نہیں بناتے جو ہم سے اس کا طالب ہو، یا جو اس کی حرص رکھتا ہو۔''

مطلب صاف ہے کہ مرتبے ومنصب کا طالب بن کر اس پر فائز ہونے والا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مرتبے ومنصب کے لائق نہیں ہے۔

بغیر طلب کے ملنے والے مرتبے پر اللہ کی مدد:

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو اس کی طلب اور جدّ جُہد کے بغیر اس کی لیاقت وصلاحیت کے سبب جب کوئی عہدہ، منصب اور مرتبہ ملتا ہے یا دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی شامل ہوتی ہے۔

"وَإِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا." (متفق علیه، مشکوٰۃ المصابیح / کتاب الإمارۃ والقضاء : ص۳۲۰)

''اگر تمھاری خواہش اور طلب کے بغیر تمھیں عہدہ، منصب اور مرتبہ دیا گیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری مدد کی جائے گی۔''

مطلب یہ ہے کہ پھر تمھیں من جانب اللہ یہ توفیق دی جائے گی کہ تم عدل و اعتدال اور نظم و ضبط کے ساتھ اُس ذمّے داری کو انجام دینے کے لائق و قابل بن سکو۔ یا ایسے وزراء و رفقاء میسّر ہوں گے جو بروقت تمھیں صحیح مشورہ دیں گے، جس کی وجہ سے یہ منصب و مرتبہ تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمت و انعام ثابت ہوگا۔

مرتبے کے حریص کے لیے وعید:

اگر کوئی نالائق شخص کسی منصب و مرتبے پر اپنی طلب سے جائز و ناجائز جدّ و جُہد سے کسی طرح فائز ہو گیا تو عموماً ایسا شخص اپنے عہدے اور منصب و مرتبے کا غلط استعمال (Misuse) کرتا ہے، من مانی کرتا ہے، ماتحتوں میں جو لوگ خود دار اور ایماندار ہوں، چاپلوسی کرنے والے اور خوشامدی نہ ہوں اُن کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اور جس طرح حصولِ منصب کے لیے ناجائز اسباب و ذرائع اختیار کیے تھے اب بقائے منصب کے لیے بھی ناجائز اسباب و ذرائع اختیار کرتا ہے، جس کی وجہ سے ایسا حریص نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی سے محروم کر دیا جاتا ہے اور انجام کار دنیا میں یا پھر آخرت میں یہی منصب اس کے لیے ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، جس کا تذکرہ حدیث میں ہوا۔ نیز ارشادِ رَبّانی ہے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (القصص : ۸۳)

''آخرت کا گھر اور اچھا ٹھکانا اُن ہی لوگوں کے لیے ہے جو روئے زمین پر بڑائی، برتری، سرکشی اور از خود بڑا بننے کا شوق نہیں رکھتے اور نہ فساد مچاتے ہیں، اور اچھا

انجام تو متقی لوگوں کے لیے ہی ہے۔''

اور جنھیں دُنیا میں بڑائی اور برتری کا شوق تھا اُن کے لیے رُسوائی اور تباہی ہوگی، اُنھیں عذابِ الٰہی میں مبتلا کرتے ہوئے کہا جائے گا:

﴿ذُقْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾﴾ (الدخان : ٤٩)

''دُنیا میں بڑا معزز ومکرّم بنا پھرتا تھا، اب اپنی بڑائی وسرکشی کی سزا چکھ لے۔''

اگرچہ یہ ابوجہل اور اُس جیسے سرکشوں کو بطورِ خاص کہا جائے گا؛ لیکن دُنیا میں جو لوگ اپنی بڑائی اور بڑا بننے کے شوق میں کچھ بھی کرنے کو تیّار ہو جاتے ہیں، حصولِ منصب یا بقائے منصب کے لیے صحیح غلط ہر قسم کے حربے اور طریقے اختیار کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے بھی عبرت کا مقام ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی وعید و ہلاکت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

مال ومرتبے والوں کے لیے پانچ قرآنی نصیحتیں:

قرآنِ کریم میں قارون کو کی گئیں پانچ نصائح کا تذکرہ ہے، تو ان کے متعلّق عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ مال ومرتبے کے حریص ان قیمتی نصائح کو مدّنظر رکھیں تو ان شاء اللہ ہلاکت سے حفاظت ہوگی۔

پہلی قیمتی نصیحت یہ ہے کہ

﴿لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾﴾ (القصص : ٧٦)

(اپنے مال ومرتبے پر) ''اِتراؤ مت، یقیناً اللہ تعالیٰ اِترانے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔''

اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال ومرتبے اور کسی بھی نعمت سے لذت وراحت اور

خوشی حاصل کرنا بُرا اور ممنوع نہیں ہے، البتہ اُسے اپنا کمال سمجھنا، اس پر اَکڑنا اور اِترانا بُرا اور ممنوع ہے۔

دوسری قیمتی نصیحت یہ ہے کہ

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ﴾ (القصص : ۷۷)

''اس مال و مرتبے سے آخرت کا توشہ جمع کرنے کی فکر اور کوشش کرو۔'' کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی مال و مرتبہ اُخروی غفلت کا سبب بن جائے، مال و مرتبے کا صحیح استعمال اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور آخرت کی بہتری کا سبب بن سکتا ہے، لہٰذا اپنے مال و مرتبے سے صرف دُنیا کی بہتری کے بجائے آخرت کی بہتری کی بھی فکر کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی دنیا کو بھی دین بنالو، اپنی دنیا کی خوشحالی کو دین کی سربلندی و ترقّی کا ذریعہ بنالو۔

تیسری قیمتی نصیحت یہ ہے کہ:

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص : ۷۷)

''اور دُنیا سے بھی اپنا حصّہ نہ بھولو۔''

فکرِ آخرت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دُنیا اور اس کے جائز تقاضوں اور مال و مرتبے کی ذمّے داریوں کو پس پشت ڈال دو؛ بلکہ اعتدال کے ساتھ دُنیا کے جائز تقاضوں کو پورا کرو اور اپنی ذمّے داریوں کو بھی نبھاؤ۔

چوتھی قیمتی نصیحت یہ ہے کہ

﴿وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ (القصص : ۷۷)

''اور تو (لوگوں کے ساتھ ویسا ہی) احسان کر جیسا احسان اللہ تعالیٰ نے

تیرے ساتھ فرمایا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے تمھیں مال ومرتبہ دیا تو یہ اس کا احسان ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ بلا کسی تفریق وتخصیص کے احسان اور حسن سلوک کا معاملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی صفت احسان کا عکس جمیل تمھاری زندگی اور اعمال وکردار میں دیکھے۔

پانچویں قیمتی نصیحت یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾ (القصص:۷۷)

''اور زمین میں فساد انگیزی (کی راہیں) تلاش نہ کر، بے شک اللہ فساد بپا کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''

اپنے مال ومرتبے کا بیجا اور غلط استعمال کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، خیر اور اہل خیر کے کاموں میں رُکاوٹیں نہ ڈالو، سازشوں کا جال نہ بچھاؤ، ورنہ مال ومرتبے کے باوجود آج نہیں تو کل ضرور ہلاک ہوجاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھیں اور دارین کی سعادتیں نصیب فرما کر ہلاکتوں سے حفاظت فرمائیں، عاجز کے ساتھ خادم زادہ محمد خلیل کے اس پہلے اعتکاف کو بھی شرفِ قبولیت عطا فرمائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهُ اٰخِرَ الْعَهْدِ مِنْ صِيَامِنَا اِيَّاهُ، فَاِنْ جَعَلْتَهُ فَاجْعَلْنِيْ مَرْحُوْمًا، وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَحْرُوْمًا.

''اے اللہ! اس رمضان کو ہمارا آخری رمضان نہ بنا، اور اگر (تقدیر کے

مطابق) یہ ہمارا آخری رمضان ہوتو ہم پر رحم فرما اور ہمیں اپنی رحمت سے محروم نہ فرما۔''

۲۷ر رمضان المبارک ر ۱۴۴۳ھ

مطابق: ۲۹ر اپریل ر ۲۰۲۲ء

شبِ جمعہ، قبل الفجر

خانقاہِ قدسیہ مسجد شیخ زکریا

جامعہ سراج العلوم، بھیروگڈھ، اُجین، ایم پی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى أٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۲۹)

شہوت پرستی کی تباہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ؛ فَاتَّقُوْا الدُّنْيَا، وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ، فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِيْ النِّسَاءِ". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ص۲۶۷/ كتاب النكاح)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دُنیا شیریں اور سرسبز (میٹھی اور ہری بھری، جاذبِ نظر) چیز ہے، اور چوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا ہے اس لیے وہ دیکھتا ہے کہ تم اس دنیا میں کس طرح عمل کرتے ہو؟ (کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دنیا کی دولت، شہرت، عورتوں یا نفس کی شہوت اور ان کے فتنے میں پھنس کر دُنیا کے خالق و مالک اور اپنے مقصدِ زندگی کو بھول جاؤ) لہٰذا دنیا (کی دولت و شہرت) اور عورتوں (کی بیجا شہوت) کے فتنے سے بچو، کیوں کہ بنی اسرائیل کی تباہی کا اوّل سبب عورتوں ہی کا فتنہ تھا۔

شہوت کی غلامی تباہی کی نشانی:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس دُنیا میں موجود مفید ترین اور بہترین چیزوں اور نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہر انسان کی فطرت وطبیعت میں اس کی اپنی مرغوب ومحبوب چیزوں کی چاہت، شہوت اور خواہش پیدا فرمائی ہے، اس لیے فی نفسہٖ کسی چیز کی شہوت اور چاہت مطلقاً بُری نہیں ہے، بلکہ دُنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن کی شہوت و چاہت کا پایا جانا بھی ضروری ہے، اب خواہ وہ شہوت و چاہت مال ومرتبے کی ہو، کھانے پینے کی ہو، پہننے اوڑھنے کی ہو، کہیں آنے جانے اور گھومنے پھرنے کی ہو، یا پھر جنس مخالف (مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) کو حاصل کرنے کی ہو، البتہ نفس کی ایسی بُری چاہت جو مرضیٔ رب کے خلاف ہو، یعنی وہ شہوت جو خلافِ شریعت ہو وہ مذموم ہے۔

اسی طرح تکمیل شہوت کے لیے اعتدال اور حدودِ شریعت سے تجاوز کر جانا، خلافِ شرع طریقہ اختیار کرنا، یا زندگی کا مقصد ہی تکمیل شہوت سمجھ لینا کہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں شہوت ہی کا غلبہ رہے اور بندہ گویا شہوت پرست بن جائے، تو یہ بلاشبہ شہوت پرستی اور نفس کی غلامی تباہی و بربادی کی نشانی ہے۔

شہوت پرستوں کا انجامِ بد:

واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں جتنی بھی قومیں اور اُمتیں پہلے تباہ و برباد ہوئیں، آج ہو رہی ہیں اور آئندہ ہوں گی ان کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب اتباعِ شہوت ہی ہے، کیوں کہ اتباعِ شہوت ہی تمام گناہوں کی اصل اور جڑ ہے، شہوت معصیت کا سبب بنتی ہے، پھر معصیت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس

حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ﴾ (مریم : ۵۹)

حق تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے سچّے جانشینوں کے تذکرے کے بعد فرمایا کہ پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف اور نااہل لوگ آ گئے جنھوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا (اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ نمازوں کو سرے سے پڑھا ہی نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ پڑھا بھی تو نہایت غفلت اور سستی کے ساتھ، یا پھر وقت سے بے وقت پڑھا۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ) اور شہوتوں کا اتباع کیا، عن قریب ایسے لوگ اپنے انجامِ بد سے دو چار ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں بُرے انسانوں کا اصل روگ اور مرض بیان فرمایا گیا، اور وہ ہے اتباعِ شہوت اور نمازوں کا ضیاع۔ اور جملہ گناہوں کی بنیادی وجہ اتباعِ ہویٰ ہے، یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں جا بجا قرآنِ کریم میں اتباعِ ہُدیٰ کا حکم فرمایا اور اتباعِ ہویٰ سے منع فرمایا، ہُدیٰ کا اتباع نجات اور ہویٰ کا اتباع ہلاکت کا سبب ہے، فرمایا:

﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى ۝﴾ (طٰہٰ : ۱۲۳)

''میری ہدایت وشریعت کا اتباع کرنے والا نہ گمراہی میں مبتلا ہوگا نہ بدبختی میں۔'' اس کے برعکس جو بندہ ہدایت وشریعت کے بجائے ہویٰ اور شہوت کا اتباع کرے گا، ''بابر بہ عیش کوش؛ کہ عالم دوبارہ نیست'' کے نعرے لگائے گا، شہوت پرستی کو مقصدِ زندگی بنالے گا تو وہ مختلف بُرائیوں میں مبتلا ہو کر اپنے انجامِ بد سے دو چار اور ہلاک ہوگا۔

﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم : ۵۹)

اس آیت کریمہ میں شہوت پرستوں کا جو انجامِ بد بیان فرمایا اس کے متعلّق صاحب روح المعانی علّامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ ابن جریر اور طبرانی حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "غَيّ" جہنّم کے نچلے حصے میں ایک نہر ہے، جس میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "غَيّ" دوزخ میں پیپ کی ایک نہر ہے، جس کا مزہ بہت ہی خبیث ہے، اس میں وہ لوگ ڈالے جائیں گے جو خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ (انوار البیان: ۴۷۶/۳)

شہوت پرستی بنی اسرائیل کی بربادی کا سبب بنی:

اس لیے حدیث پاک میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں شہوت پرستی سے بچنے کی تاکید فرمائی: "فَاتَّقُوْا الدُّنْيَا، وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ". لوگو! دنیا کی دولت، شہرت اور عورتوں کی شہوت میں افراط وتفریط سے بچو، تکمیل شہوت میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، بالخصوص عورت کی شہوت میں اس لیے کہ جس طرح ماں کا دِل اولاد سے نہیں بھرتا اسی طرح مرد کا دِل بھی عورت سے نہیں بھرتا، لہٰذا احتیاط سے کام لو۔ ورنہ یاد رکھو کہ یہی چیز بنی اسرائیل جو اولادِ انبیائے کرام ہیں ان کی تباہی وبربادی کا سبب بن گئی۔

"فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِيْ النِّسَاءِ".

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دولت وشہرت کی بیجا طلب اور حرص وہوس ہلاکت کا سبب ہے اسی طرح عورت، اس کی بیجا طلب وحرص وہوس بھی ہلاکت کا سبب ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل کی ہلاکت کا پہلا سبب بھی عورتوں کی بیجا شہوت تھی۔

شہوت پرستی سے ہلاکت کا عبرت ناک واقعہ:

اس حدیث پاک کے تحت حضرات محدثین نے شہوت پرستی سے ہلاک

ہونے والوں کے مختلف عبرت ناک واقعات نقل فرمائے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی شہوت پرستی تباہی کا بہت بڑا اور بنیادی سبب ہے۔

منجملہ ان کے ایک عبرتناک واقعہ وہ بھی ہے جس کا تذکرہ قرآن میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾ (الأعراف : ۱۷۵)

''محبوبا! آپ دُنیائے انسانیت کو اس شخص کا عبرتناک واقعہ بھی سنا دیجیے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا تھا، مگر وہ آیاتِ الٰہی سے علم الٰہی کی قدردانی و شکرگزاری کے بجائے روگردانی کرتے ہوئے نکل گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر شیطان بھی اس کے پیچھے پڑ گیا، اور وہ بالآخر گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا۔''

صاحبو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یہ انتہائی بلند اخلاقی ہے کہ عموماً وہ جب کسی کی بُرائی کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں تو اُس کے نام کی تصریح اور وضاحت نہیں فرماتے، بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر اس کی صرف اس بُری مثال یا عمل بد کا تذکرہ فرما دیتے ہیں، تاکہ اس کو رُسوا کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہوجائے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ میں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ جس کی مثال اور عبرتناک واقعہ پیش کیا جارہا ہے وہ کون تھا، لیکن حضرات مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف افراد واشخاص پر اس مثال کو چسپا کیا ہے۔

عاجز کا خیال ناقص اس سلسلے میں یہ ہے کہ یہ مثال ہر اُس فرد اور شخص پر منطبق ہوتی ہے جس میں اتباعِ ہُدیٰ کے بجائے علم الٰہی کے باوجود اتباعِ ہویٰ کی بُرائی پائی جاتی ہو، کیوں کہ ہر دور اور قوم میں ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس شخص کا اس

آیت کریمہ میں واقعہ بیان ہوا ہے اس کا نام بلعم بن باعوراء ہے، یہ ملک شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، اور ایک روایت کے مطابق بنی اسرائیل میں سے تھا، اللہ تعالیٰ نے اُسے علم و معرفت سے نوازا تھا، اپنے علاقے و زمانے کا مشہور پیشوا، مقتدیٰ اور مستجاب الدعوات شخص تھا۔

جب غرقِ فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قومِ جبّارین سے جہاد کا حکم ہوا، اور جبّارین نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچ گئے اور اُن کے مقابل قومِ فرعون کا غرق و غارت ہونا ان کو پہلے سے معلوم تھا، تو ان کو فکر ہوئی، وہ لوگ جمع ہو کر بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جلالِ الٰہی کے پیکر ہیں، پھر ان کے ساتھ لشکر جرّار ہے، اس لیے ہم تو ان سے مقابلہ کر ہی نہیں سکتے، لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ انھیں ہمارے مقابلے سے واپس کر دیں۔

بلعم نے کہا: افسوس ہے، تم کیسی بات کرتے ہو؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کے مقدّس نبی ہیں، ان کے ساتھ نصرتِ الٰہی ہے، میں اُن کے لیے بددعا کیسے کر سکتا ہوں؟ اگر میں نے ایسا کیا تو دارین میں تباہ ہو جاؤں گا۔

لیکن جب قومِ جبّارین نے بلعم سے بے حد اصرار کیا تو اس نے کہا کہ اچھا! میں اس معاملے میں اپنے رب سے مشورہ کر کے معلوم کرتا ہوں کہ ایسی دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس نے استخارہ کیا، تو خواب میں اس کو بتایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، اس نے قوم کو مطلع کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددعا کرنے سے منع کر دیا۔

اب قومِ جبّارین نے نہایت عیّاری سے کام لیتے ہوئے بطورِ ہدیہ دُنیا کی

دولت جو درحقیقت رِشوت تھی پیش کر دی، جو اس نے قبول کر لی، اور اس طرح قومِ جبّارین کا تیر نشانے پر لگ گیا، اس کے بعد انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددُعا کرنے کا اصرار کیا تو وہ اِنکار نہ کر سکا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ قوم کا ہدیہ قبول کر کے ان کا کام کر دیجیے، تب وہ دولت اور عورت کی محبّت میں آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کے لیے تیار ہو گیا، لیکن قدرتِ الٰہیہ کا یہ عجیب وغریب کرشمہ ظاہر ہوا کہ وہ جو بددُعا کے کلمات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے خلاف کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظِ بددُعا خود اپنے اور قومِ جبّارین کے خلاف نکلے، جن کو سن کر لوگ چلّا اُٹھے کہ تم تو ہمارے خلاف بددُعا کر رہے ہو، بلعم نے کہا کہ میری زبان میرے اختیار میں نہیں اور میری زبان اس کے خلاف پر قادر بھی نہیں ہے۔ اس کی اس حرکت پُرضلالت کا اثر یہ ہوا کہ من جانب اللہ بطورِ سزا اس کی زبان اس کے سینے پر کتّے کی طرح لٹک گئی اور قومِ جبّارین پر بھی تباہی نازل ہوئی۔

اس موقع پر بلعم نے قومِ جبّارین سے کہا کہ اب ہماری تباہی تو ہمارا مقدّر بن گئی، لیکن میں تمھیں ایک چال بتاتا ہوں، جس کے ذریعے تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آ سکتے ہو، وہ یہ کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور یہ تاکید کر دو کہ بنی اسرائیل ان کے ساتھ جو کچھ بدکاری کریں بلا روک ٹوک انھیں کرنے دیں، وہ لوگ مسافر ہیں، ایک مدّت سے اپنے گھروں سے باہر ہیں، اس تدبیر سے ممکن ہے کہ وہ لوگ عورتوں کی شہوت اور حرام کاری میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا شکار ہو جائیں، کیوں کہ جس قوم میں عورتوں کی بیجا شہوت ہوتی ہے وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جاتی ہے، وہ کبھی فاتح وکامران نہیں بن سکتی۔

بلعم کا یہ شیطانی مکر ان کی سمجھ میں آ گیا اور انھوں نے اس پر عمل کیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس جال میں پھنس گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو منع بھی کیا، لیکن وہ باز نہ آیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیل گیا، جس سے ایک ہی دِن میں ستّر ہزار اسرائیلی مر گئے، تب انھوں نے اس بدکار جوڑے کو قتل کر کے منظرِ عام پر ٹانگ دیا، تاکہ سب لوگ عبرت حاصل کریں اور توبہ کریں، پھر ایسا ہی ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی برکت سے طاعون کے عذاب کو ختم فرمایا۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۴/۱۱۹)

حدیث پاک میں جو ارشاد ہے: "فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ". کہ جو فتنہ اور گناہ سب سے پہلے بنی اسرائیل کی تباہی کا سبب بنا وہ عورت کی شہوت ہی کا تھا، محدثین عظام فرماتے ہیں کہ اس میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ (مستفاد از: توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۵/۳۷)

ضبطِ شہوت کی فضیلت:

کتاب وسنّت کے ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ واقعی شہوت پرستی تباہی کا سبب ہے۔ کہتے ہیں کہ شیطان انسان پر تین طریقوں اور ذریعوں سے حاوی ہوتا ہے: (۱) شہوت (۲) غفلت (۳) غصّہ۔ اور شہوت پرستی کی ایک بڑی اور بنیادی شکل مرد عورت کا ایک دوسرے کو بہر صورت حاصل کرنے اور پانے کی شدید چاہت وہوس بھی ہے، اس کی تباہی سے بچنے کا واحد حل ضبطِ شہوت ہے، یعنی نفس کی بُری چاہت وشہوت پر کنٹرول کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ شہوت پر شریعت کی لگام دی جائے، تاکہ نفس کی شہوت قابو میں رہے۔ قرآنِ کریم نے ایسے مرد وزن کو جنّت کی فضیلت اور بشارت سنائی ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ [النازعات: ۴۰-۴۱]

''جو بندہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور ضبطِ نفس کا اہتمام کرتا رہا تو آخرت میں اس کا اصلی اور دائمی ٹھکانا جنّت ہی ہے۔''

ضبطِ شہوت کے طریقے:

اب سوال یہ ہے کہ ضبطِ شہوت کا طریقہ کیا ہے؟ شہوت کو قابو اور کنٹرول میں کیسے رکھا جائے؟ تو کتاب وسنّت میں ہمیں اس کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں، جن میں پہلا فطری طریقہ تو یہ ہے کہ بروقت نکاح اور اس کے بعد بوقت شہوت زوجین مخصوص تعلّق قائم کریں۔ جیسے بھوک مٹانے کا حل یہ نہیں کہ بھوکے رہنے کے فضائل بیان کیے جائیں؛ بلکہ اصل اور آسان حل یہ ہے کہ بھوک مٹانے کے لیے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ اسی طرح ضبطِ شہوت کا حل یہی ہے کہ تکمیلِ شہوت کا شرعی طریقہ اختیار کیا جائے، نکاح کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نکاح کو آسان اور میاں بیوی کے مخصوص تعلق کو نہ صرف جائز بلکہ صدقہ اور ثواب کا ذریعہ قرار دیا، تاکہ شہوت کنٹرول میں رہے۔

اس کے بغیر ضبطِ شہوت بہت مشکل ہے، اسی لیے حکیم العصر حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ایک سلمٰی چاہیے سلمان کو　　اور دِل نہ دینا چاہیے انجان کو

لیکن اگر کسی بندے کے لیے نکاح والا عمل مشکل ہو تو اس کے لیے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلسل روزے کا اہتمام کرے۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ". (متفق عليه،

مشکوٰۃ : ۲۶۷)

ان شاء اللہ مسلسل روزوں کے اہتمام سے شہوت پر قابو حاصل ہوجائے گا۔ علاوہ ازیں تیسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ کتاب وسنّت میں شہوت پرستی کی جو تباہیاں بیان ہوئی ہیں انھیں اچھّی طرح پڑھے اور سنے، اسی طرح امم ماضیہ میں ہلاک شدہ اقوام کے حالات و واقعات میں غور وفکر سے کام لے، نیز حق تعالیٰ سے ضبطِ شہوت کی دُعا کا اہتمام والتزام کرے اور شہوت پرستی سے پناہ مانگے۔

اس کے لیے قرآنِ کریم کی یہ جامع دُعا بہت بہتر ہے جس میں فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

''اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا، پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ، ہم سے درگزر فرما، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، کہ تو ہی ہمارا مالک ہے، ہمیں کافروں اور بے ایمانوں پر غلبہ عطا فرما۔''

علّامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک قول کے مطابق یہاں ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ سے مراد شہوت پرستی ہے۔ (تفسیر قرطبی)

واقعی شہوت پرستی کی تباہی بڑی خطرناک اور ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے اس سے حفاظت کے لیے التزامِ دُعا بھی ضروری ہے، اسی کے ساتھ ضبطِ شہوت کے لیے اہتمامِ ذکر اللہ بھی نہایت مفید چیز ہے، کہ فکر کی گندگی وتاریکی ذکر کے نور سے دور ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ عاجز کے لیے دارالعلوم کا نعم البدل عافیت اور اپنی رضا ورحمت کے ساتھ مقدر فرمائیں۔ آمین۔

یومِ عرفہ/ ۱۴۴۳ھ
مطابق: ۹/جولائی/ ۲۰۲۲ء/سنیچر
بزمِ صدیقی بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۰)

خواتین کے لیے شرعی احکام، حقوق واختیارات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَلَا! كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ، وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ، وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ، وَهِيَ مَسْؤُوْلَةٌ عَنْهُمْ، وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهِ، وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْهُ، أَلَا! فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ". (متفق عليه، مشكوٰة:۳۲۰ / كتاب الإمارة والقضاء)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: باخبر ہوجاؤ! تم میں سے ہر شخص اپنی رعیت (ماتحتی میں رہنے والوں) کا نگران ہے، اور (قیامت میں) ہر شخص کو اس کے ذمے جن کی نگرانی ونگہبانی تھی (خواہ وہ افراد

ہوں یا جسم کے اجزاء) اُن کے متعلّق پوچھا جائے گا، ایک امام (خواہ اس کی امامت و سیادت کا دائرہ کسی ملک، صوبہ، شہر، علاقہ، ادارہ، یا مدرسہ اور مسجد وغیرہ تک محدود ہو وہ) اس کی ماتحتی میں رہنے والوں کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ اسی طرح مرد اپنے گھر والوں کا نگران اور ذمّے دار ہے، اس سے گھر والوں کے متعلّق سوال کیا جائے گا، تو ایک عورت (بھی) اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچّوں کی نگران اور ذمّے دار ہے، اس سے گھر والوں کے متعلّق سوال کیا جائے گا، نیز غلام اور ملازم اپنے مالک کے مال کا نگران ہے، تو اس سے بھی اپنی نگرانی کے متعلّق سوال ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ! ہر شخص ذمّے دار ہے، تو ہر ایک کو اس کی ذمّے داری کے متعلّق پوچھا جائے گا۔

کسی بھی نظام کے استحکام کے لیے عدل ضروری ہے، برابری نہیں:

اللہ ربّ العزت والجلال کی سجائی بسائی ہوئی اس کائنات میں اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوجائے گا کہ حق تعالیٰ نے نظامِ کائنات کو مساوات اور برابری کے اُصول پر نہیں بلکہ عدل و اعتدال کی بنیاد پر قائم فرمایا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ نظامِ کائنات تو خیر بڑی چیز ہے، کسی بھی ملک، صوبے، شہر، علاقے، بڑے چھوٹے دینی یا دُنیوی ادارے اور کمپنی کے نظام کے استحکام کے لیے بھی مساوات اور برابری کے بجائے عدل و اعتدال ہی ضروری ہے، کیوں کہ مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ہر اعتبار سے برابری کی جائے، جب کہ عدل و اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اسے دیا جائے، یا جو جس صلاحیت کا حامل ہو اسی کے مطابق اس کی ذمّے داری متعین کر کے اس سے معاملہ کیا جائے۔

مثلاً کسی بڑی چھوٹی کمپنی میں بہ یک وقت دو شخص ملازمت کے لیے حاضر ہوئے، جن میں سے ایک تو ہائی ایجوکیشن والا ہو اور دوسرا اَن پڑھ، تو اب مساوات کا

مطلب تو یہ ہوا کہ دونوں کی ذمّے داری اور سیلری برابر ہو؛ لیکن عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جو جس صلاحیت کا حامل ہو اس کے مطابق اس کی ذمّے داری اور سیلری متعین کی جائے۔

اسی طرح مثلاً کسی ہسپتال میں ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر اور ناخواندہ ملازم ملازمت چاہتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کا تقرّر بحیثیت طبیب اور مزدور کا بحیثیت جاروب کش (صفائی کرنے والے) کی حیثیت سے ہوگا۔ یہ مساوات تو نہیں؛ لیکن تقاضائے عدل یہی ہے۔ اسی میں سماج اور معاشرے کا مفاد اور کسی بھی معتدل نظام کا استحکام ہے۔ اگر ہر جگہ مساوات ہی کا نعرہ لگایا جائے تو اس سے نظام ہی نہیں طعام بھی بگڑ جائے گا، پھر خواہ وہ بریانی ہو یا اور کوئی لذیذ کھانا، اگر نمک، مرچ، مسالہ اور دیگر ضروری تمام اشیاء برابر سرابر ہوں تو ایسا کھانا لذیذ نہیں بدمزہ ہوگا۔ تو کسی بھی نظام و طعام کی بہتری کے لیے عدل و اعتدال ضروری ہے، برابری نہیں۔

اسلام مرد و عورت میں مساوات کا نہیں، عدل کا قائل ہے:

چوں کہ ہر ایک کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اور ضرورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا تمام میں مکمّل طور پر مساوات اور برابری ممکن نہیں ہے، جیسے اگر کہیں کہ کوّا اُڑ سکتا ہے اور انسان کوّے کی طرح نہیں اُڑ سکتا، تو یہ کوئی تقابل ہے؟ یہ انسان کی کمزوری نہیں، کوّا کوّا ہے، انسان انسان ہے، دونوں برابر نہیں ہیں، مرد و عورت کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے، بحیثیت انسان تو دونوں برابر ہیں، دونوں ہی اشرف المخلوقات ہیں، مطلب یہ ہے کہ خلقی اور پیدائشی طور پر ہر عورت مرد کی طرح کائنات کی تمام مخلوقات سے اشرف و افضل ہے، حق تعالیٰ نے عورت کو بھی ان تمام خوبیوں سے مزین فرمایا جن کی بنیاد پر وہ جملہ مخلوق سے ممتاز اور قدرتِ الٰہی کا بہترین شاہکار ہے۔ اسے بھی مرد کی طرح عقل و خرد سے نواز کر شرافت و کرامت کا تاج پہنایا گیا، تخلیق کے بہترین سانچے

میں ڈھال کر پاکیزہ چیزیں اسے بطورِ غذا عطا فرمائیں، اسے بھی بولنے، چلنے، سوچنے اور سمجھنے کی بہترین قدرت دی، نیز نسلِ انسانی کے تسلسل واضافے میں اسے بھی بنیادی طور پر شریک فرمایا، علاوہ ازیں اعمالِ صالحہ کے اَجر وثواب میں بھی اسے مرد کے برابر ہی رکھا گیا، ارشادِ باری ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب:۳۵]

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور مؤمن مَرد اور مؤمن عورتیں، اور فرماں بردار مَرد اور فرماں بردار عورتیں، اور صدق والے مرد اور صدق والی عورتیں، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں، اور عاجزی والے مرد اور عاجزی والی عورتیں، اور صدقہ وخیرات کرنے والے مرد اور صدقہ وخیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، اللہ تعالیٰ نے اِن سب کے لیے بخشش اور عظیم اجر تیار فرما رکھا ہے۔''

سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر خواتین نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ مَردوں کا ذکرِ خیر تو قرآن میں ہوتا ہے، مگر عورتوں کا ذکر نہیں ہوتا، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں دس پاکیزہ صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر یہ اوصاف مَرد وعورت میں پائے جائیں تو دونوں کا اَجر وثواب بھی برابر ہوگا، ایسا نہیں کہ مَردوں کو ان

اعمال واوصاف کا ثواب زیادہ اور عورتوں کو کم ملے گا، ثواب میں دونوں برابر ہیں۔

لیکن جب ہم مَرد وعورت کا ایک دوسرے کے بالمقابل جائزہ لیں گے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گی کہ من جانب اللہ دونوں کے درمیان فطری اور نیچرلی طور پر صلاحیتوں کا فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں عورتوں کی بہ نسبت مَردوں میں زیادہ ہیں، مثلاً جسمانی وظاہری قوت وشجاعت، سیاسی بصیرت وجرأت، علم وحکمت کی جِدّ وجُہد وذہنی صلاحیت کے علاوہ حصولِ معاش کی مہارت وغیرہ۔ جب کہ بعض صلاحیتیں مَردوں کے بجائے عورتوں میں زیادہ ہوتی ہیں، مثلاً لطافت ونزاکت، محبّت، کشش اور جاذبیت، جذبۂ حیا وحساسیت، اولاد کی تربیت کے علاوہ امورِ خانہ داری کی اعلیٰ صلاحیت وغیرہ۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں یہی وہ حقائق ہیں جن کی وجہ سے اسلام مَرد وعورت کے مابین مُساوات وبرابری کا نہیں بلکہ عدل واعتدال کا قائل ہے۔ واللہ اعلم۔

اسلام عورت کے لیے زحمت نہیں، رحمت ہے:

عدل واعتدال کے متعلّق عرض کیا گیا کہ اس کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ جس میں جو صلاحیت ہو اسی کے مطابق اس کی ذمّے داری متعین کی جائے، تو اسی کے پیشِ نظر اسلام نے ایمان، ایمانی ارکان اور بعض عمومی احکام تو مرد وعورت کے لیے یکساں رکھے؛ لیکن بعض احکام عورتوں کے لیے مخصوص کیے، جیسے مخصوص ایام میں نماز کی معافی اور روزے کی تاخیر، عدتِ وفات وطلاق، اسی طرح حج، عمرہ اور شرعی سفر میں محرم کا ساتھ ہونا وغیرہ، جب کہ بعض احکام وہ بھی ہیں جو مَردوں کے ساتھ خاص ہیں، جیسے نبوت ورسالت، قیادت وامامت وغیرہ، کیوں کہ عورتیں بالعموم ان فطری صلاحیتوں کی حامل نہیں جو ان عظیم مناصب کی متقاضی ہوتی ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مَرد و عورت کے درمیان مُساوات کے قائل ہیں خود ان کے یہاں بھی حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں، فوج اور سپہ سالاروں کے علاوہ دیگر عظیم عہدوں میں عورتوں کی تعداد مَردوں کے بالمقابل بہت ہی کم ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں عورتیں نبی، رسول اور حاکم و قاضی بنتی تو نہیں، جَنتی ضرور ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت مَردوں میں نہیں عورتوں ہی میں رکھی ہے۔ اسی کی گود سے عظیم الشان شخصیات نے جنم لے کر پَرورِش پائی ہے، عورتیں ہی اس ذمّے داری کو کمالِ حسن و خوبی سے نبھا سکتی ہیں، اسی لیے حدیث مذکور میں ارشاد ہوا: "وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَىٰ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ". عورت اسلامی شریعت میں گھر کی اِنچارج ہے، اس لیے شوہر کے گھر کی حفاظت اور اس کی اولاد کی تربیت اس کی ذمّے داری ہے، جس میں کوتاہی پر بروزِ قیامت اس کی پکڑ ہوسکتی ہے۔ اسلام نے گھر کے اندر کا نظام عورت کو تو گھر کے باہر کا نظام مَرد کو سپرد کیا، گویا مَرد وزیر خارجہ ہے، تو عورت بھی اسیر خانہ نہیں بلکہ وزیر خانہ ہے۔

نیز یہ تصوّر بھی اسلامی نہیں کہ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عورت کے بغیر کوئی گھر گھر نہیں ہوتا، حکم ہے کہ گھر کے اندر کا نظام عورت سنبھالے تو باہر کا نظام مَرد، اسی لیے عورت کی بہر صورت کفالت کی ذمّے داری مرد کی ہے، بیٹی ہے تو باپ کے ذمّے، بہن ہے تو بھائی کے ذمّے، بیوی ہے تو شوہر کے ذمّے اور ماں ہے تو بیٹے کے ذمّے اس کی کفالت ہے، خواہ عورت کسب معاش کی صلاحیت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔

اسلامی شریعت نے عورت کے لیے کسب معاش کا دروازہ بالکل بند نہیں کر دیا، البتہ شرعی دائرے میں رہتے ہوئے سرپرست (شادی سے پہلے والد اور بعد میں شوہر) کی اجازت سے کسب معاش کی سرگرمی میں حصّہ لینا اس کے لیے جائز تو

ہے؛ لیکن یہ اس کی ذمّے داری نہیں ہے، اس کی کفالت مَرد ہی کے ذمّے ہے۔

صاحبو! یہ اسلامی کلچر ہے جو واقعی عورت کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے، اس کے برعکس مغربی اور یورپی کلچر کو دیکھیں تو وہاں عورت کو دوہری ذمّے داری نبھانی پڑتی ہے، گھر کے اَندر بھی اور باہر بھی، جس کی وجہ سے عورت نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی، اس لیے اسلامی کلچر کو اختیار کرو اور مغربی کلچر سے اجتناب کرو۔

اسلام میں عورت کے حقوق:

پھر اسلام مَرد و عورت کے مابین جس عدل و اعتدال کا قائل ہے اس کا ایک اور تقاضا یہ ہے کہ جس طرح مَرد کے حقوق و اختیارات متعین و محفوظ ہیں اسی طرح عورت کے حقوق و اختیارات بھی مقرّر اور محفوظ ہوں، تو قرآنِ کریم نے عورتوں کے حقوق سے متعلّق ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ:۲۲۸]

عورتوں کے لیے بھی اسلامی شریعت میں حقوق متعین و محفوظ ہیں، جس طرح مَردوں کے لیے محفوظ ہیں، اسلام نے عورتوں کو ان کے جائز اور ضروری حقوق سے ہرگز محروم نہیں رکھا۔ اس سلسلے میں پہلا حق تو یہ ہے کہ جس طرح ایک مرد کو خلقی اور پیدائشی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ باعزّت طور پر زندگی گزارے عورت کو بھی بُنیادی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ بھی باعزّت طریقے سے زندگی گزارے۔ جاہلیت قدیمہ و جدیدہ میں عورت کو باعزّت زندہ رہنے کا حق نہیں تھا، بعض لوگ پیدا ہوتے ہی اس کو زندہ دفن کردیتے تو بعض شوہر کے ساتھ اسے بھی زندہ جلا دیتے، ان کا خیالِ فاسد یہ تھا کہ مرد ہی اصل ہے، مرد کے بغیر عورت کچھ بھی نہیں، قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ فاسد کی مذمّت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ [النحل:۵۹]

''وہ لوگوں سے چُھپا پھرتا ہے (بزعمِ خویش) اس بُری خبر کی وجہ سے جو اُسے سنائی گئی ہے، (اب یہ سوچنے لگتا ہے کہ) آیا اسے ذلّت و رُسوائی کے ساتھ (زندہ) رکھے یا اسے مٹّی میں دبا دے (یعنی زندہ درگور کر دے)، خبردار! کتنا بُرا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

اُن کے فیصلے نہایت ظالمانہ اور بُرے تھے۔ عورت بھی خلقی و پیدائشی طور پر باعزّت زندگی گزارنے کا حق رکھتی ہے جس طرح مرد کو یہ حق حاصل ہے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ عورت کو باعزّت زندگی گزارنے کا حق تو دیا ہی ہے اسی کے ساتھ اسلام نے جو مقام و مرتبہ عورت کو دیا وہ کسی اور مذہب نے نہ دیا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے میراث میں بھی عورت کا حق متعین کیا، اور یہ عورت کا دوسرا بنیادی حق ہے جو اسلام نے متعین و محفوظ کیا، ورنہ تو اسلام سے پہلے دُنیا کے اکثر مذاہب میں عورتوں کا میراث میں کوئی حق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا، جہلائے عرب کا خیال تھا کہ جو لوگ لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قبیلے کی حفاظت و مدافعت کر سکتے ہیں وہی میراث پانے کے حقدار ہیں، ہندوؤں کے یہاں تو عورتوں کے لیے میراث میں کسی حصے کا تصوّر ہی نہیں تھا، جب کہ اسلام نے میراث میں جہاں مرد کو حقدار بنایا وہاں عورت کو بھی حقدار قرار دیا، یعنی والد کی طرح والدہ، بھائی کی طرح بہن، بیٹے کی طرح بیٹی اور شوہر کی طرح بیوی بھی میراث میں اپنے متعین حصے کی حقدار ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ [النساء:۷]

''والدین اور قریبی رِشتے داروں کے ترکے میں مَردوں کا بھی حصّہ ہے اور عورتوں کا بھی، خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ، ہر ایک کا حصّہ اللہ کی طرف سے متعین ہے۔''

اسلام میں قانونِ میراث میں جن رِشتے داروں کو مقدّم رکھا گیا ہے، جو کسی بھی حال میں ترکے اور وِرثے سے محروم نہیں ہو سکتے وہ چھ افراد ہیں، جن میں سے تین مرد ہیں: باپ، بیٹا اور شوہر، اور تین عورتیں ہیں: ماں، بیٹی اور بیوی۔ ان کے علاوہ خصوصی اہمیت اُن رِشتے داروں کو حاصل ہے جن کو ذوی الفروض کہا جاتا ہے، یعنی وہ اعزّہ واقرباء جن کے حصے مقرّر کر دیے گئے ہیں، اُن میں مَردوں سے زیادہ تعداد خواتین رشتے داروں کی ہے، اس لیے کہ مرد چھ حالتوں میں ذوی الفروض میں شمار کیا جاتا ہے، جب کہ عورت سترہ حالتوں میں۔ (جس کی تفصیلات عام کتب فقہ میں موجود ہیں)۔

علاوہ ازیں مقدار کے اعتبار سے خواتین کے میراث میں حصّہ پانے کی چار حالتیں اور صورتیں ہیں۔

پہلی صورت: جب عورت کا حصّہ اپنے ہم درجہ رشتے دار مرد کے مقابلے میں آدھا ہوتا ہے، قرآنِ کریم نے اِجمالی طور پر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء:۱۱]

جس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

مثلاً (۱) بیٹے کے ساتھ بیٹی ہے۔ (۲) باپ کے ساتھ ماں ہے (بشرطیکہ مرحوم کی کوئی اولاد اور شوہر یا بیوی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی اور باپ کو عصبہ ہونے کے سبب دو تہائی حصّہ ملے گا) (۳) اسی طرح بیوی کا حصّہ بمقابلہ شوہر نصف ہے۔ (۴) حقیقی بہن بمقابلہ بھائی کے نصف حصے کی حقدار ہے۔ (بشرطیکہ مرحوم کی اولاد، والدین، شوہر یا بیوی نہ ہوں)

دوسری صورت: جس میں عورت کو مرد کے برابر حصّہ وراثت میں ملتا ہے۔ مثلاً (۱) میّت نے ماں، باپ اور ایک بیٹا چھوڑا ہو تو ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصّہ ملے گا۔ (۲) اسی طرح اگر اس نے ماں باپ اور دو بیٹوں کو چھوڑا تب بھی والدین کو چھٹا حصّہ ملے گا۔ (اور دو تہائی بیٹوں کو ملے گا) (۳) نیز اگر عورت نے شوہر، باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا تو اس صورت میں بھی ماں اور باپ دونوں چھٹے حصے کے مستحق ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے والدین کے حصے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾

یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ اور بھی کئی صورتیں کتب فقہ میں مذکور ہیں جن میں عورت اپنے ہم درجہ مرد رشتے دار کے برابر میراث کی حقدار بنتی ہے۔

تیسری صورت وہ ہے جس میں عورت مرد سے زیادہ میراث کی حصّہ دار بنتی ہے، جیسے ایک عورت نے انتقال کے بعد اپنے ورثاء میں شوہر، والدین اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اگر ترکے میں ایک کروڑ چھپن لاکھ روپے ہیں تو بیٹی بہتر لاکھ کی مستحق ہوگی، اس صورت میں اگر بیٹی کی جگہ بیٹا ہو تو اس کا حصّہ پینسٹھ لاکھ ہوگا۔ اس طرح کی اور بھی صورتیں ہیں جن میں عورت کا حصّہ مرد سے زیادہ بنتا ہے۔

اور چوتھی صورت وہ ہے جس میں صرف عورت وارث بنتی ہے، مرد وارث نہیں بنتا، جیسے ایک عورت نے اپنے ورثاء میں شوہر، حقیقی بہن اور باپ شریک بہن کو چھوڑا، تو اس وقت باپ شریک بہن چھٹے حصے کی مستحق ہے، لیکن اگر اس کی جگہ باپ شریک بھائی ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ صورتیں ہیں جن میں خواتین تو حصّہ پاتی ہیں اور ان کے مقابل مرد رشتے دار حصّہ نہیں پاتے۔ (مستفاد از: ''خواتین کے مالی حقوق''، صفحہ: ۱۰ تا ۱۵، مؤلفہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب)

میراث کے علاوہ بھی خواتین کے حقوق ہیں، جن میں بعد از نکاح مہر اور روٹی، کپڑا، مکان بلکہ جملہ ضروریات کا انتظام شوہر کے ذمّے بیوی کے لازمی حقوق میں سے ہے، جن کی تفصیلات کتاب وسنّت میں موجود ہیں۔ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلے میں مَردوں کو جو قوّامیت، فوقیت اور فضیلت عطا فرمائی اس کی ایک بڑی وجہ خود قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمائی:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ [النساء:۳۴]

''مرد عورتوں کے محافظ و منتظم ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے (بھی) کہ مرد (ان پر) اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔''

مرد خواتین کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل اور ذمّے دار ہیں، مَردوں کی ذمّے داری ہے کہ محنت سے کمائیں اور محبّت سے عورت پر لگائیں۔

کیا عورتوں کے ان حقوق سے یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی کہ اسلام نے عورت کو عزّت تحفے میں دی ہے، جب کہ مَردوں کو عزّت کمانی پڑتی ہے، اس کا حق اور شکر یہی ہے کہ عورتیں اسلام پر مرمٹیں۔

اسلام میں عورت کے اختیارات:

جہاں تک تعلق ہے عورت کے اختیارات کا تو جس طرح ایک مرد شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی ذات و مال میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے عورت بھی اس کا حق اور اختیار رکھتی ہے، اس سلسلے میں اسلام نے عورت کی عزّتِ نفس کا پورا خیال کیا ہے اور مختلف مواقع پر اپنے مال میں تصرف اور اپنے حق میں فیصلہ لینے کا اسے مکمّل اختیار دیا ہے۔

چنانچہ شریعت کے دائرے میں رہ کر ایک عورت بھی خرید و فروخت کا اختیار

رکھتی ہے، اسی طرح وہ اپنے مال میں تصرف کرسکتی ہے، اپنے مال میں سے ہدیہ اور صدقہ دے سکتی ہے، حق تعالیٰ نے صدقہ کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے اس نیک عمل کی نسبت مَردوں کی طرف بھی کی اور عورتوں کی طرف بھی، چنانچہ فرمایا:

﴿وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ﴾ [الأحزاب:۳۵]

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مرتبہ نمازِ عید کے موقع پر خواتین سے فرمایا:

"يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۳)

''اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کرو۔'' (کیوں کہ صدقہ کفارۂ معاصی، حفاظت از عذابِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے)

نیز عورت اپنا نکاح کرنے یا کسی کو اپنے نکاح کا وکیل بنانے کا بھی پورا اختیار رکھتی ہے، ان سب چیزوں میں کسی دوسرے کا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر اس پر نافذ نہیں ہوگا، خواہ فیصلہ کرنے والا اس کا سگا باپ، بھائی یا کوئی اور ہو، اگرچہ نکاح کے باب میں پسندیدہ بات اور تقاضائے حیا یہ ہے کہ عورت یہ معاملہ اپنے اولیاء کے حوالے کردے، تاہم شرعاً اپنے نکاح کی مالک خود وہی ہے، اس کی رضا و اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ قرنِ اوّل میں اس اختیار کی کچھ عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ:

مثلاً (۱) اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، بیوہ ہوگئیں، حدیث میں ہے، خود حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهٗ مُصِيْبَةٌ" جب کسی مسلمان کو کوئی بھی مصیبت (چھوٹی ہو یا بڑی، جسمانی ہو یا مالی) پہنچے تو حکم الٰہی کے مطابق وہ "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھے (یعنی ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی

طرف ہمیں واپس لوٹنا ہے) پھر یہ دُعا پڑھے: "اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا". (اے اللہ! میری مصیبت پر مجھے اجر وثواب بھی عطا فرما اور جو چیز اس مصیبت میں میرے ہاتھ سے گئی اس کا نعم البدل بھی عطا فرما) تو حق تعالیٰ اسے اس چیز کا بہتر بدلہ عطا فرماتے ہیں۔ حدیث پاک کی راویہ سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب (میرے پہلے شوہر) ابوسلمہ کا انتقال ہوگیا تو چوں کہ وہ صحابیٔ رسول اور بڑی خوبیوں کے حامل تھے اس لیے اُنھیں یہ خلجان اور خیال ہوا کہ "أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ مِنْ أَبِيْ سَلَمَةَ؟ أَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر مسلمان کون ہوسکتا ہے؟ جنھوں نے سب سے پہلے مع اہل وعیال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے جب اُنھوں نے اپنے عظیم صفات کے حامل شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر ''انا للہ'' اور مذکورہ دُعا پڑھی تو اس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے انھیں ابوسلمہ سے کروڑہا درجہ افضل شوہر سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کرا دیا۔ "فَأَخْلَفَ اللهُ لِيْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (مسلم، مشکوٰۃ: ۱۴۰)

جس کا واقعہ اس طرح ہے کہ عدّت گزرنے کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، ساتھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں اپنے نکاح کا پیغام دیا، آپ تصوّر کیجیے! یہ پیغامِ نکاح کائنات کی سب سے عظیم ہستی کی طرف سے تھا، جس کی خوشی کامیابی کی بنیادی کلید ہے، لیکن چوں کہ شرعاً عورت کو اپنے نکاح سے متعلّق اختیار ہے تو سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس اختیار کا استعمال کرتے ہوئے یہ کہہ کر نکاح سے معذرت کرلی کہ یارسول اللہ! آپ کا پیغامِ نکاح سر آنکھوں پر، تاہم میرے اندر ایک تو غیرت وحیا کا مادّہ بہت زیادہ ہے، اس لیے ڈر ہے کہ آپ کی

زوجیت میں رہتے ہوئے کبھی میری طرف سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے، پھر میری عمر بھی زیادہ ہے اور بچّے بھی۔ "وَأَنَا امْرَأَةٌ قَدْ دَخَلْتُ فِيْ السِّنِّ، وَأَنَا ذَاتُ عِيَالٍ". (مسند أحمد:۸۳/۳۳) لیکن بعد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمت دِلائی اور بچّوں وغیرہ کے متعلّق بھی تسلی دی تو آپ تیار ہوگئیں۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ:

(۲) اس سلسلے میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بھی نہایت نصیحت آموز ہے، مدینہ طیبہ میں ایک یہودی کی باندی تھی، جس کا نام بریرہ تھا، مدینہ ہی کے ایک غلام جن کا نام مغیث تھا، ان سے بریرہ کا نکاح ہوا، اب بریرہ تو خوب صورت تھی؛ لیکن مغیث کالے اور صورتاً بہت اچھے نہ تھے، بریرہ کو ان کے یہودی مالک نے ۹ اوقیہ کے بدلے میں مکاتب بنالیا، یہ بدلِ کتابت کی ادائیگی کے سلسلے میں مدد کے لیے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، اُنھوں نے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خُذِيْهَا فَأَعْتِقِيْهَا" اُسے خرید کر آزاد کردو۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو خرید کر آزاد کردیا، حدیث میں ہے کہ اس وقت تک ان کے شوہر کو آزادی نہیں ملی تھی، وہ ابھی غلام تھے، "وَكَانَ زَوْجُهَا عَبْدًا" تو شرعی قانون کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو یہ اختیار دیا کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ رہنے نہ رہنے میں مختار ہو، "فَخَيَّرَهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". تو چوں کہ وہ اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے جب انھیں آزادی کی وجہ سے قانونِ اسلامی کے مطابق طلاق کا اختیار حاصل ہوا تو اُنھوں نے اس کا استعمال کرتے ہوئے مغیث سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ "فَاخْتَارَتْ نَفْسَهَا". (متفق علیه، مشکوٰة: ۲۷۶/ باب مسألة خیار العتق)

دوسری طرف مغیث ان سے بہت زیادہ محبّت کرتے تھے، شدّتِ محبّت کی

وجہ سے وہ بریرہ کو کھونا نہیں چاہتے تھے، اس لیے جب بریرہ نے اپنے شوہر سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا تو منظر یہ تھا کہ مغیث بریرہ کے پیچھے چکّر لگاتے، روتے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کے رُخسار تر ہوجاتے، بریرہ کو سمجھانے اور منانے کی تمام کوششیں کرتے، حدیث پاک میں اس کا تذکرہ ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ زَوْجَ بَرِيرَةَ كَانَ عَبْدًا يُقَالُ لَهُ مُغِيثٌ، كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ يَطُوفُ خَلْفَهَا، يَبْكِي وَدُمُوعُهُ تَسِيلُ عَلٰى لِحْيَتِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعبَّاسٍ: "يَا عَبَّاسُ! أَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِيثٍ بَرِيرَةَ وَمِنْ بُغْضِ بَرِيرَةَ مُغِيثًا؟" فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَوْ رَاجَعْتِهِ،" قَالَتْ: "يَا رَسُولَ اللهِ! تَأْمُرُنِي؟" قَالَ: "إِنَّمَا أَنَا أَشْفَعُ،" قَالَتْ: "لَا حَاجَةَ لِي فِيهِ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ۲۷۶ / باب مسألة خيار العتق)

ان کا معاملہ دربارِ رسالت میں پہنچا، آپ ﷺ کو مغیث کے حال پر رحم آگیا، آپ ﷺ نے بریرہ کو بلوایا اور فرمایا کہ کاش! تم مغیث سے رجوع کرلیتیں (دوبارہ نکاح کرلیتیں) اب دیکھیے! حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حتیٰ کہ غلاموں اور باندیوں تک میں حضور ﷺ کی محبّت اور جذبۂ اطاعت کس قدر تھا! آپ ﷺ کی بات سن کر بریرہ نے عرض کیا: حضور! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ (کیوں کہ حکم کی اطاعت ضروری ہے، جب کہ مشورہ ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہیں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ حکم نہیں، یہ تو صرف سفارش اور مشورہ ہے، اس پر بریرہ کہنے لگیں: میں مغیث کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ وہ ان سے علیحدہ ہوگئیں۔

ان احکامات کے باوجود اگر کوئی خواتین کے بارے میں اسلام اور شرعی احکام

کے سلسلے میں بدگمان ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ شرعی احکام وحقائق سے صحیح طور پر واقف ہی نہیں، یا وہ بے توفیق اور محروم القسمت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا هَادِيْنَ مُهْتَدِيْنَ، وَاهْدِ بِنَا. آمين.

۶ رمحرم الحرام ر ۱۴۴۴ھ

مطابق: ۵ راگست ر ۲۰۲۲ء

قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۴۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۱)

شانِ رسالت میں گستاخی اور اُمّتِ مسلمہ کی ذمّے داری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الأَسْقَعِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم يقول "إِنَّ اللهَ اصْطَفَىٰ كِنَانَةَ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ، وَاصْطَفَىٰ قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفَىٰ مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ". (مسلم، مشكوٰة: ۵۱۱ / باب فضائل سيد المرسلين صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے (سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے دوسرے بیٹے سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے) کنانہ کو منتخب کیا، اور کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو چنا، اور اولادِ قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے چن لیا۔

ربّ العالمین کے خزانے کا سب سے قیمتی ہیرا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں:

اللہ ربّ العزت والجلال کائنات کے تمام موجودہ و پوشیدہ خزانوں کے ازلی و ابدی اور حقیقی خالق و مالک ہیں، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [المنافقون : ۷]

''آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔''

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے خزانے کی کوئی بھی چیز بیکار اور بے قیمت نہیں ہے، علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں — کوئی بُرا نہیں قُدرت کے کارخانے میں

البتہ خزانۂ قُدرت کا سب سے قیمتی سرمایہ اور ہیرا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کیوں کہ کائنات کی کل مخلوقات میں سب سے افضل و اکرم بنی آدم ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ [الاسراء:۷۰] اور بنی آدم میں سب سے افضل و اکرم حضرات انبیائے کرام ورُسل علیہم السلام ہیں، اور حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں سب سے افضل و اکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جس کا تذکرہ مختلف آیاتِ قرآنیہ واحادیث نبویہ میں موجود ہے، مثلاً قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴾ [الأحزاب : ۷]

''اور جب ہم نے تمام پیغمبروں سے اقرار لیا اور (بالخصوص) آپ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے (بھی)۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ ربّ العالمین نے اولاً اجمالی طور پر حضرات انبیائے کرام ورُسل علیہم السلام سے لیے گئے عہد و پیمان (نبوت کی ذمّے داری اچھی طرح ادا

کرنے کا پختہ وعدہ لینے کا) تذکرہ فرمانے کے بعد پانچ اولوالعزم اصحابِ شریعت انبیاء ورُسل علیہم السلام کا خصوصی ذکر اُن کے شرف وفضل کی وجہ سے فرمایا، جن میں سب سے پہلے فرمایا: "وَمِنْكَ" جس سے مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، پھر حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہے، حالانکہ ترتیب وجودی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں سب سے پہلے حضرت نوح، پھر حضرت ابراہیم، پھر حضرت موسیٰ، پھر حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں، اور آخر میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، لیکن آیت کریمہ میں سب سے پہلے آپ ﷺ کا ذکر فرمایا، وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام میں سب سے اعلیٰ وافضل ہیں۔

آپ ﷺ بعثت میں سب سے مؤخر ہیں لیکن خلقت میں سب سے مقدم ہیں:

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت اگرچہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کے بعد آخر میں ہوئی، لیکن آپ ﷺ کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی، جیسا کہ حدیث پاک میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ سے جب اس آیت کریمہ سے متعلق پوچھا گیا (کہ آپ کا ذکر دیگر انبیاء ورُسل سے پہلے کیوں ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"كُنْتُ أَوَّلَهُمْ فِيْ الخَلْقِ، وَآخِرَهُمْ فِيْ البَعْثِ." (تفسير القرطبي)

''میں تخلیق (وتکوین) کے اعتبار سے ان سے پہلے ہوں، اور بعثت ونبوت کے اعتبار سے اخیر میں ہوں۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالُوا: "يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَتَى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ: وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ." (رواه الترمذي،

مشکوٰۃ:۱۳، باب فضائل سید المرسلین صلّی اللہ عَلیہ وَسَلَّمَ)

''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور! آپ کے لیے نبوت کب واجب (ثابت) ہوئی؟ مطلب یہ ہے کہ آپ نبوت ورسالت کے لیے کب نامزد ہوئے؟ یا آپ کی نبوت کب سے شروع ہوئی؟ جواباً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔''

یعنی عالم اَرواح میں نبوت ورسالت تو تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کو ایک ساتھ ملی، لیکن نبوت ورسالت کے انوار اور اس کی تجلیات وبرکات کا سلسلہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عالم ارواح میں اسی وقت شروع ہوگیا تھا جب کہ سیّدنا آدم علیہ السلام ابھی مکمّل پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اس اعتبار سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افاضۂ برکاتِ نبوت میں سب سے اوّل تو ظہورِ نبوت میں سب سے آخری نبی ہیں۔ (توضیحات:۸/۱۱۸)

اس سارے مضمون کو کسی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ادا کیا ہے:

طینت جس کی سب سے مطہر　　بعثت جس کی سب سے مؤخر
خلقت جس کی سب سے مقدّم　　صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر کرنے والے خود اصحابِ قدر ہوگئے اور ناقدری وگستاخی کرنے والے نسیاً منسیا ہوگئے:

خلاصہ یہ ہے کہ کائناتِ عالم میں سب سے افضل واشرف بنی آدم ہیں، پھر بنی آدم میں سب سے افضل واشرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ کائناتِ ربّانی کے خزانوں کا سب سے قیمتی خزانہ، سرمایہ اور ہیرا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے قیمتی زمانے کے سب سے قیمتی قبیلے اور قیمتی خاندان سے منتخب فرما کر مبعوث فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدردانی اُمّت محمدیہ

کی بُنیادی ذمّے داری ہے۔

جس زمانے وعلاقے کے لوگوں نے کائناتِ ربّانی کے اس قیمتی سرمایے و ہیرے کی قدر کی (تصدیق رسالت کے بعد آپ ﷺ کی اطاعت اور عظمت ومحبّت کے تقاضوں کو پورا کیا) وہ خود اصحابِ قدر بن گئے، دوسری طرف نا قدری و گستاخی کرنے والے نسیاً منسیا ہو گئے، جناب ماہر القادری فرماتے ہیں:

اِک وہ بھی مقدّر ہوتا ہے، اِک ایسی بھی قسمت ہوتی ہے
بوجہل یوں ہی رہ جاتا ہے، بوذر رضی اللہ عنہ کو ہدایت ہوتی ہے

انبیاء ورُسل علیہم السلام کی نا قدری وگستاخی کا سلسلہ شیطان سے شروع ہوا:

کتاب وسنّت میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی تنقید وتوہین اور نا قدری و گستاخی کا بدترین سلسلہ کائناتِ ربّانی میں شیطانِ لعین سے شروع ہوا۔ اس طور پر کہ تخلیق آدم علیہ السلام کے بعد جب حق تعالیٰ نے تعظیماً سجدے کا حکم دیا تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا، اس نے سجدۂ تعظیمی سے نہ صرف انکار کیا بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں تنقید وتوہین کرتے ہوئے کہنے لگا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [الأعراف : ۱۲]

''میں آدم سے افضل وبہتر ہوں، مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا گیا۔'' لہٰذا آدم اس لائق نہیں کہ میں تعظیماً اُسے سجدہ کروں۔

اس طرح توہین رسالت ونبوت کا مذموم سلسلہ شیطانِ لعین سے شروع ہو کر مختلف ادوار واَزمان میں اس کی ذُرّیت اور ناپاک فطرت لوگوں نے جاری رکھا، کبھی تو حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کو ناحق قتل کیا، ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۙ﴾ [البقرۃ:۶۱] کبھی اُنھیں ایذائیں دی گئیں اور استہزاء (کسی چیز کو خلافِ عقل سمجھ کر مذاق

اُڑانا) کیا گیا، جس کا تذکرہ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر فرمایا، ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ [الأنعام:۱۰]

''اور بلاشبہ آپ سے پہلے (بھی) رسولوں کا مذاق کیا گیا۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝﴾ [الحجر: ۱۰-۱۱]

''اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے اگلی اُمتوں میں بھی پیغمبر بھیجے، لیکن جو بھی پیغمبر مبعوث ہوتا وہ اس کا مذاق اُڑاتے۔''

اسی مضمون کو ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا:

﴿يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝﴾ [یٰسٓ: ۳۰]

''ہائے افسوس ان بندوں پر! جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو اُنھوں نے اس کا ضرور مذاق اُڑایا۔''

خود امام الانبیاء والمرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی شیطانی ذُرّیت کا یہی رویّہ رہا، کوہِ صفا سے اعلانِ نبوت کے بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ناپاک سلسلہ شروع ہوگیا، جیسا کہ حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: صَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّفَا ذَاتَ يَوْمٍ، فَقَالَ: "يَا صَبَاحَاهْ! فَاجْتَمَعَتْ إِلَيْهِ قُرَيْشٌ، قَالُوا: مَا لَكَ؟ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ يُصَبِّحُكُمْ أَوْ يُمَسِّيكُمْ، أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونِي؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: فَإِنِّي نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ، فَقَالَ أَبُو لَهَبٍ: تَبًّا لَكَ أَلِهَذَا جَمَعْتَنَا؟ فَأَنْزَلَ اللهُ ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ

وَتَبَّ ﴿۱﴾". (رواه الشيخان، مشكوٰة / باب فضائل سيد المرسلين صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ایک دِن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھ کے خطاب فرمانے لگے کہ باخبر ہوجاؤ! تو قریش جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمھیں خبر دوں کہ دُشمن تم پر صبح یا شام کے وقت حملہ کرسکتا ہے، تو کیا تم میری بات سچ مانو گے؟ اُنھوں نے کہا: کیوں نہیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھیں ایک سخت ترین عذاب سے متنبہ کررہا ہوں، تو ابولہب نے کہا: تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا اس لیے تو نے ہمیں یہاں جمع کیا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مسد نازل فرمائی۔''

اسی طرح احادیث میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حرمِ کعبہ میں دورانِ نماز گندگی ڈالی گئی۔ حدیث پاک میں ہے:

"كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي عِنْدَ الْبَيْتِ وَمَلأُ مِنْ قُرَيْشٍ جُلُوسٌ، وَقَدْ نَحَرُوا جَزُورًا، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: أَيُّكُمْ يَأْخُذُ هٰذَا الْفَرْثَ بِدَمِهٖ ثُمَّ يُمْهِلُهٗ حَتّٰى يَضَعَ وَجْهَهٗ سَاجِدًا، فَيَضَعُهٗ ـ يَعْنِي ـ عَلٰى ظَهْرِهٖ؟ قَالَ عَبْدُ اللهِ: فَانْبَعَثَ أَشْقَاهَا، فَأَخَذَ الْفَرْثَ، فَذَهَبَ بِهٖ، ثُمَّ أَمْهَلَهٗ، فَلَمَّا خَرَّ سَاجِدًا وَضَعَهٗ عَلٰى ظَهْرِهٖ، فَأُخْبِرَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ جَارِيَةٌ، فَجَاءَتْ تَسْعٰى، فَأَخَذَتْهُ مِنْ ظَهْرِهٖ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالَ: اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِأَبِي جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ وَعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ حَتّٰى عَدَّ سَبْعَةً مِنْ قُرَيْشٍ." (سنن النسائي الصغرٰى / باب فرث ما يؤكل لحمه يصيب الثوب)

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون و پاگل کہا گیا:

﴿وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝﴾ [الحجر: ٦]

''اور (کفار گستاخی کرتے ہوئے) کہتے ہیں: اے وہ شخص جس پر قرآن اُتارا گیا ہے! بیشک تم دیوانے ہو۔''

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "أَبْتَرَ" (بے نام ونشان) کہا گیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر نازل فرمائی، یہاں تک کہ مکہ کی زمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قدر تنگ کر دی گئی کہ آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَّةَ: "مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ." (رواه الترمذي، مشكوٰة: ٢٣٨ / باب حرم مكة)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہجرت کے وقت) مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے مکہ! تو کس قدر پاکیزہ شہر ہے اور مجھے بہت محبوب بھی ہے، اگر میری قوم مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کرتی تو میں تیرے علاوہ کہیں سکونت اختیار نہ کرتا۔''

طائف کی وادیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسا کر لہولہان کر دیا گیا، طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گئے ظلم کو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت ظلم قرار دیا، بخاری شریف کی روایت ہے:

عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَتْهُ أَنَّهَا قَالَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَلْ أَتَى عَلَيْكَ يَوْمٌ كَانَ أَشَدَّ مِنْ يَوْمِ أُحُدٍ؟ قَالَ: "لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ مَا لَقِيتُ، وَكَانَ

أَشَدَّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ، فَلَمْ يُجِبْنِي إِلَىٰ مَا أَرَدْتُ، فَانْطَلَقْتُ وَأَنَا مَهْمُومٌ عَلَىٰ وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ ...الخ" (رواه البخاري، مشكوٰة : ص۵۴۳ / باب المبعث وبدء الوحي)

ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی مکہ کے کفّار و بے ایمانوں کی طرح مدینہ کے یہود اور منافقین نے آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے بنائے، حتیٰ کہ خود آپ ﷺ کی موجودگی میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار کذّاب وملعون میدان میں آئے، تاکہ آپ کی روشن تعلیمات وہدایات مشکوک ہوجائیں۔

شانِ رسالت میں گستاخانہ جسارت کے مقاصد:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جن خبیث فطرت اور ناپاک طینت لوگوں نے شانِ رسالت میں گستاخی کی جسارت کی ان کے مذموم مقاصد میں بنیادی مقصد تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اِظہارِ عداوت ہے، لیکن دوسرا مقصد نبی ﷺ کی روشن تعلیمات و ہدایات کو مشکوک قرار دینا بھی ہے، تاکہ دیگر مذاہب و ادیانِ باطلہ کے بالمقابل دینِ حق اور اسلام کے بڑھتے ہوئے رُجحانات واثرات کو ختم کیا جائے یا کم کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے عزّت وجلال کی قسم! یہ بھی سچّی حقیقت ہے:

ہم نہیں کہتے، یہ تاریخ بتاتی ہے ہمیں
مٹ گئے دینِ الٰہی کو مٹانے والے
اسلام کی فطرت میں قُدرت نے لچک رکھی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

علاوہ ازیں شانِ رسالت میں گستاخی کا ایک مقصد اپنے حلقے میں ہیرو بننا بھی

ہے، اس بہانے مشہور ہونا یا پھر اس کے ذریعے دُنیوی و سیاسی مفاد کا حصول بھی ہوتا ہے، کیوں کہ اُنھیں اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس غلیظ اور ناپاک جسارت سے مسلمانوں کی ملّی اور مذہبی غیرت جوش میں آئے گی، سویا ہوا شیر بیدار ہو کر باہر نکل پڑے گا اور سارے عالم میں شور مچا دے گا۔

اور صاحبو! واقعہ یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی، اپنے بیوی بچّوں حتیٰ کہ ماں باپ تک کی گستاخی گوارا کر سکتا ہے، لیکن دُنیا کا ادنیٰ مسلمان بھی شانِ رسالت میں ادنیٰ گستاخی برداشت کر نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے بعد مسلمانوں کا قبلۂ محبّت رسول اللہ ﷺ ہیں، الحمدللہ ہمیں اپنی ذات، آل و اولاد اور ماں باپ سے اتنی (ایمانی، عقلی بلکہ فطری و طبعی) محبّت نہیں ہوتی جتنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے ہوتی ہے، الحمدللہ ہمارا یقین ہے کہ:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الأحزاب:٦]

''نبی (ﷺ) مؤمنین پر خود ان کی جانوں سے زیادہ حق اور تعلق رکھتے ہیں۔''

اس کا تقاضا یہی ہے کہ خود اہل ایمان بھی بحمداللہ اپنی جان سے زیادہ کائنات کی جان نبی الانس والجان جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے محبّت کریں اور بالیقین کرتے ہیں۔ یہ اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ ایک ادنیٰ مسلمان بھی ناموسِ رسالت (نبی پاک ﷺ کی حُرمت و عظمت) کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا اپنی سعادتِ کبریٰ و عظمیٰ سمجھتا ہے، کسی نے صحیح کہا ہے:

غلامانِ محمد ﷺ جان دینے سے نہیں ڈرتے
یہ سر کٹ جائے یا رہ جائے وہ پرواہ نہیں کرتے

یہ کوئی جذباتی شعر و شاعری اور کھوکھلی عقیدت نہیں بلکہ سچّی اور تاریخی حقیقت

ہے، چنانچہ عہدِ نبوت سے لے کر عصرِ حاضر تک جن جاں نثار مقدّس ہستیوں نے شانِ رسالت میں گستاخی کرنے والے بدبختوں کو ان کے انجامِ بد تک پہنچایا، یا اِس راہِ وفا میں اپنا سب کچھ لُٹا دیا ان کی ایک طویل فہرست ہے۔

توہین رسالت کی سزا:

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اللہ ربّ العزت کے بعد نبی رحمت ﷺ محسن انسانیت ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایسے محسن کی شان میں توہین ناقابل معافی جُرم ہے، قرآن میں خود حق تعالیٰ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو نبی ﷺ کو ایذا پہنچائے، (جس کی ایک شکل شانِ رسالت میں گستاخی کرنا بھی ہے) حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ایذا و تکلیف کو اپنی ایذا و تکلیف شمار کیا ہے اور ایسے شخص کو دُنیا و آخرت میں ملعون قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ [الأحزاب : ۵۷]

''بلا شبہ جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو ایذا پہنچاتے ہیں اللہ نے دارین میں اُن پر لعنت کی ہے اور اُن کے لیے رُسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی سنّت و عادت یہی ہے کہ توہین رسالت کے مجرمین کو دُنیا میں کچھ مہلت دی جاتی ہے، لیکن بالآخر اُنھیں ان کے بدترین اَنجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی کو فرمایا:

﴿فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾ [الرعد:۳۲]

''میں نے پہلے تو اُن کفّار کو مہلت دی، پھر اُن کو پکڑ لیا، تو دیکھو! میرا عذاب کس قدر دردناک تھا۔''

اس سلسلے میں اسلامی مملکت کے حکام کو بھی حکم ہے کہ توہین رسالت کے مجرمین ملعونین جہاں کہیں پائے جائیں قتل کر دیے جائیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝﴾ [الأحزاب : ٦١]

''وہ ملعون جہاں پائے جائیں اُنھیں پکڑو اور بے دریغ قتل کر دو۔''

فقیہ العصر حضرت مفتی عبدالشکور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو بے دریغ قتل کرنا واجب ہے۔'' (گستاخِ رسول اور مُرتد کی شرعی سزا:۲۹)

اسلامی حکومت میں حاکم وقت کے لیے یہی حکم ہے، اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ ''گستاخِ رسول کی ایک ہی سزا، سر تن سے جدا''۔ علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حاصل یہ ہے کہ شاتم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کفر اور اس کے قتل کے دُرست ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں، اور یہی ائمہ اربعہ سے منقول ہے۔ (شامی: ۴/ ۶۴)

مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید نے حضرت امام دارالہجرہ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اگر دُنیا میں کسی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کا واقعہ رونما ہو جائے تو اُمّت مسلمہ کی کیا ذمّے داری ہے؟ تب امام دارالہجرہ سیّدنا امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ ''اُمّت مسلمہ اس (گستاخ) سے بدلہ لے۔'' پوچھا گیا کہ اگر حالات ایسے نہ ہوں (یعنی قتل نہ کر سکیں) تو؟ فرمایا: (اگر توہین رسالت کے مجرم کو جہنّم رسید نہ کر سکیں) ''تو ساری اُمّت مر جائے، اس کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' (بحوالہ: انسانی عظمت کے تابندہ نقوش)

ان اقوال سے بھی مسئلے کی حسّاسیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اُمّت مسلمہ کی ذمّے داری:

(۱) ایسے وقت میں ضرورت ہے کہ ہم اپنی غیرتِ ایمانی کا ثبوت پیش کریں اور شانِ رسالت میں ہونے والی گستاخی کے دِل خراش واقعات کو روکنے کے لیے ہر قسم کے آپسی اختلافات کو پس پشت ڈال کر بُنیانِ مرصوص، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو کر منظّم طریقے پر حکومت وقت کو ایسے قوانین بنانے پر مجبور کریں جن میں توہین رسالت کے مجرم کو ناقابل معافی قرار دے کر تختۂ دار تک پہنچایا جائے۔

یاد رکھو! ناموسِ رسالت کی حفاظت کرنے والے اور اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کرنے والے مسلمانوں کو قرآنِ کریم میں کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الأعراف : ۱۵۷]

''وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائیں اور ان کی تعظیم کریں اور ان کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (یعنی قرآنِ کریم) تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

(۲) ایسے وقت میں اس بات کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنّت کو ایک مشن سمجھ کر اپنے قول وعمل اور افعال وکردار کے ذریعے اُسے عام کریں، اس سلسلے میں میڈیا، ذرائع اِبلاغ اور جدید وسائل کا حدودِ شرع میں رہ کر سہارا لینا بھی مفید ثابت ہوگا۔

یہ چیز دُشمنوں پر ہمیں غالب کرے گی، قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝﴾ [النساء:٦٦]

''اگر یہ لوگ صرف میرے رسول کی ہدایت ونصیحت اور سیرت وسنّت کو اپنا لیتے تو ہر قسم کی خیر وبہتری اور ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔''

(۳) اُمّت کے عوام اور اُن سے زیادہ خواص کی ایک ذمّے داری یہ ہے کہ جب شانِ رسالت میں گستاخی کے جگر خراش واقعات پیش آرہے ہوں تو ایسے وقت میں ہم اس کے اسباب معلوم کرکے اس کا تدارُک اور غلط فہمی دور کرنے کی عقل ونقل کی روشنی میں بھرپور کوشش کریں، اس کی ایک بڑی وجہ حضور ﷺ کی پاکیزہ سیرت سے ناواقفیت اور جہالت بھی ہے۔ آج اس ترقّی کے دور میں بھی خود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بدقسمتی سے حضور ﷺ کی سیرت اور شخصیت سے ناواقف ہے، لہٰذا ہر مسلمان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ حسب استطاعت اپنے قول وعمل اور تحریر وتقریر کے ذریعے آپ ﷺ کی سیرت وسنّت اور انسانیت کے تئیں آپ ﷺ کے بے پناہ احسان کے تذکرے وچرچے ہر ہر گھر اور مجلس میں عام کریں۔

حق تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل سے نوازیں، آج جب کہ تنزانیہ کے سفر کے لیے پابرکاب ہوں حق تعالیٰ اس سفر کو وسیلۂ ظفر بنا کر مقاصد حسنہ میں بھرپور کامیابی عطا فرمائیں اور اپنی رضا وخوشنودی کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

۹ر صفر المظفر ر ۱۴۴۴ھ

مطابق: ۷ر ستمبر ر ۲۰۲۲ء

بروز بدھ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ٢١٠)

☆.....☆.....☆

(۳۲)

سیرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ مِنْ أَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ أَبُوْ بَكْرٍ"، وَعِنْدَ البُخَارِيِّ: "أَبَا بَكْرٍ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا، وَلٰكِنْ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهٗ، لَا تُبْقِيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ خَوْخَةٌ إِلَّا خَوْخَةَ أَبِي بَكْرٍ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٥٥٤ / باب مناقب أبي بكر رضي الله عنه)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں میں سب سے زیادہ جس نے مجھ پر احسان کیا، میری خدمت اور خوشنودی میں اپنا وقت اور مال لگایا وہ ابوبکر ہیں۔ اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق لفظ "أَبَا بَكْرٍ" ہے، (یعنی پروردگارِ عالم حق تعالیٰ کے بعد اس کی مخلوقات میں میرے سب سے بڑے محسن ابوبکر ہیں) اور اگر میں (ربّ کریم کے علاوہ) کسی کو اپنا خلیل (یعنی ایسا جگری دوست جس کی دوستی دِل کی گہرائیوں میں سرایت کر جائے، یا ایسا سچا اور اچھا دوست جس کی طرف اپنی ضرورتوں میں تحت الاسباب رجوع کیا جائے اور اپنے ذاتی امور و معاملات میں جس پر بھروسہ کیا جائے)

بناتا تو (شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر یہ) ابوبکر ہی اس کے حق دار ہیں۔ البتہ اسلامی اُخوت ومودّت کا تعلق میرے اور ابوبکر کے درمیان درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ مسجد (نبوی) میں ابوبکر کے گھر کے روشن دان (کھڑکی) کے علاوہ کوئی روشن دان باقی نہ رکھا جائے۔''

مرض الوفات سے دو چار روز قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی، اس سے بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان محبّت وقربت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اس ارشاد میں خلافت صدیقی کی طرف اشارہ موجود ہے۔ جیسا کہ مظاہر حق میں اس کی تفصیل ہے۔ (از: توضیحات: ۸/ ۲ ۳۷)

شانِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم:

اللہ ربّ العزت نے اپنی مشیت وحکمت کے تحت مخلوقات میں بعض کو بعض پر فوقیت وفضیلت عطا فرمائی ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

﴿نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ [یوسف: ۷۶]

''ہم جسے چاہیں اُس کے درجات بلند کر دیتے ہیں۔''

لیکن بُنیادی طور پر (ان) انسانوں کو (جن میں واقعی انسانی صفات ہیں) اکثر مخلوقات پر فوقیت وفضیلت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ [الإسراء: ۷۰]

''اور ہم نے اُنھیں اکثر مخلوقات پر جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے فضیلت دے کر برتر بنا دیا۔''

پھر ان میں بھی تمام انسانوں پر حضرات انبیائے کرام ورُسل علیہم السلام کو فوقیت وفضیلت عطا فرمائی، بلکہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو تو کائنات کی تمام

مخلوقات میں فوقیت وفضیلت عطا فرمائی۔ پھر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں سب سے زیادہ فوقیت وفضیلت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔ البتہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تمام انسانوں میں افضل ہیں، پھر جس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں تو انبیائے کرام علیہم السلام کے صحابہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سب سے افضل ہیں۔ اور جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر قرآن کریم کے ساتھ کتب سابقہ سماویہ (آسمانی کتابوں) میں ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر خیر بھی کتب سابقہ میں ہوا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ﴾ [الفتح: ۲۹]

''ان کے یہ اوصاف تورات میں (بھی مذکور) ہیں اور ان کے (یہی) اوصاف انجیل میں (بھی مرقوم) ہیں۔''

اور جہاں تک تعلق ہے قرآنِ کریم میں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر خیر کا تو عاجز کے خیالِ ناقص میں قرآن میں شانِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان دراصل وہ ایوارڈز اور گولڈ میڈلز ہیں جو ان کے کمالِ ایمان واِخلاص، اعمال واخلاق اور پاکیزہ اوصاف و سیرت سے خوش ہوکر خود ربّ العالمین نے اُنھیں عطا فرمائے۔

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے گولڈ میڈلز:

حق تعالیٰ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جو ایوارڈز اور گولڈ میڈلز عطا فرمائے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر ان کا تذکرہ موجود ہے، مثلاً کہیں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۵]

''یہی لوگ من جانب اللہ راہِ راست پر ہیں اور یہی لوگ فلاح یاب ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾﴾ [البقرة : ١٥٧]

''یہی ہیں وہ لوگ جن پر ان کے رب کی جانب سے نوازشیں (عام رحمتیں) ہیں اور (خاص عنایت و) رحمت بھی، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾﴾ [البقرة : ١٧٧]

''یہی لوگ سچّے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤﴾﴾ [الأنفال : ٤]

''یہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بلند درجات ہیں، بخشش ہے اور باعزّت رزق ہے۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُونَ ﴿١٠﴾﴾ [المؤمنون : ١٠]

''یہی لوگ (جنّت الفردوس کے) وارث ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُونَ ﴿٦١﴾﴾ [المؤمنون : ٦١]

''یہی وہ لوگ ہیں جو نیکیوں اور بھلائیوں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور وہ ان میں ایک دوسرے سے آگے رہنے کی سعی کرتے ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ [الحجرات : ۷]

''یہی لوگ استقامت کے ساتھ ہدایت پر گامزن ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ [الحجرات : ۱۵]

''یہی لوگ (ایمان واطاعت میں نہایت مخلص اور) سچے ہیں۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [المجادلة:۲۲]

''یہی لوگ اللہ کی جماعت اور اس کا لشکر ہیں، یاد رکھو! اللہ کا لشکر ہی کامیاب ہونے والا ہے۔''

کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ﴾ [البينة : ۷-۸]

''یہی لوگ بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے یہاں ایسے دائمی باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان (کے عمل) سے راضی ہوگیا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے انعام) سے راضی ہوگئے۔''

(تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَة)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیّد الانبیاء تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سیّد الصحابہ ہیں:

غرض حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سب سے افضل ہیں، پھر جس طرح حضراتِ انبیاء ورُسل علیہم السلام میں حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں تو حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سیّد الانبیاء ہیں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سیّد الصحابہ ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کوئی نبی، رسول، اُستاذ و پیر نہیں، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح کوئی اُمتی، صحابی، شاگرد اور مُرید بھی نہیں۔

یہ باتیں محض عقیدت کی بنیاد پر نہیں بلکہ حقیقت کے پیشِ نظر ہیں، کیوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل ہونا بھی کتاب وسنّت سے ثابت ہے، وہ اس طرح کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے اپنے سب سے مکرّم ومقرّب بندے کے متعلّق فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات : ۱۳]

''تم میں سب سے زیادہ متقی اللہ پاک کے نزدیک سب سے زیادہ معزز ہے۔''

اس پس منظر میں جب ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآنِ کریم میں "أَتْقَىٰ" فرمایا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ [اللیل : ۱۷]

''اور اس (دوزخ) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو سب سے زیادہ متقی ہے۔'' لفظ "أَتْقَىٰ" اسم تفضیل ہے، ہر وہ شخص جو تقویٰ کی تینوں قسموں پر عمل کرتا ہو یعنی شرکِ جلی، شرکِ خفی اور ظاہری و باطنی (جسمانی وقلبی) گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہو اُسے "أَتْقَىٰ" کہتے ہیں۔

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہی شان تھی، حتیٰ کہ اسلام لانے سے پہلے بھی آپ بُت پرستی، شراب نوشی اور دروغ گوئی وغیرہ سے بچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظِ آیت تو عام ہیں مگر شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ

بطورِ خاص سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلّق نازل ہوئی، یہاں لفظ "أَتْقٰى" سے مُراد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ (معارف القرآن)

تقریباً تمام مفسّرین اس پر متفق ہیں، تو جب آپ رضی اللہ عنہ کو خود اللہ ربّ العزت نے "أَتْقٰى" فرمادیا تو اسی سے آپ کا سب سے افضل ہونا بھی واضح ہوگیا۔

علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے انسانوں کے جو اعلیٰ درجات بیان فرمائے ان میں سب سے پہلا درجہ نبوت کا ہے، اس کے بعد صدیقیت کا، پھر شہادت اور صالحیت کا درجہ ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ [النساء:٦٩]

''اور جو کوئی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے تو یہی لوگ (روزِ قیامت) ان (ہستیوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا ہے جو کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ ربّ العزت نے نبیین کے بعد سب سے بڑا درجہ صدیقین کا بیان فرمایا ہے، تو سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقین کے سردار ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا صدیق ہونا بھی کتاب وسنّت سے ثابت ہے، ارشادِ عالی ہے:

﴿وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ [الزمر:٣٣]

''اور جو اس صدق کو لے کر آئے اور جنھوں نے اس صدق کی تصدیق کی تو وہی لوگ متقی ہیں۔''

حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں "اَلَّذِی جَآءَ" سے مُراد جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور "الصِّدق" سے مُراد یا تو کلمۂ توحید ہے جس

کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے تھے، یا پھر اس سے مُراد قرآنی ہدایات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں، اور "صَدَّقَ بِہٖ" کے عموم میں اگرچہ ہر ایسا مسلمان داخل ہے جس کے ظاہر و باطن (زندگی) میں سچّائی اس قدر سرایت کر جائے کہ کذب کی کوئی گنجائش ہی نہ رہے، لیکن سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مُراد سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، کیوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ) کے بعد جیسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ توحید کی دعوت پیش فرمائی تو فوراً اس کی تصدیق فرمائی۔ (البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی معرفت آپ کو اٹھارہ سال کی عمر سے حاصل تھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شام کا سفر کیا تھا) پھر ساری زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تعلیمات و ہدایات کی بلا چون و چرا تصدیق فرمائی۔ معراج کے موقع پر بھی جب اہل مکّہ نے اس واقعے کا انکار کیا، تکذیب کی، تب بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سنتے ہی فوراً تصدیق فرمائی، اس تصدیق ہی کے سبب خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "صدیق" کا لقب عنایت فرمایا۔

حدیث پاک میں ہے، سیّدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا صدیق اکبر، سیّدنا عمر فاروق اور سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ اُحد پہاڑ پر تشریف لے گئے، تو وہ حرکت کرنے لگا، اس وقت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم مُبارک اُحد پر مارتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اُثْبُتْ أُحُدُ! فَمَا عَلَيْكَ إِلَّا نَبِيٌّ أَوْ صِدِّيقٌ أَوْ شَهِيدَانِ". (رواه البخاري، مشكاة : ٥٩٧ / باب مناقب هؤلاء الثلاثة رضي الله عنهم)

"ارے اُحد! تھم جا، کیوں کہ اس وقت تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس میں نبی سے مُراد تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، صدیق سے

مُراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور دو شہید سے مُراد حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما ہیں۔

نبی کے بعد سب سے اعلیٰ مقام صدیق کا ہے اور سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیق فرمایا۔ اس سے بھی آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری اُمّت میں سب سے افضل ہونا واضح ہو گیا۔

نیز مرض الوفات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے مصلے پر امامت کے لیے مقرّر فرمایا، اور شرعی ضابطہ یہ ہے کہ امام اسے مقرّر کیا جائے جو سب سے اعلیٰ و افضل ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مسجد کا امام مقرّر فرمایا، یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ آپ سیّد الصحابہ ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات:

آپ کی پاکیزہ زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) اسلام سے قبل (۲) اسلام کے بعد (۳) خلافت کے بعد۔ ان میں حضرات علماء نے سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اسلام سے قبل کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت واقعۂ عام الفیل کے دو سال چھ ماہ بعد اور ہجرتِ نبوی سے پچاس سال چھ ماہ پہلے ۲۷ / اکتوبر ۵۷۳ء کو ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے تقریباً دو سال بعد۔ زمانۂ جاہلیت میں آپ کا نام عبدالکعبہ رکھا گیا، جسے بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبدیل فرما کر عبداللہ رکھا، آپ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ، والدہ کا نام سلمٰی بنت صخر اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کے بقول لیلیٰ بنت صخر اور کنیت اُمّ الخیر ہے۔ آپ کا تعلق قبیلۂ قریش کی شاخ بنو تیم سے ہے۔ سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب والد اور والدہ دونوں کی جانب سے ساتویں پشت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ابوبکر ہے، اسی سے آپ مشہور بھی ہوئے۔

حضرات مؤرّخین نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں: ایک وجہ یہ کہ عربی زبان میں "بَکْر" جوان اونٹ کو کہتے ہیں، چوں کہ سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اونٹوں کو پالنے اور ان کی بہترین پرورش میں بڑی دل چسپی رکھتے تھے، نیز ان کے علاج و معالجے میں بھی بڑی مہارت اور واقفیت رکھتے تھے، اس مناسبت سے لوگوں نے آپ کو ''ابوبکر'' کہنا شروع کر دیا، جس کے معنیٰ ہیں اونٹوں کا باپ۔ سوچئے کہ جو انسان جانوروں تک کا خیال رکھتا ہو وہ انسانوں کا کتنا خیال رکھتا ہوگا!

دوسری وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ لفظ ''ابو'' کے ایک معنیٰ ہیں والا، اور ''بکر'' کے معنیٰ ہیں پہل کرنا، پیش قدمی کرنا، آپ قبولِ اسلام سے قبل ہی ہمیشہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں پہل اور پیش قدمی کرنے والے تھے، پھر بعثت نبوی اور نزولِ وحی کے بعد قبولِ اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن رسالت کو آگے بڑھانے میں اپنے اموال و اوقات سے ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فائدہ پہنچانے میں دیگر تمام صحابہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے، جس کی شہادت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور میں دیتے ہوئے فرمایا کہ ''لوگوں میں میرے سب سے بڑے محسن ابوبکر ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد ہوا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا لِأَحَدٍ عِنْدَنَا يَدٌ إِلَّا وَقَدْ كَافَيْنَاهُ مَا خَلَا أَبَا بَكْرٍ، فَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا يَدًا يُكَافِيهِ اللهُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَا نَفَعَنِي مَالُ أَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِي مَالُ أَبِي بَكْرٍ". (الترمذي، مشكوٰة : ٥٥٥ / باب مناقب قريش وذكر القبائل / الفصل الأول)

''ایسا کوئی نہیں جس نے ہمیں کچھ عطا کیا ہو، ہمارے ساتھ امداد و احسان کا

معاملہ کیا ہو اور ہم نے اس (محسن) کو بدلہ نہ دیا ہو۔ (ہر ایک کے احسانات کا بدلہ میں نے دُنیا ہی میں چکا دیا ہے) لیکن ابوبکر (میرا وہ یار اور رفیق غار) ہے جس کے احسانات کا بدلہ تو قیامت میں اللہ تعالیٰ ہی عطا کریں گے، مجھے کسی کے مال نے اِتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر کے مال نے پہنچایا۔''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امورِ خیر میں پہل اور پیش قدمی کرنے کے سبب اس کنیت سے پکارا جانے لگا۔

علاوہ ازیں ''صدیق'' اور ''عتیق'' آپ کے وہ مبارک القاب، ایوارڈز اور گولڈ میڈلز ہیں جو من جانب اللہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو عطا فرمائے۔

یہاں یہ وضاحت بھی مفید ہے کہ ایک لفظ ہے ''سچّا'' جسے ''صادق'' کہتے ہیں، اور دوسرا لفظ ہے نہایت سچّا، اسے ''صدیق'' کہتے ہیں، دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے کہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تو یہ صادق ہے، لیکن کہنے والا زبان کی یہ بات دِل کے یقین سے کہے تو وہ صدیق ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ لقب خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمایا، جس کے متعلّق تفصیل گزر چکی۔

''عتیق'' کا ایک مطلب ہے آزاد شدہ، حدیث پاک میں ہے، سیّدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس اقدس میں حاضر ہوئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ اخلاق واوصاف سے خوش ہوکر) فرمایا:

"أَنْتَ عَتِيْقُ اللهِ مِنَ النَّارِ، فَيَوْمَئِذٍ سُمِّيَ عَتِيْقًا". (الترمذي، مشكوة المصابيح : ط۵۵۶/ باب مناقب أبي بكر)

''اللہ پاک نے آپ کو جہنّم سے آزاد فرما دیا۔'' تو اسی دِن سے آپ کا ایک

لقب ''عتیق'' ہوگیا۔

صاحبو! اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں بھی القاب رائج تھے، البتہ اس میں مبالغہ نہ تھا، لہٰذا کسی کو اس کے واقعی اوصاف کی بُنیاد پر مناسب القاب سے نوازنا بدعت نہیں ہے۔

ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ولادت کے بعد یا کسی اور موقع پر آپ کی والدہ سلمٰی بنت صخر (یا لیلیٰ بنت صخر) بن عامر نے اپنے اس عظیم شان والے بیٹے سے متعلّق ہاتف غیبی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

يَا أَمَةَ اللهِ عَلَى التَّحْقِيقِ! أَبْشِرِيْ بِالْوَلَدِ الْعَتِيْقِ

اسْمُهُ فِي السَّمَاءِ الصِّدِّيقُ لِمُحَمَّدٍ صَاحِبٌ وَرَفِيقُ

(مرقاۃ المفاتیح: ۱۷/ ۳۳۴)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جس ماحول میں اپنا بچپن اور لڑکپن بلکہ جوانی گزاری وہ ماحول قابل لاحول تھا، ہر طرف کفر و شرک اور فسق و فجور کا زور تھا، مگر چوں کہ حق تعالیٰ آپ کو اپنے آخری رسول، محبوبِ کل، ہادیٔ سبل کا حبیب و محبوب اور رفیق و وزیر بنانا چاہتے تھے اس لیے آپ کی فطرت ہی ایسی بنائی کہ آپ طبعی اور فطری طور پر بھی جاہلیت کی بُرائیوں سے دور اور نفور رہتے تھے۔

منقول ہے کہ آپ کے والد ابو قحافہ ایک مرتبہ آپ کو لے کر بُت خانے گئے اور اس کی عظمت بیان کر کے اُس کی عبادت کی ترغیب دینے لگے، آپ کو بے حقیقت و بے حیثیت بتوں کی عظمت و عبادت گوارا نہ تھی، اس لیے مندر کے بڑے بُت سے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بھوکا ہوں، کیا تم مجھے کھانا دے سکتے ہو؟ کپڑے دے سکتے ہو؟ بتوں کی بے زبانی

مسلّم ہے، کوئی جواب نہ دارد، تب آپ نے غصے ہو کر بُت کو ایک پتھر مارا، جس سے وہ منھ کے بل گر پڑا۔ (سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، از: صحابہ کی پاکیزہ زندگی)

بُت پرستی سے تو آپ کا دامن پہلے ہی سے پاک تھا، اب آپ اس سے مزید بیزار ہو گئے۔ اسی طرح دورِ جاہلیت میں بھی جب کہ شراب بہت زیادہ عام تھی، مگر آپ نے کبھی شراب نہیں پی، روایت میں ہے کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ جاہلیت میں کبھی آپ نے شراب پی؟ تو فرمایا: اللہ کی پناہ! کبھی نہیں، کیوں کہ میں اپنی عزّت و اخلاق کو داغدار ہونے سے بچانا چاہتا تھا، اور جو بندہ شراب پیتا ہے وہ اپنی عزّت و اخلاق کو ضائع کر دیتا ہے، یہ بات سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تصدیق فرمائی۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۲۹)

سب جانتے ہیں کہ جہلائے عرب میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج و مزاج نہیں تھا، چند لوگ ان میں پڑھے لکھے تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان میں سے ایک تھے، اس وجہ سے بھی آپ کو قوم میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ آپ نے کپڑوں کی تجارت شروع کی، جس میں آپ کی سچّائی اور سمجھ داری کے سبب غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تجارت ہی کے سلسلے میں آپ نے نوجوانی میں اپنے جگری دوست محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مل کر شام کا سفر کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیس سال کی عمر میں شام کا سفر کیا، جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے، اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، اس سفر میں بحیرا راہب سے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی پیشین گوئی سنی (جو اس نے آسمانی کتابوں میں پڑھ کر، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر بیان کی) تب ہی سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے جگری دوست سے اور زیادہ قریب ہو گئے اور فیصلہ کر لیا

کہ ساری زندگی اس دوستی کو نبھائیں گے اور ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہیں گے۔

قبولِ اسلام کے بعد کے حالات:

یہی وجہ ہے کہ نزولِ وحی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے تو اپنی رفیقۂ حیات سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو دین کی دعوت پیش کی، جسے اُنھوں نے قبول فرمایا، بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اپنے اس رفیق خاص کو دین کی دعوت دی تو وہ بھی بلا کسی دلیل و حجّت طلب کیے اور کسی قسم کے غور و فکر اور چون و چرا کے بغیر اوّل مرحلے میں ایمان قبول فرما کر مشرّف باسلام ہو گئے، حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس کسی پر بھی اسلام پیش کیا وہ اسلام سے کچھ نہ کچھ ضرور جھجکا، مگر ابوبکر نے بلا جھجک لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ (عیون الاثر: ۱/ ۹۵، سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۱۵۰)

علّامہ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

چشم احمد بر ابوبکرے زدہ　　او زیک تصدیق صدیق آمدہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے دعوت ایمان پیش کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی، جس تصدیق نے ابوبکر کو صدیق بنا دیا۔

حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ عورتوں میں بلکہ اُمّت میں سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والی سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کے بعد آزاد مَردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تو بچّوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اوّل المؤمنین ہیں۔

(البدایہ والنہایہ: ۳/ ۲۹، سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۱۵۰)

یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی لوگ تھے۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہ اکثر بدظن ہوتا ہے، جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصیت تھی کہ

جو آپ سے قریب ہوتا وہ آپ پر فِدا ہو جاتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہی حال تھا۔

سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوتی مشن کو بڑھانے اور تقویت پہنچانے کے لیے اپنا مال و متاع بلکہ کل سرمایہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے وقف کر دیا، آپ کی دعوتی فکر کے نتیجے میں حضرت عثمان بن عفّان، حضرت زبیر بن عوّام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم وغیرہم مسلمان ہوئے، یہ سب شُرفائے قریش اور عشرۂ مبشّرہ میں سے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے، ان ہی کے متعلّق حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ﴾ [الحدید : ۱۹]

''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہید ہیں، ان کے لیے ان کا (خصوصی) اجر بھی ہے اور نور بھی۔''

یہاں صدیقین سے مُراد ایک قول کے مطابق اُمّت محمدیہ کا ہر مخلص مؤمن ہے، اور شہید سے مُراد یا تو جہاد فی سبیل اللہ میں مارا جانے والا یا پھر قیامت کے دِن حضرات انبیائے کرام و رسل علیہم السلام کی تبلیغ کی گواہی دینے والا مُراد ہے، اور یہ گواہی اُمّت محمدیہ کا اعزاز ہے، چنانچہ فرمانِ باری ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ [البقرۃ : ۱۴۳]

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں (اعتدال والی) بہتر اُمّت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ ہو۔''

ظاہر ہے کہ اُمّت محمدیہ کا ہر سچّا پکّا مسلمان اس کا مصداق ہوسکتا ہے، لیکن اس کے اوّلین مصداق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، بالخصوص جو حضرات ابتدائی مکّی دور میں مسلمان ہوئے وہ سخت حالات سے دوچار ہوئے اور دینِ حق کی خاطر اُنھوں نے سخت سے سخت قربانیاں پیش فرمائیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی مکّی زندگی کے مکمّل تیرہ سال تک ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں، اور ہر تکلیف و مصیبت میں ہر طرح سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا مکمّل ساتھ دیا اور دُشمنوں سے ان کا دِفاع فرمایا۔

طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما جب اسلام لائے تو نوفل بن خویلد نے جو قریش کے شیر کہلاتے تھے دونوں کو ایک رسّی میں باندھ دیا، اسی وجہ سے حضرت صدیق اکبر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما ''قرینین'' (یعنی دونوں ایک رسّی میں بندھے ہوئے) کہلاتے ہیں۔ (سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۲۳۰)

نیز مسند بزّار اور دلائل ابی نعیم میں محمد بن علی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبے میں ارشاد فرمایا: بتاؤ! سب سے زیادہ بہادُر کون ہے؟ لوگوں نے کہا: آپ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا حال تو یہ ہے کہ جس نے میرا مقابلہ کیا اس سے میں نے انتقام لیا، (اس لیے یہ کوئی خاص بہادُری نہیں، اصل) بہادُر تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ قریش مکّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارتے جا رہے تھے اور یہ کہتے جا رہے تھے کہ "أَنْتَ جَعَلْتَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَّاحِدًا". تو نے ہی ہمارے تمام معبودوں کو ایک معبود بنا دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت ہم میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جائے اور آپ کو دُشمنوں سے چھڑائے، حسن اتفاق سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عین اُسی وقت تشریف لائے اور فوراً

دُشمنوں کے غول میں گھُس گئے، ایک مکّا اس کے اور ایک اُس کے رسید کیا، اُس کے بعد آپ نے عقبہ بن ابی معیط کو دھکّا دیا اور وہ آیت پڑھی جس میں قومِ فرعون کے مردِ مؤمن نے فرعون و ہامان سے کہا تھا:

﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [المؤمن:۲۸]

''کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمھارے رب کے پاس سے واضح معجزات لے کر آیا ہے۔''

اسی طرح اس وقت سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفّار سے کہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ فرما کر رونے لگے اور فرمایا: اللہ کی قسم! سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آلِ فرعون کے اس مردِ مؤمن سے بھی افضل ہیں، بلکہ اللہ کی قسم! سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک گھڑی آلِ فرعون کے اس مردِ مؤمن کی ساری زندگی سے بدرجہا بہتر ہے، کیوں کہ آلِ فرعون کے مردِ مؤمن نے اپنے ایمان کو چھُپایا تھا، جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا اظہار فرمایا۔

(فتح الباري: ۱۴۹/۷، باب ما لقي النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه من المشركين بمكة)

نیز اس شخص نے صرف زبانی نصیحت وحمایت کی، جب کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زبانی نصیحت وحمایت کے ساتھ طاقت وقوت سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت ونُصرت فرمائی، آپ کی اس حمایت ونُصرت کے سبب دُشمنوں پر سکتہ طاری ہوگیا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علیحدہ ہوگئے۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۱۹۸۔۱۹۹)

اسلام کے ابتدائی دور میں جب آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں سے جو آزاد ہیں اُنھیں کوئی زیادہ پریشان نہیں کرسکتا، البتہ جو مسلمان کسی کی غلامی میں ہیں اُن کی ماب لنچنگ ہورہی ہے، ان پر ہر ممکن ظلم ڈھایا جارہا ہے، تب آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے اشارے پر غلاموں کو آزاد کرانا شروع کیا، اپنے مال کا بڑا حصّہ اس کام میں خرچ کیا، منھ مانگی قیمت دے کر بھی مسلمان غلاموں اور کنیزوں کو ظالم کفّار سے آزاد کروایا۔

مستدرکِ حاکم میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ عادت تھی کہ جس مسلمان کو کفّار کے ہاتھ میں قید دیکھتے اس کو خرید کر آزاد فرما دیتے تھے، اور یہ لوگ عموماً ضعفاء ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ نے کہا: جب تم غلاموں کو آزاد ہی کرتے ہو تو اِتنا کام کرلو کہ ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی اور بہادر ہیں، تاکہ وہ کل تمھارے دُشمنوں کا مقابلہ کرسکیں اور تمھاری حفاظت کرسکیں، تب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا مقصد ان آزاد کردہ حضرات (غلاموں) سے کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں ہے، بلکہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے ان کو آزاد کرتا ہوں۔ (تفسیر مظہری، معارف القرآن)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ آپ کی اس شان کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾ [اللیل:۱۷ - ۲۱]

''اور اس (آگ) سے اس بڑے پرہیزگار شخص کو بچالیا جائے گا جو اپنا مال (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اپنے جان و مال کی) پاکیزگی حاصل کرے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جارہا ہو، مگر (وہ) صرف اپنے ربِ عظیم کی رضاجوئی کے لیے (مال خرچ کررہا ہے) اور عنقریب وہ (اللہ کی عطا سے اور اللہ اس کی وفا سے) راضی ہوجائے گا۔''

واقعہ یہ ہے کہ اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر قدم قدم پر موقع بہ موقع جتنا مال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خرچ فرمایا اس میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم کا سرمایہ تیرہ سال (مکی دور) میں اسلام اور مسلمانوں پر خرچ کر ڈالا، اور جو بچا وہ سفر ہجرت اور مسجد نبوی کی زمین کی خریداری پر صرف ہو گیا، جب کپڑا نہ رہا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کمبل اوڑھ کر دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں اپنے پروردگار سے بے حد راضی ہوں۔ (سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۲۲۸)

غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس طرح بے انتہا محبّت فرماتے تھے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بے انتہا محبّت فرماتے۔

حدیث پاک میں مروی ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: "أَيُّ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيْكَ؟" "حضور! آپ کو سب سے زیادہ محبّت کس سے ہے؟" "قَالَ: عَائِشَةُ، قُلْتُ: مِنَ الرِّجَالِ؟ قَالَ أَبُوْهَا". آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ عائشہ صدیقہ سے، تو میں نے عرض کیا: مردوں میں سب سے زیادہ محبّت آپ کو کس سے ہے؟ فرمایا: عائشہ کے والد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے۔

(متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۵۵۵/ باب مناقب ابی بکر)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: تم میرے غار کے رفیق اور حوضِ کوثر کے ساتھی ہو۔

"أَنْتَ صَاحِبِيْ فِي الغَارِ، وَصَاحِبِيْ عَلَى الحَوْضِ". (الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ص۵۵۵/ باب مناقب قريش وذكر القبائل / الفصل الأول)

نیز ایک موقع پر فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ: "أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَخَذَ بِيَدِي، فَأَرَانِي بَابَ الْجَنَّةِ الَّذِي تَدْخُلُ مِنْهُ أُمَّتِي"، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: "يَا رَسُولَ اللهِ! وَدِدْتُ أَنِّي كُنْتُ مَعَكَ، حَتَّى أَنْظُرَ إِلَيْهِ"، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَمَا إِنَّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ! أَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِي". (أبو داود، مشكوٰة : ٥٥٦ / باب مناقب قريش وذكر القبائل / الفصل الأول)

''اے ابوبکر! تم میری اُمّت کے سب سے پہلے جنّتی ہو۔'' یہ ہے شانِ ابوبکر بزبانِ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عاشق اکبر تھے:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غایت درجے کی محبّت رکھتے تھے، یعنی آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطیع ہونے کے ساتھ متبع بھی تھے، اور اس اُمّت میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے عاشق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی ہیں، آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشا کو خوب سمجھتے اور اس پر فوراً عمل پیرا ہوتے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق واصاف کا ہر حال میں کامل اتباع فرماتے، گویا آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رنگ میں رنگ چکے تھے، اس کی دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

(۱) جس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہجرت حبشہ کے ارادے سے نکلے تو مکّہ کے باہر مقام ''برک الغماد'' پر قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی، علیک سلیک کے بعد جب اُسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارادے کا پتا چلا تو وہ کہنے لگا: ابوبکر! تم جیسا آدمی نہ نکلتا ہے اور نہ نکالا جاتا ہے، کیوں کہ تم بے سہاروں کا سہارا ہو، صلہ رحمی کرنے والے ہو، قرض داروں کا بوجھ برداشت کرتے ہو، مہمان نواز ہو، حق کے مددگار ہو، میں تمھیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ (تمھاری طرح شان والا شخص

ہمارے یہاں سے جائے یہ ہمارے لیے رُسوائی کی بات ہے) ابن الدغنہ نے اس موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعینہٖ وہی اوصاف بیان کیے جو پہلی وحی کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینے کے لیے اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی شان میں کہے تھے۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۲۶۳)

(۲) صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس صلح سے پریشان اور مغموم تھے، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح بالکل مطمئن تھے، اس موقع پر سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے نبیٔ برحق نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! کیا ہم لوگ حق پر اور کفّار باطل پر نہیں ہیں؟ فرمایا: بے شک، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: پھر ہم (اس قدر دب کر صلح کر کے) ذلّت کیوں برداشت کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کا رسول اور نبیٔ برحق ہوں، میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا، وہی میرا معین و مددگار ہے۔ اس کے بعد فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی گفتگو کی، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس وقت لفظ بہ لفظ وہی جواب دیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا تھا۔ (زاد المعاد: ۲/ ۱۲۸، سیرۃ المصطفیٰ: ۲/ ۳۶۴)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اخلاق و اوصاف وہی تھے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مرضی و منشا بھی وہی ہوتی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی۔ ان حقائق کی بنیاد پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق اکبر بھی تھے۔ شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وَكَانَ حِبَّ رَسُوْلِ اللهِ قَدْ عَلِمُوْا مِنَ البَرِيَّـةِ لَمْ يَعْـدِلْ بِـهٖ رَجُـلًا

یہ بات دُنیا پر عیاں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جتنی محبّت وعقیدت ہے دُنیا میں اتنی عقیدت وعشق کسی کو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس عاشق اکبر ہی نے اُمّت کو سنبھالا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو مضبوط کیا اور بڑھایا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اور سچّے جانشین بنے، جس کا واضح اشارہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت بھی فرمایا جب ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی معاملے میں گفتگو کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بعد میں آنے کو فرمایا، اس نے عرض کیا: حضور! میں آئی اور آپ کو نہ پایا تو بات کیسے بنے گی؟ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فَإِنْ لَمْ تَجِدِيْنِيْ فَأْتِيْ أَبَا بَكْرٍ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٥٥ / باب مناقب قريش وذكر القبائل / الفصل الأول)

''اگر مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس چلی جانا'' (کیوں کہ وہ میرے نائب اور خلیفہ ہیں)

ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی) خلافت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (توضیحات: ۸/ ۳۷۴)

نیز آیت کریمہ میں لفظ "ثَانِيَ اثْنَيْنِ" اس بات کی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلیفۂ بلافصل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، کیوں کہ خلیفہ بادشاہ کا ثانی ہوتا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

نیز آیت کریمہ میں لفظ "لِصَاحِبِهٖ" سے بھی آپ کی صحابیت کا صریح ثبوت ملتا ہے، یوں تو تمام ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صحابیت مسلّم ہے، لیکن حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ کی صحابیت قرآن سے ثابت ہے، اس لیے اس کا منکر کافر ہے۔ (انوار البیان)

خلافت کے بعد کے حالات:

آپ نے اپنے دورِ خلافت میں مرتدین کا پوری جرأت سے مقابلہ کیا اور فتنوں کو بڑی قوت سے دبا دیا، یہاں تک کہ تمام جزیرۃ العرب اسلامی حکومت کا مطیع بن گیا۔

حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مدّتِ خلافت صرف سوا دو برس ہے، لیکن اس قلیل مدّت میں بھی آپ نے عظیم الشان کارنامے انجام دیے، آپ کے دورِ خلافت کا بیشتر حصہ اندرونی و بیرونی دُشمنوں پر قابو پانے میں صرف ہوا، لیکن اس کے باوجود آپ ملکی نظم و انتظام سے غافل نہیں رہے، جب کبھی کوئی اہم مسئلہ و معاملہ پیش آتا تو آپ پہلے یہ دیکھتے کہ اس بارے میں قرآنِ کریم کیا کہتا ہے؟ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات اس سلسلے میں کیا ہیں؟ اگر سنّت رسول میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تو آپ مہاجرین و انصار کے اکابر کو جمع کر کے مشورہ کرتے، پھر فیصلہ فرماتے۔ دورِ صدیقی گویا ارشادِ باری ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ:۳۸] کی عملی تفسیر تھا، آپ نے اپنی قوتِ تدبر و فراست ایمانی اور عزم و ہمت کی بدولت ریاست مدینہ اور خلافت اسلامیہ کو اِتنی مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا جس پر آپ کے اولوالعزم جانشین خلیفۂ ثانی سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک وسیع و عریض اور شاندار عمارت تعمیر کر دی۔

اس کے باوجود آپ کی تواضع و انکسار کا یہ حال تھا کہ جب آپ کی کوئی تعریف کرتا تو آپ یہ دُعا کرتے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ خَيْراً مِمَّا يَقُوْلُوْنَ، وَاغْفِرْلِيْ مَا لَا يَعْلَمُوْنَ".
(لذتِ مناجات:۸۲)

''اے اللہ! جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں آپ مجھے اس سے بہتر بنا دیجیے، اور جو کچھ یہ جانتے نہیں اس پر میری مغفرت فرما دیجیے۔''

اَللّٰهُمَّ أَنْتَ أَعْلَمُ بِي مِنْ نَفْسِي، وَأَنَا أَعْلَمُ بِنَفْسِي مِنْهُمْ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي خَيْرًا مِمَّا يَظُنُّونَ، وَاغْفِرْ لِي مَا لا يَعْلَمُونَ، وَلا تُؤَاخِذْنِي بِمَا يَقُولُونَ." (أسد الغابة : ۳۲٤/۳)

''اے اللہ! تو مجھے میری ذات سے بھی زیادہ جانتا ہے، اور میں خود اُن لوگوں کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ جانتا ہوں، اے اللہ! یہ لوگ میرے متعلّق جو گمان رکھتے ہیں مجھے اس سے بہتر بنا دے، اور میرے اُن گناہوں کو معاف فرما دے جنھیں یہ لوگ نہیں جانتے، اور یہ لوگ میری توصیف میں جو باتیں کرتے ہیں ان میں میرا مؤاخذہ نہ فرما!'' (سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: ۱/ ۲۷۷، بحوالہ اسد الغابہ: ۳/ ۳۲۴، مستفاد از: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ زندگی: ۷۳)

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سچّے جانشین نے ۲۲/ جمادی الآخرۃ/ ۱۳ھ کو بہ عمر ۶۳/ سال اس دارِ فانی سے رحلت فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جگہ پائی۔

کسی نے شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس طرح بھی بیان کیا: ''جو کل تھا وہ آج ہے، جو آج ہے وہ کل تھا۔'' مطلب یہ ہے کہ آج حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب ہیں، تو کل گذشتہ بھی آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ حق تعالیٰ ہمیں بھی ان کا قرب نصیب فرمائیں۔ آمین۔

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عفت وعظمت پر نذرانۂ عقیدت

تیری پاکیزگی پر نطق فطرت نے شہادت دی
تجھے عظمت عطا کی، عافیت بخشی، فضیلت دی

خدائے لم یزل کا بارہا تجھ پر سلام آیا
مبارک ہیں وہ لب جن پر ادب سے تیرا نام آیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے "صدیقہ" لقب تیرا
فقط فرشی نہیں عرشی بھی کرتے ہیں ادب تیرا

شرف تیرے دوپٹے نے یہ جنگ بدر میں پایا
اسے پرچم بنا کے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لہرایا

تیرا حجرہ امین خاص ہے ذاتِ رسالت کا
بساطِ عرش پر یہی ہے ٹکڑا باغِ جنّت کا

اسی میں رحمت اللعالمین رہتے تھے، رہتے ہیں
تیرا حجرہ ہے جس کو گنبد خضرا بھی کہتے ہی

اسی سے حشر کے دن سرورِ کونین اٹھیں گے
مگر تنہا نہیں اٹھیں گے، مع شیخین اٹھیں گے

شفاعت کی تیرے رحمت کدے سے ابتدا ہوگی
اسی پر امتوں کی مغفرت کی انتہا ہوگی

نعت پاک

اُجالے میں اندھیرے کا گزارا ہو نہیں سکتا
نبی کا نام لیوا بے سہارا ہو نہیں سکتا

بروزِ حشر ان کے سامنے جاؤں جہنّم میں
میرے آقا کو یہ ہرگز گوارا ہو نہیں سکتا

فرشتے باادب سورج، ستارے باعث رحمت
مدینہ سا کوئی بھی دلکش نظارہ ہو نہیں سکتا

نہیں قائل جو صدیق و عمر عثمان و حیدر رضی اللہ عنہم کا
یقیناً وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دُلارا ہو نہیں سکتا

بنامِ حق اگر ہم سب چلیں آقا کے اشارے پر
تو کشتی سے کبھی بدظن کنارہ ہو نہیں سکتا

مؤرخہ: ۲۴ر صفر المظفر ر ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۲۲ر ستمبر ر ۲۰۲۲ء
بروز جمعرات، بعد مغرب
بمقام: دار الارشاد الاسلامیہ بغالہ، دار السلام، تنزانیہ، مشرقی افریقہ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۳)

سیرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُونَ، فَإِنْ يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ فَإِنَّهُ عُمَرُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٥٦ / باب مناقب عمر رضي الله عنه)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم سے پہلے لوگوں میں محدَّث (الہام یافتہ) ہوا کرتے تھے، اگر میری اُمّت میں کوئی محدَّث (ملہم) ہوا تو وہ عمر ہوں گے۔''

سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سیّد المحدَّثین ہیں:

اللہ ربّ العزت نے حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے علاوہ بھی ہر اُمّت میں الہامی اشخاص وافراد پیدا فرمائے ہیں، جن کی اِلہام واِلقاء کے ذریعے رہنمائی کی جاتی ہے، من جانب اللہ اُن کے دِلوں میں نیکی وبھلائی کی باتیں ڈالی جاتی ہیں، خصوصاً جب کوئی اہم وپیچیدہ مسئلہ ومعاملہ درپیش ہو تو من جانب اللہ وہ ایسی رائے اختیار کرتے ہیں جو درست اور صحیح ہو، اس قسم کے اَفراد واَشخاص کو ''موفَّق من اللہ'' بھی کہا جاتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی توفیق ہر وقت ان کے ساتھ ہوتی ہے، حق تعالیٰ ان کے دِل وزبان پر حق، سچ اور نیکی وبھلائی کو جاری فرمادیتے ہیں۔

اس اُمّت میں بھی ایسے بہت سے اشخاص وافراد ہر زمانے وعلاقے میں رہے ہیں، اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے رہیں گے، ان میں سرفہرست خلیفۂ ثانی لاثانی سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہیں، جیسے سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں کلّی طور پر سب سے افضل اور سیّد الصحابہ ہیں، تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی جزوی خصوصیات میں یہ ہے کہ آپ سیّد المحدّثین ہیں، یعنی اُمّت کے تمام الہام یافتہ اور موفّق من اللہ افراد واشخاص کے سردار ہیں، حدیث مذکور میں اسی کو فرمایا، اس کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ اللهَ جَعَلَ الحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهٖ". (سنن الترمذي، مشكوٰة : ٥٥٧ / باب مناقب عمر رضي الله عنه)

حق تعالیٰ نے دین اسلام کی برکت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی زبان ودِل پر حق جاری فرمادیا۔

سیرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جو بات حق تعالیٰ نے آپ کے دِل وزبان پر جاری فرمائی بعد میں وہی آیت قرآنی بن گئی، جو داعیہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دِل میں پیدا ہوا من جانب اللہ وہی حکم وحی کے ذریعے نازل ہوگیا۔

موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ:

(۱).....ایک مرتبہ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہے تھے، طواف کے بعد مقامِ ابراہیم پر پہنچے تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے

درخواست کی کہ یا رسول اللہ! اگر طواف کے بعد مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعات پڑھی جائیں تو کتنا اچھا ہو! اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵]

''اور مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔''

(۲)..... ایک مرتبہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: حضور! آپ کی خدمت میں مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں، اس لیے اگر آپ ازواجِ مطہرات سے بھی پردے کا حکم فرمادیں تو کتنا اچھا ہو! اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ﴾ [الأحزاب: ۵۳]

''اور اگر اُن ازواج سے تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔''

(۳)..... جنگ بدر کے ستر (۷۰) قیدیوں کے متعلق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ اُنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کر دیا جائے؟ تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ کفر کے ان سرغنوں کو قتل ہی کر دیا جائے، اس سے کفّار پر اسلام کا رُعب بھی بیٹھ جائے گا اور کفر کی جڑیں بھی کٹ جائیں گی، اس کے برعکس عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہ تھی کہ اُنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور بالآخر اسی پر عمل بھی ہوا، تب حق تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرما کر حکم فرمایا کہ اسی طرح کرنا چاہیے تھا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ [الأنفال: ۶۷]

''نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے پاس (کافر) قیدی ہوں، جب تک کہ زمین میں (دُشمنوں کو) اچھی طرح کچل نہ دے۔''

اسی کو ایک حدیث میں سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے نہایت ادب کے ساتھ ذکر

فرمایا کہ

"وَافَقْتُ رَبِّيْ فِيْ ثَلَاثٍ: فِيْ مَقَامِ إِبْرَاهِيْمَ، وَفِي الْحِجَابِ، وَفِيْ أُسَارٰى بَدْرٍ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٥٨ / باب مناقب عمر رضي الله عنه)

(یہ وہ) تین باتیں ہیں جن میں میرے رب کا حکم میری رائے کے موافق نازل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ جو بات اور حکم اللہ تعالیٰ کے یہاں پردۂ غیب میں مقرر تھا اس کے ظہور سے پہلے اللہ ربّ العالمین نے سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی زبان و دِل سے ظاہر فرمادیا۔

ان کے علاوہ بھی قرآنِ کریم میں کئی مقامات ایسے ہیں جن میں سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی رائی حق تعالیٰ کے حکم اور مشیت کے موافق تھی اور اسی کے مطابق آیت کریمہ نازل ہوئی، جنھیں ''موافقاتِ عمر'' کہتے ہیں۔

(۴).....رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کی موت کے بعد اس کے بیٹے صحابیٔ رسول کی خواہش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منع کیا، بعد میں اس ممانعت کا حکم قرآنِ پاک میں نازل ہوا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [التوبة:٨٤]

''اور آپ کبھی بھی ان (منافقوں) میں سے جو کوئی مر جائے اس (کے جنازے) پر نماز نہ پڑھیں اور نہ ہی آپ اس کی قبر پر کھڑے ہوں (کیوں کہ آپ کا کسی جگہ قدم رکھنا بھی رحمت و برکت کا باعث ہوتا ہے اور یہ آپ کی رحمت و برکت کے حق دار نہیں ہیں)۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر

کیا اور وہ نافرمان ہونے کی حالت میں ہی مر گئے۔"

(۵).....اسی طرح سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سن کر فرمایا: "سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ" بعد میں قرآنِ کریم کی آیت اسی طرح نازل ہوئی۔ (توضیحات: ۸/۳۹۵)

(۶).....نیز واقعۂ عسل کے موقع پر سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی بعد میں اسی کے مطابق آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝﴾ [التحریم: ۵]

"اگر وہ تمھیں طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ اُن کا رب انھیں تم سے بہتر ازواج بدلے میں عطا فرما دے (جو) فرماں بردار، ایماندار، اطاعت گزار، توبہ شعار، عبادت گزار، روزہ دار، (بعض) شوہر دیدہ اور (بعض) کنواریاں ہوں گی۔"

علّامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بیس موافقاتِ عمر کا ذکر کیا ہے۔ (توضیحات: ۸/۳۹۵)

غالباً اسی وجہ سے ایک موقع پر سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خصوصی منقبت و فضیلت بیان کرتے ہوئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ". (رواه الترمذي وقال: هٰذا حديث حسن غريب، مشكوٰة: ۵۵۸)

"میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر (میں اس کی استعداد تھی، اس لیے وہ) نبی ہوتے، لیکن چوں کہ نبوت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرما دیا، اس لیے اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں بن سکتا۔

صاحبو! رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسی استعداد والا جلیل القدر صحابی خلیفۂ ثانی لاثانی نبی نہیں بن سکتا تو پھر کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی کیا اوقات جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے؟

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات:

سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے قبل بھی بڑی عزّت وعظمت سے نوازا تھا، کیوں کہ آپ کا تعلق عرب کے معزز وممتاز خاندان سے تھا، آپ کی ولادت مکّہ مکرّمہ میں واقعۂ فیل کے تیرہ سال بعد ہجرت سے چالیس سال پہلے ۵۸۳ء میں ہوئی، آپ کا نام عمر بن خطّاب، لقب فاروق اور کنیت ابوحفص ہے، لقب اور کنیت دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا شدہ ہیں، نویں پشت میں آپ کا نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے، نویں پشت میں کعب کے دو بیٹے تھے، ایک مرّہ، دوسرے عدی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرّہ کی اولاد میں سے ہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدی کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے سیّدنا ابوحفص عمر فاروق رضی اللہ عنہ عدوی (قریشی) ہیں۔ (توضیحات:۸/۳۸۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خاندان دورِ جاہلیت سے ہی نہایت ممتاز تھا، آپ کے جدّ اعلیٰ عدی عرب کے باہمی تنازعات (جھگڑوں) میں ثالث (فیصل اور جج) مقرر ہوا کرتے تھے، اور قریش کو کسی قبیلے کے ساتھ کوئی سیاسی معاملہ درپیش ہوتا تو آپ سفیر بن کر جایا کرتے تھے، اور یہ دونوں منصب عدی کے خاندان میں نسل در نسل چلے آرہے تھے، ددھیال کی طرح سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ننہال کی طرف سے بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپ کی والدہ حنتمہ ہاشم بن مغیرہ کی بیٹی تھیں، اور مغیرہ اس درجے کے آدمی تھے کہ جب قریش کسی قبیلے سے نبرد آزمائی کے لیے جاتے تو فوج کا

اہتمام ان ہی کے متعلّق ہوتا تھا۔ (العقد الفرید، باب فضائل العرب)

آپ کے ایامِ طفولیت (بچپن) بلکہ سن رُشد (لڑکپن) کے حالات بھی پردۂ خفا میں (کم معلوم) ہیں۔ جوانی کا آغاز ہوا تو ان شریفانہ مشاغل میں مشغول ہو گئے جو شرفائے عرب میں عموماً رائج تھے، یعنی نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی، شہہ سواری اور خطابت میں مہارت پیدا کی، نیز لکھنا پڑھنا بھی سیکھا، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو سترہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان میں سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بھی سرفہرست ہیں۔

(استیعاب، تذکرہ عمر بن الخطاب)

تعلیم وتعلّم سے فارغ ہونے کے بعد آپ فکر معاش کی طرف متوجّہ ہوئے، عرب میں لوگوں کا زیادہ تر ذریعۂ معاش تجارت تھا، اس لیے آپ نے بھی اسی کو اختیار کیا اور اسی سلسلے میں آپ نے بھی دور دراز ممالک کا سفر کیا، جس کی وجہ سے آپ کو بڑے تجربے اور فوائد حاصل ہوئے۔ آپ کی خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری اور معاملہ فہمی بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے۔ اور ان ہی اوصاف کی بنا پر قریش نے آپ کو سفارت کے منصب پر مامور کر دیا تھا، قبائل کے درمیان جب کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو آپ ہی سفیر بن کر جاتے اور اپنے غیر معمولی فہم وتدبّر اور تجربے سے کام لے کر اس کو حل کرتے تھے۔ (فتوح البلدان بلاذری: ۴۷۷)

جب ریگستانِ عرب میں آفتابِ اسلام طلوع ہوا، مکّہ کی گھاٹیوں سے صدائے توحید بلند ہوئی، عمر کے لیے یہ صدا نہایت نامانوس تھی، اس لیے سخت برہم ہوئے، حتیٰ کہ جس کے متعلّق بھی معلوم ہوتا کہ وہ دامن اسلام سے وابستہ ہو گیا ہے تو آپ اس کے دُشمن بن جاتے اور سختی سے کام لیتے، لیکن اسلام کا نشہ تو ایسا نہ تھا جو چڑھ کر اُتر جاتا، تمام تر سختیوں کے باوجود آپ کسی کو بھی اسلام سے ہٹا نہ سکے، دین اسلام پر مسلمانوں

کی استقامت عمر کو متاثر کر گئی۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات:

ان ہی دِنوں ایک مرتبہ رات میں عمر مسجد حرام میں داخل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشغولِ تلاوت پایا، عمر بے اختیار کھڑے ہو کر سننے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ الحاقہ پڑھ رہے تھے، جس میں قیامت اور حشر ونشر کا نہایت مؤثر بیان ہے، عمر کے دِل پر خاص اثر ہوا، دِل میں کہا: قریش سچ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝﴾ [الحاقة: ٤٠-٤١]

''یہ ایک کریم قاصد کا (منزّل من اللہ) کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم یقین رکھتے ہو۔''

عمر نے دِل میں کہا: یہ تو کاہن ہے، جو میرے دِل کی بات بھی جان گیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلی آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ [الحاقة: ٤٢-٤٣]

''اور یہ کسی کاہن کا کلام بھی نہیں ہے، مگر تم بہت کم نصیحت لیتے ہو، یہ تو ربّ العالمین کی جانب سے اُتارا ہوا کلام ہے۔''

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: "فَوَقَعَ الإِسْلَامُ فِيْ قَلْبِيْ كُلَّ مَوْقِعٍ". (مسند احمد: ۱/۱۷) اسی وقت اسلام میرے دِل میں پوری طرح جاگزیں ہو گیا۔

چوں کہ آپ فطرۃً وطبعاً مستقل مزاج اور پختہ کار تھے، اس لیے اپنے اسلام کا

اظہار نہیں کیا، اسے چھپایا، لیکن اسی نمازِ تہجد کے بعد (یا بعد میں) جب رحمت للعالمین ﷺ نے ربّ العالمین کے سامنے جھولی پھیلا کر یہ دُعا کی:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " اَللّٰهُمَّ أَعِزِّ الإِسْلَامَ بِأَبِيْ جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ، أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ، فَأَصْبَحَ عُمَرُ، فَغَدَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ صُلِّي فِيْ المَسْجِدِ ظَاهِرًا". (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ۵۵۷)

''الٰہ العالمین! ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ذریعے اسلام کو سربلندی عطا فرما۔'' مگر یہ دولت قسّام ازل نے عمر کی قسمت میں لکھ دی تھی، اس لیے دُعائے رسول ﷺ عمر کے حق میں قبول ہوگئی۔ ہمارے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

عمر قبول، عمر قابل، عمر مقبول　　عمر دُعائے پیغمبر، عمر مُرادِ رسول

انسانی تاریخ میں تین دُعائیں ایسی ملتی ہیں جن کی وجہ سے صفحۂ ہستی پر ایک انقلاب بپا ہوگیا: (۱) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دُعا، جب آپ نے تعمیر بیت اللہ کے وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی رحمت کو مانگا:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [البقرة : ۱۲۹]

''اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول (ﷺ) مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان (کے نفوس وقلوب) کو خوب پاک صاف کردے، بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔''

(۲) حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی دُعا، جب آپ نے فرعون کے ظلم کے

خلاف بنی اسرائیل کے حقوق کی بحالی کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کی تصدیق و تائید کو مانگا:

﴿وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ﴾ [القصص : ۳٤]

''اور میرے بھائی ہارون وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں، سو اُنھیں میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے! کہ وہ میری تصدیق کر سکیں، میں اس بات سے (بھی) ڈرتا ہوں کہ (وہ) لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔''

(۳) حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دُعا، جب آپ نے ابتدائے اسلام میں گلشن اسلام کی آبیاری کے لیے عمر کی شوکت وجلالت کو مانگا:

"اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الإِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ خَاصَّةً". (ابن ماجه)

اس کا اثر یہ ہوا کہ صبح میں عمر پیغمبر اسلام کو قتل کرنے نکلے کہ راستے میں نُعیم بن عبداللہ نحام سے معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہ بنت خطّاب اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو گئے، تو فوراً بہن کے گھر گئے اور جا کر بہنوئی کی خوب پٹائی کی، جسم لہولہان کر دیا، بہن بولیں: عمر! جو خون تمھاری رگوں میں دوڑتا ہے وہی خون میری رگوں میں بھی دوڑتا ہے، اگر تم کفر میں پختہ ہو تو میں اسلام میں پختہ ہوں، جو کر سکتے ہو کر لو۔ فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ.

بہن بولیں: عمر! ہم کو اگر تو مار بھی ڈالے شکنجوں میں کسے، یا بوٹیاں کتوں سے نچوالے
مگر ہم دین حق سے ہرگز پھر نہیں سکتے بلندی معرفت کی مل گئی ہے، گر نہیں سکتے

حضور پاک ﷺ کی دُعائے مستجاب کے بعد بہن کی اسلام پر استقامت نے عمر کو مزید متاثر کیا، عمر کہنے لگے: اچھا! ٹھیک ہے، جو تم پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ!

اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک روایت کے مطابق سورۂ حدید کی ابتدائی آیات ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [الحدید:۷] تک سنائیں۔ اور دوسری روایت کے مطابق سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات ﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ﴾ [طٰہٰ:۱۴] تک سنائیں۔ (دار قطنی، حاکم، بیہقی)

تو عمر بے اختیار پکار اُٹھے: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ". پھر درِ اقدس پر مُرادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بن کر حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ اتنی زور سے لگایا کہ تمام پہاڑیاں گونج اُٹھیں۔ (سیرۃ النبی:۱/۲۰۹، بحوالہ: اسد الغابہ وابن عساکر وکامل ابن اثیر)

سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا یہ واقعہ سن نبوی چھ ماہِ ذوالحجہ میں پیش آیا، جب آپ کی عمر تینتیس (۳۳) سال کی تھی، ان دِنوں مسلمانوں کی تعداد انچالیس (۳۹) تھی۔ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خوش ہوئے، بلکہ آسمان کے فرشتے بھی خوش ہوئے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ عمر کے اسلام لانے سے آسمان کے فرشتے بھی خوش ہوئے۔ (ابن ماجہ)

اس سے قبل مسلمان بظاہر بے بسی اور مجبوری کے عالم میں تھے، علانیہ مذہبی فرائض کی ادائیگی تو درکنار اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، نہ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھنا آسان تھا، لیکن سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے اسلام لاتے ہی حالات بالکل بدل گئے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائے مستجاب کے مطابق واقعی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد باطل کے بالمقابل دینِ حق کو سربلندی نصیب ہوئی، علانیہ حرم میں نماز پڑھی جانے لگی۔ "ثُمَّ صُلِّيَ فِي الْمَسْجِدِ ظَاهِرًا". (ترمذی،

مشکوۃ: ۵۵۷)

نیز علانیہ طور پر اسلام کی دعوت وتبلیغ بھی شروع ہوگئی، اسی روز سے حق اور باطل کا فرق واضح ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ''فاروق'' کا لقب عطا فرمایا۔
(طبقاتِ ابن سعد: ۳/ ۱۹۴، سیرۃ مصطفیٰ: ۱/ ۲۵۱ تا ۲۵۶)

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی اسلام پر استقامت:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ میں قبولِ اسلام سے قبل جو شدّت کفر میں تھی وہی شدّت ومحبّت اور استقامت اب دین اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے پیدا ہوگئی۔ منقول ہے کہ اسلام لانے کے بعد آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے اسلام لانے کی خبر ایسے شخص کو دوں جو بات کو مشہور کرنے میں خوب ماہر ہو، تاکہ تمام مشرکین مکّہ کو میرے اسلام لانے کی اطلاع ہوجائے، اس کام کے لیے مکّہ میں جمیل بن معمر جمحی مناسب تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے جا کر کہا کہ تجھے معلوم بھی ہے کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں؟ سنتے ہی فوراً جمیل بن معمر اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے مسجد حرام کی طرف بھاگا اور جہاں رؤسائے قریش جمع تھے وہاں آکر بآوازِ بلند کہا: قریشیو! باخبر ہوجاؤ! خطّاب کا بیٹا بے دین ہوگیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی پیچھے پیچھے پہنچا اور کہا: یہ غلط کہتا ہے، میں صابی اور بے دین نہیں، بلکہ مسلمان ہوا ہوں، پھر آپ نے کلمہ شہادت کا برملا اظہار واعلان فرمایا، یہ سننا تھا کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور مارنا شروع کیا، اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ماموں عاص بن وائل سہمی نے آپ کو چھڑا کر اپنی پناہ میں لے لیا، جس کی وجہ سے مشرکین کا مجمع منتشر ہوگیا۔ (سیرت ابن ہشام: ۱۲۱، البدایہ والنہایہ: ۳/ ۸۲، فتح الباری: ۷/ ۱۳۵، از: سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۲۵۷)

اس کے بعد مکّہ مکرّمہ میں جس قدر مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اسی قدر مشرکین

کا بغض وعناد بھی بڑھتا گیا، مسلمانوں کا کامل استیصال کرنے کے لیے مشرکین کے تمام قبائل نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ مسلمانوں کے علاوہ بنی ہاشم اور ان کے تمام حامیوں سے تعلقات ختم کر دیے جائیں، یہ مذموم سلسلہ تین سالوں تک قائم رہا، لیکن کسی مسلمان کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش نہیں آئی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اسلام لانے کے بعد سے ہجرت تک مشرکین مکّہ کے مظالم کا برابر مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہجرتِ مدینہ منورہ کا حکم آ گیا تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کے لیے آمادہ ہو گئے۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی ہجرت اور فضیلت:

آپ رضی اللہ عنہ نے جس جرأت کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان فرمایا اُسی جرأت کے ساتھ ہجرت کا بھی اظہار فرمایا، دیگر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تو خفیہ طور پر ہجرت فرمائی، لیکن سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہم نے علانیہ طور پر اس شان سے ہجرت فرمائی کہ اولاً مسلّح ہو کر مشرکین کے مجمعوں سے گزرتے ہوئے خانۂ کعبہ پہنچے اور نہایت اطمینان سے طواف کیا، مقامِ ابراہیم پر تسلّی سے نماز پڑھی، اس کے بعد مشرکین کی مجالس میں جا کر فرمایا: جس کو مقابلہ کرنا ہو وہ مکّہ سے باہر نکل کر مقابلے کر لے، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی، اور آپ رضی اللہ عنہ سفرِ ہجرت کے لیے چند رُفقاء کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ (زرقانی: ۱/۳۱۷)

سچ ہی کہا ہے کہ

عمر کے نام پہ طاغوت لرزہ بر اندام　　عمر کی صولت وسطوت سے سرنگوں اصنام

ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی ریاست کا قیام ہوا، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں استحکام پیدا کرنے کے لیے مہاجرین وانصار کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی تو سیّدنا فاروقِ اعظم اور عتبان بن مالک رضی اللہ عنہما (قبیلۂ بنی سالم کے معزز رئیس) کے مابین

یہ رشتہ قائم ہوا، اس میں انصار نے جو ایثار کا حق ادا کیا اس کی مثال اوّلین وآخرین میں نہیں مل سکتی، اب تک نمازیں دو ہی فرض تھیں، فجر اور عصر، وہ بھی دو رکعات، شب معراج میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں، اور سفر ہجرت کے بعد سفر کے لیے دو رکعات باقی رہیں، اور حضر میں ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعات مقرر ہوئیں۔ (رواہ البخاری عن عائشہ)

پھر معمول یہ تھا کہ نماز کے وقت حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ سے مُناجات کے شوق میں خود بہ خود جمع ہو جاتے، لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں آئے دِن اضافہ ہونے لگا، ریاست مدینہ کی آبادی بھی بڑھنے لگی، جس کی وجہ سے ضرورت پیش آئی کہ نماز کی اطلاع کے لیے کوئی مناسب طریقہ متعین کیا جائے، تاکہ بروقت سبھی کے لیے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنا آسان ہو جائے، چنانچہ اس کے لیے مشورہ ہوا تو مختلف آراء سامنے آئیں، اس موقع پر حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ نے خواب میں اذان کا جو طریقہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا حضرات شیخین سیّدنا صدیق اکبر اور سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان فرمایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان کے فیصلے پر مکمّل اطمینان ہو گیا۔ (سیرۃ مصطفیٰ: ۱/ ۲۶۲ تا ۱/ ۴۲۷)

اس طرح وہ اذان جو اسلام کا عظیم شعار ہے اور جس میں توحید ورسالت کے اعلان سے سارا عالم دِن رات گونجتا ہے اس میں بھی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے خواب کو خاص دخل ہے۔

بعد میں جب ظلم کے خلاف جہاد کا حکم نازل ہو کر غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تمام ہی غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست وبازو بن کر برابر شریک رہے، اس میں آپ رضی اللہ عنہ اسلام کے مقابلے میں اپنی قرابت اور تعلق والوں

سے ذرّہ برابر بھی متاثر نہیں ہوئے۔ غالباً اسی لیے ایک موقع پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کے متعلّق ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں میرے لیے بمنزلۂ آنکھ اور کان ہیں، یعنی میرے مطیع، وزیر اور مشیر ہیں۔

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ حَنْطَبٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَىٰ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَقَالَ: "هٰذَانِ السَّمْعُ وَالبَصَرُ". (الترمذي، مشكوٰة:٥٦٠)

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح میرے بھی دو وزیر آسمان میں جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام ہیں، تو دو وزیر زمین میں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

"وَأَمَّا وَزِيرَايَ مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ فَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ". (الترمذي، مشكوٰة:٥٦٠)

ایک مرتبہ فرمایا کہ معلوم نہیں تمھارے درمیان اب کتنی زندگی باقی رہ گئی، لہٰذا تم میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنا۔

"عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "إِنِّي لَا أَدْرِي مَا بَقَائِي فِيكُمْ، فَاقْتَدُوا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي، وَأَشَارَ إِلَىٰ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ". (الترمذي، مشكوٰة : ٥٦٠)

اس قسم کی روایتوں کے پیشِ نظر اہل سنّت والجماعت کے نزدیک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اُمّت مسلمہ میں سب سے افضل سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو خلیفۂ ثانی سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ ہوئے، خلافت صدیقی کا زمانہ سوا دو برس ہے، اس میں جس قدر اہم اُمور انجام پائے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بھی برابر اُن میں شامل رہے، تدوین قرآنِ کریم کی ابتدا عہد صدیقی میں سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی کے مشورے اور اصرار سے ہوئی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنے

دورِ خلافت میں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے بعد منصب خلافت کے لیے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں ہوسکتا، اس لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے قبل اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ ثانی نامزد فرمایا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مؤرّخہ: ۲۲/ جمادی الآخرہ/ ۱۳ھ مطابق: ۲۳/ اگست/ ۶۳۴ء کو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت سنبھالی اور خلافت صدیقی کے قلیل عرصے میں مدّعیانِ نبوت، مرتدین عرب اور منکرین زکوٰۃ کا خاتمہ ہوکر جن فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا، دس سالہ خلافت فاروقی میں ان کی گویا تکمیل ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت فاروقی میں عدل و اعتدال، اخلاق و ایثار اور بے پناہ مہارت و استقامت کے سبب بفضلہٖ تعالیٰ جس طرح دین اسلام کی نشر و اشاعت اور فتوحات ہوئیں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل بیت المقدس (یروشلم) پہلی مرتبہ فتح ہوا۔ شام سے مصر اور مصر سے دیارِ بکر تک، اور دیارِ بکر سے لے کر عراق و ایران اور فارس تک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے تمام علاقوں پر اسلامی جھنڈا لہرانے لگا، ایک ہزار چھتیس بڑے شہران کے مضافات کے ساتھ فتح ہوئے، جو بھی علاقہ فتح ہوتا فوراً حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اس میں مسجد بنواتے، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں چار ہزار عام مساجد اور نو سو جامع مساجد قائم فرمائیں۔ (توضیحات: ۸/ ۳۸۲)

دورِ فاروقی میں مملکت اسلامیہ کا کل رقبہ بائیس لاکھ اِکاون ہزار تیس (۲۲۵۱۰۳۰) مربع میل تک پھیل گیا۔ تاریخ اسلامی کا انصاف کے ساتھ مطالعہ

کریں تو اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ دورِ فاروقی میں ہونے والی فتوحات میں ایک واقعہ بھی ظلم وتعدی کا قطعاً نہیں ملتا، اسلامی لشکر کو نبوی ہدایت بتاکید کی جاتی کہ بچّوں، بوڑھوں، عورتوں اور مذہبی رہنماؤں سے تعرض نہ کیا جائے، قتل عام تو دور کی بات ہے، ہرے بھرے درختوں تک کو کاٹنے کی اجازت نہ تھی، اپنے حکام کو یہ ہدایت بھی تھی کہ مفتوحہ اقوام کے ساتھ انصاف واخلاق سے پیش آئیں، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی رعایا اپنے حکام کی گرویدہ ہوجاتی اور اسلامی حکومت کو اللہ پاک کی رحمت سمجھ کر قبول کر لیتی، کہتے ہیں کہ فتوحاتِ شام میں تو خود شامیوں نے جاسوسی اور خبر رَسانی کی خدمات انجام دیں۔ (بلاذری:۱۲۸)

خلافت فاروقی میں انصاف و اخلاق کی بہترین مثال فتح بیت المقدس بھی ہے، دورِ فاروقی میں اسلامی لشکر نے ۱۶ھ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی امارت میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا، بعد میں حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ عنہ بھی شامل ہو گئے، بیت المقدس کے عیسائیوں نے کچھ دِنوں کی مدافعت کے بعد مصالحت پر آمادگی ظاہر کی اور اپنے اطمینان کے لیے یہ خواہش کی کہ امیر المؤمنین خود یہاں آکر اپنے ہاتھ سے معاہدہ لکھیں، سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کر کے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو نائب مقرّر فرما کر مدینہ منورہ سے بیت المقدس کی طرف نہایت سادگی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ (طبری:۲۴۰۴)

اس موقع پر بعض خیر خواہوں نے اس خیال سے کہ عیسائی لوگ امیر المؤمنین کے معمولی لباس اور بے سروسامانی کو دیکھ کر اپنے دِل میں کیا کہیں گے؟ سواری کے لیے تُرکی گھوڑا اور پہننے کے لیے قیمتی لباس پیش کیا، تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزّت دی ہے وہ اسلام کی وجہ سے ہے، نہ کہ لباس کے سبب۔ (کنز

العمال:۶/ ۳۵۳)

پھر اسی سادگی کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں داخل ہوئے، بعد میں عیسائیوں کے گرجا کی سیر کی، نماز کا وقت ہوا تو باوجودیکہ عیسائیوں نے خود چل کر گرجا میں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ آئندہ نسلیں اس کو حجّت قرار دے کر مسیحی معبدوں میں دست اندازی نہ کریں باہر نکل کر نماز پڑھی۔ (فتوح البلدان، بلاذری: ۴۴۷)

فتح بیت المقدس میں سلطنت اسلامیہ کی عظمت شان کے ساتھ ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کے اِنصاف واَخلاق کو بھی خاص دخل ہے۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی سادگی اور شانِ بے نیازی:

اتنی عظیم اسلامی سلطنت کے خلیفہ ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی نہایت بے تکلّف اور سادہ تھی، آپ نے مخدوم وخادم اور نوکر وآقا کی تمیز باقی نہ رہنے دی، خود خادم بن کر رہے۔

(۱)..... کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ صفوان بن اُمیہ نے آپ کے سامنے ایک خوان پیش کیا تو آپ نے فقیروں اور غلاموں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اُن لوگوں پر جن کو غلاموں کے ساتھ کھانے میں شرم آتی ہے۔ (الأدب المفرد/ باب هل يجلس خادمه معه إذا أكل)

(۲)..... ایک مرتبہ آپ اپنے دورِ خلافت میں سر پر چادر ڈال کر باہر نکلے، ایک غلام کو سواری پر جاتے دیکھا، چوں کہ آپ تھک گئے تھے اس لیے اس غلام سے اپنے ساتھ بٹھا لینے کی درخواست کی، اس غلام کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا شرف ہو سکتا تھا؟ وہ فوراً گدھے سے اُتر گیا اور سواری کے لیے اپنا گدھا پیش کر دیا، حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنی وجہ سے میں تمھیں تکلیف نہیں دے سکتا، جس طرح تم سوار تھے سوار رہو، میں تمھارے پیچھے بیٹھوں گا۔ پھر اسی حالت میں مدینہ کی گلیوں میں داخل ہوئے، لوگ امیر المؤمنین کو ایک غلام کے پیچھے سوار دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب فقۃ البیع)

(۳).....ایک مرتبہ کسریٰ کا مشیر خاص ہرمُزان فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا، اس نے ہیرے جواہرات سے مزین سونے کا تاج پہن رکھا تھا، ریشمی لباس زیب تن تھا، مدینہ میں داخل ہوکر پوچھنے لگا: خلیفہ کا محل کہاں ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہاں محلّات نہیں ہوتے، اس نے تعجب سے پوچھا کہ تمھارے خلیفہ کہاں رہتے ہیں؟ لوگوں نے مٹّی کے ایک چھوٹے سے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ خلیفہ کی رہائش گاہ ہے، اس نے حیران ہوکر دیکھا تو کہیں بھی گارڈز کو نہ پایا، پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ امیر المؤمنین نے اپنے لیے کوئی حفاظتی دستہ مقرر نہیں کیا، خیر، اس نے درِ فاروقی پر جاکر دستک دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر پر نہیں تھے، کہا: مسجد یا مدینہ کی کسی بھی جگہ تلاش کر لیجیے، چنانچہ تلاش کرتے ہوئے وہ ایک درخت کے پاس پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی چھاؤں میں اپنے بازو کا تکیہ بنا کر پیوند لگی چادر اوڑھے گہری نیند میں پایا، ہرمُزان سوچنے لگا کہ یہی وہ عمر ہے جو دُنیا کا سب سے بڑا فاتح ہے؟ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کانپتے ہیں اور جس کے سامنے بڑے بڑے متکبّرین کی گردنیں جھک گئیں، آپ رضی اللہ عنہ کی سادگی اور شانِ بے نیازی کو دیکھ کر ہرمُزان پر کپکپی طاری ہوگئی، اس نے ایک بڑا تاریخی جملہ کہا کہ خلیفۃ المسلمین! آپ کے یہاں کا اَمن آپ کے عدل ہی کا نتیجہ ہے۔ (از: سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے سنہرے واقعات: ۱۴۴، المسك والعنبر في خطب المنبر لعائض القرني)

(۴).....ناداروں، محتاجوں اور بے کسوں کی نُصرت و مدد کے لیے رات کے وقت آپ گشت فرماتے اور حسبِ موقع ان کی اعانت ونُصرت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کے وقت گشت کرتے ہوئے مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر مقامِ حرّہ پہنچے، دیکھا کہ ایک عورت اپنے تین بچّوں کے ساتھ ہے، بچّے رو رہے ہیں، حقیقت حال دریافت کی تو عورت نے کہا کہ بچّے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، میں نے اُنھیں بہلانے کو خالی ہانڈی چڑھادی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وقت مدینہ آئے اور آٹا، گھی، گوشت اور کھجور وغیرہ لے کر چلے، آپ کے خادم اسلم نے کہا بھی کہ میں لے کر چلتا ہوں، تو فرمایا: کیا قیامت میں بھی میرا بوجھ تم ہی اُٹھاؤ گے؟ پھر خود ہی سامان اُٹھا کر عورت کے پاس گئے، اس نے بخوشی سارا انتظام قبول کیا اور دُعائیں دیں۔ (کنز العمال: ۶/ ۲۵۳)

(۵).....ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے ایک بدّو کے خیمے کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ بدّو کی بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً گھر آئے اور اپنی بیوی اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر بدّو کے خیمے میں پہنچے، تھوڑی دیر بعد بچّہ پیدا ہوا تو اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا نے اندر سے آواز دی: امیر المؤمنین! اپنے دوست کو بیٹے کی مبارک باد دیجیے! بدّو امیر المؤمنین کا لفظ سن کر گھبرا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: گھبرانے کی ضرورت نہیں، کل میرے پاس آنا، ہم بچّے کا وظیفہ مقرّر کردیں گے۔

(کنز العمال: ۶/ ۳۴۳)

حضرت قاری سیّد صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا:

ملک میں دورہ کرنے والے سلطان تو ایسے دیکھے ہیں
فاروق جیسا گشت لگانا سب کے بس کی بات نہیں

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۂ اوّل اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل ہیں، تو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثانی لاثانی ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبّت میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہیں۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبّت:

ابتدائی زمانے میں ایک مرتبہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: حضور! آپ مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے عزیز ومحبوب ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عمر! جب تک میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں تیرا ایمان کامل نہیں ہوسکتا، تب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اب تو آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور محبوب ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عمر! اب بات مکمّل ہوئی!

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ هِشَامٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ أٰخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: يَا رَسُولَ اللهِ! لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْآنَ يَا عُمَرُ!". (رواه البخاري / كتاب الأيمان والنذور / باب كيف كانت يمين النبي صلّى الله عليه وسلم، الرقم: ٦٦٣٢)

پھر واقعی آپ رضی اللہ عنہ نے ساری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبّت فرمائی، جس کا اندازہ مختلف واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

(۱).....جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی تو خبر سن کر سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حاضرِ خدمت ہونا چاہا، لیکن اجازت نہ ملی، تو پکار کر عرض کیا: اللہ کی قسم! میں حفصہ کی سفارش کے لیے نہیں آیا، اگر حکم فرمائیں تو اس کی گردن مار دوں۔ (فتح الباری: ۹/۲۵۱)

(۲).....جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی طرح اس بات کا یقین نہیں ہو رہا تھا، تو مسجدِ نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ جس نے بھی کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں میں اس کا سر قلم کر دوں گا، پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اور اُمّت مسلمہ کو سنبھالا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کبھی یاد آتی تو آپ پر رقّت طاری ہو جاتی۔ ایک مرتبہ سفرِ شام میں سیّدنا بلال رضی اللہ عنہ نے مسجدِ اقصیٰ میں اذان دی تو آپ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ (فتوح الشام)

(۳).....یہ فطری بات ہے کہ محبوب کا عزیز بھی محبوب ہوتا ہے، اسی وجہ سے جن لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم عزیز رکھتے سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کا خاص خیال رکھا، جب آپ رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وظائف مقرّر فرمائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی تنخواہ اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ مقرّر کی اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُسامہ سے بہت محبّت فرماتے تھے۔ (مستدرک حاکم: ۳)

آپ رضی اللہ عنہ ازواجِ مطہرات کے احترام کا بھی خصوصی خیال رکھتے، ان کی تنخواہیں سب سے زیادہ یعنی بارہ ہزار مقرّر فرمائی۔ (کتاب الخراج: ۲۴)

فتح مدائن کے بعد جب مالِ غنیمت آیا تو اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو پانچ سو درہم اور حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کو ہزار ہزار دراہم عطا فرمائے۔ (ایضاً)

آپ نے خاندانِ نبوت سے تعلق قائم کرنے ہی کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نورِ عین حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا سے ۱۷ھ میں چالیس ہزار درہم مہر پر نکاح کیا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت:

آپ رضی اللہ عنہ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نسبت سے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے پناہ محبّت تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ مدینۃ الرسول میں شہادت کی دُعا مانگتے تھے، حالانکہ وہ مسلمانوں کا دارالحکومت تھا، لیکن خلوصِ دِل سے مانگی ہوئی دُعا قبول ہوئی، اس کا اثر اس طرح ہوا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام فیروز لؤلؤ نے آپ کے پاس آکر اپنے آقا کی بے جا شکایت کی، اس لیے آپ نے توجّہ نہیں فرمائی، اس پر وہ ناراض ہوگیا، اگلی صبح ۲۷ ذوالحجہ ۲۲ھ محرابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نمازِ فجر کے دوران پہلی صف میں خنجر لے کر آگیا اور نماز کے دوران آپ رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا، اس نے آپ پر متواتر چھ وار کیے، جس سے آپ گر پڑے، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نماز مکمّل فرمائی۔ (مستدرکِ حاکم: ۱/۹۱)

تین دِن تک آپ شدید زخمی ہونے کی حالت میں رہے، اسی دوران آپ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے چھ افراد (حضرت عثمان، علی، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم) کے درمیان شوریٰ قائم فرمائی کہ ان میں سے کسی بھی ایک پر بقیہ پانچ کا اتفاق ہوجائے اُسے خلیفہ منتخب کیا جائے۔

اس سے فارغ ہوکر اپنے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیج کر پہلوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہونے کی اِجازت مانگی۔
(مستدرکِ حاکم: ۱/۹۱)

پھر یکم محرّم الحرام ۲۴ھ بہ عمر ۶۳ سال شہید ہوکر پہلوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ فرضي الله عنه وأرضاه.

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِي سَبِيْلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِيْ فِيْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ، آمِيْن يَا رَبَّ العَالَمِيْنَ!

یکم ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۲۸ اکتوبر ۲۰۲۲ء
بروز جمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۴)

سیرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لِكُلِّ نَبِيٍّ رَفِيْقٌ، وَرَفِيْقِيْ يَعْنِيْ فِيْ الجَنَّةِ عُثْمَانُ".

(رواه الترمذي، ورواه ابن ماجه عن أبي هريرة رضي الله عنه، مشكوٰة المصابيح : ٥٦١ / باب مناقب عثمان رضي الله عنه)

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ہر نبی کا جنّت میں ایک (خاص) رفیق (ساتھی) ہوگا، اور میرے ساتھی عثمان بن عفّان ہوں گے۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی یہ جزوی فضیلت وخصوصیت ہے کہ آپ جنّت میں رفیق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے)۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عظمتِ شان:

اللہ ربّ العزت کے نزدیک انسان کی عظمت اُس کے خاندان اور نسل سے نہیں، بلکہ ایمان اور حسنِ عمل سے ہے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات : ١٣]

''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ باعزّت وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو۔''

اس سے واضح ہوا کہ عظمت انسانی کا اصل معیار نسل نہیں، بلکہ حسن عمل ہے، یہی وجہ ہے کہ حسن عمل اور اعلیٰ کردار سے عاری شخص اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' (میرا باپ سلطان وحکمران تھا) تو اُسے دُنیا میں بھی کوئی خاص عظمت و فضیلت حاصل نہیں ہوا کرتی، کیوں کہ سوال تو وہی ہے نا کہ

تھے تو وہ آبا تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟ ہاتھ پر ہاتھ دَھرے منتظرِ فردا ہو

اسی کو کسی عربی شاعر نے یوں کہا ہے:

إِنَّ الفَتَىٰ مَنْ يَقُوْلُ: هَا! أَنَا ذَا لَيْسَ الفَتَىٰ مَنْ يَقُوْلُ: كَانَ أَبِيْ

''جوان تو دراصل وہی ہے جو میدان میں آکر (اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے) کہے کہ میں یہاں موجود ہوں، جوان وہ نہیں جو کہے کہ میرا باپ اِتنا بڑا بہادُر تھا۔''

اس میں پیغام یہ ہے کہ اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے اپنے اخلاق و کردار کو قابل قدر بنانے کی فکر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے نسب اور قرابت پر فخر کرنے والوں کو متنبہ فرما کر حسن عمل کی طرف متوجّہ فرمایا، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾﴾ [البقرة : ١٤١]

''وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، جو عمل اُنھوں نے کمائے وہ اُن کے لیے ہیں اور تمھارے لیے وہی ہے جو تم نے کمایا، اُن کے اعمال کے متعلّق تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔''

لہٰذا اپنے عمدہ اخلاق و کردار کی فکر کرو۔ البتہ اگر ایمان اور حسن عمل کے ساتھ

کسی خوش نصیب کا تعلق اعلیٰ خاندان سے بھی ہو تو پھر اُس کی عظمت شان میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں اسلام کے تیسرے خلیفہ، سیّد الاسخیاء، سراپا شرم و حیا، دامادِ مصطفیٰ، ابوعبداللہ سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا شمار ایسے ہی خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے، آپ کو کمالِ ایمان و اخلاق کے ساتھ مختلف اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت و رشتے داری بھی حاصل تھی، جس کی وجہ سے آپ کی عظمت شان میں مزید اضافہ ہوگیا۔

عثمانی غنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات:

سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی ولادت واقعۂ فیل (اَبرہہ بادشاہ کے ہاتھیوں کے ساتھ مکّہ مکرّمہ میں حملہ) کے چھ سال بعد ۵۷۶ء یعنی ہجرت سے ۴۷ سال پہلے مکّہ مکرّمہ کے قبیلۂ قریش میں ہوئی۔ (الاصابہ: ۴/ ۳۷۷)

آپ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاملتا ہے، جب کہ آپ کی نانی اُمّ حکیم بیضاء بنت عبد المطلب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی پھوپھی اور والدہ اَرْوٰی بنت کُرَیز پھوپھی زاد بہن اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے ماموں ہیں۔
فتح الباری/کتاب المناقب وتاریخ الاسلام: ۱/ ۲۵۲)

یعنی آپ رضی اللہ عنہ نجیب الطرفین (والدین میں سے ہر ایک اعلیٰ حسب و نسب کے حامل) ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوہرے داماد، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کے بہنوئی، سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہم زُلف (ساڑھو) اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے خالو ہیں۔ آپ باعتبارِ عمر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقریباً پانچ اور سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تین سال چھوٹے ہیں۔ آپ کا نام عثمان، کنیت ابوعمرو اور ابوعبداللہ، اور لقب ذوالنورین ہے۔ علّامہ بدالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدۃ القاری میں فرمایا کہ اس کی

اصل اور پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیاں پہلے سیّدہ رُقیہ اور بعد میں سیّدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں، اس لیے آپ کو ''ذوالنورین'' (دونور والے) کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ از آدم تا ایں دَم آپ کے علاوہ کسی کو یہ خصوصیت حاصل نہ ہوسکی۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یکے بعد دیگرے دونوں شاہ زادیوں کے انتقال کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ غمگین ہوگئے تو آپ کی تسلّی کے لیے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میری دَس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں ایک کے بعد دوسری سے تمھارا نکاح کردیتا۔ (المعجم الاوسط: ۴/ ۳۲۲، حدیث نمبر: ۶۱۱۶)

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ قیام اللیل میں قرآنِ کریم کی بہ کثرت تلاوت فرماتے، قیام اللیل اور قرآنِ کریم کی تلاوت دونوں ہی نور ہیں، اور سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ دونوں کا بہت اہتمام فرماتے تھے، اس لیے بھی آپ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔ (مستفاد از: سیرتِ عثمان ذوالنورین: ۵۴، مؤلفہ ڈاکٹر علی محمد الصلابی، از: صحابۂ کرام کی پاکیزہ زندگی: ۱۶۱)

عاجز کے خیالِ ناقص میں ایک اور وجہ بھی ہے جس کو حضرت مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی اپنے مواعظ میں بیان فرمائی ہے کہ قرآنِ کریم نے مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ شہادت پر فائز خوش نصیب بندوں کو آخرت میں خصوصی نور کی خوش خبری سنائی ہے، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ﴾ [الحدید: ۱۹]

''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہید ہیں، ان کے لیے (آخرت میں خصوصی) اجر بھی ہے اور نور بھی۔''

یہاں قرآنِ کریم نے صدیق اور شہید دونوں کے لیے نور کی بشارت دی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سیّدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں، صدیق تو اس لیے کہ قرآن کریم نے صدیق کے اوصافِ ثلاثہ بیان فرمائے ہیں: (۱) اِعطا اور جود و سخا (۲) تقویٰ (۳) تصدیق حسنیٰ (انصاف پر مبنی ہر اچھی بات کی تصدیق کرنا)

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝﴾ [اللیل: ۵-۶]

''پس جس نے (اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں) دیا اور پرہیزگاری اختیار کی، اور اس نے اچھائی (یعنی دینِ حق اور آخرت) کی تصدیق کی۔''

یہ اوصاف سب سے نمایاں طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ میں پائے گئے، اس لیے آپ صدیقِ اکبر کہلائے، لیکن سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ میں بھی یہ تینوں اوصاف علیٰ وجہ الکمال پائے گئے (جیسا کہ آپ کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے) اس لیے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ صدیق بھی ہیں۔

اور رہی بات شہید کی تو اس کی پیشین گوئی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائی جب آپ سیّدنا صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے ساتھ جبلِ اُحُد پر تشریف فرما تھے، اور وہ جلالِ نبوت سے کانپنے لگا۔

"اُثْبُتْ أُحُدُ! فَمَا عَلَيْكَ إِلَّا نَبِيٌّ، وَصِدِّيْقٌ، وَشَهِيْدَانِ". (رواه البخاري، مشكوٰة المصابيح: ٥٦٣ / باب مناقب هؤلاء الثلاثة)

''اُحُد! تھم جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔''

اس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو صدیقیت اور شہادت دونور کے مستحق ہونے کے سبب ''ذوالنورین'' کہا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت اور اعلیٰ سیرت کے حامل ہونے کے ساتھ ثروت وسخاوت میں بھی مشہور تھے اس لیے بھی آپ عثمان غنی کہلائے۔ اور دورِ جاہلیت میں بھی آپ نہایت محبّت وعظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے دور کی ایک عرب خاتون اپنے بچّے کو لوری دیتے ہوئے کہہ رہی تھی: رحمٰن کی قسم! میں تجھ سے اس طرح محبّت کرتی ہوں جس طرح قریش عثمان سے محبّت کرتے ہیں۔ (سیرتِ عثمان ذوالنورین: ۶۰ تا ۶۲، سیرتِ خلفائے راشدین: ۱۵۱، از: صحابہ کی پاکیزہ زندگی: ۱۶۱)

ابتدا ہی سے آپ کی حیا و پاک دامنی اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی بھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا، نہ کبھی زِنا (اور کسی بھی طرح کی بے حیائی کا ارتکاب) کیا اور نہ کبھی کسی بُت کے سامنے سجدہ کیا۔ آپ میں حیا کا اس قدر غلبہ تھا کہ (یا تو آپ کپڑوں میں غسل کرتے یا پھر) غسل کے لیے کپڑے اُتارتے تو کمرہ بند کر کے غسل خانے میں بیٹھ کر غسل فرماتے، شرم کی وجہ سے کھڑے ہونے کی جُرأت نہیں کر سکتے تھے۔

آپ اتنے باحیا تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی آپ سے حیا کرتے تھے، حدیث پاک میں ہے: سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں بے تکلّف بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں یکے بعد دیگرے حضراتِ صدیق و عمر رضی اللہ عنہما تشریف لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ویسے ہی بیٹھے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہتمام سے بیٹھ گئے اور فرمایا:

"أَلَا أَسْتَحْيِيْ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحْيِيْ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ". (رواه مسلم / مشكوٰة المصابيح : ٥٦٠ / باب مناقب عثمان رضي الله عنه)

''کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''

یہ اسی کا ثمرہ تھا کہ نوجوانوں کی شراب وشباب کی محفلیں بھی آپ کو اپنی طرف مائل نہ کرسکیں، حالانکہ جہلائے عرب عموماً ان چیزوں کے رَسیا تھے، آپ نے عام اہلِ عرب کے خلاف ابتدا ہی سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور عہدِ شباب ہی میں تجارت میں مشغول ہوکر اپنی صداقت وامانت کے باعث اس میں خوب ترقّی حاصل کی۔

عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات:

سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب عمر عزیز کے پینتیسویں سال کو پہنچے تب مکّہ کی فضا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید ورسالت کی صدا بلند فرمائی، اگرچہ عرب کے مذہبی تخیلات اور جاہلی سماج کے لحاظ سے یہ صدا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی نامانوس تو تھی، لیکن آپ اپنی فطری حیا و پاک دامنی اور پارسائی کے سبب اسے قبول کرنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ جس کا ظاہری سبب یہ بنا کہ ان دِنوں سب سے پہلے (مَردوں میں) سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایمان لائے، پھر آپ نے دین وایمان کی دعوت وتبلیغ کو اپنا نصب العین بنا کر اپنے حلقۂ احباب میں کام شروع کیا، عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دورِ جاہلیت ہی سے دوستانہ تعلق تھا، اس لیے آپ نے اپنے اس عزیز دوست کو بھی دینِ حق کی دعوت دی تو عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اس دعوت کو قبول فرما کر دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضر ہوکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق سیّدنا صدیق اکبر، سیّدنا علی مرتضیٰ اور سیّدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کے بعد چوتھے نمبر پر ایمان لانے والے سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں، اسی لیے آپ کا شمار "السَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ" میں کیا جاتا ہے۔

آپ کا خاندان بنواُمیہ بھی اسلام اور مسلمانوں کا سخت مخالف بلکہ دُشمن تھا،

بالخصوص آپ کا چچا حکم بن ابی العاص، اس لیے سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد چچا حکم بن ابی العاص نے آپ کے ساتھ نہایت سختی برتی، آپ کو ایک رسّی سے باندھ دیا اور کہا کہ جب تک گھر واپسی کر کے باپ دادا کے مذہب میں نہیں لوٹو گے ہم تمھیں نہیں چھوڑیں گے، اسی طرح باندھ کر رکھیں گے، اس ماب لینچنگ کے خلاف آپ نے نہایت جُرأتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا کہ ربّ ذوالجلال کی قسم! میں دین اسلام کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا، چاہے تو میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، دین حق پر آپ کی اس استقامت سے متاثّر اور مجبور ہو کر بالآخر حکم بن ابی العاص نے آپ کو رِہا کر دیا۔ (سیر الصحابہ: ۱/ ۱۵۲)

کچھ ہی عرصے کے بعد حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو وہ عظیم شرف حاصل ہوا جو آپ کی کتابِ زندگی کا نمایاں باب اور عنوان ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی منجھلی شاہ زادی سیّدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا کے لیے آپ کو بحکم الٰہی پسند فرمایا، حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا، رُخصتی سے قبل اس نے اسلام دُشمنی میں باپ کے کہنے پر سیّدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی، تو اعلانِ نبوت کے تیسرے سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا دوسرا نکاح سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے کر دیا، عربی کا شاعر کہتا ہے:

أَحْسَنُ زَوْجَيْنِ رَأَهُمَا إِنْسَانُ رُقَيَّةُ وَزَوْجُهَا عُثْمَانُ

''کسی بھی انسان نے رُقیہ اور عثمان سے بہتر جوڑا نہیں دیکھا۔''

پھر اُن کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحب زادی سیّدہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا سے عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا نکاح فرما دیا۔ یہ دونوں مقدّس نکاح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ منشائے خداوندی کے مطابق فرمائے، حدیث میں ہے:

"إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ أَوْحَىٰ إِلَيَّ أَنْ أُزَوِّجَ كَرِيمَتِيْ مِنْ عُثْمَانَ".

(المعجم الصغير: ١ / ٢٥٣، المعجم الأوسط: ٤ / ١٨)

یہ فضیلت حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اسی لیے حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

عثمانِ غنی کا ہم سر ہونا مال میں بے شک ممکن ہے
ذوالنورین کا رُتبہ پانا سب کے بس کی بات نہیں

نکاح کے بعد اس مقدّس جوڑے کو اسلام میں سب سے پہلی ہجرت کا شرف حاصل ہوا، کیوں کہ مکّہ مکرّمہ میں اسلام کی آئے دِن ترقّی سے مشرکین قریش کا غیظ و غضب بڑھتا گیا، سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ بھی اپنی وجاہت وعظمت اور خاندانی شرافت و عزّت کے باوجود کفّار کی جفا کاریوں اور زیادتیوں سے بچ نہ سکے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اشارہ پاکر اپنی زوجہ مقدّسہ کو ساتھ لے کر حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

قافلۂ حق وصداقت کا یہ پہلا جوڑا تھا جس نے دینِ حق کی محبّت میں وطن کی محبّت کو قُربان فرما کر جلا وطن ہونا گوارا کرلیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ عُثْمَانَ أَوَّلُ مَنْ هَاجَرَ بِأَهْلِهِ مِنْ هٰذِهِ الأُمَّةِ". (الإصابة: ٨ / تذكرة رقية)

علاوہ ازیں حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ وہ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے رضائے الٰہی کی خاطر اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت فرمائی۔ (المعجم الکبیر: ۱/ ۹۰/ حدیث نمبر: ۱۴۳)

پھر ہجرت بھی ایک نہیں، دو دفعہ فرمائی، ایک دفعہ یہی ہجرتِ حبشہ، پھر دوسری ہجرت مدینہ۔ (اس لیے آپ کو ذوالہجرتین بھی کہا جاتا ہے) (تاریخ ابن عساکر: ۳۹/۸)

مدینہ طیبہ میں آپ حضرت اَوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مہمان ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں میں برادری (مؤاخات) قائم فرمائی۔ (طبقات: ۳/۳۸)

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا جذبۂ جود وسخا:

سخاوت یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے رزقِ حلال سے اُس کے بندوں بالخصوص نیک لوگوں اور ضرورت مندوں میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رحمت کا ذریعہ ہے، حدیث میں ہے:

"السَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِنَ اللهِ، قَرِيْبٌ مِنَ الجَنَّةِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّاسِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ١٦٤)

صاحبو! سخاوت وہ سایہ دار وثمر آور درخت ہے جس کے سایے اور پھل سے سخی دارین میں فائدہ اُٹھاتا ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

سخی اپنے مال کا پھل کھاتا ہے　　بخیل سونے چاندی کا غم کھاتا ہے

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی سخاوت تو دورِ جاہلیت میں بھی مشہور تھی، اسلام کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد فرماتے۔ اگر کسی جمعہ کو ناغہ ہوجاتا تو اگلے جمعہ کو دو غلام آزاد فرماتے۔ (تاریخ ابن عساکر)

آپ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد چوبیس ہزار ہے۔ (سیرتِ عثمان ذوالنورین :۲۱۱، صحابہ کی پاکیزہ زندگی: ۲۱۳)

عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ آپ سیّد الاسخیاء ہیں۔ اور سخاوت اگر جنّت کا درخت ہے تو سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ اس کی نہایت اہم شاخ ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بھی کیا جاسکتا ہے:

(۱).....ہجرتِ مدینہ طیبہ کے بعد جب آبادی بڑھی تو میٹھے پانی کی قلّت

محسوس ہونے لگی، کیوں کہ وہاں میٹھے پانی کا ایک ہی کنواں تھا، جس کا نام ''بیر رومہ'' تھا، یہ کنواں وادیٔ عقیق میں مسجد قبلتین کے پاس تھا۔ (توضیحات: ۸/ ۴۱۵)

اس کنویں کا مالک ایک یہودی تھا جو لوگوں کو مہنگے دام میں پانی فروخت کیا کرتا تھا، جس سے لوگوں کو سخت پریشانی ہوتی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ کون ہے جو یہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کرے؟ ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ اُسے جنّت عطا فرمائیں گے۔

"أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِينَةَ وَلَيْسَ بِهَا مَاءٌ يُسْتَعْذَبُ غَيْرَ بِئْرِ رُومَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ يَشْتَرِي بِئْرَ رُومَةَ؟ فَيَجْعَلَ دَلْوَهُ مَعَ دِلَاءِ الْمُسْلِمِينَ بِخَيْرٍ لَهُ مِنْهَا فِي الْجَنَّةِ". (الترمذي، مشكوٰة: ٥٦١ / باب مناقب عثمان رضي الله عنه)

تب عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا جذبۂ سخاوت جوش میں آ گیا، آپ فوراً خریدنے کے لیے اس یہودی کے پاس گئے جس کا ذریعۂ معاش کنویں کا پانی تھا، اس نے اپنا کنواں بیچنے سے انکار کر دیا، تب آپ نے ایک تدبیر پیش فرمائی اور کنویں والے سے فرمایا کہ اگر تم پورا کنواں فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو آدھا ہی فروخت کر دو، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دِن کنویں کا پانی تمھارا ہوگا تو دوسرے دِن میرا ہوگا، یہ آپ کی بزنیس ٹرک تھی، آپ کا ٹیکسٹ اسٹیپ کچھ اور ہی تھا جس کو وہ یہودی سمجھ نہ سکا اور وہ آدھا کنواں بارہ ہزار درہم میں فروخت کرنے پر راضی ہو گیا، تو آپ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اطلاع دیتے ہوئے عرض کیا کہ حضور! میرے حصّے کا کنواں عام لوگوں کے لیے وقف ہے، چنانچہ جو دِن حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص تھا اس میں عام لوگ کنویں پر آ کر مفت پانی حاصل کر کے اتنا ذخیرہ کر لیتے جو اُنھیں دوسرے دِن بھی کافی

ہو جاتا، جس کی وجہ سے یہودی کی باری میں کوئی بھی شخص پانی خریدنے نہ جاتا، کیوں کہ ہر کسی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باری میں مفت پانی مل جایا کرتا تھا تو کوئی بھی قیمت دے کر یہودی سے پانی کیوں خریدتا؟ اس طرح وہ یہودی بقیہ آدھا کنواں بھی بیچنے پر راضی ہو گیا اور سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آٹھ ہزار میں بقیہ آدھا کنواں بھی خرید کر پورا کنواں عام لوگوں کے لیے وقف فرما دیا۔

طبرانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنواں آپ نے پینتیس ہزار درہم میں خرید کر وقف فرمایا تھا۔(المعجم الكبير للطبراني : ٢ / ٤١)

(۲).....اسی طرح جب ہجرتِ مدینہ طیبہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد بڑھی تو مسجد نبوی تنگ ہونے لگی، تب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی توسیع کے لیے ملحقہ (قریب کی) زمین خرید کر مسجد نبوی میں شامل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

"مَنْ يَشْتَرِيْ بُقْعَةَ اٰلِ فُلَانٍ؟ فَيَزِيْدُهَا فِي الْمَسْجِدِ بِخَيْرٍ لَهٗ مِنْهَا فِي الْجَنَّةِ". (سنن الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ٥٦١ / باب مناقب عثمان)

''کون ہے جو آلِ فلاں کی زمین خرید کر مسجد نبوی میں شامل کرے؟ جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اُسے جنّت میں اس سے بہترین زمین عطا فرمائیں گے۔''

اس ترغیب پر بھی سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ذاتی مال سے زمین خرید کر مسجد نبوی میں شامل فرما کر دوسری مرتبہ جنّت کے حقدار بن گئے۔

سنن نسائی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے وہ قطعۂ زمین بیس یا پچیس ہزار درہم میں خرید کر مسجد نبوی میں شامل فرمایا۔(سیرتِ عثمان ذوالنورین: ۱۱۳، بحوالہ: ترمذی ونسائی، سیرتِ خلفائے راشدین: ۱۵۵، از: صحابہ کی پاکیزہ زندگی: ۱۶۴)

(۳).....حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دریائے سخاوت تو ہر وقت جوش میں رہتا

تھا، پھر بوقت ضرورت آپ کی سخاوت کیسے کام نہ آتی؟ یہی وجہ ہے کہ جیش العسرۃ یعنی تنگیٔ عیش میں مبتلا لشکر، کیوں کہ جن دِنوں اسلامی لشکر نے غزوۂ تبوک کے لیے پیش قدمی کی وہ مالی لحاظ سے تنگ دستی کے ایام تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تیاری کے لیے مالی تعاون کی ترغیب دی، سنتے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللهِ! عَلَيَّ مِائَةُ بَعِيْرٍ بِأَحْلَاسِهَا، وَأَقْتَابِهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ".

(سنن الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ٥٦١ / باب مناقب عثمان)

''اللہ تعالیٰ کی راہ میں کام آنے کے لیے سو اونٹ مع ان کی جھولوں اور پالانوں (ساز وسامان) کے اپنے ذمے لیتا ہوں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت مسرور ہوئے، مگر ابھی اور ضرورت تھی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر امداد کی طرف متوجّہ فرمایا: "ثُمَّ حَضَّ عَلَى الجَيْشِ". دوبارہ بھی سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: "عَلَيَّ مِائَتَا بَعِيْرٍ". حضور! پہلے سو اونٹ کے علاوہ مزید مع ساز وسامان دو سو اونٹ کی ذمّے داری لیتا ہوں۔ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے) پھر ترغیب دی تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! (پہلے سو، پھر دو سو کے علاوہ مزید) تین سو اونٹ مع سامان اپنے ذمّے لیتا ہوں، اب تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس جذبۂ جود وسخا سے اس قدر خوش ہوئے کہ منبر سے اُتر کر اعزازی تمغے سے نواز دیا کہ

"مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ". (الترمذي، مشكوٰة : ٥٦١)

''آج کے بعد عثمان کوئی نفل عمل نہ بھی کرے تو اُسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

اس میں سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حسن خاتمہ اور جنّتی ہونے کی بشارت ہے۔ یہ ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا وصف اِعطا اور جود وسخا، جس کی وجہ سے متعدد مرتبہ حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے آپ نے جنّت کی خوش خبری پائی۔

عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا تقویٰ اور خوفِ خدا:

زندگی میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی مرتبہ جنّت کی بشارت حاصل کرنے کے باوجود آپ کے تقویٰ اور خوفِ خدا کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ بھی ذیل کے واقعات سے کیا جاسکتا ہے:

(۱).....سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ خوفِ خداوندی کے سبب اکثر آبدیدہ (روتے) رہتے، موت و عاقبت کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا، سامنے سے جب کوئی جنازہ گزرتا تو آپ کھڑے ہوجاتے اور بے اختیار رونے لگتے، قبرستان جاتے تو اس قدر روتے کہ ڈاڑھی تَر ہوجاتی، لوگ کہتے بھی کہ حضرت! جنّت و دوزخ کے تذکروں سے آپ پر اتنی رقّت طاری نہیں ہوتی، آخر قبرستان میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ بے قرار ہوجاتے ہیں؟ فرمایا: میرے محبوب کا فرمان ہے کہ

"اَلْقَبْرُ أَوَّلُ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ، فَإِنْ يَنْجُ مِنْهُ، فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ، فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ ". (مسند أحمد / مسند عثمان بن عفان رضي الله عنه / الرقم : ٤٥٤)

''قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اگر اس میں آسانی ہوگئی تو دیگر تمام منازل آسان ہوں گی، ورنہ تمام منازل دُشوار ہوجائیں گی۔'' (العیاذ باللہ)

(۲).....ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک غلام سے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ تنبیہاً تمھارا کان کھینچا تھا، لہٰذا تم مجھ سے اس کا بدلہ لے لو، تم بھی میرا کان مروڑ دو، اس غلام نے تعمیلِ حکم میں آپ کا کان ہاتھ میں لے لیا تو فرمایا: جس طرح میں نے زور سے مروڑا تھا تم بھی ایسا ہی کرو۔ پھر فرمایا: دُنیا میں قصاص کا ہوجانا قصاصِ آخرت سے

بہتر ہے۔(الریاض النضرۃ:۲/۴۵)

(۳).....قرآنِ کریم نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے یہ حکم دیا کہ

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ﴾ [الحشر:۷]

''جو کچھ رسول تمھیں عطا کریں وہ لے لو اور جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ اور (حکم رسول کی بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔''

اس آیت کریمہ میں اوامر و نواہی میں بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کیا حال تھا؟ ایک موقع پر خود فرمایا:

"فَوَ اللهِ مَا عَصَيْتُهُ، وَلَا غَشَشْتُهُ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللهُ".

(رواه أحمد : ١ / ٦٦ / الرقم : ٤٨٠)

''اللہ کی قسم! میں نے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کی اور نہ ہی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دھوکہ کیا، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وِصال فرما گئے۔''

عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت:

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے یہی وہ اوصاف وخواص ہیں جن کی وجہ سے آپ کی عظمت وفضیلت میں چار چاند لگ گئے۔

(۱).....حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عظیمہ کی گواہی اللہ ربّ العالمین نے دی، تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اخلاقِ عالیہ کی گواہی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی زوجۂ عثمان غنی سیّدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے تو اس وقت وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سر دھو رہی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

" أَكْرِمِيْهِ! فَإِنَّهُ مِنْ أَشْبَهِ أَصْحَابِيْ بِيْ خُلُقًا". (الطبراني في المعجم الكبير: ١ / ٧٦ / الرقم : ٩٩، مجمع الزوائد : ٩ / ٨١، صحابہ کی پاکیزہ زندگی:۱۶۲)

''بیٹی! اپنے شوہر کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، کیوں کہ اخلاق کے لحاظ سے عثمانِ غنی میرے صحابہ میں سب سے زیادہ میرے مشابہ ہیں۔''

(۲).....جس طرح حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے محبّت کرنے والوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبّت اور اُن سے بغض رکھنے والوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغض فرماتے، یہی معاملہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھا۔ روایت میں ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک جنازہ لایا گیا، تاکہ آپ نمازِ جنازہ پڑھائیں، "فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، انکار فرمادیا، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تعجب سے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

"إِنَّهُ كَانَ يُبْغِضُ عُثْمَانَ، فَأَبْغَضَهُ اللهُ". (رواه الترمذي / كتاب المناقب / باب في مناقب عثمان / الرقم : ٣٧٠٩)

''یہ شخص عثمان غنی سے بغض رکھتا تھا، جس کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ (اور اس کے رسول) کا بھی مبغوض بن گیا۔''

(۳)..... بیعت رِضوان کا واقعہ بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت کا بہترین ثبوت ہے، ہوا یوں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مکّہ مکرّمہ میں نہایت امن سے داخل ہوئے اور عمرہ کرکے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سر منڈایا اور بعض نے بال کتروائے۔ (بیہقی فی الدلائل، از سیرتِ مصطفیٰ:۲/ ۳۳۷)

آپ نے جب یہ خواب حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا تو سنتے ہی زیارتِ بیت اللہ کے شوق نے سبھی کو بے چین کر دیا، حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بقصد عمرہ مدینہ طیبہ سے مکّہ مکرّمہ کا ارادہ فرما کر یکم ذی القعدہ/ ۶ھ دوشنبہ کو سفر شروع کیا، تقریباً پندرہ سو حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہمراہ تھے، کیوں کہ جنگ کا خیال تک نہ تھا اس لیے کسی بھی قسم کا سامانِ حرب و جنگ بھی ساتھ نہ تھا، صرف اتنے ہی ہتھیار تھے جو اُس زمانے میں مسافر کے لیے لازم اور ضروری تھے۔ (فتح الباری/کتاب الشروط، طبقات ابن سعد: ۲/ ۶۹)

اُدھر قریش مکّہ کو جب اس کا پتا چلا تو وہ جنگ کے لیے تیّار ہو گئے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حُدَیبیہ پہنچ کر سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو سفیرِ اسلام بنا کر مکّہ مکرّمہ روانہ کیا، تاکہ رؤسائے قریش کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عزم و ارادے سے آگاہ کریں کہ ہمارا مقصد جنگ و جدال ہرگز نہیں، صرف عمرہ کرنا مقصود ہے، لیکن مشرکینِ مکّہ کو یہ بات ہضم نہ ہوئی کہ مسلمان ہماری پیشگی اجازت کے بغیر عمرہ کر کے چلے جائیں، اس لیے سفیرِ اسلام سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ اس سال تو ہم مسلمانوں کو عمرہ کی اجازت نہیں دے سکتے، البتہ اے عثمان! آپ ہمارے معزّز مہمان اور محرم ہیں، اس لیے اگر آپ چاہیں تو تنہا طواف کر سکتے ہیں، تب سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر میں بھی اپنے محبوب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر ہرگز طواف نہیں کر سکتا۔ یہ تھا حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و تعلق، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر طواف و عمرہ کرنا گوارا نہ کیا۔ قریش یہ فیصلہ سن کر خاموش ہو گئے اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو روک لیا۔

اِدھر حُدَیبیہ میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ ہوا، اس وقت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیکر کے ایک

درخت کے نیچے بیٹھ کر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بات پر بیعت لی کہ جب تک جان میں جان ہے جم کر ظالموں سے جہاد کریں گے، مر جائیں گے مگر بھاگیں گے نہیں۔ خونِ عثمان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیے کہ اس کے عوض حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً پندرہ سو جاں نثار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو داؤ پر لگانے کو تیار ہو گئے۔ جب حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بیعت کر چکے تو آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "إِنَّ عُثْمَانَ فِيْ حَاجَةِ اللهِ، وَحَاجَةِ رَسُوْلِهٖ". عثمان چوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام اور تعمیلِ حکم پر گئے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا اور بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمان کی جانب سے بیعت ہے۔ "فَضَرَبَ بِإِحْدٰى يَدَيْهِ عَلَى الْأُخْرٰى" یہ فضیلت و خصوصیت بھی سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا۔ حدیث پاک میں ہے:

"فَكَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ خَيْرًا مِنْ أَيْدِيْهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ". (سنن الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ٥٦١)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ہاتھ جو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تھا دیگر تمام صحابہ کے ہاتھوں سے کہیں افضل اور بہتر تھا جو اُن کی طرف سے تھے۔''

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کی غرض سے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کرنا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:٨٠] اسی طرح یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو اللہ تعالیٰ کی بیعت قرار دیا، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ﴾ [الفتح:۱۰]

''بلا شبہ آپ سے جو لوگ بیعت کر رہے ہیں درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ ہی سے بیعت کر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔''

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اس بیعت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے سبھی بیعت کرنے والوں کے لیے اپنی دائمی رضا وخوشنودی کا اعلان فرمادیا:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح:۱۸]

اسی مناسبت سے اس کو ''بیعتِ رضوان'' کہتے ہیں۔ (سیرتِ مصطفیٰ:۲/۳۳۹)

گویا سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی برکت سے تقریباً پندرہ سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور جنّت کی بشارت مل گئی۔ خود حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے متعلّق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ جنّت کی بشارت دی ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ جنّت میں ہر نبی کا ایک رفیق وعزیز ہوگا، اور میرے رفیق عثمان ہیں۔ یہ بھی آپ کی جزوی خصوصیت وفضیلت ہے کہ دُنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت حاصل رہی اور جنّت میں رفاقت نصیب ہوگی۔

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت:

جہاں تک تعلق ہے آپ کی خلافت کا تو آپ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفۂ ثالث ہیں، جس کی طرف اشارہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

"أُرِيَ اللَّيْلَةَ رَجُلٌ صَالِحٌ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ نِيطَ بِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَنِيطَ عُمَرُ بِأَبِي بَكْرٍ، وَنِيطَ عُثْمَانُ بِعُمَرَ". (سنن أبي داود، مشكوٰة المصابيح : ٥٦٣)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جُڑے ہوئے ہیں، عمر ابوبکر کے ساتھ، تو عثمان عمر کے ساتھ لٹکے یعنی جُڑے ہوئے ہیں۔ حضرات محدثین نے فرمایا ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترتیب خلافت کی جانب اشارہ فرمایا (کہ میرے بعد ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان ہوں گے) واللہ اعلم۔ (توضیحات: ۸/۴۲۱)

یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین دِن بعد ۴ محرّم الحرام ۲۴ھ دوشنبہ کو حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاقِ رائے سے آپ مسند خلافت پر فائز ہوئے، جن حالات میں آپ نے خلافت کو قبول فرمایا وہ اگرچہ مشکل ترین حالات تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نرمی و ملاطفت اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی سیاست کو اپنا شعار بنایا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کو فراست و بصیرت سے بھی نوازا تھا، جس کی وجہ سے اسلامی سلطنت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، یعنی کابل سے مراکش تک لاکھوں مربع میل میں اسلامی سلطنت پھیل گئی۔ آپ کا دورِ خلافت بھی سب سے طویل رہا (گیارہ سال، گیارہ ماہ اور ۲۲ دِن) تقریباً بارہ سال۔ (الاصابہ)

ان میں ابتدائی چھ سال تو بڑی خوبی و خوشحالی سے گزر گئے، البتہ بعد میں وہ فتنہ ظاہر ہوا جس کی پیشین گوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی کہ

"ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقَى بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ إِلَّا دَخَلَتْهُ". (صحيح البخاري، مشكوٰة المصابيح: ٤٦٦)

عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

جس کی ایک بڑی اور ظاہری وجہ یہ تھی کہ آپ نے اپنے بعض اقارب کو ان کی اعلیٰ صلاحیت کے پیشِ نظر حکومتی عہدے عطا فرمائے تھے، جس پر بعض لوگوں نے

اعتراض کیے، ان ہی کو مزید ہوا دینے کی غرض سے صنعائے یمن کا ایک یہودی باشندہ عبداللہ بن سبا بظاہر مسلمان بن کر مدینہ طیبہ آ گیا اور نہایت عیاری و ہوشیاری سے سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور آپ کے گورنروں کے خلاف بکواس کرتا رہا، مگر مدینہ طیبہ میں اس کا داؤ نہ چل سکا، تو وہ بصرہ پھر کوفہ پہنچا، وہاں سے بھی ناکام ہو کر مصر پہنچ گیا، اُن دِنوں وہاں کے گورنر سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی جانب سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھے، جو نہایت اصول پسند اور خلافت عثمانی و اسلامی کے نہایت خیر خواہ تھے، بے اصولی بالکل برداشت نہ کرتے، ظاہر ہے کہ زمانے و علاقے کے بد باطن لوگ ایسوں کو پسند نہیں کرتے، اس لیے بعض مصری لوگ اس کی سازش میں آ گئے اور رَفتہ رَفتہ اُنھوں نے اپنی اجتماعیت بڑھا کر سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ کیا کہ مصر کے گورنر کو ہٹا کر اُن کی جگہ محمد بن ابی بکر صدیق کو گورنر بنا دیا جائے، جس کو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے مشورے کے بعد منظور فرما کر ایک پروانہ لکھ دیا کہ اب میرے خط کے بعد مصر کے گورنر محمد بن ابی بکر ہوں گے، خط لے کر یہ لوگ محمد بن ابی بکر کی سربراہی میں مدینہ طیبہ سے مصر کی طرف چلے گئے اور معاملہ بظاہر رفع دفع ہو گیا۔

مگر کسی فتنہ پرور نے فوراً گورنر مصر کے نام سیّدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک خط لکھ دیا کہ جوں ہی محمد بن ابی بکر تمھارے پاس آئیں تم اُنھیں قتل کر دینا۔ خط پر کسی طرح حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی مہر جو اس کے پاس تھی لگا دی اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا گھوڑا دے کر جلدی سے آپ کے ایک غلام کو مصر روانہ کیا۔

راستے میں اسی قافلے نے شک کی بنیاد پر غلام کو گرفتار کر لیا، تلاشی لی تو خط برآمد ہوا، اہل قافلہ حیران ہو گئے کہ ایک طرف عثمان غنی محمد بن ابی بکر کے نام گورنری کا خط لکھ کر دے رہے ہیں اور دوسری طرف اُن کے قتل کا حکم بھی جاری کر رہے ہیں، محمد بن

ابی بکر اور اُن کے مخلص رُفقا کو اس میں سازش کی بو آئی، اس لیے وہ دوبارہ مدینہ طیبہ آئے۔ (مستفاد از: توضیحات: ۷/۴۷۸)

اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے اس خط سے لا علمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ خط نہ میں نے لکھا ہے نہ املا کرایا ہے اور نہ ہی مجھے اس کا کوئی علم ہے، چاہو تو مجھ سے قسم لے لو، یا پھر تم اپنے دعوے پر دو گواہ پیش کرو، لیکن وہ گواہ تو پیش نہ کر سکے اور نہ اُنھوں نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی، پھر اسی کو بنیاد بنا کر حکومت سے بغاوت کر دی اور خلافت سے دست برداری کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ خلافت سے دست بردار نہ ہوئے تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے، آپ کے گھر کے پاس مصری بلوائی جمع ہو گئے اور اس طرح آپ اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے، کیوں کہ اسلامی اَفواج سرحدوں پر تھیں، اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حج پر گئے ہوئے تھے، اس لیے بھی مدینہ طیبہ پر بلوائیوں کا قبضہ آسان ہو گیا۔

جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے اُنھوں نے فتنے کی سنگینی کا اندازہ لگا کر سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ ان سے مقابلے کی ہمیں اجازت دے دیں، تو چوں کہ آپ مدینہ طیبہ میں اپنی وجہ سے خون خرابہ نہیں چاہتے تھے اس لیے مقابلے کی اجازت نہیں دی۔ تب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسری تجویز یہ پیش فرمائی کہ پھر آپ مدینہ طیبہ سے روانہ ہو کر شام چلے جائیں، آپ نے اسے بھی قبول نہیں فرمایا کہ زندگی بھر دامن رسول میں رہا تو اب مدینہ کیسے چھوڑ دوں؟ میں مدینہ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔

آپ نے باغیوں کا خلافت سے دست برداری کا مطالبہ اس لیے قبول نہیں فرمایا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکیدی وصیت تھی کہ

"يَا عُثْمَانُ! إِنَّهُ لَعَلَّ اللهَ يُقَمِّصُكَ قَمِيصًا، فَإِنْ أَرَادُوكَ عَلَى خَلْعِهِ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ". (سنن الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ٥٦٢)

خلافت نہ چھوڑنا (شہادت گوارا کر لینا) اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بروز جمعہ عصر کے وقت ۱۸ر ذوالحجہ ۳۵ھ بہ عمر ۸۲ سال چالیس دِن کے محاصرے کے بعد روزے کی حالت میں نہایت مظلومیت کے ساتھ آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

گئے یہاں سے شہید ہوکر وہاں وہ پہنچے سعید ہوکر

حق تعالیٰ آج گجرات میں ہونے والے اسمبلی انتخاب کو صالح انقلاب کا سبب بنائیں۔ آمین۔

۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۵ر دسمبر ۲۰۲۲ء
بروز پیر (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ٢١٠)

(۳۵)

سیرتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللهُ عَنهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ : "أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسىٰ، إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٦٣ / باب مناقب علي بن أبي طالب)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام، بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

دو طرح کے مسلمانوں کے لیے خوش خبری:

اللہ ربّ العالمین نے قرآنِ کریم میں دو طرح کے مسلمانوں کو اپنی رضا و خوشنودی کی خوش خبری سنائی: (۱) سابقین اوّلین (۲) اُن کے مخلص متبعین۔ (اللّٰھم اجعلنا منھم، آمین) چنانچہ فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [التوبة : ١٠٠]

اب سوال یہ ہے کہ ''سابقین اوّلین'' سے مُراد کون ہیں؟ تو اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال منقول ہیں:

(۱) وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم مُراد ہیں جنھوں نے ایمان لانے کے بعد ہجرت و نصرت میں سبقت فرمائی۔

(۲) وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے ہجرت سے قبل اسلام قبول کیا، خواہ وہ مہاجرین ہوں یا انصار۔

(۳) وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے دونوں قبلوں (بیت اللہ اور بیت المقدس) کا رُخ کر کے نمازیں پڑھیں۔ یعنی تحویل قبلہ سے قبل مسلمان ہوئے، خواہ مہاجرین ہوں یا انصار۔

(۴) مہاجرین و انصار میں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو بیعت رضوان میں شریک تھے۔

(۵) مطلقاً تمام ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مُراد ہیں، کیوں کہ اُن کا ایمان باقی اُمّت سے سابق ہے اور اوّل ہے۔ نیز دوسری جگہ تمام ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بھلائی یعنی اپنی رضا اور خوشنودی کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ [الحدید: ۱۰]

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تا قیامت اُن اہل ایمان کے لیے بھی رضائے الٰہی کی خوش خبری دی گئی جو عقائد و اعمال میں اخلاص کے ساتھ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اتباع کرتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ﴾ [التوبۃ: ۱۰۰] اور اللہ پاک کی رضا و خوشنودی کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خوش ہو کر اُن کی لغزشوں کو معاف فرما کر اُن کے اعمالِ صالحہ کو قبول فرمایا۔ (مستفاد از: معارف القرآن)

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات:

ان میں جہاں تک تعلق ہے سابقین اوّلین کا تو جیسا کہ عرض کیا ایک قول کے مطابق تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اُن میں شامل ہیں، اس لیے بلا شبہ تمام ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بغیر کسی استثنا کے جنّتی اور دائمی رضائے الٰہی کے حقدار ہیں۔ رضي الله عنهم ورضوا عنه. لیکن ان میں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بالکل ہی ابتدا میں مسلمان ہوئے، چوں کہ اُنھوں نے دینِ حق کی حفاظت واشاعت کی خاطر طرح طرح کی قربانیاں دیں اس لیے اُن کا مرتبہ ومقام بعد کے صحابہ سے بلند وبالا ہے۔ حق تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ فرما کر جنّت الفردوس کے عظیم الشان درجات اور خصوصی انعامات کی بشارت دیتے ہوئے اُن کے بارے میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ﴾ [التوبة : ۲۰]

وہ عظیم المرتبت محسنین اُمّت حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو ایمان باللہ، ہجرتِ مدینہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سبقت لے گئے اُن میں اسلام کے چوتھے خلیفہ، دامادِ مصطفیٰ، سیّد الاولیاء علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی بہر صورت سرِ فہرست آتا ہے، لہٰذا آپ اس بشارتِ الٰہی کے یقینی مصداق ہیں۔ آیت کریمہ کی روشنی میں سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوجائے گا۔

آپ قریش مکّہ کے اس عظیم خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو حرمِ کعبہ کے خصوصی انتظامات اور حُجاجِ بیت اللہ کی خدمات میں سب سے ممتاز تھا، مزید برآں آپ ہی کے خاندان میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، آپ کے والد خواجہ ابو طالب اور والدہ فاطمہ بنت اسد دونوں ہی کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاشمی خاندان سے تھا، کیوں

کہ خواجہ ابوطالب کی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے ہوئی، اس لیے سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نجیب الطرفین ہاشمی ہیں۔ (مستفاد از: سیرتِ ابن ہشام: ۱/ ۲۲۸، توضیحات: ۸/ ۴۲۲)

آپ کی ولادت ہجرت سے ۲۳ سال اور بعثت سے ۱۰ سال قبل ۱۲/ رجب المرجب/ مطابق: ۱۷/ مارچ/ ۵۹۹ء بروز جمعہ مکّہ مکرّمہ میں ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ حرمِ کعبہ میں پیدا ہوئے، لیکن حضرات علمائے محققین کے یہاں یہ قول مرجوح ہے، کیوں کہ راجح قول کے مطابق بیت اللہ کے اندر حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کی ولادت نہیں ہوئی۔

"وَفِيْ شَرْحِ النَّوَوِيْ عَلٰى مسلم: "وَفِيْهِ حَكِيْمُ بْنُ حِزَامٍ الصَّحَابِيُّ، وَمِنْ مَنَاقِبِهٖ: أَنَّهٗ وُلِدَ فِيْ الْكَعْبَةِ. قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ : "وَلَا يُعْرَفُ أَحَدٌ شَارَكَهٗ فِيْ هٰذَا". (شرح النووي على مسلم :۲ / ۱۴۲، دار إحياء)

آپ کا نام علی، ابوالحسن اور ابوتراب کنیت ہے (جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمائی تھی۔ بخاری) ''اسد اللہ، حیدر (شیر) اور ''المرتضیٰ'' آپ کا لقب ہے۔

(مستفاد از توضیحات: ۸/ ۴۲۲)

آپ کا سلسلۂ نسب خلفائے ثلاثہ کی بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا جناب ابوطالب کے بیٹے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ پیارے نبی نے علی کے گھر تو علی نے نبی کے گھر پرورش پائی ہے، وہ اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ اور دادا خواجہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک آٹھ سال کی تھی تب سے چچا ابوطالب نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا، پھر جب تک زندہ رہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھل کر حمایت فرمائی، اس لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی ہدایت کے

شدید طالب تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کچھ اور ہی تھی، آپ ﷺ کی وہ تمنّا بظاہر پوری نہ ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ﴾ [القصص:٥٦]

البتہ آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف مسلمان بھی ہوئیں اور ہجرت بھی کی، جب ان کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ نے کفن میں اپنی قمیص پہنائی اور ان کی قبر میں خود لیٹ کر اسے متبرک فرمایا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس عنایت کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: ابوطالب کے بعد مجھ پر سب سے زیادہ احسان اسی نیک سیرت خاتون کا رہا ہے۔ (اسد الغابۃ: ۵/ ۵۱۷)

حضور ﷺ نے اپنے اِن محسنین کے حسن سلوک کا بدلہ اس طرح بھی چکایا کہ بعثت کے دسویں سال جب سیّدنا علی رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضور ﷺ اس وقت تجارت پیشہ ہونے اور سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے سبب خوش حال تھے، جیسا کہ حضرات مفسرین نے ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝٨﴾ [الضحیٰ:٨] کے تحت فرمایا: "أَيْ: فَأَغْنَاكَ بِمَالِ خَدِيْجَةَ". جب کہ چچا ابوطالب ایک تو کثیر العیال تھے (آپ کے چار بیٹے طالب، عقیل، جعفر اور علی کے علاوہ دو بیٹیاں جمانہ اور اُمّ ہانی تھیں)۔ دوسرے معاشی تنگی پھر قحط سالی کے سبب مزید پریشان تھے، اس لیے حضور ﷺ نے اپنے دوسرے چچا جناب عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر ہم خواجہ ابوطالب کی اولاد کو اپنی کفالت میں لے لیں تو شاید ان کا کچھ بوجھ ہلکا ہوجائے، یہ تجویز جب خواجہ ابوطالب کی خدمت میں پیش کی تو وہ بخوشی تیّار ہو گئے اور فرمایا: جعفر تو عبّاس کی کفالت میں رہیں اور علی نبی ﷺ کی، تبھی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے نبی کے زیر پرورش آ گئے۔ (مستفاد از: سیرتِ ابن ہشام: ۱/ ۲۸)

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام اور بعد کے حالات:

جس طرح پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیارے علی کے والدین نے اولاد کی طرح پالا اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے علی کو بھی اولاد کی طرح پالا، اس لیے پیارے نبی کے گھر پرورش پانے والے پیارے علی علم و ہدایت سے کیوں کر محروم رہتے، آپ کو بچپن ہی سے درسگاہِ نبوت میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا زرّیں موقع نصیب ہوا، جس کا سلسلہ تا وفات قائم رہا، لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی آپ نے بچپن ہی میں حاصل کر لی تھی، چنانچہ ظہورِ اسلام کے وقت اگرچہ آپ کی عمر بہت کم تھی، مگر آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ (فتوح البلدان بلاذری: ۴۷۷)

اسی لیے ابتدا ہی سے بعض دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح آپ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحریری کام انجام دیتے تھے، کاتبین وحی میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے لکھے جانے والے مکاتب و فرامین بعض اوقات آپ کے ہاتھوں لکھے جاتے۔ اور حدیبیہ کا صلح نامہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی لکھا تھا۔ (مستفاد از: سیرتِ مصطفیٰ: ۲/ ۳۴۴)

سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن عاطفت میں تربیت پائی، اس لیے آپ کی پاکیزہ سیرت عمدہ تربیت و اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھی، آپ کی پیشانی کبھی غیر اللہ کے سامنے نہیں جھکی اور نہ زبان کبھی کلمۂ کفر و شرک سے آلودہ ہوئی۔ اسلام سے قبل بھی دورِ جاہلیت میں ہونے والے تمام خرافات و فضولیات سے آپ محفوظ رہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد سب سے پہلے آپ کی رفیقۂ حیات اُمّ المؤمنین والمؤمنات سیّدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے ایمان لائیں، پھر آپ کے بعد حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق سیّدنا علی رضی اللہ عنہ (دوسرے ہی

دِن) مسلمان ہوئے، اس کی تائید میں خود سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ شعر پیش کیا جس میں فرمایا:

سَبَقْتُكُمْ إِلَى الإِسْلَامِ طُرًّا غُلَامًا مَا بَلَغْتُ أَوَانَ حُلُمِيْ

''میں لڑکا ہی تھا، بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ تم میں سب سے پہلے اسلام کی طرف سبقت کی۔''

مُحَمَّدُ النَّبِيُّ أَخِيْ وَصِهْرِيْ وَحَمْزَةُ سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ عَمِّيْ

''نبی محمد میرے بھائی اور خسر ہیں تو سیّد الشہداء حمزہ میرے چچا ہیں۔''

حضرت مجاہد اور ابن اسحٰق کے بقول اس وقت سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال تھی۔ بعض حضرات کے نزدیک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ (گلدستۂ تفاسیر تحت الآیۃ: السابقون الاولون.....الخ)

حضرات علمائے محققین نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں، ان کے بعد گھر کے بچّوں میں سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ اور اُمّت کے مَردوں میں سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے، وغیرہ۔

بہر حال سیّدنا علی رضی اللہ عنہ ایمان باللہ میں سابق اور مقدّم ہیں۔ علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو یوں تعبیر فرمایا:

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علی عشق را سرمایۂ ایماں علی

''پہلے مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، عشق کے لیے ایمان کا سرمایہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

نیز یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عبادت کا شرف بھی سب سے پہلے آپ ہی کو حاصل ہوا۔ روایت میں ہے کہ ایمان لانے کے بعد حضرت

علی رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پہاڑ کی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ وہاں سے ان کے والد خواجہ ابوطالب کا گذر ہوا، وہ خاموشی سے دیکھتے رہے، نماز کے بعد ابوطالب نے پوچھا کہ یہ کونسا مذہب ہے جو تم نے اختیار کرلیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ دین ابراہیمی ہے، خواجہ ابوطالب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: بیٹا! تم محمد کا ساتھ نہ چھوڑنا، مجھے یقین ہے کہ محمد تمھیں محض نیکی ہی کی ترغیب دیں گے۔ (تاریخ اسلام: ۱/۹۶، از: اکبر شاہ نجیب آبادی)

اسی طرح ایک مرتبہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشغولِ عبادت تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائیں جانب تھے، اتفاق سے اسی وقت خواجہ ابوطالب کا وہاں سے گذر ہوا، آپ کے ساتھ آپ کے دوسرے بیٹے جعفر بھی تھے، خواجہ ابو طالب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو جعفر سے مخاطب ہوکر کہا: اے بیٹے! تم بھی علی کی طرح اپنے چچازاد بھائی کی قوتِ بازو بن جاؤ اور بائیں جانب کھڑے ہوکر ان کے ساتھ نماز میں مشغول ہوجاؤ۔
(اسد الغابۃ: ۱/۲۸۷، از: سیرتِ مصطفیٰ: ۱۵۳)

ظہورِ اسلام اور قبولِ اسلام کے بعد سیّدنا علی رضی اللہ عنہ مکّہ کے مشکل ترین حالات میں بھی مسلسل تیرہ سال اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست و بازو بنے رہے، جس کی بہترین مثال دعوت ذوالعشیرۃ کا واقعہ ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی رشتے داروں اور ساتھیوں کو انفرادی طور پر دعوت دیتے رہے، پھر جب تقریباً تین سال کے بعد حکم الٰہی ہوا کہ

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝﴾ [الحجر: ۹۴ - ۹۵]

''اب آپ برملا دعوتِ دین کا اعلان و اظہار کردیجیے اور مشرکین سے اعراض

کیجیے، آپ کا مذاق کرنے والوں کی سزا کے لیے تو ہم ہی کافی ہیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان دین کی دعوت دینے کے لیے مکّہ والوں کو کوہِ صفا پر جمع فرمایا اور آیت کریمہ: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ [الشعراء:۲۱۴] نازل ہونے کے بعد اپنے خاندان والوں کو دعوتِ طعام کے عنوان سے گھر پر جمع فرمایا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامِ دعوت پر مامور فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت بمشکل تیرہ چودہ سال تھی، لیکن آپ نے اس کم سنی کے باوجود بہترین دعوت کا انتظام فرمایا، جس میں اولادِ عبدالمطلب کے کم وبیش چالیس افراد جمع ہوئے، حضرت حمزہ، عباس، ابوطالب اور ابولہب بھی شریک تھے، دعوتِ طعام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دیتے ہوئے اپنے مشن میں ساتھ دینے کی ترغیب دی تو اس موقع پر سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ خاندان کے کسی بھی فرد نے ساتھ نہیں دیا۔

(تفسیر طبری: ۲/ ۱۲۷، الخصائص الکبریٰ: ۱/ ۱۲۳، سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۱۶۶، گلدستۂ تفاسیر)

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہجرتِ مدینہ:

بعد میں جیسے جیسے لوگ دامن اسلام سے وابستہ ہوتے گئے مشرکین مکّہ کا بغض وعناد اور ظلم وستم بڑھتا گیا، لیکن اُن حالات میں بھی مسلسل تیرہ سال سابقین اوّلین دین حق کی خاطر طرح طرح کی قربانیاں دیتے رہے، تب منشائے الٰہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کو ہجرتِ مدینہ کا حکم فرمایا تو چند ہی نفوسِ قدسیہ کے علاوہ سارا مکّہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا، ہجرتِ مدینہ سے مشرکین کو یہ اندیشہ ہوا کہ اب مسلمان ہمارے قبضۂ اقتدار سے باہر ہوگئے ہیں اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی قوت و جمعیت بڑھا کر ہم سے انتقام لیں، لیکن چوں کہ مسلمانوں کے نبی ابھی مکّہ ہی میں ہیں، وہ مکّہ سے رُخصت ہوں اس سے قبل ہی اُنھیں دُنیا سے رُخصت کر دیا جائے۔ چنانچہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا پروگرام بنا کر وہ لوگ شب ہجرت کاشانۂ نبوت کی طرف بڑھے، حق تعالیٰ نے مشرکین کے مکر کی اطلاع اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر اگلا پروگرام سمجھا دیا، اس کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ والوں کی امانتیں اپنے علی کو سپرد کر کے اُنھیں بستر نبوی پر سُلا دیا اور خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کے لیے روانہ ہو گئے، اس نازُک اور بظاہر پُرخطر گھڑی میں بھی علی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بنے رہے، چنانچہ رات بھر مشرکین کا محاصرہ قائم رہا، جب صبح پُرسکون نیند لے کر پیارے علی بسترِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُٹھے تو مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے علی کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور اپنی غفلت پر برہم ہوئے، پھر علی کو چھوڑ کر مقصد اصلی کی تلاش میں نکل گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت تقریباً بائیس تیئیس سال تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ مکّہ مکرّمہ میں دو تین دِن رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ساری امانتیں ادا فرما کر دین حق کی حفاظت ونشر واشاعت کے لیے عازمِ مدینہ ہوئے۔ (ابن سعد: تذکرۂ علی: ۱۳)

ہجرتِ مدینہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقین اوّلین مہاجرین وانصار میں مؤاخات قائم فرمائی تو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے پیارے علی کو پسند فرمایا، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: آخَىٰ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَصْحَابِهِ، فَجَاءَ عَلِيٌّ تَدْمَعُ عَيْنَاهُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! آخَيْتَ بَيْنَ أَصْحَابِكَ وَلَمْ تُؤَاخِ بَيْنِي وَبَيْنَ أَحَدٍ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَنْتَ أَخِي فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ." (رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ٥٦٤، باب مناقب علي بن أبي طالب)

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے علی کو خصوصیت کے ساتھ اُخوت کا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے فرمایا: ''علی! تم تو دُنیا اور آخرت دونوں جہاں میں میرے بھائی ہو۔''

ایک اور موقع پر پیارے علی کے ساتھ کمالِ قرابت و محبّت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ عَلِيًّا مِنِّي وَأَنَا مِنْهُ، وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ بَعْدِي". (الترمذي، مشكوٰة:٥٦٤)

''علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں (اتنا ہی نہیں، بلکہ جیسے علی میرے محبوب اور دوست ہیں اسی طرح) علی تمام اہل ایمان کے محبوب اور دوست ہیں۔''

نیز ایک موقع پر فرمایا:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ". (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٥٦٤)

''میں جس کا دوست ہوں علی بھی اس کا دوست ہے۔'' حتیٰ کہ ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبّت کو ایمان کی علامت اور علی سے نفرت کو نفاق کی علامت قرار دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ یقین دلایا تھا کہ

"لَا يُحِبُّنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا يُبْغِضُنِي إِلَّا مُنَافِقٌ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٥٦٣)

''مجھ سے مؤمن شخص ہی محبّت کرے گا اور منافق ہی مجھ سے نفرت کرے گا۔''

ایک حدیث میں فرمایا: ''علی سے منافق محبّت نہیں کرتا اور مؤمن علی سے عداوت نہیں رکھتا۔''

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "لَا يُحِبُّ عَلِيًّا مُنَافِقٌ، وَلَا يُبْغِضُهُ مُؤْمِنٌ". (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة : ٥٦٤)

اسی طرح ارشادِ الٰہی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾﴾ [مریم:۹۶] کے متعلق بعض علماء نے فرمایا کہ یہ آیت کریمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر قرطبی)

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں بیان فرمایا ہے کہ اس آیت کریمہ کا نزول حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا کہ تمھاری محبّت سوائے کفّار کے تمام مؤمنوں کے دِلوں میں ہوگی۔ (گلدستۂ تفاسیر)

ان حقائق سے سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مزید برآں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے دوسرے سال اپنی سب سے لاڈلی بیٹی خاتونِ جنّت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے بحکم الٰہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پسند فرما کر دامادی کا شرف عطا فرمایا، حالانکہ حضرات شیخین سیّدنا صدیق اکبر اور سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما نے خود فاطمہ کے لیے پیغامِ نکاح دیا تھا، لیکن منشائے الٰہی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعزاز سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا، حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: "خَطَبَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فَاطِمَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّهَا صَغِيرَةٌ، ثُمَّ خَطَبَهَا عَلِيٌّ، فَزَوَّجَهَا مِنْهُ". (النسائي، مشكوٰة : ٥٦٥)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جنّتی جوڑے سے بے پناہ محبّت فرماتے تھے، حدیث پاک میں ہے، حضرت جمیع بن عُمیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سیّدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا سے سوال کیا: "أَيُّ النَّاسِ كَانَ أَحَبَّ إِلَىٰ

رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ؟" رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبّت کس سے تھی؟ تو امّی جان نے وسعتِ قلبی سے کام لیتے ہوئے فرمایا: حضور ﷺ کو سب سے زیادہ محبّت فاطمہ سے ہے، پوچھا کہ مَردوں میں سب سے زیادہ محبّت کس سے ہے؟ "قَالَتْ: زَوْجُهَا". (رواه الترمذي مشكوٰة: ٥٧٠، باب مناقب أهل البيت) فرمایا: فاطمہ کے شوہر (علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) سے۔

یہی وجہ ہے کہ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ کے بعد جب بیٹی فاطمہ کی رُخصتی کا وقت آیا تو حضور ﷺ کا منشا تھا کہ اس مقدّس جوڑے کا گھر قریب ہی ہو، چنانچہ حضور ﷺ کے جاں نثاروں میں سے سیّدنا حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے کاشانۂ اقدس سے قریب اپنا ایک گھر اس جنّتی جوڑے کے لیے پیش کر کے حضور ﷺ کو خوش کر دیا۔
(طبقات ابن سعد: ۸/۱۹ ملخصاً)

اس مقدّس جوڑے کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے حسن، حسین اور محسن (جو بچپن ہی میں وفات پا گئے) اور تین بیٹیاں زینب، رُقیہ اور اُمّ کلثوم عطا فرمائیں۔ (توضیحات: ۸/ ۴۵۶) اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کا سلسلۂ نسل بھی اسی مقدّس جوڑے سے پھیلایا ہے۔ (سیرتِ مصطفیٰ: ۳/۳۴۱)

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ سیّد الاولیاء علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے محبّ بھی تھے اور محبوب بھی، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک مرتبہ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کسی جنگی مہم پر تھے تو حضور ﷺ نے اس طرح دُعا کی کہ

"اَللّٰهُمَّ لَا تُمِتْنِيْ حَتّٰى تُرِيَنِيْ عَلِيًّا". (الترمذي، مشكوٰة: ٥٦٤)

''الٰہی! جب تک علی صحیح سلامت واپس لوٹ نہ آئیں مجھے موت نہ دینا۔''

خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی حضور ﷺ سے محبّت کا حق ادا کرتے ہوئے ہر

حال میں، ہر طرح مال و جان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کا ساتھ دیا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے سابقین اوّلین کی جن صفاتِ ثلاثہ کا ایک آیت قرآنہ میں تذکرہ فرمایا سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس کے یقینی مصداق ہیں، ان اوصاف میں سے ایمان باللہ اور ہجرتِ مدینہ سے متعلّق قدرے تفصیلات تو آ گئیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سخاوت:

اب جہاں تک تعلق ہے تیسری صفت حسنہ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں مال و جان کی قربانی پیش کرنا ﴿وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ﴾ [التوبۃ:۱۱] جس کا مطلب یہ ہے کہ سابقین اوّلین نے جب کبھی ضرورت پیش آئی سخاوت و شجاعت کا بھرپور مظاہرہ فرمایا، اس حوالے سے جب سیرتِ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ہم دیکھتے ہیں تو آپ کی سخاوت و شجاعت کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں، کہتے ہیں کہ کوئی سائل درِ علی سے کبھی خالی نہ جاتا تھا، حتیٰ کہ سخت ضرورت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی محبّت میں ایثار سے کام لیتے، اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے، خود بھوکے رہ کر بھی دوسروں کو کھلاتے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رات بھر کھجوروں کے باغ کو پانی پلا کر جو مزدوری حاصل ہوئی اس سے جَو کا حریرہ بنوایا، ابھی پک کر تیّار ہی ہوا تھا کہ کھانے سے قبل ایک مسکین آ کر صدا دینے لگا، آپ نے اپنی اور اہل خانہ کی بھوک کی پرواہ کیے بغیر مدینہ کے اس مسکین کو وہ حریرہ کھلا دیا اور دوبارہ اسی جَو سے حریرہ بنوایا، جب وہ بھی پک کر تیّار ہو گیا تو کھانے سے قبل ایک یتیم نے آواز دی، آپ نے فوراً یہ کھانا بھی یتیم مدینہ کو کھلا دیا اور گھر والوں سے فرمایا کہ پھر بقیہ جَو کا حریرہ تیار کر لیا جائے، تیسری مرتبہ بھی جب کھانا تیّار ہوا اور کھانا ہی چاہتے تھے کہ

ایک قیدی یا غلام نے دست سوال دراز کیا۔ (حالانکہ وہ کافر تھا مگر) آپ نے اُسے بھی بھوکا چھوڑ کر کھانا گوارا نہیں کیا، تیسری مرتبہ کا کھانا بھی اس قیدی کو کھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ سخاوت و ایثار اس قدر پسند آیا کہ قرآنِ کریم میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝٨﴾ [الدھر:٨]

''اور (اپنا) کھانا اللہ تعالیٰ کی محبّت میں (خود اس کی طلب و حاجت ہونے کے باوجود اِیثاراً) محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔''

(بخاري، كتاب المناقب/ باب مناقب علي)

آج تو لوگ دولت کے باوجود سخاوت نہیں کرتے (اِلا ماشاء اللہ) سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت میں حاجت کے باوجود سخاوت و ایثار سے کام لیتے تھے۔ مال دار صحابۂ کرام میں ایثار و سخاوت کا اعلیٰ نمونہ سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پیش کیا تو بظاہر غریب صحابہ میں ایثار و سخاوت کا عمدہ نمونہ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پیش کیا۔

(۲) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کی تعلیم و تربیت میں دِن رات مشغول رہتے تھے، اس حوالے سے بلا کسی فرق کے ہر خاص و عام کو آنے کی اجازت ہوتی تھی، آنے والوں میں بعض حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں رازداری کی باتیں بھی دیر تک کرتے رہتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مروّت میں کسی کو کچھ نہ فرماتے، اس کا ناجائز فائدہ اُٹھانے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ایذا پہنچانے کے لیے منافقین بھی مجلس نبوی میں آکر علیحدگی میں دیر تک سرگوشی کیا کرتے، ان میں بعض نئے اور ناواقف مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں لمبی لمبی باتیں کرتے رہتے، اس وجہ سے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے شروع میں استحبابی حکم نازل فرمایا کہ جو بھی نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے خفیہ بات کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ کر دے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [المجادلة:۱۲]

''اے ایمان والو! جب تم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو، یہ تمھارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے، البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاسکو تو اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔''

اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے فوراً بعد سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ نے اس پر عمل فرمایا، آپ نے ایک دینار صدقہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں بات کرنے کا وقت لیا۔ (بعد میں یہ حکم اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا) (معارف القرآن)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ساری اُمّت میں یہ شرف صرف سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا، آپ سے پہلے اور بعد میں بھی کسی کو اس آیت پر عمل کرنے کا موقع نہیں ملا، نزولِ آیت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دینار تھا جس کو دس درہم میں تڑوا کر دس کے دس دراہم صدقہ کر کے بارگاہِ نبوی میں سرگوشی کے لیے حاضر ہوئے اور دس سوالات کیے:

(۱) پہلا سوال یہ پوچھا کہ حضور! وفا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت (دینا، پھر اس پر استقامت)۔

(۲) فساد کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک وکفر کرنا۔

(۳) حق کیا ہے؟ فرمایا: اسلام، قرآن اور ولایت (سرپرستی، حق تصرف اور صاحب اختیار ہونا یہ اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت ہے، یہاں یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم)۔

(۴) حیلہ کیا ہے؟ (لغت میں حیلہ کے معنیٰ ہیں کسی مطلب کو تدبیر سے حاصل کرنا، لسان العرب: ۱۰۰/۳) فرمایا: ترکِ حیلہ (بوقت ضرورت حیلۂ شرعی کی

اجازت ہے بھی تو اس کا بُنیادی مقصد حرام سے بچنا ہے)

(۵) یا رسول اللہ! مجھ پر کونسی چیز لازم ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت۔

(۶) حضور! میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کس طرح کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خلوص اور یقین کے ساتھ۔

(۷) یا رسول اللہ! میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عافیت۔ (دُنیوی مصائب اور دوزخ سے حفاظت)

(۸) اپنی نجات کے لیے کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اکل حلال اور صدقِ مقال (حلال کماؤ، کھاؤ اور سچ بولو)

(۹) حضور! سرور (خوشی) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنّت۔

(۱۰) راحت (چین وسکون) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنّت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت۔

سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات ملنے کے بعد آیت کریمہ کا حکم منسوخ ہوگیا۔ (گلدستۂ تفاسیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو تین ایسی عظیم خصوصیات حاصل تھیں کہ ان میں سے اگر ایک بھی میرے لیے ہوتی تو مجھے سُرخ اونٹوں (محبوب ترین مال) سے زیادہ پسند ہوتی: (۱) سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح (۲) خیبر میں جھنڈے کا عطا کیا جانا (۳) سرگوشی سے پہلے صدقے والی آیت پر عمل۔ (قرطبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت:

رہی بات راہِ حق میں جانِ عزیز کو قربان کرنے کی، جسے قرآنِ کریم نے سابقین اوّلین کی صفات میں اس طرح بیان فرمایا کہ ﴿وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ﴾ [التوبة : ۲۰]

تو جس طرح بوقت ضرورت غربت کے باوجود آپ نے سخاوت و ایثار سے کام لیا اسی طرح بوقت ضرورت جب کبھی ظالموں سے مقابلے کا موقع آیا تو آپ نے بڑھ چڑھ کر جوہرِ شجاعت کا مظاہرہ فرمایا، جب بھی سیّدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی شمشیر ذوالفقار کو ہاتھ میں لیے میدانِ جنگ میں آتے تو دُشمنوں کے دِل ہل جاتے، غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں آپ اسلامی لشکر کے خاص سپاہی رہے، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے اسی طرح غزوۂ تبوک کے موقع پر سیّدنا علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے شریک نہ ہو سکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اہل بیت کی نگرانی کے لیے چھوڑا تھا، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اہل بیت ہی کے ایک اہم فرد تھے۔

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے متعلّق فرمایا تھا:

"اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِيْ". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ٥٦٨، باب مناقب أهل بيت النبي صلّى الله عليه وسلم)

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو تبوک سے محرومی کا رَنج ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کی تسلّی کے لیے فرمایا: "أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى". تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ یعنی جس طرح

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر جانے کے وقت اہل خانہ کی دیکھ بھال کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑا تھا اسی طرح تبوک کے موقع پر اہل بیت کی دیکھ بھال کے لیے ہم نے آپ کو چھوڑا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو انبیاء مبعوث ہوئے لیکن میرے بعد کوئی نبی کبھی نہیں آئے گا۔

سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جنگ میں دُشمنوں کی صفوں میں بلاخوف وخطر داخل ہو جاتے اور دُشمنوں کا صفایا کر دیتے، فاتح خیبر کا شرف بھی اللہ تعالیٰ نے سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی کو عطا فرمایا، غزوۂ خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥١٣)

''میں (اسلامی) جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔''

تقریباً پندرہ سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے، ہر ایک کی تمنّا تھی کہ کل صبح کو جھنڈا مجھے ملے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا، پھر علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد شجاعت سے رئیس خیبر مرحب کو تلوار کے وار سے ڈھیر کر کے خیبر کے سب سے بڑے اور مشہور قلعہ قموص کو فتح کیا اور فاتح خیبر کے لقب سے ملقب ہوئے۔

(توضیحات:۸/۴۲۸)

کسی نے خوب کہا ہے کہ

تیرا حال سب کو سنانا پڑے گا — زمانے کو پھر سے جگانا پڑے گا
گرایا تھا جس نعرے سے تو نے خیبر — وہی نعرہ پھر اب لگانا پڑے گا
بہت مار کھائی ہے غیروں سے ہم نے — تیری راہ پہ خود کو لانا پڑے گا

جسے رَکھ دیا ہم نے مشکل سمجھ کر — وہی بھاری پتھر اُٹھانا پڑے گا
تجھ جیسی عزّت اگر مانگتے ہیں — شجاعت کا پرچم اُٹھانا پڑے گا
کھڑے ہو کے ہر وادیٔ پُرخطر میں — حوادث پہ خود مسکرانا پڑے گا
مٹانا پڑے گا سبھی نفرتوں کو — چراغِ محبّت جلانا پڑے گا
تجھ جیسی عظمت اگر چاہتے ہیں — تو بوسیدہ خیموں میں جانا پڑے گا
نظر کو تیری بارگاہِ اَدب میں — جھکانا پڑے گا، جھکانا پڑے گا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور خانہ جنگیاں:

سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ اخیر میں بلوائیوں کی بغاوت اور آپ کی شہادت کے بعد خانہ جنگی کے سبب حالات بڑے سنگین تھے، اس وقت باب العلم والحکمۃ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اور خلافت کا حقدار نہ تھا، اس لیے حضرات مہاجرین وانصار کے اِصرار پر مؤرّخہ: ۲۱ر ذوالحجہ ۳۵ھ بروز دوشنبہ آپ نے خلافت کی ذمّے داری قبول فرمالی، والیٔ شام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیعت علی سے اس لیے منع کیا کہ وہ چاہتے تھے کہ پہلے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے، اس کے بعد بیعت کی جائے، اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی خونِ عثمان کے قصاص کا مطالبہ کررہے تھے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی قصاص لینے میں تاخیر کے رَوادار نہیں تھے، لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ بلوائیوں اور باغیوں کے خلاف فوری طور پر اِقدام ناممکن تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اگر بلوائیوں اور باغیوں سے جنگ کر کے اُن کا خاتمہ کر دیتے ہیں تو اُن کے قبائل اُن کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے، اور اس طرح اُن باغیوں کی قوت جو ابھی محض چند ہزار تھی اُس میں دسیوں گُنا اضافہ ہو جاتا، پھر اُن سے نمٹنے کے لیے دسیوں جنگیں لڑنی پڑتیں، بعد کے

واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر بالکل دُرست تھا کہ فی الحال معاملات کو ٹھنڈا ہونے دیا جائے اور جب حکومت مستحکم ہو جائے تو پھر اُن باغیوں کے خلاف پوری قوت سے کاروائی کی جائے۔

دوسری طرف حضرت طلحہ اور حضرت زُبیر رضی اللہ عنہما قاتلینِ عثمان کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے دیکھنا گوارا نہ کر سکے، اس لیے دونوں حضرات عمرہ کے لیے مکّہ مکرّمہ چلے گئے، اُن دِنوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حج سے فارغ ہو کر مکّہ مکرّمہ سے مدینہ طیبہ آ رہی تھیں کہ مقامِ سرِف میں آپ کو شہادتِ عثمان کی خبر ملی، سن کر سکتے میں آ گئیں اور مکّہ مکرّمہ واپس چلی گئیں، یہاں حضرت طلحہ و زُبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات کے بعد مدینہ طیبہ کے حالات معلوم ہوئے کہ خونِ عثمان کے چھینٹے ابھی تک دَر و دِیوار پر نظر آ رہے ہیں اور بلوائی آزاد گھوم رہے ہیں تب سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی قصاصِ عثمان کو ضروری سمجھ کر لوگوں کو بھی اس کی دعوت دے کر آمادہ کیا، اس پر مسلمانوں کا ایک بڑا لشکر تیّار ہو گیا۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بگڑنے کے سبب مدینہ میں جنگ کی نوبت نہ آ جائے لشکر کے ساتھ بصرہ روانہ ہو گئیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ جب اس کاروائی سے واقف ہوئے تو دفعِ فساد اور اصلاح بین المسلمین کی خاطر ایک فوج لے کر بصرہ تشریف لے گئے، معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے آپ نے قعقاع بن عمرو کو سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا، چوں کہ دونوں جانب سے دِل بالکل صاف تھے اس لیے صلح و مصالحت کی باتیں ہونے لگیں، لیکن بد قسمتی سے بلوائی و سبائی عناصر دونوں فوج میں شامل تھے جن کا مقصد فتنہ و فساد کے علاوہ کچھ نہ تھا، اُنھیں یقین تھا کہ اگر صلح ہو کر آپسی خانہ جنگی ختم ہو گئی اور مسلمان متحد ہو گئے تو قصاص ضرور لیا جائے گا، پھر تو ہماری خیر نہیں، اس لیے جس صبح کو صلح نامہ لکھا جانا تھا اُسی رات بلوائیوں نے حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا کی فوج پر حملہ کر دیا، تو مدافعت میں اِدھر سے بھی تلواریں بے نیام ہو گئیں، دونوں ہی جانب کے لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ دوسرے نے بدعہدی کی ہے، اس غلط فہمی سے جنگ کی آگ اور تیز ہو گئی، جس میں طرفین کے تیرہ ہزار لوگ مارے گئے، ان میں عشرۂ مبشرہ کے دو صحابی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج غالب آئی۔ یہ واقعہ جمادی الثانیہ ۳۶ھ میں پیش آیا، سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس جنگ میں اپنے اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے یہ جنگ ''جنگ جمل'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس پر بعد میں سیّدنا علی المرتضیٰ اور سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زندگی بھر افسوس کرتے اور روتے رہے، اس سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامی خلافت وحکومت کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ شرط رکھی کہ پہلے باغیوں سے خونِ عثمان کا قصاص لیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ پہلے حکومت کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں تاکہ حکومت بلوائیوں پر ہاتھ مار سکے، لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے موقف پر قائم رہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چار و ناچار مقابلے کے لیے نکلنا پڑا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ کے لیے پہلے ہی نکل چکے تھے، مقامِ صفین میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور مسلسل کئی روز تک سلسلہ جاری رہا، اس میں جانبین سے عام مسلمانوں کے علاوہ ستّر بدری صحابہ، سات سو بیعت رضوان کے جاں نثار اور چار سو عام مہاجرین وانصار مارے گئے، پھر تحکیم کی تجویز پر جنگ موقوف ہو گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو اپنا اپنا حکم بنایا، پھر ایک تفصیلی عہد نامہ مرتّب ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دونوں حَکَم فریق کی رعایت کے بغیر اُمّت کی خیر خواہی میں جو فیصلہ کریں وہ واجب التسلیم ہوگا۔ (توضیحات: ۷/۴۷۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

اس عہد نامے کے بعد لوگ جُدا ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام واپس آ گئے، اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف آپ ہی کے ہمراہیوں میں سے ایک بڑی تعداد نے خروج کیا، وہ سب مقامِ حرورا میں جمع ہونے لگے، اُن کا دعویٰ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحکیم کی تجویز مان کر نعوذ باللہ گناہِ کبیرہ کیا، وہ لوگ "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ" کا نعرہ لگانے لگے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کو اِفہام وتفہیم کے لیے بھیجا، کافی بحث ومباحثہ کے بعد ایک بڑی جماعت نے تو رجوع کر لیا، لیکن پھر بھی ایک جماعت اپنی ضد پر اَڑی رہی اور یہ لوگ نہروان چلے گئے، جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے مقابلے کے لیے تشریف لے گئے اور پورے لشکر کا صفایا کر دیا، یہ واقعہ ۳۸ھ میں پیش آیا۔

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آخری جنگ تھی، اس جنگ سے بچ بچا کر تین خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم، برک بن عبداللہ اور عمر بن بکیر کسی طرح مکّہ مکرّمہ میں جمع ہو گئے، ان تینوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ علی بن ابی طالب، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص کو کسی بھی طرح قتل کر دیا جائے، ابن ملجم نے کہا کہ میں علی کے کام کا ذمّہ لیتا ہوں، برک نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا ذمّہ لیا تو عمر بن بکیر نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا، اور یہ بھی طے کیا کہ سب اپنا کام سترہ رمضان کو اَنجام دیں گے، اس معاہدے کے بعد ابن ملجم کوفہ اور بقیہ دونوں شام چلے گئے، وہ دونوں تو اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے، مگر ابن ملجم اپنے ناپاک عزم میں بظاہر کامیاب ہو گیا، سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عادتِ شریفہ تھی کہ نمازِ فجر کے لیے لوگوں کو جگاتے ہوئے بہت

سویرے ہی مسجد تشریف لے جاتے، اُس دِن ابن ملجم راستے میں چھپ کر بیٹھ گیا، جیسے ہی آپ اس کے قریب سے گزرے اس ملعون نے دھوکے سے آپ کی پیشانی مبارک پر تلوار ماردی جو دِماغ تک پہنچ گئی، آپ خون سے نہا گئے، ڈاڑھی مبارک خون سے رنگین ہوگئی، پھر تیسرے دِن ۱۹ رمضان المبارک ۴۰ھ میں بہ عمر تریسٹھ سال آپ کی شہادت کا ناگوار واقعہ پیش آیا۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۳/ ۲۲، طبری: ۲۴۶۱)

اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلّق پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جس میں آپ نے فرمایا تھا:

"يَقْتُلُكَ أَشْقَىٰ هٰذِهِ الأُمَّةِ كَمَا عَقَرَ نَاقَةَ اللهِ أَشْقَىٰ بَنِيْ فُلَانٍ مِنْ ثَمُوْدَ". (مسند أبي يعلىٰ / مسند علي بن أبي طالب: ١ / ٥٦٩)

''تجھے اس اُمّت کا وہی شخص مارے گا جو سب سے زیادہ شقی اور بد بخت ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کے پیر کاٹنے والا قومِ ثمود کا سب سے زیادہ شقی شخص تھا۔ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو کوفہ کے ایک قبرستان میں دفنایا گیا اور (شروع میں) آپ کی قبر کو مخفی رکھا گیا تاکہ خوارج اس کی بے حُرمتی نہ کریں۔ بعض مؤرّخین کے بقول ''دارالامارہ''، بعض کے نزدیک کوفہ کی جامع مسجد کے پاس اور بعض کے بقول عام قبرستان میں آپ مدفون ہیں۔ (البدایہ والنہایہ: ۷/ ۳۶۵)

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا قَبْلَ الْمَوْتِ، وَارْحَمْنَا عِنْدَ الْمَوْتِ، وَلَا تُعَذِّبْنَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَلَا تُحَاسِبْنَا يَوْمَ القِيَامَةِ، إِنَّكَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. آمِيْن، يَا رَبَّ العَالَمِيْنَ!

۶ر جمادی الثانیہ ر ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۳۰ر دسمبر ر ۲۰۲۲ء، قبل الجمعہ
وارِدحال: دار المعارف الاسلامیہ
کریلی، نور اللہ روڈ، الہ آباد

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البدیع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۶)

اہلِ بیت کی عظمت اور حقوق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَامَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فِينَا خَطِيبًا بِمَاءٍ يُدْعَىٰ: "خُمًّا" بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ، فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: "أَمَّا بعدُ، أَلَا! أَيُّها النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَنِي رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ: أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللهِ، فِيهِ الْهُدَىٰ وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ، فَحَثَّ عَلَىٰ كِتَابِ اللهِ وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: وَأَهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ فِي أَهْلِ بَيْتِي". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ٥٦٨، باب مناقب أهل بيت النبي صلّى الله عليه وسلم)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دِن مکّہ مکرّمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان (پانی کے ایک تالاب پر) جس کو مقام (غدیر خُم) کہا جاتا ہے خطابِ عام کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد وعظ و نصیحت فرمائی، پھر ارشاد فرمایا: لوگو! باخبر ہو جاؤ، میں بھی ایک انسان ہوں، اب وہ

وقت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ پیغامِ اجل (موت کا پیغام) لے کر آئے اور میں اُسے قبول کرلوں، اور میں تمھارے درمیان دو قیمتی (اور اہم) چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ان میں سے پہلی چیز تو کتاب اللہ ہے، اس میں ہدایت اور نور ہے، لہٰذا تم کتاب اللہ (کی ہدایت و احکام) کو مضبوطی سے پکڑ لو، آپ ﷺ نے کتاب اللہ کی اہمیت پر کافی ترغیب و تاکید فرمائی، پھر فرمایا: دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں تمھیں اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا پاس ولحاظ رکھنے کی تاکید کرتا ہوں، (یہ بات آپ ﷺ نے بطورِ تاکید دو مرتبہ ارشاد فرمائی، اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو بیان ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ) میں تمھیں اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب یاد دِلاتا ہوں جو میرے اہل بیت کے ادائے حقوق میں کمی وکوتاہی کے سبب ہوگا۔ (العیاذ باللہ العظیم)۔

اہل بیت کون؟

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ جس مقدّس ومنتخب خاندان اور گھرانے میں پیدا ہوکر پلے بڑھے اور ساری زندگی رہے، اس خاندان اور گھرانے کے مقدّس ومنتخب اہل ایمان کو اہل بیت کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ تو ''گھر والوں'' کے ہیں، لیکن اس کے مفہوم میں آدمی کے بیوی بچّے اور قریبی رشتے دار بھی داخل ہیں، اس لیے جب لفظ ''اہل بیت رسول'' بولا جائے گا تو اس میں حضور ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات، ذریاتِ طیبات اور اہل قرابت ورشتے دار شامل ہوں گے، ان میں ازواجِ مطہرات (پاکیزہ بیویوں) کا اہل بیت رسول سے ہونا تو نص قطعی (کلامِ الٰہی) سے ثابت ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

﴿تَطْهِيرًا﴾ [الأحزاب : ٣٣]

''اللہ پاک تو یہی چاہتے ہیں کہ تم اہل بیت سے (ہر طرح کے گناہوں کی) نجاستوں اور گندگیوں کو دور کر دے اور تمھیں خوب اچھی طرح (نافرمانیوں سے) پاک صاف کر دے۔''

ہمارے علمائے محققین نے فرمایا کہ یہ بات حق تعالیٰ نے بطورِ منقبت نہیں، بطورِ نصیحت فرمائی، یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم سے گندگی دور کر دی گئی اور تم بالکل پاک اور معصوم کر دیے گئے، بلکہ یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ تم سے گندگی دور کر دینا چاہتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ (مخصوص) احکام پر تم عمل کرو گے تو تمھیں پاکیزگی کی نعمت نصیب ہوگی، ورنہ نہیں۔

اور اگر ﴿وَيُطَهِّرَكُمْ﴾ سے شیعہ حضرات اہل بیت رسول کے مخصوص افراد کی معصومیت ثابت کر رہے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو، غسل اور تیمّم کرنے والے تمام اہل ایمان کو معصوم نہ مان لیا جائے، کیوں کہ ان کے متعلق بھی تو حق تعالیٰ نے ﴿وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ [المائدة:٦] فرمایا ہے، اگر اس سے اہل ایمان کی معصومیت ثابت نہیں ہوتی تو اس سے بھی اہل بیت کی معصومیت ثابت نہیں ہوتی۔ فافہم۔

کتاب وسنّت کی روشنی میں ہم اہل بیت رسول کو حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح محفوظ تو مانتے ہیں، لیکن معصوم نہیں مانتے، معصوم تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اہل بیت کا اوّلین مصداق ازواجِ مطہرات ہیں:

چوں کہ اس آیت کریمہ میں اہل بیت کی تطہیر و پاکیزگی بیان کی گئی اس لیے اسے آیت تطہیر کہتے ہیں، اس کا اصل اور اوّلین مصداق تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہی ہیں، کیوں کہ خطاب کا آغاز ہی "يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ" سے کیا گیا اور ماقبل

اور مابعد کی پوری گفتگو میں وہی مخاطب ہیں۔

رئیس المفسرین سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

"نَزَلَتْ فِيْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً".

(روح المعاني : ١٢ / ١٤٠، أنوار البيان)

خود قرآنِ کریم میں بھی ''اہل بیت'' کا لفظ بیوی کے لیے استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۂ ہود میں ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت دیتے ہیں تو آپ کی بیوی سیّدہ سارہ سن کر اظہارِ تعجب کرتی ہیں کہ بھلا اس عمر میں ہمارے یہاں بچّہ؟ تب فرشتوں نے کہا:

﴿قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ﴾ [هود : ٧٣]

''کیا تم اللہ تعالیٰ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اے اہل بیت! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔''

ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت سے مراد بیوی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ آیت تطہیر میں بھی اہل بیت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویاں ہیں، البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد و اقارب بھی اس میں ضمناً شامل ہیں، اس لیے کہ آیت تطہیر کے بعد ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کالی کملی میں ملبوس تشریف لائے، اتنے میں حضرات حسنین، فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہم بھی تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں کو اپنی چادر میں لے کر اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: "خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدَاةً وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مُرَحَّلٌ مِنْ شَعَرٍ أَسْوَدَ، فَجَاءَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ

فَأَدْخَلَهُ، ثُمَّ جَاءَ الْحُسَيْنُ فَدَخَلَ مَعَهُ، ثُمَّ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَأَدْخَلَهَا، ثُمَّ جَاءَ عَلِيٌّ فَأَدْخَلَهُ، ثُمَّ قَالَ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (مسلم، مشكوٰة : ٥٦٨، باب مناقب أهل البيت)

اور بتلادیا کہ اہل بیت میں یہ حضرات بھی شامل ہیں، یہ لوگ الگ نہیں ہیں۔

اہل بیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل اور اقارب بھی داخل ہیں:

رہی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل واقارب کے اہل بیت سے ہونے کی تو مختلف روایتیں اس سلسلے میں منقول ہیں، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّتِهِ يَوْمَ عَرَفَةَ، وَهُوَ عَلَى نَاقَتِهِ القَصْوَاءِ يَخْطُبُ، فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: " يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا: كِتَابَ اللهِ، وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي". (الترمذي، مشكوٰة : ٥٦٩)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کے دن اپنی قصواء نامی اونٹنی پر خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، اگر تم ان کو اچھی طرح پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، ان میں سے ایک کتاب اللہ ہے، اور دوسری چیز میری اولاد اہل بیت ہیں۔ ''عترۃ'' کا مطلب ہے آل واولاد، نسل اور رشتے دار، اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ تمام (اہل ایمان) رشتے دار ہیں جن پر زکوٰۃ وصدقات (واجبہ) حرام ہیں، کیوں کہ حدیث ثقلین کے تحت مسلم میں ہے کہ راویٔ حدیث نے صحابیٔ رسول سیّدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے جب اہل بیت کے متعلق پوچھا تو فرمایا:

" أَهْلُ بَيْتِهٖ مَنْ حَرُمَ الصَّدَقَةُ عَلَيْهِ بَعْدَه، قَالَ: وَمَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ اٰلُ عَلِيٍّ، وَاٰلُ عَقِيْلٍ، وَاٰلُ جَعْفَرٍ، وَاٰلُ عَبَّاسٍ". (مسلم)

''یہ آلِ علی، آلِ عقیل، آلِ جعفر اور آلِ عباس سبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے دار ہونے کے سبب اہل بیت میں داخل ہیں اور عظمت وفضیلت کے بلا شبہ حقدار ہیں۔

اہل بیت کی عظمت وفضیلت:

عاجز کے خیالِ ناقص میں اہل بیت کی عظمت و فضیلت مختلف جہات و وجوہات سے ثابت ہے:

(۱) حق تعالیٰ نے اُنھیں شرفِ صحابیت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ازدواجی، نسبی اور خاندانی اعتبار سے شرفِ قرابت بھی نصیب فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو یہ فضیلت اصلاً ومستقلاً حاصل ہے کہ دُنیا ہی میں نہیں بلکہ روزِ محشر بھی ان کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم رہے گا، چنانچہ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بہ سند صحیح ایک حدیث صحیح کو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دِن ہر ایک نسبی وازدواجی تعلق ختم ہوجائے گا سوائے میرے نسبی وازدواجی تعلق کے۔ قرآنِ کریم نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا:

﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ [المؤمنون:۱۰۱]

علماء نے فرمایا ہے کہ اس میں ضمناً اہل ایمان بھی داخل تو ہیں (کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت مسلمہ کے روحانی باپ ہیں تو آپ کی ازواجِ مطہرات مائیں ہیں) لیکن اہل بیت اصلاً اور مستقلاً داخل ہیں۔ (مستفاد از: معارف القرآن)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں اور رسولوں میں سے منتخب اور سب سے افضل ہیں، تو اہل بیت رسول تمام گھرانوں میں سے منتخب اور سب سے افضل ہیں، حدیث پاک

میں وارد ہے:

"إِنَّ اللهَ خَلَقَ الخَلْقَ، فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ، ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ، فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ فِرْقَةً، ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ، فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ قَبِيلَةً، ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوتًا فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ بَيْتًا، فَأَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا".

(الترمذي، مشكوٰة : ٥١٣، باب فضائل سيد المرسلين صلى الله عليه وسلم)

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے اُن میں سے بہترین مخلوق میں پیدا فرمایا، پھر اس بہترین مخلوق کو دو طبقوں میں تقسیم فرمایا تو مجھے اُن میں سے بہترین طبقے میں رکھا، پھر اس بہترین طبقے کو قبائل در قبائل تقسیم فرمایا تو مجھے اُن میں سے بہترین قبیلے میں رکھا، پھر اُن بہترین قبائل کے مختلف گھرانے بنائے تو مجھے بہترین گھرانے میں رکھا (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحدیث بالنعمت کے طور پر) فرمایا: میں اُن میں ذات کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر و افضل ہوں اور گھر کے اعتبار سے بھی۔''

(۳) اہل بیت رسول کی عظمت و فضیلت ہی کے پیش نظر ان پر زکوٰۃ و صدقات (واجبہ) کو حرام قرار دیا گیا، اس لیے کہ حدیث پاک کے مطابق زکوٰۃ مال کا میل کچیل ہے:

"إِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ، وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ، وَلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ". (مسلم، مشكوٰة : ١٦١، باب من لا تحل له الصدقة)

اور جب زکوٰۃ مال کا میل ہے تو اہل بیت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

(۴) اہل بیت کی عظمت و فضیلت ہی کے پیش نظر نماز کے آخری قعدے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آل رسول پر بھی ضمناً و تبعاً درود پڑھا جاتا ہے (جو شوافع کے یہاں تو فرض ہے لیکن احناف کے یہاں سنّت مؤکدہ ہے) جس سے نماز کے اجر و

ثواب میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

(۵) اہل بیت رسول کی عظمت وفضیلت اس وجہ سے بھی ہے کہ اُنھوں نے ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھایا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مجاہدات میں تو پیش پیش رہے لیکن منافع میں اپنے آپ کو پیچھے رکھا اور دوسروں کو ترجیح دی۔

دولت دنیا سے منھ موڑا:

اس سلسلے میں یوں تو اہل بیت میں کئی مثالیں ملتی ہیں، ایک بہترین مثال تخییر کا واقعہ ہے، جب فتح خیبر کے بعد مالی وسعت ہوئی تب ازواجِ مطہرات نے بھی توسیع نفقہ کا مطالبہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات ناگوار گزری، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً ایک ماہ کے لیے بیویوں سے علیحدگی اختیار فرمالی، حق تعالیٰ نے آیت تخییر نازل فرمائی، جس میں ازواجِ مطہرات کے سامنے دونوں راستے پیش کر کے اختیار دیا گیا کہ:

﴿إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝﴾ [الأحزاب : ۲۸]

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت و رفاقت چھوڑ کر دُنیا کی زیب و زینت و دولت مطلوب ہے تو وہ بھی حاضر ہے، لیکن اگر:

﴿وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ [الأحزاب : ۲۹]

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت اور عیش آخرت کی چاہت ہے تو پھر قناعت کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے کہ آیت تخییر کے نزول کے بعد تمام ازواجِ مطہرات نے متفقہ فیصلہ سنایا کہ ہمیں دُنیا کی دولت و راحت کے بجائے

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت مطلوب ہے۔ (مسلم، مشکوٰۃ: ۲۸۱، باب عشرۃ النساء)

اسی طرح ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں غلام اور باندیاں پیش کی گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب میں تقسیم فرمادیں، لیکن بیٹی فاطمہ اور داماد علی المرتضیٰ کو ضرورت کے باوجود خادم یا باندی کے بجائے اعمالِ صالحہ و تسبیح کی ترغیب دے کر راضی فرمایا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۹ / باب ما یقول عند الصباح والمنام)

جس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرح اہل بیت رسول نے بھی ہمیشہ دُنیا اور اس کی دولت و راحت سے منھ موڑا اور صبر و شکر کے ساتھ قناعت کی راہ اپنائی، کسی نے سچ ہی کہا ہے:

دولت دُنیا سے منھ موڑا، رنج کو اُٹھایا، حق کو نہ چھوڑا
اللہ، اللہ، عزمِ مصمم، صلی اللہ علیہ وسلم

اہل بیت کی عظمت و فضیلت کا تقاضا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اُن سے محبّت و عقیدت رکھی جائے اور اُن کی سیرت و کردار کو اختیار کیا جائے۔

اہل بیت کا پہلا حق محبّت:

کتاب و سنّت کی روشنی میں ہمارے علماء نے اہل بیت رسول کے جو حقوق بیان فرمائے ہیں بنیادی طور پر ان میں پہلا حق یہ ہے کہ اہل بیت سے محبّت و عقیدت اپنی چاہت کے مطابق نہیں بلکہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے رکھی جائے۔

حدیث شریف میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَحِبُّوا اللهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعَمِهِ، وَأَحِبُّونِي لِحُبِّ اللهِ،

وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي". (سنن الترمذي، مشكوٰة : ٥٧٣)

''اللہ تعالیٰ سے محبّت رکھو، اس لیے کہ وہی تمھیں اپنی نعمتوں سے رزق دیتا ہے اور تمھاری پرورش کرتا ہے (تو محسن سے محبّت تقاضائے فطرت ہے) اور اللہ پاک ہی کی محبّت کے سبب مجھ سے محبّت کرو، اور میری محبّت کے سبب میرے اہل بیت سے محبّت کرو۔''

اہل بیت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبّت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبّت کے سبب ہمیں بھی اُن سے محبّت ہونی چاہیے۔ بقولِ شاعر:

رنگِ چمن پسند، نہ پھولوں کی بو پسند ہم کو ہے وہ پسند جسے آئے تو پسند

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وصلحائے اُمّت حضرات اہل بیت سے بڑی محبّت کرتے تھے، چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے، آپ فرماتے ہیں:

"وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَرَابَةُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ قَرَابَتِيْ". (بخاري / باب مناقب قرابة رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنقبة فاطمة)

نیز منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سیّدنا عباس رضی اللہ عنہ جب کبھی حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما کے پاس سے گزرتے اور وہ سواری پر ہوتے تو یہ دونوں حضرات ان کے اکرام میں اپنی سواری سے اُتر جاتے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۹۳)

یہ بھی منقول ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنی سواری پر سوار ہوئے تو چوں کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب اور معلم الصحابہ تھے اس لیے ان کے اکرام میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سواری کی رکاب تھام لی، تو حضرت زید

بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے حضور کے چچازاد بھائی! ایسا نہ کرو، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: "هٰكَذَا أُمِرْنَا أَنْ نَفْعَلَ بِعُلَمَائِنَا". ہمیں اپنے علماء کے ساتھ ایسا ہی (اکرام واحترام) کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس پر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور فرمایا: "هٰكَذَا أُمِرْنَا أَنْ نَفْعَلَ بِأَهْلِ بَيْتِ نَبِيِّنَا". (الإصابة في تمييز الصحابة: ۱۲۶/٤) ہمیں بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح (اکرام اور تعظیم ومحبّت) سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو اہل بیت سے محبّت کی فرضیت کے قائل ہیں، آپ فرماتے ہیں:

يَا أَهْلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ! حُبُّكُمْ فَرْضٌ مِنَ اللهِ فِي القُرآنِ أَنْزَلَهُ

''اے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ سے محبّت کرنا من جانب اللہ فرض ہے، جسے اس نے قرآنِ کریم میں نازل کیا ہے۔''

كَفَاكُمْ مِنْ عَظِيْمِ القَدْرِ أَنَّكُمْ مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلٰوةَ لَهُ

''آپ کے لیے یہ عظیم مرتبہ ہی کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ پڑھے اس کی نماز مکمّل نہیں ہوتی۔'' (مرقاۃ: ۱/۶۷)

(جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ نماز کے قعدۂ اخیرہ میں شوافع کے یہاں درود شریف پڑھنا فرض ہے)۔

صاحبو! جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کمالِ ایمان کی علامت ہے اسی طرح اہل بیت رسول سے محبّت بھی کمالِ ایمان کی علامت ہے، لیکن یاد رکھو! اہل بیت سے محبّت اور اقرارِ عظمت کے لیے کسی صحابی پر لعنت شقاوت ہے، کیوں کہ خود اہل بیت کا یہ طریقہ نہیں ہے، اُنھوں نے نفرت کرنے والوں کو بھی پیغامِ محبّت دیا ہے، اسی

لیے کہا نا!.....

سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دُعائیں دیں

اہل بیت کا دوسرا حق اطاعت:

اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا بنیادی حق یہ ہے کہ ان کی پاکیزہ سیرت اور ان کے مقدّس اخلاق و اوصاف کو اختیار کیا جائے، دینی امور و معاملات میں ان کا اتباع و اطاعت کی جائے، حدیث پاک میں اس کی بھی ترغیب آئی ہے، فرمایا: "إِنْ أَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا، كِتَابَ اللهِ، وَعِتْرَتِيْ أَهْلَ بَيْتِيْ". مطلب یہ ہے کہ لوگو! میرے دُنیا سے جانے کے بعد جب تک تم کتاب اللہ کے احکام اور میرے اہل بیت کے اتباع کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ اہل بیت کی اطاعت اور ان کی اتباع یہ ان کا دوسرا بنیادی حق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کے ساتھ اہل بیت کی اطاعت کا حکم و ترغیب اس لیے دی کہ اہل بیت تمام کے تمام اعلیٰ درجے کے متبع سنّت تھے، اتباعِ سنّت ہی ان کی علامت ہے، اس لیے ان کی اتباع سنّت ہی کی اتباع ہے۔ واللہ اعلم۔

اہل بیت کے حقوق میں کوتاہی تباہی ہے:

واقعہ یہ ہے کہ اہل بیت رسول سے محبّت و عقیدت اور ان کا اتباع و اطاعت مغفرت و نجات کا تو ان کے حقوق سے غفلت ہلاکت کا سبب ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کو سمجھانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کو کشتیٔ نوح سے تشبیہ دی، فرمایا:

" أَلَا! إِنَّ مَثَلَ أَهْلِ بَيْتِيْ فِيْكُمْ مَثَلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ، مَنْ رَكِبَهَا نَجَا، وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا هَلَكَ". (مسند أحمد، مشكوٰة : ٥٧٣)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب کو ستاروں سے تشبیہ دی:

"أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ"...الخ (رواه رزين، مشكوٰة : ٥٥٤، باب مناقب الصحابة)

تو ظاہر ہے کہ کشتی صحیح سمت تب ہی چل سکتی ہے جب کہ ستاروں سے روشنی حاصل کی جائے، لہٰذا اہل ایمان کی کشتی بھی جنّت اور صراطِ مستقیم کی سمت تبھی چل سکے گی جب کہ اصحابِ رسول اور اہل بیت رسول دونوں سے محبّت کی جائے، بلکہ اصحابِ رسول کی طرح اہل بیت رسول سے محبّت کی جائے۔

حق تعالیٰ ہم تمام کو توفیق عمل عطا فرمائیں، اللہ پاک بزم صدیقی میں ترمیم کے بعد والدہ اور اپنی فیملی کے ساتھ نیچے والے حصے میں آج سے منتقل ہونے کو خیر و برکت کا ذریعہ بنائیں۔

اَللّٰهُمَّ مُنَّ عَلَيْنَا، وَقِنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ، إِنَّكَ أَنْتَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ، آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ. (تفسير ابن كثير / الطور / الآية : ٢١)

۴ر رجب المرجب ر ۱۴۴۴ھ

مطابق: ۲۷ر جنوری ر ۲۰۲۳ء

دارالارشاد، بزمِ صدیقی بڑودا، بروز جمعہ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ٢١٠)

(۳۷)

اولاد کے انتقال پر صبر کا اَجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ مُوْسىٰ الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا مَاتَ وَلَدُ الْعَبْدِ قَالَ اللهُ تَعَالىٰ لِمَلَائِكَتِهِ: قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِي؟ فَيَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ، فَيَقُوْلُ: قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهِ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ، فَيَقُوْلُ: مَاذَا قَالَ عَبْدِي؟ فَيَقُوْلُوْنَ: حَمِدَكَ، وَاسْتَرْجَعَ، فَيَقُوْلُ اللهُ: ابْنُوا لِعَبْدِي بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَسَمُّوْهُ بَيْتَ الْحَمْدِ". (رواه أحمد والترمذي، مشكوٰة المصابيح : ۱۵۱ / باب البكاء على الميت)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کسی (مؤمن) بندے (بندی) کا کوئی بچّہ (بچّی) وفات پا جاتا ہے تو حق تعالیٰ (ملک الموت اور اُن کے معاوِن) فرشتوں سے فرماتے ہیں: تم نے میرے بندے کے بچّے کی روح قبض کی ہے (اپنا مشن اور ٹارگیٹ پورا کر لیا؟) وہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے اس کے دِل کا پھل لے لیا؟ عرض کرتے ہیں: جی ہاں، تو حق تعالیٰ (جاننے کے باوجود فرشتوں کو گواہ بنانے کے لیے) فرماتے ہیں کہ (اس حادثے) پر میرے بندے نے کیا کہا؟ عرض کرتے

ہیں: تیری حمد بیان کی (یہ سوچ کر کہ ہر اچھی بُری تقدیر من جانب اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں خیر ہی ہے، تیرے اس فیصلے پر بھی سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے) "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا، تب حق تعالیٰ فرماتے ہیں (اولاد کی وفات پر صبر کے اجر میں) میرے بندے (بندی) کے لیے جنّت میں ایک گھر بناؤ اور اُس کا نام "بیت الحمد" (تعریف کا گھر) رکھو۔"

بیوی کھیتی ہے تو بچّے پھل:

اللہ ربّ العزت نے مرد کے لیے عورت کو کھیتی اور اولاد کو اس سے حاصل ہونے والے بہترین پھل قرار دیا، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠﴾ [البقرة : ۲۲۳]

"تمھاری بیویاں (بیوی نہیں فرمایا، فَافْهَم) تمھارے لیے کھیتی ہیں۔"

دوسری جگہ دُنیوی آزمائش ومصائب کی پانچ شکلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اولاد میں کمی کے لیے "ثَمَرَات" (البقرۃ:۱۵۵) کا تو حدیث مذکور میں بھی بچّے کے لیے "ثمرة" کا لفظ استعمال فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ بیوی کھیتی ہے تو بچّے پھل ہیں۔

ظاہر ہے کہ تحت الاسباب اس کھیتی سے بھی پھل اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ اس پر توجّہ دی جائے، اس کی ضروریات کا انتظام کیا جائے، اس کے تحفظ کا پورا خیال بھی کیا جائے، اس لیے کہ اگر ایک کسان کے پاس کھیتی کی زمین تو ہے مگر وہ اس پر کوئی توجّہ ہی نہیں دیتا، اس کی بڑھوتری و ہریالی کے لیے اسے بیج، کھاد اور پانی وغیرہ نہیں دیتا، اس پر اپنا وقت اور راحت وآرام قربان نہیں کرتا، نیز اس کی طرف آنے والے جانوروں سے حفاظت اور اُسے لوگوں کی گذرگاہ بننے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسی کھیتی نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتی، یہی حال بیوی بچّوں کا بھی ہے، جب بیوی

کھیتی ہے تو اس سے پھل بھی اُسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اُس پر توجّہ بھی دی جائے، اس کی ضروریات اور تحفظات کا مکمّل انتظام کیا جائے۔

پھر جس طرح ایک کسان اپنی محنت و کوشش کے بعد لہلہاتی کھیتی اور اُس کی ہریالی و شادابی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنی کھیتی کے پھل یعنی بچّوں کے پیدا ہونے کے بعد اُن کو پَروان چڑھتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بلکہ ایک اچھّا مسلمان تو اپنی اس کھیتی کے لیے پھلنے پھولنے کی دُعا بھی کرتا ہے:

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾ [الفرقان : ٧٤]

''اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنادے۔''

لیکن ظاہر ہے کہ یہ خوشی اُس دِن غمی میں بدل جاتی ہے جس دِن اولاد انتقال کر جاتی ہے، وہ دِن اس صاحب اولاد کے لیے بڑی آزمائش و امتحان کا ہوتا ہے۔

جس مسلمان کے تین بچّے انتقال کر جائیں وہ جنّت میں جائے گا:

کسی بھی ماں باپ کے لیے اولاد کے انتقال اور جُدائی کا صدمہ برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا، البتہ اگر (مسلمان) ماں باپ عین اس ابتلا کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے صبر و ضبط سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی ہوجائیں تو یہی چیز اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی رَضا و رَحمت، جہنّم سے حفاظت اور قیامت میں شفاعت کا بہترین ذریعہ بنے گی، جیسا کہ مختلف احادیث میں یہ تمام فضائل منقول ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسلم: "لَا يَمُوت لِمُسلِمٍ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْوَلَدِ، فَيَلِجُ النَّارَ، إِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ۱۵۰ / باب البكاء على الميت)

''جس مسلمان کے تین نابالغ بچّے انتقال کر جائیں (اور وہ والدین اس صدمے پر صبر اور رضا بر قضا سے کام لیں تو بدلے میں اللہ تعالیٰ اُنھیں جہنّم سے محفوظ فرمائیں گے) وہ جہنّم میں داخل نہ ہوگا، مگر قسم پوری کرنے کے لیے۔''

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں قسم کھائی ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝﴾ [مریم:۷۱]

''تم میں سے ہر ایک دوزخ سے گزرنے والا ہے، یہ آپ کے رب کا لازمی حکم ہے جس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔''

حضرات محققین فرماتے ہیں کہ یہاں ''ورود'' سے مُراد اہل ایمان کے لیے ''مرور'' ہے، لیکن بے ایمان کے لیے ''دخول'' ہے۔ واللہ اعلم۔

محدثین فرماتے ہیں کہ قیامت کے دِن حق تعالیٰ کی جانب سے دوزخ پر ایک پُل رکھا جائے گا، جس کا نام پُل صراط ہے، اس پر مؤمن و کافر گزریں گے، مؤمن پار ہو جائیں گے اور کفّار کٹ کر نیچے گر جائیں گے، اس طرح گزرنے سے حق تعالیٰ کی قسم پوری ہو جائے گی۔ "إِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ" کا یہی مطلب ہے۔ (توضیحات: ۳/ ۳۸۲)

جس کے دو بچّے انتقال کر جائیں وہ بھی جنّت میں جائے گا:

اس حدیث میں تین بچّوں کے انتقال پر صبر کا اَجر بیان ہوا ہے۔ دوسری روایتوں میں دو بچّوں کے انتقال پر صبر کا بھی یہی اَجر بیان فرمایا گیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنِسْوَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ: "لَا يَمُوتُ لِإِحْدَاكُنَّ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْوَلَدِ،

فَتَحْتَسِبُهُ إِلَّا دَخَلَتِ الْجَنَّةَ". فَقَالَتْ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ: أَوِ اثْنَانِ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: أَوْ اثْنَانِ ". (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ۱۵۰)

''ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری عورتوں سے فرمایا کہ تم میں سے جس عورت کے تین بچّے مرجائیں (جو حدّ بلوغ کو نہ پہنچے ہوں) اور وہ عورت اس پر (صبر کرتے ہوئے) ثواب کی اُمید وطلب رکھے تو وہ جنّت میں داخل کی جائے گی، یہ سُن کر اُن میں سے کسی خاتون نے عرض کیا کہ حضور! اگر کسی کے دو بچّے مرجائیں تو کیا اس کے لیے بھی یہی فضیلت و بشارت ہے؟ فرمایا: جی ہاں، اُس کے لیے بھی یہی فضیلت و بشارت ہے۔''

ایک روایت میں ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلٰى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِيثِكَ، فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَفْسِكَ يَوْمًا نَأْتِيكَ فِيهِ، تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ."

''عہدِ نبوی کی ایک خاتون دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر اپنے اور خواتین اسلام کے جذبۂ صالحہ کا اظہار کرتی ہے (اس سے واضح ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں مَردوں کی طرح عورتوں میں بھی علمِ دین کے حصول اور اُس پر عمل کا بے حد شوق تھا) اسی جذبۂ صادقہ کی تسکین کے پیشِ نظر عرض کیا کہ حضور! مَردوں نے تو آپ کی تعلیمات و ارشادات سے خوب استفادہ کیا (اور اُن کے لیے تو بہت سے مواقع ہیں) ہمارے لیے بھی کوئی دِن (اور جگہ) مقرّر فرمادیں جس میں ہم جمع ہوجایا کریں اور آپ تشریف لاکر ہمیں بھی اپنی تعلیمات وہدایات سے نوازیں۔

فَقَالَ: "اجْتَمِعْنَ فِي يَوْمِ كَذَا وَكَذَا، فِي مَكَانِ كَذَا وَكَذَا".

''اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا: تم فلاں دِن، فلاں وقت فلاں جگہ جمع ہوجاؤ۔''

"قَاجْتَمَعْنَ، فَأَتَاهُنَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللهُ".

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق عورتیں وقت مقرّرہ پر کسی خاص جگہ جمع ہو گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے پاس تشریف لائے۔ گویا کنواں خود پیاسوں اور سچّے طالبوں کے پاس حاضر ہوگیا۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا تھا وہ آپ نے خواتین کو بھی سکھایا۔

صاحبو! اس طرزِ نبوی سے معلوم ہوا کہ دین سیکھنے سکھانے کے لیے اُمّت کی خواتین کو شہروں سے باہر نکالنے کے بجائے شہروں اور مخصوص علاقوں محلّوں میں ہی اُن کے لیے نبیوں کے وارثوں کے ذریعے دین سیکھنے سکھانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ فَافْهَم۔

غرض عہدِ نبوی میں خواتین کے اس پہلے اجتماع میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ثُمَّ قَالَ: "مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ بَيْنَ يَدَيْهَا مِنْ وَلَدِهَا ثَلَاثَةً إِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِنَ النَّارِ، فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَوِ اثْنَيْنِ؟ فَأَعَادَتْهَا مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: وَاثْنَيْنِ، وَاثْنَيْنِ، وَاثْنَيْنِ". (بخاري، مشكوٰة : ١٥٣)

''تم میں سے جس نے اپنی اولاد میں سے (تین لڑکیاں یا لڑکے) آگے بھیج دیے ہوں (یعنی اس کے تین بچّے مر گئے ہوں) تو وہ بچّے اس کے لیے نارِ جہنّم سے پردہ (حفاظت کا ذریعہ) بن جائیں گے۔ ان میں سے کسی عورت نے دو مرتبہ دریافت کیا کہ حضور! جس عورت کے تین نہیں بلکہ دو ہی بچّے انتقال کر جائیں تو کیا یہ فضیلت و بشارت اُس کے لیے بھی ہے؟ فرمایا: جی ہاں، اس کے لیے بھی یہی فضیلت ہے۔''

جس کا ایک بچّہ انتقال کر جائے وہ بھی جنّت میں جائے گا:

ان روایتوں میں دو بچّوں کے انتقال پر جہنّم سے حفاظت کی فضیلت وارد ہوئی ہے، جب کہ دیگر روایتوں میں ایک بچّے کے انتقال پر بھی یہی فضیلت بیان ہوئی ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم: "مَنْ قَدَّمَ ثَلَاثَةً مِنَ الْوَلَدِ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ، كَانُوا لَهُ حِصْنًا حَصِينًا مِنَ النَّارِ، فَقَالَ أَبُو ذَرٍّ: قَدَّمْتُ اثْنَيْنِ، قَالَ: وَاثْنَيْنِ، قَالَ أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ أَبُو الْمُنْذِرِ سَيِّدُ الْقُرَّاءِ: قَدَّمْتُ وَاحِدًا، قَالَ: وَوَاحِدًا".

(رواه الترمذي، مشكوٰة المصابيح : ١٥٣)

اس حدیث میں فرمایا کہ جس شخص نے اپنی اولاد میں سے ایسے تین بچّے جو بلوغ کو نہ پہنچے ہوں آگے بھیجے ہوں (یعنی اس کے مرنے سے پہلے مر گئے ہوں) تو وہ اس کے لیے حصن حصین اور آگ سے حفاظت کا بہترین قلعہ اور ذریعہ ہوں گے، یہ سُن کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے تو دو بچّے بھیجے ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بچّوں کے انتقال پر بھی یہی فضیلت ہے، اس موقع پر سیّد القراء ابوالمنذر سیّدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں نے ایک ہی بچّہ بھیجا ہے (میرے ایک بچّے کا انتقال ہوا ہے) تو کیا میرے لیے بھی یہ فضیلت ہے؟ ارشاد فرمایا: ہاں جی، ایک بچّے کے انتقال پر بھی صبر و رضا سے کام لینے والے والدین کے لیے یہ فضیلت ہے کہ حق تعالیٰ اُنھیں جہنّم سے محفوظ فرمائیں گے۔

ایک روایت میں اس سلسلے کا ایک واقعہ منقول ہے:

عَنْ قُرَّةَ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا كَانَ يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ ابْنٌ لَهُ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتُحِبُّهُ؟

فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَحَبَّكَ اللهُ كَمَا أُحِبُّهُ، فَفَقَدَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: مَا فَعَلَ ابْنُ فُلَانٍ؟ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ مَاتَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمَا تُحِبُّ أَنْ لَا تَأْتِيَ بَابًا مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ إِلَّا وَجَدْتَهُ يَنْتَظِرُكَ؟ فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! لَهُ خَاصَّةً أَمْ لِكُلِّنَا؟ قَالَ: بَلْ لِكُلِّكُمْ". (رواه أحمد، مشكوٰة المصابيح : ۱۵۳)

حضرت قرہ مُزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک صحابی خدمت اَقدس میں تشریف لاتے تو ہمیشہ اُن کا لڑکا ساتھ ہوتا، ایک دِن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صحابی کی اپنے بیٹے سے شدید محبّت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم اپنے بیٹے کو بہت زیادہ محبوب وعزیز رکھتے ہو جو ہر وقت ساتھ رکھتے ہو؟ اُنھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس سے اپنی محبّت کی شدّت کو کیا بتاؤں! بس میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ آپ سے بھی ایسی ہی محبّت کرے جیسا کہ میں اپنے اس بچّے سے کرتا ہوں، کچھ عرصے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بچّے کو اپنے باپ کے ساتھ نہیں پایا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے متعلق پوچھا، کسی نے بتایا کہ حضور! اُس بچّے کا انتقال ہوگیا، بعد میں وہ صحابی حاضرِ خدمت ہوئے تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بیٹے کے انتقال پر صبر کے اَجر وثواب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں کہ بروزِ قیامت تم جنّت کے (آٹھوں دروازوں میں سے) جس دروازے پر جاؤ وہاں اپنے اس وفات پانے والے لڑکے کو دروازے پر تمھارا انتظار کرتے ہوئے پاؤ، تاکہ وہ تمھیں اپنے ساتھ ہاتھ پکڑ کر جنّت میں لے جائے؟ اس فضیلت وبشارت کو سُن کر وہ صحابی بہت خوش ہوگئے، اس وقت کسی صحابی نے عرض کیا کہ حضور! یہ بشارت بطورِ خاص اُن ہی کے لیے ہے یا سب کے لیے؟ فرمایا: یہ فضیلت وبشارت ساری اُمّت کے لیے ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لَهُ: مَاتَ ابْنٌ لِي، فَوَجَدْتُ عَلَيْهِ، هَلْ سَمِعْتَ مِنْ خَلِيلِكَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ شَيْئًا يَطِيْبُ بِأَنْفُسِنَا عَنْ مَوْتَانَا؟ قَالَ: نَعَمْ، سَمِعْتُهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "صِغَارُهُمْ دَعَامِيصُ الْجَنَّةِ، يَلْقَىٰ أَحَدُهُمْ أَبَاهُ، فَيَأْخُذُ بِنَاحِيَةِ ثَوْبِهِ، فَلَا يُفَارِقُهُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ۱۵۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے اُن سے کہا کہ میرا ایک چھوٹا بچّہ انتقال کر گیا جس کا مجھے بے حد غم ہے، کیا آپ نے اپنے خلیل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کچھ سُنا ہے جو ہمارے لیے تسلّی کا باعث ہو؟ تو سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں جی، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچّے تو جنّت کے ''دَعَامیص'' ہیں۔ (یہ ''دعموص'' کی جمع ہے، دعموص پانی کا ایک قسم کا سیاہ کیڑا ہے جو پانی میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ ''دعموص'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اُمرا و سلاطین کے یہاں دخیل ہوتا ہے، مسلسل اُن کے یہاں آتا جاتا رہتا ہے اُسے ''دعموص'' کہتے ہیں، حدیث پاک میں مسلمانوں کے فوت شدہ چھوٹے بچّوں کو جنّت کے ''دَعامیص'' اس لیے کہا گیا کہ یہ بھی جنّت میں ہر جگہ بلا روک ٹوک بآسانی آتے جاتے رہتے ہیں)۔

ایسے ہی فوت شدہ بچّوں سے متعلق عاجز عرض کرتا ہے کہ

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو میں مر گیا　　میں تو پھول ہوں، گلشن میں چلا گیا

آگے فرمایا کہ جب اُن میں سے کسی کا باپ (اور ماں قیامت میں) اُسے ملے گا تو وہ بچّہ اپنے والدین کے کپڑے کا کونہ پکڑ لے گا اور اللہ تعالیٰ سے درخواست

(سفارش) کر کے اپنے ماں باپ کو جنّت میں داخل کرادے گا، اپنے ماں باپ کے بغیر یہ جنّت میں رہنا گوارا نہیں کرے گا۔ پھر جنّت میں والدین کو شاندار محل دیا جائے گا، حدیث مذکور میں اس کا نام ''بیت الحمد'' آیا ہے کہ جو بھی اُسے دیکھے گا تو تعریف کرے گا۔

ناتمام بچّہ بھی والدین کو جنّت میں لے جائے گا:

اسی پر بس نہیں، حدیث پاک میں تو یہاں تک فرمایا ہے کہ کسی مسلمان والدین کا ناتمام بچّہ بھی انتقال کر جائے تو وہ بھی اپنے والدین کے لیے دخولِ جنّت کا ذریعہ بن جائے گا۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا:

"وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ إِنَّ السِّقْطَ لَيَجُرُّ أُمَّهُ بِسَرَرِهٖ إِلَى الْجَنَّةِ إِذَا احْتَسَبَتْهُ." (رواه أحمد وابن ماجه، مشكوٰة المصابيح : ١٥٣)

اگر کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے اور وہ اس صدمے پر صبر سے کام لے کر ثواب کی اُمید رکھے تو یہ ساقط شدہ (ناتمام بچّہ) اپنی آنول (بچّے کی پیدائش کے وقت ناف کے ساتھ ایک تسمہ ہوتا ہے جو بچّہ دانی کی جھلّی سے کٹ کر ناف کے ساتھ لٹکتا ہے) کے ذریعے کھینچ کر جنّت میں لے جائے گا۔

ایک روایت میں تو نہایت عجیب وغریب بات بیان کی گئی ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ السِّقْطَ لَيُرَاغِمُ رَبَّهٗ إِذَا أَدْخَلَ أَبَوَيْهِ النَّارَ، فَيُقَالُ: أَيُّهَا السِّقْطُ الْمُرَاغِمُ رَبَّهٗ! أَدْخِلْ أَبَوَيْكَ الْجَنَّةَ، فَيَجُرُّهُمَا بِسَرَرِهٖ حَتّٰى يُدْخِلَهُمَا الْجَنَّةَ". (رَوَاهُ ابْن مَاجَه، مشكوٰة المصابيح : ١٥٣)

عاجز کے خیالِ ناقص میں یہ حدیث ''رحمت حق بہانہ می جوید'' (اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت مسلمان کی بخشش کا بہانہ ڈھونڈتی ہے) کی بہترین مثال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دِن جب اللہ تعالیٰ ساقط شدہ (نا تمام) بچّے کے والدین کو اُن کی بداعمالیوں کے سبب دوزخ میں داخل کرنا چاہے گا تو وہ نا تمام بچّہ اللہ تعالیٰ سے اِصرار کرے گا کہ اُس کے والدین کو دوزخ میں داخل نہ کیا جائے، تو حق تعالیٰ اُس نا تمام بچّے کی سفارش (اصرار) کو مان لے گا اور اس سے کہا جائے گا: "أَيُّهَا السِّقْطُ الْمُرَاغِمُ رَبَّهُ!" اپنے رب سے جھگڑنے والے نا تمام بچّے! "أَدْخِلْ أَبَوَيْكَ الْجَنَّةَ" اپنے والدین کو جنّت میں لے جا، اس وقت وہ نا تمام بچّہ اپنے والدین کو اپنی آنول کے ذریعے کھینچ کر انھیں جنّت میں داخل کرائے گا۔

اولاد کے انتقال پر صبر جمیل کا عظیم مثالی واقعہ:

یہ تمام فضائل اُن لوگوں کو حاصل ہوں گے جو مسلمان ہیں اور جنھوں نے اس صدمے پر صبر سے کام لیا اور ثواب کی اُمید رکھی، ایسے مسلمان والدین کے لیے بچپن میں انتقال کرنے والی یہ اولاد ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات ہے، ایسے مؤمنین صابرین کو اُن کے بچّوں کے انتقال پر تعزیت (تسلی) پیش کرنے کے بجائے تہنیت (مبارک بادی) پیش کی جاسکتی ہے، کیوں کہ اُنھیں تو گویا جنّت کا ویزا ہی مل گیا۔ (اللہ تعالیٰ میرے والدین کو بھی بچپن میں ہمارے ایک بھائی کے انتقال پر ان فضائل کا مصداق بنادیں۔ آمین)۔

ظاہر ہے کہ صدمے کے وقت صبر و رضا سے کام لینا اس وقت آسان ہے جب کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچّے وعدوں پر یقین ہو، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی حال تھا، اس لیے اُنھوں نے اس معاملے میں بھی قابلِ رَشک کردار ادا فرمایا۔

چنانچہ خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیّدنا انس رضی اللہ عنہ اولاد کے انتقال پر صبر جمیل کا ایک عظیم مثالی واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سیّدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا سے ایک

بیٹا تھا، جو بچپن ہی میں بیمار ہو کر اس وقت انتقال کر گیا جب حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سفر پر تھے، بچّے کی تجہیز و تکفین کے بعد سیّدہ اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا نے گھر والوں سے عرض کیا کہ ابوطلحہ جب سفر سے گھر لوٹیں تو تم میں سے کوئی بھی بچّے سے متعلق کچھ نہ کہنا، میں خود ہی اُنھیں خبر کر دوں گی، پھر ایسا ہی ہوا کہ آنے کے بعد اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا نے شوہر کے سامنے کھانا پیش کیا، بعد میں اپنے آپ کو اچھّی طرح بناؤ سنگھار کر کے پیش کیا، حتیٰ کہ میاں بیوی نے وظیفۂ زوجیت ادا کیا (صحبت کی) فراغت کے بعد اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا کہنے لگیں:

"يَا أَبَا طَلْحَةَ! أَرَأَيْتَ لَوْ أَنَّ قَوْمًا أَعَارُوا عَارِيَتَهُمْ أَهْلَ بَيْتٍ، فَطَلَبُوا عَارِيَتَهُمْ، أَلَهُمْ أَنْ يَمْنَعُوهُمْ؟ قَالَ: لَا. قَالَتْ: فَاحْتَسِبِ ابْنَكَ."

(رواه مسلم / باب : من فضائل أبي طلحة الأنصاري رضي الله عنه)

''ابوطلحہ! اگر کچھ لوگ اپنی امانت کسی کے پاس رکھیں اور بعد میں اپنی اُس امانت کا مطالبہ کریں تو گھر والوں کو وہ امانت بحسن و خوبی لوٹا دینی چاہیے یا نہیں؟ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: بالکل لوٹا دینی چاہیے، کیوں کہ صاحب امانت اپنی چیز جب چاہے لے سکتا ہے، اُس پر اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہمارا بیٹا بھی ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہم سے لے لیا، اس کا انتقال ہو گیا، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا کے کمالِ صبر و حوصلہ کو دیکھ کر حیران ہو گئے، صبح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورے واقعے کی اطلاع دی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں دُعا دی کہ "بَارَكَ اللهُ لَكُمَا فِي غَابِرِ لَيْلَتِكُمَا" اللہ پاک تمھاری گذشتہ رات میں برکت عطا فرمائیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کے صبرِ جمیل اور نبوی دُعاؤں کا ثمرہ اس طرح ظاہر ہوا کہ راوی فرماتے ہیں کہ "فَرَأَيْتُ لَهُمَا تِسْعَةَ أَوْلَادٍ، كُلُّهُمْ قَدْ قَرَأَ الْقُرْآنَ". (بخاري /باب من لم يظهر حزنه عند المصيبة / الرقم : ١٣٠١) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا سے نو بیٹے پیدا

ہوئے، جو سب کے سب قرآنِ کریم کے قاری تھے۔ معلوم ہوا کہ اولادِ صغار کے انتقال پر صبر کا صلہ آخرت میں تو ہے ہی، بعض اوقات دُنیا میں بھی ملتا ہے۔

اہل جنّت کے خدّام:

رہی بات بے ایمان لوگوں کی اولادِ صغار کی تو کتاب وسنّت سے معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمان کی وہ اولاد جو بچپن ہی میں انتقال کر گئی وہ بھی جنّتی تو ہے لیکن وہ اپنے والدین کے لیے نہ ذخیرہ ہوگی، نہ ذریعۂ نجات بنے گی، حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے اُنھیں جنتیوں کا خادم بنادے گا، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ﴾ [الطور: ۲۴]

''اور اُن کے اِردگرد اُن کے نوعمر غلام وخدّام گھوم رہے ہوں گے، وہ ایسے خوب صورت ہوں گے گویا کہ وہ صدف میں چھپے ہوئے موتی ہیں۔''

حدیث پاک میں مروی ہے، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کیا: حضور! جب جنتیوں کے خادم موتیوں کی طرح حسین ہوں گے تو خود مخدوم کے حسن وجمال کا کیا عالم ہوگا؟ فرمایا:

"مَا بَيْنَهُمَا كَمَا بَيْنَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَبَيْنَ أَصْغَرِ الْكَوَاكِبِ."
(تفسير القرطبي / تحت الآية)

''خادم پر مخدوم کی فضیلت ایسی ہوگی جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے۔'' (معالم التنزیل یل رسورۂ طور رزیر آیت)

اہل جنّت کے اِن خدّام کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ مشرکین کی اولاد کو اللہ تعالیٰ جنتیوں کا خادم بنادیں گے۔ (قرطبی)

قرآنِ کریم میں جنتیوں کے خدّام سے متعلّق ''غلمان'' (طور: ۲۴) اور ''وِلدان'' (واقعہ: ۱۷) کے الفاظ ذِکر کیے گئے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن

بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اہل دُنیا کے وہ بچّے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اس لیے اُن کی نہ کچھ نیکیاں ہوں گی کہ اُن کی جزا پائیں، اور نہ بدیاں ہوں گی کہ اُن کی سزا پائیں، تو ظاہر بات ہے کہ یہ وہی اہل دُنیا ہو سکتے ہیں جن کو کفر و شرک کے سبب جنّت نصیب نہ ہوئی ہو، ورنہ مؤمنین صالحین کے لیے تو حق تعالیٰ نے خود بشارت بلکہ ضمانت دی کہ اُن کی ذرّیت بھی اُن کے ساتھ جنّت میں لا ملائی جائے گی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ [الطور:۲۱]

اس کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو ابوداؤد طیالسی، طبرانی اور بزّار نے حضرت انس اور حضرت سمرہ رضی اللہ عنہما سے نقل کا ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین کے بچّے (جو نابالغ ہونے کی حالت میں انتقال کر چکے ہوں وہ) اہل جنّت کے خدّام ہوں گے۔ (اس کے متعلق مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتح الباری اور عمدۃ القاری / کتاب الجنائز / باب ما قیل فی اولاد المشرکین)

حق تعالیٰ ہمیں بھی دارین میں اپنی دائمی رضا سے محروم نہ فرمائیں۔ آمین۔

۲۵ / رجب المرجب / ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۱۷ / فروری / ۲۰۲۳ء
قبل الجمعہ / دار الارشاد، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البدیع : ۲۱۰)

(۳۸)

اللہ کے راستے کی حقیقت وفضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَغَدْوَةٌ فِي سَبِيْلِ اللهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ص۳۲۹/ كتاب الجهاد)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک صبح یا ایک شام (جہاد وقتال مع الکفار) کے لیے نکلنا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔''

اللہ کے راستے کے فضائل:

اللہ ربّ العزت نے قرآنِ کریم میں تقویٰ کی طرح ''سبیل اللہ'' کی بھی جا بجا ترغیب دی ہے، اسی طرح جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے فرامین میں اللہ کے راستے میں نکلنے اور خرچ کرنے کی عظیم الشان فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، منجملہ ان کے مذکورہ حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے راستے میں ایک صبح یا شام کے لیے نکلنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ اس قسم کی متعدد روایتیں ذخیرۂ احادیث میں ملتی ہیں۔

مسند احمد میں اس کی تفصیل ہے جس سے اس روایت کا شانِ ورود معلوم ہوتا

ہے کہ حضرت ابوأمامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے کسی سریہ (اسلامی لشکر) میں نکلے تو سفر کے دوران ہمارا گذر ایک ایسی وادی سے ہوا جس میں شیریں پانی اور ہریالی تھی، رفقائے سفر میں سے ایک ساتھی کا ارادہ ہوا کہ اسلامی لشکر سے الگ تھلگ ہو کر اسی وادی میں قیام کر لے، لیکن حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنی مرضی سے جس چیز کو اچھا سمجھتے اس پر عمل نہ کرتے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تحقیق کرتے، پھر اجازت ملنے پر عمل کرتے، انھوں نے بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو آپ نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: یہ ایک طرح کی رہبانیت ہے، جس کی ہماری شریعت میں اجازت نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستے کی فضیلت قسم کھا کر اس طرح بیان فرمائی کہ

"لَغَدْوَةٌ فِي سَبِيْلِ اللهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا، وَلَمَقَامُ أَحَدِكُمْ فِي الصَّفِّ خَيْرٌ مِنْ صَلَاتِهِ سِتِّيْنَ سَنَةً". (مسند أحمد، مشكوٰة : ٣٣٤، كتاب الجهاد)

''اللہ کے راستے میں صبح یا شام کا تھوڑا وقت بھی گزارنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اور تم میں سے کسی کا میدانِ جہاد کی صف میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی تنہا پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔''

یعنی نماز کی صف میں کھڑا ہونا بھی مبارک عمل ہے، لیکن میدانِ جنگ کی صف میں کھڑا ہونا اس سے بھی زیادہ مبارک عمل ہے۔

(۱) اور قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عالم اور غیر عالم درجے میں برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح مجاہدین اور قاعدین (بلا عذرِ شرعی جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت نہ کرنے والے) بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [النساء : ۹۵]

''مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو (جہاد سے جی چرا کر) بغیر کسی (عذر) تکلیف کے (گھروں میں) بیٹھے رہنے والے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرنے والے ہیں (یہ دونوں درجے وثواب میں) برابر نہیں ہوسکتے۔''

(۲) ایک حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ أَرْسَلَ نَفَقَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَأَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ دِرْهَمٍ".

''جس نے اللہ کے راستے میں مال واسباب خرچ کیا، لیکن خود (کسی وجہ سے گھر میں رہا، اللہ کے راستے میں نہ نکل سکا) تو اُسے ایک درہم خرچ کرنے پر سات سو درہم خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔''

"وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَأَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ أَلْفِ دِرْهَمٍ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَآءُ﴾ (رواه ابن ماجه، مشكوٰة المصابيح : ۳۳۵)

''اور جو شخص خود بھی اللہ کے راستے میں نکلا اور اپنا مال واسباب بھی اللہ کے راستے میں لگایا تو اسے ایک درہم کے عوض سات لاکھ خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔''

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۶۱) تلاوت فرمائی، جس میں فرمایا کہ ''اللہ پاک جس کے لیے چاہتا ہے ثواب میں اضافہ کرتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مطلقاً خرچ کرنے کا ثواب تو سات سو گُنا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکل کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا

ثواب سات لاکھ گنا ہے۔

(۳)ایک موقع پر کسی نے حضور پاک ﷺ سے سوال کیا کہ "أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ؟" سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ فرمایا: "إِيْمَانٌ بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ" اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، دریافت کیا: "ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: الجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ" ایمان کے بعد سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۲۲۱، کتاب المناسک)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ایمان کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کو سب سے افضل عمل قرار دیا، جب کہ بعض روایتوں میں ایمان کے بعد نماز کو سب سے افضل عمل قرار دیا گیا۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی بہترین تطبیق یہ ہے کہ جن دِنوں اور علاقوں میں جہاد فرضِ عین ہو اس وقت وہاں ایمان کے بعد سب سے افضل عمل جہاد ہے، جب کہ جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی حالت میں ایمان کے بعد نماز سب سے افضل عمل ہے۔ واللہ اعلم۔

اصلاً ''اللہ کے راستے'' سے مُراد جہاد ہے:

ان نصوص کے علاوہ بھی کتاب وسنّت میں اللہ کے راستے میں نکلنے اور خرچ کرنے کے بہ کثرت فضائل بیان ہوئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ''اللہ کے راستے'' سے کیا مُراد ہے؟ جواب یہ ہے کہ ''سبیل اللہ'' یعنی اللہ کے راستے سے مُراد اصلاً تو جہاد و قتال مع الکفار ہی ہے، جیسا کہ علّامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ''سبیل اللہ'' کے تحت فرمایا ہے۔ (مستفاد از توضیحات:۶/۴۷۱)

قرآنِ کریم میں بھی تقریباً چھتیس مقامات ایسے ہیں جہاں ﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ [المائدۃ:۵۴] اور ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ [التوبۃ:۱۱۱] کے الفاظ

آئے ہیں، جن سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ''فی سبیل اللہ'' سے مُراد جہاد و قتال مع الکفار ہی ہے۔ نیز کتب احادیث میں سے صرف مشکوٰۃ کے کتاب الجہاد میں تقریباً نوے (۹۰) مرتبہ ''سبیل اللہ'' کا اطلاق واستعمال جہاد وقتال مع الکفار کے لیے ہوا ہے۔ (توضیحات: ۶/ ۴۷)

اس اعتبار سے کتاب وسنّت میں جہاں کہیں بھی مطلقاً ''فی سبیل اللہ'' کے فضائل منقول ہیں وہاں ان کے حقیقی ویقینی مصداق ومستحق حضرات مجاہدین ہی ہیں، جو میدانِ جہاد میں نکل کر اپنی پوری توانائی وطاقت کے ساتھ دین حق کی سربلندی کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دُشمنوں سے جنگ کرتے ہیں، محض جہاد کے لغوی اور لفظی معنیٰ پر اکتفا نہیں کر لیتے، لہٰذا جہاد فی سبیل اللہ کے مطلق فضائل کو تبلیغی جماعت کے ساتھ خاص کر لینا غلط ہے۔

ضمناً اللہ کے راستے میں دین کے تمام احکام داخل ہیں:

البتہ چوں کہ ''سبیل اللہ'' ایک وسیع المعنیٰ لفظ بھی ہے، اس کے مفہوم میں کافی وسعت بھی ہے، اس لیے ضمناً اس کے عموم میں دین اسلام کے وہ تمام شعبے اور احکام بھی داخل ہیں جن کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کر لیتا ہے، کتاب و سنّت کی عمومی اصطلاح میں انھیں بھی ''سبیل اللہ'' یعنی اللہ کا راستہ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں تقریباً پچیس (۲۵) مقامات ایسے ہیں جہاں ﴿تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران:۹۹] اور ﴿لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال:۳۶] جیسے الفاظ آئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان جگہوں میں ''سبیل اللہ'' کا اطلاق واستعمال دین اسلام اور اس کے تمام ارکان واحکام کے لیے ہوا ہے۔ (توضیحات: ۶/ ۴۷)

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ﴾ [النحل : ۸۸]

''جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کو بڑھاتے جائیں گے، کیوں کہ وہ فساد برپا کرتے تھے۔''

صاحب جلالین رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ''سبیل اللہ'' کی تفسیر دین سے کی ہے، آپ نے "بِصَدِّهِمِ النَّاسَ عَنِ الإِيمَانِ" فرما کر واضح فرمادیا کہ (ضمناً) سارا دین و ایمان ''سبیل اللہ'' کا مصداق ہے۔ علاوہ ازیں احادیث طیبہ میں بھی مختلف اعمال و احکام پر ''سبیل اللہ'' کا اطلاق ہوا ہے۔

علم ومعرفت کی طلب بھی اللہ کا راستہ ہے:

مثلاً (۱) علم شرعی اور معرفت الٰہی کی طلب میں نکلنے کو بھی اللہ کا راستہ قرار دیا گیا ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ العِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ، حَتَّىٰ يَرْجِعَ". (رواه الترمذي، مشكوة المصابيح : ۳٤، كتاب العلم)

علم شرعی اور معرفت الٰہی کی طلب میں نکلنے والا اللہ کے راستے میں ہوتا ہے گھر واپسی تک، قرآن کریم نے بھی طالبین علوم نبوت ومعرفت حضرات علماء وطلبہ کو ''سبیل اللہ'' کا مصداق قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ [البقرة : ۲۷۳]

اس میں فرمایا کہ اصل انفاق وامداد کے مستحق وہ لوگ ہیں جو دینی علوم وامور

کی مشغولیت کے سبب معاشی سرگرمی کے لیے کہیں جانہیں سکتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی، جنھوں نے اپنی زندگیاں دینی علوم وامور کے لیے وقف کردی تھیں، یہ لوگ حالت امن میں ہمہ وقت حصولِ علم میں مشغول رہتے تو حالت جنگ میں بھی صف اوّل میں ہوتے، جس کی وجہ سے ان کے لیے معاشی مشاغل کے مواقع تقریباً نہیں تھے، مگر اس کے باوجود کسی کے سامنے کبھی دست سوال دراز نہ کرتے، قرآنِ کریم نے اغنیاء کو ان کی طرف متوجّہ فرمایا، گویا قرآنِ کریم نے اس آیت کریمہ میں باایمان فقراء کا نمونہ پیش فرما دیا، اسی کے ساتھ باایمان اغنیاء کو فقراء کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس کی طرف بھی رہنمائی فرمائی۔ علاوہ ازیں نزولِ قرآن کے زمانے میں آیت کریمہ کے اوّلین اور بہترین مصداق اصحابِ صفہ تھے، لیکن یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے، اس لیے آج بھی جو حضرات دینی علوم وامور میں مشغولی کے سبب معاشی مشاغل اختیار نہیں کر سکتے وہ بھی اس میں داخل ہیں، کیوں کہ وہ بھی لوگ اللہ کے راستے میں ہیں۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی اللہ کا راستہ ہے:

(۲) اسی طرح اسلام کے ارکانِ اربعہ پر بھی ''سبیل اللہ'' کا اطلاق واستعمال ہوا ہے، چنانچہ حدیث پاک کے راوی ابوعبس عبدالرحمٰن الانصاری البدری رضی اللہ عنہ نے حضرت عبایہ بن رافع رضی اللہ عنہ کو نمازِ جمعہ میں جاتے وقت ایک حدیث شریف سنائی کہ

"مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، فَتَمَسَّهُ النَّارُ". (رواه البخاري، مشكوٰة المصابيح : ۳۲۹، كتاب الجهاد)

''اللہ کے راستے میں جس بندے کے پاؤں گرد آلود ہو جاتے ہیں تو اس کو دوزخ کی آگ نہیں چھوتی۔''

اس حدیث سے بتایا کہ تمھارا نمازِ جمعہ میں جانا بھی ''سبیل اللہ'' کا مصداق ہے، اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب "بَابُ المَشْيِ إِلَى الجُمُعَةِ" (بخاری:۱/ ۱۲۴) قائم فرما کر اس روایت سے ثابت فرمایا کہ نمازِ جمعہ کے لیے نکلنا بھی اللہ کے راستے میں نکلنا ہے۔ علّامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مُطَابَقَتُهُ لِلتَّرْجَمَةِ مِنْ حَيْثُ إِنَّ الْجُمُعَةَ تَدْخُلُ فِي قَوْلِهِ: "فِي سَبِيلِ اللهِ"؛ لِأَنَّ السَّبِيلَ اسْمُ جِنْسٍ مُضَافٌ، فَيُفِيدُ الْعُمُومَ".

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري: ٦ / ٢٠٥ / بابُ المَشْيِ إِلَى الجُمُعَةِ وقَوْلِ اللهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿فاسْعَوْا إِلىٰ ذِكْرِ اللهِ﴾ ومَنْ قَالَ: السَّعْيُ: العَمَلُ والذَّهَابُ لِقَوْلِهِ تَعَالىٰ: ﴿وسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا﴾ (الإِسْرَاء: ١٩) ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان)

اسی کے ساتھ نفل روزے سے متعلّق حضرات محدثین نے ایک روایت نقل فرمائی ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيْدِنِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ صَامَ يَوْمًا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بَعَّدَ اللهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۷۹، باب صيام التطوع)

''جس نے بھی اللہ کے راستے میں (جہاد مع الکفار کے وقت، یا خالصۃً لوجہ اللہ) ایک دِن بھی روزہ رکھا تو اللہ پاک اس کے چہرے (ذات) کو (دوزخ کی) آگ سے ستّر برس کی مسافت کے بقدر (یعنی بہت) دور کردیں گے۔''

اس حدیث میں حضرات محدثین نے فرمایا کہ اس فضیلت کا اصل مصداق تو مجاہد فی سبیل اللہ ہی ہے، کیوں کہ اسے جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ اہتمام روزہ یعنی دو عبادتوں کا موقع ملا، اس لیے اس عظیم بشارت کا وہ حقدار ہے۔ لیکن دوسرا احتمال یہ بھی

ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ کے علاوہ بھی اگر کوئی مخلص اپنے مقام پر خلوصِ نیت کے ساتھ روزہ رکھے تو وہ بھی اس فضیلت و بشارت کا حقدار بن سکتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآنِ کریم نے مصارفِ زکوٰۃ میں خرچ کرنے کو ''سبیل اللہ'' فرمایا، اور جو لوگ اس کا اہتمام نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی وعید سنائی، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ [التوبة : ٣٤]

یعنی جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں عذابِ الیم کی خوش خبری سنادو۔ ظاہر ہے کہ یہاں ''اللہ کے راستے'' سے مُراد زکوٰۃ وخیرات کے مصارف ہیں کہ ان میں خرچ کرنا بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے حج (وعمرہ) کا تو حدیث پاک میں اسے بھی اللہ کا راستہ قرار دیا گیا ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنا اونٹ اللہ کے راستے میں وقف کیا تھا، تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اونٹ اپنی بیوی کو دے دو، تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر حج (عمرہ) کرے۔ "فَإِنَّهُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ" اس لیے کہ یہ بھی اللہ کا راستہ ہی ہے۔ (ابوداؤد: ۲۷۲/ کتاب المناسک/ باب العمرہ)

ایک اور حدیث شریف میں فرمایا:

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "النَّفَقَةُ فِيْ الحَجِّ كَالنَّفَقَةِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ". (مسند أحمد : ٥ / ٣٥٥، الرقم : ٢٣٣٨٨، مجمع الزوائد : ٣ / ٢٠٨)

''حج میں خرچ کرنا اللہ کے راستے میں خرچ کرنے ہی کے مترادف ہے، جس کا ثواب سات سو گنا تک ملتا ہے۔''

مالِ حلال حاصل کرنا بھی اللہ کا راستہ ہے:

حتیٰ کہ حضرت امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "بَابٌ فِي حُقُوقِ الأَوْلَادِ" میں ایک روایت نقل فرمائی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالِ حلال کو حاصل کرنا بھی اللہ کا راستہ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"مَرَّ بِهِمْ رَجُلٌ، فَعَجِبُوْا مِنْ خَلْقِهِ، فَقَالُوْا: "لَوْ كَانَ هٰذَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ".

فرماتے ہیں کہ ایک شخص کا حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس سے گذر ہوا جس کا حلیہ بہت اچھا تھا، تو بعض لوگوں نے کہا: کاش! کہ یہ اللہ کے راستے میں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا (جیسا کہ آج کل غالی تبلیغی جماعت والے کہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت میں وقت لگتا تو کتنا اچھا ہوتا! کیوں کہ عموماً ایسے لوگ دعوت وتبلیغ کا مطلب صرف تبلیغی جماعت سمجھتے ہیں، جو سراسر غلط اور غلو ہے) بہر حال حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو فرمایا:

"إِنْ كَانَ يَسْعَىٰ عَلَىٰ أَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيْرَيْنِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، وَإِنْ كَانَ يَسْعَىٰ عَلَىٰ وُلْدِهٖ صِبْيَةً فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، وَإِنْ كَانَ يَسْعَىٰ عَلَىٰ نَفْسِهٖ، لِيُعِفَّهَا، فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ". (شعب الإيمان للبيهقي : ٦ / ٤١٣، مجمع الزوائد : ٨ / ١٤٤)

''اگر یہ بندہ مالِ حلال کے حصول کی جدّ وجُہد اور کوشش کرتا ہے، تاکہ اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کرے تو یہ اللہ کے راستے کی کوشش ہے، اور اگر یہ بندہ اپنے

چھوٹے بچّوں کی کفالت کی غرض سے یہ محنت اور کوشش کرتا ہے تب بھی اس کی یہ محنت و کوشش اللہ کے راستے ہی میں شمار ہوگی، اور اگر یہ بندہ عفت کی نیت سے (سوال کی ذلّت سے حفاظت کے لیے) مالِ حلال حاصل کرنے کی فکر میں ہے تب بھی یہ اللہ ہی کے راستے میں ہے۔''

مطلب صاف ہے کہ اخلاصِ نیت کے ساتھ حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے بندۂ مؤمن کا تجارت، ملازمت اور زراعت وغیرہ میں مشغول ہونا بھی فی سبیل اللہ ہے۔

اللہ کے راستے میں تنگی نہیں:

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ اللہ کے راستے میں تنگی نہیں بلکہ بڑی وسعت ہے، لہٰذا اگر کوئی صاحب ایمان بندہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہے، اس کی رضا وخوشنودی حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے کوئی ایک ہی راستہ نہیں ہے، آج بھی کئی راستے کھلے ہیں، بلکہ حدیث پاک میں فرمایا:

"الإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ شُعْبَةً". (متفق علیه، مشکوٰة: ۱۲، کتاب الإیمان)

''ایمان کی ستّر سے زائد شاخیں ہیں۔'' تو یہ تمام شاخیں اور شعبے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے ہی ہیں، اب جس کے لیے جو راستہ آسان ہو اخلاص واعتدال کے ساتھ اس پر چل کر وہ اللہ تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔

اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی، آثار ونشاں سب باقی ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

اللہ پاک ہم سب کو اپنا بنالیں اور ہماری زندگی کو مقصدِ رمضان کی طرح سراپا بندگی بنا کر موت کو ہمارے لیے عید اور اپنی رضا ودید کا ذریعہ بنادیں۔ آمین۔

مؤرخہ: ۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ
مطابق: ۵؍اپریل ۲۰۲۳ء، بروز بدھ
دارالارشاد، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۳۹)

اِصلاحِ معاشرہ کا شرعی طریقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِي قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي، يَقْدِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُغَيِّرُوا عَلَيْهِ، فَلَا يُغَيِّرُوا، إِلَّا أَصَابَهُمُ اللهُ بِعَذَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَمُوتُوا." (رواه أبو داود وابن ماجه، مشكوٰة: ۴۳۷، باب الأمر بالمعروف)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس قوم کا کوئی فرد گناہ کا ارتکاب کرتا ہو اور اس قوم کے لوگ (ہاتھ یا زبان سے) اسے گناہ سے روکنے کی طاقت کے باوجود نہ روکیں (اصلاح کی فکر و کوشش بھی نہ کریں) تو (دُنیا ہی میں) موت سے پہلے اُن پر عذابِ الٰہی نازل ہوجاتا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی حقیقت:

اللہ ربّ العزت والجلال نے ہمیں بالکل اکیلا اور تن تنہا کسی صحرا اور سمندر میں نہیں بلکہ انسانی معاشرے اور سماج میں پیدا فرمایا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے اردگرد

تقریباً انسانوں کا ہجوم موجود رہتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم اور آپ کسی اور مخلوق کے ساتھ نہیں بلکہ انسانوں ہی کے ساتھ دِن رات، خوشی وغمی، خوش حالی و بدحالی اور سفر و حضر میں مل جل کر رہتے ہیں اور زندگی بسر کرتے ہیں، درحقیقت معاشرہ اسی کو کہتے ہیں، اس لیے کہ لفظ ''معاشرہ'' عَاشَرَ یُعَاشِرُ کا مصدر ہے، جس کا مفہوم ہے انسانوں کے مختلف افراد وطبقات کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ یا پھر معاشرے سے مُراد افراد کا وہ مجموعہ ہے جو کسی زمانے وعلاقے میں اپنی قوم و قبیلے یا ہم زبان وہم وطن لوگوں کے ساتھ مل جل کر اپنے اپنے مکانات، محلوں، سوسائٹیوں، بستیوں، شہروں، صوبوں اور ملکوں میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر انسان معاشرے کا ایک فرد ہی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے انسانی فطرت وطبیعت میں نیکی کے علاوہ بدی کا میلان ورجحان بھی رکھا ہے، جس کی وجہ سے معاشرے کا اچھے سے اچھا فرد بھی بعض اوقات گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، اب اگر معاشرے کا کوئی فرد بدی و بُرائی میں مبتلا ہوجائے تو اسلامی شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ اس کو بلیک میل کرنے یا اس کی بُرائی کا چرچا کرنے کے بجائے اس کی اصلاح کی مخلصانہ کوشش کی جائے، عرف میں اس کو ''اصلاحِ معاشرہ'' کہتے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت وضرورت:

اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت وضرورت اس لیے بھی ہے کہ گناہ وہ گندگی ہے جسے صاف نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ پورا معاشرہ اس گندگی کی لپیٹ میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوسکتا ہے، کیوں کہ نیکی نیکی کو کھینچتی ہے تو گناہ گناہ کو۔ جب بندہ گناہ کے بعد سچّی توبہ اور اپنی اصلاح نہیں کرتا تو ایک گناہ کی نحوست سے دوسرے گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، اسی طرح گناہ میں مبتلا فرد کی اصلاح میں غفلت برتی جائے تو ایک فرد کے بعد دیگر افراد بھی بعض

اوقات گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، نتیجۃً آہستہ آہستہ سارا گھرانہ اور پورا معاشرہ گناہوں کی دَلدل میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی مثال کشتی کے مانند ہے، تو معاشرے کے مختلف افراد و طبقات کی مثال اس کشتی کے مسافر اور سواروں کے مانند ہے، جب کہ گناہ کی مثال کشتی کے سوراخ کی سی ہے، پانی کے جہاز یا کشتی میں خدانہ خواستہ سوراخ ہو جائے تو دانائی یہی ہے کہ پہلی فرصت میں اسے بند کیا جائے، ورنہ سب کا بیڑا غرق ہو جائے گا، بالکل اسی طرح انسانی معاشرے میں معاصی اور بالخصوص اجتماعی معاصی کے سوراخ ہو جائیں تو پہلی فرصت میں معاشرے کے مصلحین اصلاح کی فکر کریں، ورنہ پورا معاشرہ عذابِ الٰہی سے ہلاک ہو سکتا ہے، قرآنِ کریم نے اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ [الأنفال:۲۵]

''اور اس فتنے سے ڈرو جو خاص طور پر صرف ان لوگوں ہی کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں۔'' (بلکہ اس ظلم کا ساتھ دینے والے اور اس پر خاموش رہنے والے بھی ان ہی میں شریک کر لیے جائیں گے۔)

اسی کے ساتھ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بھی بیان فرمایا کہ انسانی معاشرہ اسی وقت عذابِ الٰہی سے ہلاک ہوا جب لوگ انفرادی و اجتماعی طور پر گناہوں میں مبتلا ہو گئے، بلکہ عادی ہو گئے اور کسی نے بھی اصلاح کی فکر نہیں کی، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ﴾ [هود : ۱۱۷]

''اور آپ کے رب کا یہ (ضابطہ ہی) نہیں کہ بستیوں کو کسی ظلم کی وجہ سے ہلاک کر دے، جب کہ اس کے باشندے اصلاح (معاشرہ کی فکر) کرنے والے ہوں۔''

قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بھی بیان ہوا کہ حق تعالیٰ

نے کسی بھی قوم کی خوش حالی کو بدحالی سے اسی وقت بدلا جب وہ مجموعی طور پر بدکاری میں مبتلا ہوگئی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ [الرعد : ۱۱]

''بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔''

واقعہ یہ ہے کہ معاشرے میں اکثریت مصلحین (جن کے اخلاق و معاملات اچھے ہوں، کسی کو دھوکہ اور ایذا نہیں پہنچاتے۔ معارف القرآن) کی ہوگی تو وہ عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے گا۔ اور جس معاشرے میں اکثریت مفسدین کی ہوگی وہ ہلاک ہو جائے گا، بلکہ حدیث مذکور میں تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ معاشرے کی اکثریت ہی نہیں، فردِ واحد بھی گناہوں میں مبتلا ہو اور معاشرے کے دیگر افراد قدرت کے باوجود اس کی اصلاح کی فکر نہیں کریں گے تو وہ دنیا ہی میں مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

آج صرف ایک فرد نہیں، گھر کے تمام افراد اور شادیوں وغیرہ میں خاندان کے تمام افراد علانیہ طور پر اجتماعی گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور کسی کو اصلاح کی فکر نہیں ہوتی۔ (الا ماشاء اللہ)۔ ایسی صورت میں معاشرہ عذابِ الٰہی سے کیوں کر محفوظ رہ سکتا ہے؟ آج جب کہ انسانی معاشرہ گناہ کے بڑھتے سیلاب میں مبتلا ہے تو ضرورت ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی فکر اور مصلحین کی قدر کی جائے۔

اصلاحِ معاشرہ کا پہلا قدم خود کی اصلاح ہے:

اب اگر واقعی ہم اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں سنجیدہ اور فکر مند ہیں تو اس کا پہلا قدم خود کی اصلاح ہے، کیوں کہ معاشرہ افراد کے مجموعے سے بنتا ہے، اور ہم خود بھی معاشرے کے ایک فرد ہیں، لہٰذا سب سے پہلا اہم اور آسان کام یہ ہے کہ ہم اپنی

اصلاح کی فکر کریں، دوسروں کی اصلاح آسان نہیں، ہم دوسروں کو بآسانی نہیں بدل سکتے؛ مگر اپنے آپ کو تو بدل ہی سکتے ہیں، معاشرے کا ہر فرد اور گھر اصلاح کی فکر کر لے گا تو بڑی حد تک معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی، جیسے ہر گھر کا کوئی فرد یا خادم اپنے گھر کے آنگن کو صاف کر لے گا تو سیدھی بات ہے کہ سارا محلّہ، علاقہ اور سوسائٹی کا راستہ صاف ہو جائے گا، ایسے ہی اپنی اصلاح کا معاملہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے دوسروں سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجّہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ﴾ [المائدة: ١٠٥]

''اے ایمان والو! اپنی اصلاح کی فکر (پہلے) کرو۔ تمھیں کوئی گمراہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت یافتہ ہو چکے ہو۔''

جیسے اگر سارا گھرانہ اور معاشرہ بیمار ہے، آپ خود بھی تو پہلے اپنے علاج کی فکر کریں۔ نیز جس طرح ادائے حقوق کے سلسلے میں ہمارا نفس مقدم ہے:

"وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ." (رواه البخاري / كتاب الصوم / باب من أقسم علىٰ أخيه ليفطر في التطوع، رقم الحديث: ١٩٦٨)

تو اصلاح کے سلسلے میں بھی ہمارا نفس اور اپنی ذات مقدم ہے۔ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ معاشرے کا تقریباً ہر ایرا غیرا نتھو خیرا مصلح تو بننا چاہتا ہے مگر صالح بننا پسند نہیں کرتا، یعنی تقریباً ہر ایک شخص دوسروں کو تو بُرا سمجھتا ہے، خود کو نہیں، دوسروں کی اصلاح تو چاہتا ہے، اپنی نہیں، سارے جہاں کی فکر ہے مگر اپنی اصلاح سے بے خبر ہے، اس طرح معاشرے کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی، اسی کو کہا گیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص اپنی اصلاحی کوششوں، فکروں، تقریروں اور تحریروں میں کما حقہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا جو خود اپنی اصلاح سے غافل ہو، جس کے قول و فعل میں تضاد ہو، جو باتیں تو خیر البریہ کی کرتا ہو مگر خود شرّ البریہ میں شامل ہو۔ (العیاذ باللہ العظیم) یہ طریقہ نبیوں اور نیک لوگوں کا نہیں، بلکہ یہودیوں کا ہے، ایسے ہی لوگوں کو قرآنِ کریم نے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ٤٤]

''یہ کیا تماشا ہے کہ دوسروں کو تو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو مگر خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

لیکن یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر صالح شخص مصلح نہیں بن سکتا، بے عمل اور بدعمل وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا، مقصد یہ ہے کہ مصلح کو چاہیے کہ خود بھی صالح بن جائے، کیوں کہ اس آیت کریمہ میں نیکی کی ترغیب پر مذمّت بیان نہیں کی گئی؛ بلکہ خود نیکی پر عمل نہ کرنے کی مذمّت بیان کی گئی ہے۔ (فافہم)۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صلحائے اُمّت اپنی اصلاحی کوششوں اور فکروں میں اس لیے بھی کامیاب ہوئے کہ انھوں نے محض قولی دعوت پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ جو کچھ کہا اس پر خود عمل کر کے بھی دکھایا، وہ اگر تقویٰ کی تاکید فرماتے تو خود بھی متقی ہوتے، وہ اگر لوگوں کو ادائے حقوق اور حسن سلوک کی ترغیب دیتے تو خود بھی اس کا اہتمام ضرور کرتے، آج اچھے اچھے لوگوں میں بھی اس کی کمی ہے، اس لیے بھی

اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں کما حقہ کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ اگر ہم واقعی معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں تو اس کا شرعی طریقہ، پہلا قدم اور بنیادی کام خود کی اصلاح ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کا دوسرا قدم اہل خانہ کی اصلاح ہے:

اپنی ذات سے اصلاحِ معاشرہ کی ابتدا کرنے کے بعد اپنے گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد کی اصلاح کی فکر کریں، اس لیے کہ جس طرح کسب معاش میں اہل خانہ کی فکر معاشرے کے دیگر افراد سے مقدّم ہے، یعنی جس طرح دنیوی اعتبار سے ہر بندہ دوسروں کے بالمقابل پہلے اپنے گھر والوں کے لیے روزی روٹی، کپڑا، مکان اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی فکر کرتا ہے بالکل اسی طرح فکر معاد اور فکر اصلاح میں بھی اہل خانہ دوسروں پر مقدّم ہیں، یہی اصل شرعی ترتیب ہے۔ حق تعالیٰ نے ہر ایمان والے کو اپنی اور اہل خانہ کی اصلاح کا مکلّف بنایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [التحریم : ٦]

''اے ایمان والو! خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو نارِ دوزخ سے بچاؤ۔''

اس کا طریقہ یہی ہے کہ خود بھی فرائض اسلام اور حلال وحرام کے احکام سیکھ کر ان پر عمل کرو، اپنے اہل خانہ کو بھی عمل کراؤ، خود بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے گناہوں سے بچو اور اپنے اہل خانہ کو بھی اس کی تلقین کرو، خود بھی اعمالِ جنّت کا اہتمام اور اعمالِ جہنّم سے اجتناب کرو اور اپنے اہل خانہ کو بھی اس کی تاکید کرو۔

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ حکم الٰہی صرف اہل ایمان ہی کے لیے نہیں؛ بلکہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم بالکل ابتدائے نبوت ہی میں دیا گیا:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ [الشعراء : ٢١٤]

''پیارے نبی! اپنے قریبی رشتے داروں کو اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی پر آنے

والے) عذاب سے ڈرایئے!''

حدیث پاک میں ہے کہ اس حکم الٰہی کی تعمیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی رشتے داروں اور قبیلے والوں کو جمع فرما کر بڑے اہتمام کے ساتھ نام بنام لوگوں سے فرمایا: ''اے کعب بن لُوَی کے بیٹو! اے مرّہ بن کعب کے بیٹو! اے عبد شمس کے بیٹو! اے عبد مناف کے بیٹو! اے بنی ہاشم اور اے بنی عبد المطلب!

"أَنْقِذُوْا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح : ص٤٦٠ / باب الإنذار والتحذير)

''اپنے آپ کو نارِ دوزخ سے بچاؤ!'' حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی بطورِ خاص یہ فرمایا:

"يَا فَاطِمَةُ! أَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ." (أيضًا)

پھر جیسے اجتناب عن المعصیۃ کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے لیے فکر مند رہتے اسی طرح اہتمامِ طاعت کے سلسلے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل خانہ کی بڑی فکر فرماتے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک موقع کا تذکرہ کرتے ہوئے اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت گھبرا کر یہ کہتے ہوئے بیدار ہوئے کہ

"سُبْحَانَ اللهِ! مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الخَزَائِنِ، وَمَاذَا أُنْزِلَ مِنَ الفِتَنِ، مَن يُوْقِظُ صَوَاحِبَ الحُجُرَاتِ؟ ـ يُرِيْدُ أَزْوَاجَهُ ـ لِكَيْ يُصَلِّيْنَ."
(رواه البخاري، مشكوٰة : ص١٠٩ / باب التحريض على قيام الليل)

''سبحان اللہ! آج کی رات من جانب اللہ کس قدر خزانے اور فتنے اُتارے گئے، کوئی ہے جو اِن حجروں والیوں کو جگا دے، تاکہ وہ بھی نمازِ تہجد پڑھیں۔'' (اور

رحمت الٰہی کی حقدار بن جائیں)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ وطرزِ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ ہم بھی اپنے اہل خانہ کی دینی واصلاحی فکر کریں، اگر ہر گھر کا سربراہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کے حضور سوال کیے جانے کے احساس کے ساتھ فرمانِ نبوی: "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ." (صحيح البخاري / كتاب الجمعة / باب الجمعة في القرىٰ والمدن) کو مدّنظر رکھتے ہوئے فکرمند ہوکر اہل خانہ کی اصلاح کی کوشش کرے، اوامر کی رغبت دے کر نواہی سے روکے تو کم از کم معاشرے کا ایک گھرانہ اور رفتہ رفتہ دوسرا، پھر تیسرا، اس طرح سارا معاشرہ درست ہوسکتا ہے، اصلاحِ معاشرہ کا صحیح اور شرعی طریقہ یہی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کا تیسرا قدم مخلصانہ کوشش ہے:

اپنی اور اہل خانہ کی اصلاح کے علاوہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بُرائیوں پر بہ نیت اصلاح نظر ڈالیں، اُن بُرائیوں کے اسباب پر غور کریں، پھر اپنی بساط و استطاعت کے بقدر انفرادی یا اجتماعی طور پر اصلاح کی مخلصانہ کوشش کریں، اس لیے کہ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس کو بُرائیوں سے بچانا اور خوش گوار بنانا بھی ہماری اہم ذمّے داری ہے، یہ ذمّے داری ہمیں کسی سرکار نے نہیں؛ بلکہ پروردگار نے دی ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان پر معاشرے کے دیگر افراد کا بھی حق بنتا ہے کہ وہ ان کی اصلاح وفلاح کی فکر کرے۔

حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی مختصر مگر جامع و پُراثر سورت العصر میں کامیابی کو جن چار کاموں میں منحصر قرار دیا: (۱) ایمان (۲) اعمالِ صالحہ (۳) حق کی وصیت (کسی کو تاکید کے ساتھ مؤثّر انداز میں نصیحت کرنا، یا نیک کام کی ہدایت کرنے کو بھی وصیت کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مرنے والا اپنے بعد والوں کو جو ہدایات دیتا ہے اسے

بھی وصیت کہتے ہیں) (۴) اور صبر کی وصیت کرنا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾ [العصر]

ان میں سے پہلی دو باتوں اور صفتوں کا تعلق تو ہر بندے کی انفرادی اور پرسنل لائف سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور تمام عقائد حقہ پر ایمان رکھنا اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنا، ایمانی زندگی گزارنا ہر ایک پر لازم ہے، ایمان تو بیج ہے اور اعمالِ صالحہ درخت ہیں، جب تک زمین میں بیج نہ ہو کوئی درخت پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح جب تک ایمان کا بیج نہ ہو کوئی عمل صالح قبول نہیں ہوتا، اس لیے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی صفات تو معاشرے کے ہر فرد میں ہونی چاہیے؛ لیکن معاشرے کو بُرائیوں سے بچانے کے لیے صرف ذاتی طور پر ایمان و اعمالِ صالحہ کا اہتمام کافی نہیں ہے؛ بلکہ معاشرے کے دیگر افراد کی فکر کرنا بھی اپنی بساط کی حد تک ضروری ہے۔

چنانچہ دوسری دو باتوں اور صفتوں کا تعلق اجتماعی و معاشرتی زندگی سے ہے کہ لوگوں کو بھی حق و سچ کی تلقین و تاکید کرو اور اس راہ میں آنے والی مصیبتوں پر صبر و ضبط سے کام لو، اس کے لیے خرافات و رسومات سے پاک معتبر علماء کی وعظ و نصیحت کی مجالس بھی مفید ثابت ہوں گی، اس لیے کہ خود قرآن نے اس کی اِفادیت کو بیان فرمایا ہے:

﴿وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝٥٥﴾ [الذٰریٰت: ۵۵]

وعظ و نصیحت سے اہل ایمان کو نفع ہوگا، اب جس کا ایمان جس قدر قوی ہوگا اس کو اتنا ہی نفع ہوگا، لیکن نفع ضرور ہوگا، البتہ اگر وعظ و نصیحت میں ریا و رسم ہو، یا جو کچھ کہا جائے وہ حق و سچ نہ ہو، یا کہنے والے کی نیت خالص نہ ہو، یا پھر کہنے کا طریقہ صحیح نہ ہو تو نفع نہیں ہوتا، ورنہ خرافات و رسومات سے پاک علمائے حقانی و ربانی کی مخلصانہ وعظ و

نصیحت سے بھی اگر کسی کو نفع نہیں ہوتا تو اسے اپنے ایمان کے بارے میں غور کرنا چاہیے، کیوں کہ وعظ و نصیحت سے فائدہ اسی کو نہیں ہوگا جس میں ایمان نہیں۔

معاشرہ کیسے خوش گوار بنتا ہے؟

پھر اسی پر اکتفا نہ کیا جائے کہ معاشرے کو بُرائیوں سے بچانے کی خود انفرادی یا اجتماعی طور پر فکر و کوشش کی جائے؛ بلکہ معاشرے کو خوش گوار بنانے کی فکر کرنا بھی انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی بساط کی حد تک ضروری ہے، یوں تو اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر مختلف ہدایات دی ہیں؛ لیکن سورۂ حجرات میں اس سلسلے کی چند مفید و مؤثر ہدایات دی گئی ہیں، جن کا اہتمام کرنے سے انسانی سماج و معاشرہ بڑی حد تک خوش گوار بن جاتا ہے۔

(۱) منجملہ ان کے پہلی ہدایت ہے: "فَتَبَيَّنُوْا". مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں پھیلنے والی کسی بھی خبر پر تحقیق کے بغیر عملی کاروائی مت کرو۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک معاشرتی بُرائی ہے جو آج کل موبائل اور سوشل میڈیا کے دور میں پہلے سے زیادہ عام ہوگئی ہے، ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی خبر کسی حوالے سے چلتی اور پھیلتی ہے تو تحقیق کی زحمت کے بغیر عموماً اسے مان کر عملی کاروائی شروع کر دی جاتی ہے، جس کا بعض مرتبہ بے حد نقصان ہوتا ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے یہ ہدایت دی کہ کسی بھی خبر پر تحقیق کے بغیر تصدیق و یقین کر کے عملی کاروائی شروع مت کرو، اس سے فتنہ و جھگڑے کا دروازہ بآسانی کھل سکتا ہے، اس لیے حکم ہے کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ [الحجرات: ٦]

''اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق (شخص) کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔''

(۲) دوسری ہدایت یہ دی کہ "فَأَصْلِحُوْا". مطلب یہ ہے کہ جب کبھی کہیں لڑائی جھگڑا ہو جائے تو حتیٰ الامکان لڑائی جھگڑا کرنے والوں میں (مزید آگ مت لگاؤ، بلکہ بجھاؤ) صلح کراؤ۔ معاشرے میں مل جل کر رہنے والے افراد کے درمیان بعض مرتبہ لڑائی جھگڑا ہونا بھی فطری بات ہے، ایسی صورتِ حال میں معاشرے کے دیگر لوگ محض تماشا دیکھنے کے بجائے غیر جانب داری کے ساتھ ان کے درمیان صلح وصفائی کی فکر وکوشش کریں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا﴾ [الحجرات: ۹]

''تم دونوں فریق کے درمیان عدل سے صلح کراؤ اور انصاف قائم کرو۔''

(۳) تیسری ہدایت دی گئی: "وَأَقْسِطُوْا". انصاف سے کام لیا کرو، اس فتنے اور جھگڑے کے درمیان بالفرض کوئی ایک بندہ یا فریق ظلم پر اُتر آئے تو وہ تمھارا اپنا ہو یا غیر، مرد ہو یا عورت، بظاہر قوی ہو یا کمزور، ظلم سے باز نہ آجائے وہاں تک مظلوم کی نصرت وحمایت کرو، ساتھ ہی ظالم کو بھی ظلم سے روکنے اور بچانے کی فکر وکوشش کرو۔ اسی کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

"اُنْصُرْ أَخَاكَ، ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا." (رواه البخاري / كتاب المظالم / باب : أَعِنْ أخاك ظالما أو مظلوما)

مظلوم کی مدد تو یہ ہے کہ اس کی حمایت کی جائے، جب کہ ظالم کو ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد کرنا ہے۔

(۴) چوتھی ہدایت ہے: "لَا يَسْخَرْ". حقارت کے ساتھ کسی کا مذاق نہ اُڑاؤ، معاشرے میں بگاڑ کی ایک وجہ یہ ہے کہ دوسرے کی عزّتِ نفس کا لحاظ نہ کیا جائے، اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے، حقیر سمجھتے ہوئے اس کا مذاق کیا جائے، اس سے

دوسرے کے دِل میں احساسِ کمتری اور منفی خیالات پیدا ہوتے ہیں، پھر یہی چیز کسی بڑے فتنے اور جھگڑے کا سبب بن جاتی ہے، اس لیے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ﴾ [الحجرات : ۱۱]

کوئی مرد کسی مرد کا تو کوئی عورت کسی عورت کا حقارت کے ساتھ مذاق نہ کرے، یہ کسی مؤمن کامل کی شان و پہچان نہیں ہے۔

(۵) پانچویں ہدایت ہے: "وَلَا تَلْمِزُوْٓا". ایک دوسرے کو طعنے مت دو۔ یہ بھی ایک مذموم بُرائی و خرابی ہے، کیوں کہ ہر ایک انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور معاشرے کا ایک فرد ہے، حق تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے لوگوں کے درمیان صورت، خلقت اور خاندان وغیرہ میں کچھ کچھ فرق رکھا ہے، لیکن ہر ایک کی حیثیت دوسرے سے ممتاز ہے، ہر بندہ اپنی جگہ اپنے اہل خانہ وغیرہ کے لیے قیمتی ہے، اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے کو طعنہ دے۔ لہٰذا فرمایا:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [الحجرات : ۱۱]

(۶) چھٹی ہدایت ہے: "وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ". ایک دوسرے کو بُرے (ناموں اور) القاب سے نہ پکارو۔ معاشرے میں رہنے والے مختلف افراد کا ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد کرنا در اصل ایک دوسرے کی عزّتِ نفس کو مجروح کرنا اور ایک دوسرے کی عزّتِ نفس سے کھیلنے کے مترادف ہے، خود انسانیت کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کے پسندیدہ ناموں اور القاب سے یاد کیا جائے، تاکہ معاشرے کا ماحول خوش گوار بنا رہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ [الحجرات : ۱۱]

(۷) ساتویں ہدایت ہے: "اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ" بدگمانیوں سے بچو، انسان جب بدگمانی میں مبتلا ہوتا ہے تو پہلا نقصان خود کا ہوتا ہے کہ بدگمانی کرنے والے کی سوچ آہستہ آہستہ منفی بن جاتی ہے، جس کا بہت غلط اور بُرا اثر اس کی صحت اور ایمان پر بھی پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ بدگمانی مختلف بُرائیوں اور خرابیوں کی پہلی سیڑھی ہے، اس لیے حکم فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ [الحجرات : ۱۲]

''اے ایمان والو! زیادہ تر گمانوں سے بچتے رہو۔''

(۸) آٹھویں ہدایت ہے: "لَا تَجَسَّسُوْا". کسی کی ٹوہ اور جاسوسی میں نہ لگو۔ ظاہر ہے کہ جب معاشرے کے مختلف افراد ایک دوسرے کی کمزوریوں اور بُرائیوں کی جستجو اور تلاش میں لگے رہیں گے تو اس سے آپسی اعتماد و احترام ختم ہو جائے گا، جو معاشرے کے لیے بہت نقصان دہ بات ہے، قرآنِ کریم نے معاشرے کو بُرائیوں اور نقصان سے بچانے اور خوش گوار بنانے کے لیے فرمایا: ﴿لَا تَجَسَّسُوْا﴾ [الحجرات:۱۲]

مطلب یہ ہے کہ کون کس وقت کہاں کیا کر رہا ہے؟ اس تحقیق و جستجو کے چکّر میں مت رہو، اپنے کام سے مطلب رکھو، ورنہ مقاصدِ حسنہ سے غافل ہو جاؤ گے۔

البتہ جو جستجو و تحقیق کسی کے ساتھ بھلائی و نیک نیتی کے تحت ہو تو وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے، مثلاً اپنے قرب و جوار کے محلے، علاقے یا رشتے داروں میں کوئی غریب ہونے کے ساتھ نہایت خوددار ہے، جس کی وجہ سے ضرورت کے باوجود وہ غیرت کے پیشِ نظر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، تو قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کر مدد کرنے کی ترغیب دی ہے:

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ [البقرۃ:۲۱۹]

اسی طرح کسی شخص یا گروہ سے متعلّق یہ شُبہ ہو کہ ان کی پس پردہ سرگرمیاں معاشرے کے دیگر بے گناہ افراد کے لیے پُرخطر ہیں، یا ملک وملّت کے امن وعدل کو ان سے نقصان کا امکان ہے، تو اس صورت میں حاکم وذمّے دار کے لیے تجسس وتحقیق نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے، عام انسان کے لیے حکم یہ ہے کہ اگر وہ اصلاح کر سکے ایسی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کو باخبر کرے جو اصلاح کر سکتے ہوں یا اُن کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں، یہ حقیقت حضور پاک ﷺ نے حدیث پاک میں کشتی کے مسافروں کی مثال دے کر سمجھائی ہے۔

"فَإِنْ أَخَذُوا عَلٰى أَيْدِيهِمْ، فَمَنَعُوهُمْ، نَجَوْا جَمِيعًا، وَإِنْ تَرَكُوهُمْ غَرِقُوا جَمِيعًا." (سنن الترمذي / أبواب الفتن / الرقم : ٢١٧٣)

البتہ اگر کسی کے متعلّق ذاتی طور پر جسمانی یا جانی نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہو تو دفعِ مضرّت کے لیے تحقیق کرنا جائز ہے۔

جہاں تک تعلق ہے کسی کی بُرائی کے علم میں آنے کا، تو اگر وہ بُرائی اس کی ذات تک ہی محدود ہو، نیز ایسے موقع پر تحقیق نہ کرنے سے اپنا اور قوم وملّت کا کوئی نقصان بھی نہ ہو، بلکہ تحقیق کرنے سے اس کی رُسوائی کا امکان ہو تو اس صورت میں تحقیق وجستجو کرنا حرام ہے، حکم یہ ہے کہ اگر آدمی اس کو نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو تو اسے اس بُرائی سے بچنے کی نصیحت کر دے، ورنہ صرفِ نظر کرے، نظر انداز کرے اور اس کی بُرائی پر پردہ ڈالے۔ حدیث پاک میں ایسے ہی موقع پر یہ عمل کرنے والوں کے لیے فضیلت ہے کہ جو لوگ دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالیں گے حق تعالیٰ ان کے عیوب پر پردہ ڈالیں گے۔

لیکن اگر وہ بُرائی متعدی قسم کی ہو، دوسروں کے لیے بھی نقصان کا سبب ہو تو اس صورت میں ''انکارِ منکر'' (کشتی کے مسافروں والی حدیث) پر عمل کرنا چاہیے۔

(۹) نویں ہدایت ہے: "وَلَا يَغْتَبْ". ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ آج بدقسمتی سے معاشرے میں یہ خرابی و بُرائی صرف عوام ہی میں نہیں، بعض خواص تک کی نجی و عمومی مجالس میں اس قدر عام ہے کہ اس کی قباحت اب تقریباً دِلوں سے ختم ہو چکی ہے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خرابی ایک سیاسی انسان میں تو ہو سکتی ہے، سچے مسلمان میں نہیں۔ (العیاذ باللہ العظیم) غیبت سے معاشرہ گندہ ہی ہوگا، پاکیزہ نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ [الحجرات:۱۲]

''اور آپس میں ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔''

(۱۰) دسویں ہدایت یہ ہے کہ نسبی تفاخر سے بچو اور تقویٰ اختیار کرو، کیوں کہ برتری و بہتری کا معیار خاندان و نسب نہیں بلکہ ایمان و تقویٰ ہے، رہی بات نسب کی تو یاد رکھو کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے سبھی کو حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے پیدا فرمایا۔ اور جہاں تک تعلق ہے خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کا تو یہ محض تعارف کے لیے ہے، تفاخر کے لیے نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں فضیلت کا اصل معیار اور مدار ایمان و تقویٰ ہے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات : ۱۳]

لہٰذا اسی کو اختیار کرو اور نسبی و خاندانی تفاخر سے احتیاط کرو۔

قرآنِ کریم کی یہ وہ ہدایات ہیں جن پر اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے، ان

ہدایات پر عمل کیے بغیر اصلاحِ معاشرہ مشکل ہے۔

اللہ ربّ العزت عافیت کے ساتھ ہماری، اہل خانہ اور پوری اُمّت مسلمہ کی اصلاح فرما کر ہمیں نیک اور اپنا پسندیدہ بنادیں، ہمارے اس سفر عمان کے میزبان ندیم اسحاق طالب سنار اصاحب کی محبّت وخدمت کو شرفِ قبول عطا فرمائیں۔

آمین بحرمة سيد الأبرار والمرسلين

صلى الله عليه وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين

۴؍ذوالحجہ؍۱۴۴۴ھ

مطابق: ۲۳؍جون؍۲۰۲۳ء، قبل الجمعہ

واردحال: جامع السلطان، قابوس الاکبر، مسقط، عمان

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلىٰ اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِيْ الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ۲۱۰)

☆.....☆.....☆

(۴۰)

بڑھاپا باعثِ شقاوت یا سعادت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا تَنْتِفُوا الشَّيْبَ، فَإِنَّهٗ نُوْرُ الْمُسْلِمِ، مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْإِسْلَامِ كَتَبَ اللهُ لَهٗ بِهَا حَسَنَةً، وَكَفَّرَ بِهَا عَنْهُ خَطِيْئَةً، وَرَفَعَهٗ بِهَا دَرَجَةً." (رواه أبوداود، مشكوٰة / ص۳۸۲/ باب الترجل)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہم سے نقل کرتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سفید بالوں کو مت نوچو، اس لیے کہ بڑھاپا (جس کی ایک علامت بالوں میں سفیدی بھی ہے) مسلمان کے لیے نورانیت کا ذریعہ ہے، جو جوان بحالت اسلام بوڑھا ہوتا ہے اس کے لیے (ہر سفید بال کے عوض) ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک گناہ معاف اور ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے۔''

دنیوی زندگی کے چار مراحل:

اللہ ربّ العزت والجلال نے اس دنیا میں انسانی زندگی کو چار مراحل میں تقسیم فرمایا، جن میں پہلا مرحلہ بچپن ولڑکپن کا ہے، دوسرا جوانی، تیسرا ادھیڑ عمر اور چوتھا بڑھاپا

ہے، بچپن اور لڑکپن کا مرحلہ وزمانہ پیدائش سے تقریباً پندرہ سال تک کا ہوتا ہے، اس کے بعد جوانی ہے جو پندرہ سے تقریباً پینتیس چالیس سال تک کا عرصہ ہے، بعد میں ادھیڑ عمر ہے جو چالیس سے ساٹھ سال تک کا زمانہ ہے، اخیر میں بڑھاپا ہے جو ساٹھ سال سے شروع ہوکر موت تک رہتا ہے، علّامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمْ أَنَّ الإِنْسَانَ أَرْبَعَةٌ : سِنُّ الصِّبَا، وَسِنُّ الشَّبَابِ، وَسِنُّ الكُهُولَةِ، وَسِنُّ الشَّيْخُوخَةِ، فَسِنُّ الصِّبَا: هُوَ الَّذِي يَكُونُ فِيهِ الْبَدَنُ دَائِمَ النُّشُوءِ وَالنُّمُوِّ، وَهُوَ إِلىٰ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً، وَسِنُّ الشَّبَابِ: هُوَ الَّذِي يَتَكَامَلُ فِيهِ النُّمُوُّ، وَيَبْتَدِئُ عَقِيبَهُ بِالانحِطَاطِ، وَمُنْتَهَاهُ فِي غَالِبِ الأَحْوَالِ خَمْسٌ وَثَلَاثُونَ سَنَةً، وَقَدْ يَبْلُغُ أَرْبَعِينَ". (كشف المشكل من حديث الصحيحين: ٣ / ٥٣٢)

گویا دنیوی زندگی کے زیادہ سے زیادہ چار دِن ہیں: پہلا دِن بچپن کا، دوسرا جوانی کا، تیسرا ادھیڑ عمر کا اور چوتھا بڑھاپے کا، جب کہ پانچواں دِن موت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد ادھیڑ عمری، پھر ادھیڑ عمری کے بعد بھی بڑھاپے کا امکان ہے، لیکن بڑھاپے کے بعد تو موت ہی ہے۔ دنیا کی یہ مختصر سی زندگی اس اذان سے شروع ہوتی ہے جس کی نماز نہیں اور اس نماز پر ختم ہوتی ہے جس کی اذان نہیں، لہٰذا اب تک کی زندگی غفلت ومعصیت میں گزار دی تو اب بڑھاپے کو بہترین موقع سمجھ کر موت کی تیاری کر لینی چاہیے، کیوں کہ زندگی کا ابتدائی مرحلہ بچپن ہے تو آخری مرحلہ بڑھاپا ہے۔

بچپن اور بڑھاپا دونوں کمزوری کے زمانے:

جس طرح بچپن میں انسان کمزور اور ضعیف ہوتا ہے اسی طرح بڑھاپے میں

بھی ضعیف و کمزور ہوجاتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً﴾ [الروم : ٥٤]

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تمھیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا، پھر اس کمزوری کے بعد (جوانی کی شکل میں) توانائی عطا فرمائی، پھر اس توانائی کے بعد کمزوری (ادھیڑ عمری) اور بڑھاپے میں مبتلا کیا۔''

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے یہ چاروں مراحل وتغیّرات اللہ ربّ العزت کی قدرت ومعرفت کے دلائل ہیں، دنیا میں ہر پیدا ہونے والا بچّہ بالکل بے بس، عاجز اور نادان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ [النحل : ٧٨]

''اللہ پاک نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی جانتے نہیں تھے۔''

اس وقت انسان کو نہ مقصدِ زندگی کا پتا تھا، نہ کسی بھی قسم کے رشتوں کا احساس تھا، کمزور و عاجز اتنا کہ کسی بھی جاندار کا بچّہ اتنا عاجز اور محتاج نہیں ہوتا، پھر اس ننھے منّے بچّے کی جسمانی طاقت و ذہنی صلاحیت من جانب اللہ بتدریج بڑھنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بچّہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے، اب جوانی سے دنیوی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

یاد رکھو! یہ جوانی زندگی کا سب سے طویل اور قیمتی زمانہ ہوتا ہے، جس میں جسمانی طاقت، ذہنی صلاحیت اور ہر چیز اپنے عروج وکمال کو پہنچ جاتی ہے، لیکن جوانی کا یہ زمانہ بھی ایک عرصے کے بعد ختم ہوجاتا ہے، گجراتی میں کہتے ہیں: 'જવાની જવાની છે.'

شاعر کہتا ہے:

ڈھل جائے گی یہ جوانی جس پہ تجھ کو ناز ہے
تو بچالے چاہے جتنا، چار دِن کا ساز ہے

اور:

کر خدا کی عبادت جوانی میں تو — کل بڑھاپا تیرے سر پہ آجائے گا
ختم ہوجائے گی طاقت دست و پا — پھر عبادت کا کوئی بھروسہ نہیں

بڑھاپے کا علاج ممکن نہیں:

ادھیڑ عمر میں قدرتی اور غیر اختیاری طور پر زندگی میں زوال، ضعیفی و بے اعتدالی آنے لگتی ہے، پھر ادھیڑ عمری کے بعد ساٹھ سے ستر پچھتّر سال کا زمانہ بڑھاپے کا ہے جو موت کا پروانہ لے کر آتا ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَعْمَارُ أُمَّتِي مَا بَيْنَ السِّتِّينَ إِلَى السَّبْعِينَ، وَأَقَلُّهُمْ مَنْ يَجُوزُ ذٰلِكَ." (ترمذي وابن ماجه، مشكوٰة / صـ٤٥٠/ باب الأمل والحرص)

''میری اُمّت کی (عموماً) عمر (طبعی) ساٹھ سے ستر کے مابین ہے، بہت کم لوگ ہوں گے جو اس سے تجاوز کریں گے۔''

بڑھاپے کی اصل عمر یہی ہے جس میں بوڑھے کے جسمانی قویٰ و اعضاء رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتے ہیں۔

مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

پھر حقیقت یہ ہے کہ میڈیکل سائنس کی روز افزوں ترقّی اور کوششوں کے باوجود آج تک بڑھاپے کا علاج نہ ممکن ہوسکا اور نہ آئندہ ہوسکے گا، کیوں کہ حدیث

میں بڑھاپے کو لاعلاج مرض قرار دیا گیا ہے:

"يَا عِبَادَ اللهِ! تَدَاوَوْا؛ فَإِنَّ اللهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ : الهَرَمُ." (رواه أحمد والترمذي وأبوداود، مشكوٰة: ص۳۸۸ / كتاب الطب والرقىٰ)

''اے اللہ کے بندو! (اپنی بیماری کا) علاج کرو (یہ تقدیر الٰہی اور توکّل علی اللہ کے خلاف نہیں) اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں فرمائی جس کا علاج اور شفا نہ رکھی ہو، البتہ ایک بیماری ایسی ہے جس کا علاج ممکن نہیں، وہ ہے بڑھاپا۔''

بڑھاپے کو چھپانا ممکن نہیں:

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑھاپے کو چھپانا بھی ممکن نہیں، اگر کسی نے بال کی سفیدی کو چھپا بھی لیا تو کھال کی سلوٹ اور چال کی سستی کو کیسے چھپا سکتا ہے؟ اسی طرح بڑھاپے کے سبب ہونے والی مختلف تبدیلیوں اور تکلیفوں کو بھی چھپانا ممکن نہیں۔

صاحبو! واقعی بڑھاپے کی پکڑ بڑے بڑے متکبرین کی اکڑ کو ختم کر دیتی ہے، حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الشِّخِّيرِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مُثِّلَ ابْنُ آدَمَ وَإِلَىٰ جَنْبِهِ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ مَنِيَّةً، إِنْ أَخْطَأَتْهُ المَنَايَا وَقَعَ فِي الهَرَمِ حَتَّىٰ يَمُوتَ." (رواه الترمذي، مشكوٰة: ص۱۳۷)

''ابن آدم (انسان) کو اس حال میں پیدا کیا گیا کہ اس کے پہلو (اردگرد) میں ننانوے مہلک (تباہ کن) بلائیں (گھومتی) ہیں، اگر (بالفرض وہ) ان سے بچ بھی گیا تو بڑھاپے میں موت سے قبل مختلف آفات و امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔''

انتہائی بڑھاپے کی عمر:

بالخصوص عمر رذیل یعنی انتہائی بڑھاپے میں تو بندہ چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ دیکھنے سننے اور بول و براز (پیشاب، پاخانہ) سے بھی عاجز ہوجاتا ہے، جیسے بچّہ اپنی ابتدائی عمر میں اپنے والدین و اہل خانہ کا محتاج ہوتا ہے، بوڑھا بھی اپنی انتہائی عمر میں اولاد اور اہل خانہ کا محتاج ہوجاتا ہے، کہتے ہیں کہ ''بچّہ اور بوڑھا برابر ہوتے ہیں''۔

ارشادِ باری ہے:

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [یٰسٓ : ٦٨]

''اور جسے ہم لمبی عمر عطا کرتے ہیں اُسے خلقت و عادت میں اُلٹا کر دیتے ہیں، پھر بھی کیا وہ اس بات کو سمجھتے نہیں؟''

جس طرح انسان بچپن میں کمزور ہوتا ہے اسی طرح بڑھاپے میں بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم بڑھاپے میں عادات و اوصاف کو اُلٹا کر دیتے ہیں کہ جو چیزیں پہلے محبوب تھیں اب مبغوض ہوگئیں، جو چیزیں باعث راحت تھیں وہ اب باعث کلفت بن گئیں۔

واقعی انتہائی بڑھاپے میں کمزوریوں اور تکلیفوں کے سبب مزاج میں ٹیڑھاپن اور چڑچڑاہٹ آجاتی ہے۔ لطیفہ ہے کہ ایک بوڑھا ڈاکٹر کے پاس جا کر کہنے لگا: نظر کمزور ہوگئی، کہا: بڑھاپے کا اثر ہے، کہنے لگا: طبیعت میں سستی و کمزوری آگئی، کہا: بڑھاپے کا اثر ہے، کہنے لگا: کمر بھی جھک گئی ہے، کہا: بڑھاپے کا اثر ہے، سن کر بوڑھا ناراض ہوکر کہنے لگا: اے جاہل! تجھے بڑھاپے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں؟ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا: آپ کی یہ ناگواری بھی بڑھاپے ہی کا نتیجہ ہے!

حتیٰ کہ جس طرح بچّہ ابتدائی عمر میں بے شعور ہوتا ہے، بوڑھا بھی انتہائی عمر

میں بے شعور ہو جاتا ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ [النحل:۷۰]

''اور تم میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جو انتہائی بڑھاپے کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس علم کو پچھلی زندگی میں حاصل کیا تھا اس کا اکثر حصّہ بھول جاتے ہیں، یا کسی بات سے باخبر ہونے کے باوجود بھی بے خبر ہو جاتے ہیں۔''

یہ حالات انتہائی بڑھاپے میں ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بقول پچھتّر سال، بعض نے اسّی سال کہا ہے اور ایک قول کے مطابق نوے سال کی عمر انتہائی بڑھاپا ہے جسے ''ارذل العمر'' بھی کہتے ہیں۔ (صحیحین، بحوالہ معارف القرآن)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر و شرک، نفاق و شقاق، فقر و فسوق کے علاوہ جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں ''ارذل العمر'' یعنی انتہائی بڑھاپا بھی ہے، فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ العَجْزِ، وَالكَسْلِ، وَالجُبْنِ، وَالبُخْلِ، وَالهَرَمِ، وَعَذَابِ القَبْرِ." (رواه مسلم، مشكوٰة المصابيح / ص۲۱۶)

''الٰہ العالمین! میں تجھ سے عاجزی، سستی، بزدِلی، بخل، انتہائی بوڑھا ہو جانے اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔''

کیوں کہ اس میں بندہ قدم قدم پر محتاج ہو جاتا ہے، آدمی اپنی عزّت و عظمت کو بچا بھی نہیں سکتا، بے کار بن جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

فَلَا وَاللّٰهِ مَا فِي العَيْشِ خَيْرٌ إِذَا مَا عُدَّ مِنْ سَقَطِ الْمَتَاعِ

''خدا کی قسم اُس زندگی میں کوئی خیر نہیں جب آدمی کو گھر کی گری پڑی چیزوں میں شمار کیا جائے۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

غافل انسان کے لیے بڑھاپا بُرا پا ہوتا ہے:

ظاہر ہے کہ اس دنیا میں انسان کا آنا اور یہاں مختصر یا طویل قیام کرنا، پھر اس دنیا سے جانا کسی بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ بقولِ ابراہیم ذوقؔ:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

کون کب پیدا ہوگا؟ کتنا عرصہ دنیا میں رہے گا؟ اور کب مرے گا؟ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت و مرضی پر موقوف ہے، اس لیے اب سوال یہ ہے کہ من جانب اللہ اگر کوئی بندہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا تو کیا ہر کسی کے لیے انتہائی بڑھاپا بُرا پا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ غافل انسان جس نے زندگی کے قیمتی اوقات و لمحات اپنے اللہ اور انجام سے غافل ہو کر اور اپنی اور اہل خانہ کی اصلاح سے بے فکر ہو کر غفلت و معصیت میں گزار دیے، حتیٰ کہ بڑھاپے کو بھی رجوع الی اللہ کا بہترین موقع نہ سمجھا تو ایسے غافل انسان کے لیے یہ بڑھاپا بُرا پا، باعث حسرت، علامت شقاوت اور اس کے گھر والوں کے لیے بوجھ ہوتا ہے، بے دین گھرانے و معاشرے میں ایسے بوڑھے کو عضو زائد سمجھ کر یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر اولڈ ایج ہوم میں دھکیل دیا جاتا ہے، جہاں یہ بوڑھا اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں بظاہر بے سہارا ہو کر مر مر کے جیتا اور جی جی کر مرتا ہے۔ بقولِ شاعر: ؎

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں؟
بوڑھوں کو بھی موت نہ آئے تو کیا کریں؟

قرآنِ کریم نے ایسے ہی بوڑھے کے متعلق فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝﴾ [التین : ۵]

''پھر ہم نے اسے انتہائی پستی و ذلّت کی طرف لوٹا دیا۔''

حالانکہ یہ دنیا کا حال ہے، آخرت کی ذلّت تو انتہائی خطرناک ہے، العیاذ باللہ العظیم۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت سے باخبر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا ۚ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ﴿٣٧﴾﴾ [فاطر : ۳۷]

''جہنّم میں وہ چیخ چیخ کر فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! ہمیں اس عذاب سے نکال کر ایک بار پھر دنیا میں جانے کا موقع دیجیے، اب ہم نیک کام کریں گے، کبھی بُرائی نہیں کریں گے، حق تعالیٰ فرمائیں گے: کیا ہم نے تمھیں اتنی مہلت اور (پختہ وسمجھ داری کی) عمر نہیں دی تھی کہ اگر تم حق، سچ اور زندگی کے مقصد کو سمجھنا چاہتے تو سمجھ سکتے تھے، پھر اسی پر ہم نے اکتفانہ کیا، بلکہ تمھارے پاس نذیر (نبی اور ان کے وارثین، یا بڑھاپا اور اس کی بیماریاں و کمزوریاں) بھی آئے، مگر تم تو غافل ہی رہے، تو اب عذاب ہی بھگتو، ظالمین کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔''

''اب پچھتاوے کیا ہوت ہے؟ جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت''

چنانچہ ایک حکایت منقول ہے کہ (خواب میں) کسی نے ملک الموت سے کہا: تم بھی عجیب ہو، کسی بھی قسم کی پیشگی اطلاع اور میسیج کے بغیر آکر لوگوں کی روح قبض کر لیتے ہو؟ ملک الموت نے کہا: ارے بھائی! میں اپنے آنے کی اطلاع اور نوٹس ضرور دیتا ہوں، لیکن اکثر لوگ اس کی طرف توجّہ ہی نہیں دیتے، پھر کہا: یہ بڑھاپا اور اس کی آفات واَمراض میرے نوٹس اور میسیج ہی تو ہیں، نیز یہ دنیوی حادثات وآفات بھی تو میرے نوٹس اور میسیج ہی تو ہیں، حتیٰ کہ دوسروں کے موت کی خبریں بھی تو میرے نوٹس و میسیج ہیں، مگر عموماً لوگ اس کی طرف دھیان دے کر موت کی تیاری نہیں کرتے۔ ان

ہی کے لیے بڑھاپا بُرا پا ہے۔ (مستفاد از: اصلاحی خطبات: ۱/۸۹)

نیک مسلمان اور صاحب قرآن کے لیے بڑھاپا خیر و برکت ہے:

اس کے برعکس جس نے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات ولمحات کو ضائع نہیں کیا، اپنے اللہ اور انجام سے غافل اور اپنی اور اپنے اہل خانہ کی اصلاح سے بے فکر نہیں رہا، بالخصوص بڑھاپے کو موت سے قبل رجوع الی اللہ، تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا بہترین موقع سمجھا تو یقیناً ایسے نیک مسلمان اور صاحب قرآن کے لیے بڑھاپا خیر و برکت، باعث رحمت ومغفرت اور علامت سعادت ہوتا ہے، قرآنِ کریم نے ایسے ہی مسلمان اور صاحب قرآن بوڑھے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ [التین:۶]

''لیکن جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے (حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے انھیں بڑھاپے کی ذلّت سے محفوظ فرمائیں گے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اولاً انھیں دنیا ہی میں پھر موت کے بعد آخرت میں) وہ اجر وثواب عطا فرمائیں گے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔''

حضرات مفسرین کے بقول آیت کریمہ میں استثناء کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ انھیں بڑھاپے کی ذلّت سے دنیا میں اور دوزخ کی ذلّت سے آخرت میں محفوظ فرمائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان سے مراد نیک مسلمان ہیں، جب کہ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے صاحب قرآن کو مراد لیا ہے، انھیں بڑھاپا (غافل انسان کے بالمقابل) یا تو دیر سے آتا ہے، یا اگر آتا بھی ہے تو حق تعالیٰ انھیں حتی الامکان محتاجی سے محفوظ رکھتے ہیں، یا ان کے لیے ان کی صلبی اور روحانی اولاد میں خدمت گزار پیدا فرما دیتے ہیں۔

﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ کا مطلب یہ بھی ہے کہ بڑھاپے کے

سبب جن نفل اعمال میں کمی ہوگی بغیر عمل کے بھی ان کا اجر بدستور جاری رکھا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم: "إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا كَانَ عَلَى طَرِيقَةٍ حَسَنَةٍ مِنَ الْعِبَادَةِ، ثُمَّ مَرِضَ، قِيلَ لِلْمَلَكِ الْمُوَكَّلِ بِهِ: "اكْتُبْ لَهُ مِثْلَ عَمَلِهِ إِذَا كَانَ طَلِيقًا، حَتَّىٰ أُطْلِقَهُ، أَوْ أَكْفِتَهُ إِلَيَّ." (شرح السنة، مشكوٰة: ص۱۳۶/ باب عيادة المريض)

''جب بندہ عبادت کے نیک راستے پر ہوتا ہے (بندۂ مؤمن ایمانی زندگی گزارتا ہے) پھر بیمار ہوجاتا ہے (خواہ وہ بیماری جوانی اور ادھیڑ عمر میں ہو یا بڑھاپے کی شکل میں ہو، اور اس بیماری کی وجہ سے بندہ نفل عبادات کا اہتمام نہیں کر پاتا) تو حق تعالیٰ بندوں کے اعمالِ صالحہ لکھنے پر متعین فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس بندے کے لیے وہی اجر لکھو جو اس کی تندرستی اور جوانی میں کرنے پر لکھا جاتا تھا، حتیٰ کہ میں اسے اس بیماری سے آزاد کردوں، یا اسے موت دے کر اپنے پاس بُلالوں۔''

نیز اس نیک مسلمان صاحب قرآن کو بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں کے سبب دارین میں اجرِ عظیم سے نوازا جاتا ہے۔ (کمافی القرطبی)

بوڑھے نیک مسلمان کے فضائل:

اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں بوڑھے نیک مسلمان کے فضائل منقول ہیں:

مثلاً (۱) حدیث مذکور میں فرمایا کہ جو بندہ بحالت اسلام بوڑھا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے بالوں میں چاندی وسفیدی آجاتی ہے، یہ بڑھاپا نیک مسلمان کے لیے نورانیت (زینت ووقار) کا سبب ہے، حق تعالیٰ ہر ہر بال کے عوض ایک ایک نیکی عطا فرماتے ہیں،

ایک ایک گناہ معاف فرمادیتے ہیں اور جنّت میں ایک ایک درجہ بلند فرماتے ہیں۔

(۲) ایک روایت میں ہے:

"عَنْ كَعْبِ بْنِ مُرَّةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الإِسْلَامِ كَانَتْ لَهُ نُورًا يَوْمَ القِيَامَةِ." (رواه الترمذي والنسائي، مشكوٰة : ص۳۸۲ / باب الترجل)

''حالت اسلام میں بوڑھے ہونے والے نیک مسلمان کے لیے بڑھاپا قیامت کے دِن نور کا سبب ہوگا۔''

(۳) اور ایک حدیث میں نیک عمل کے ساتھ طویل عمر کو علامت سعادت قرار دیا گیا ہے:

"إِنَّ مِنَ السَّعَادَةِ أَنْ يَطُوْلَ عُمْرُ العَبْدِ، وَيَرْزُقَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ الإِنَابَةَ." (رواه أحمد، مشكوٰة / ص۱۴۰/ باب تمني الموت وذكره)

''بلاشُبہ نیک بختی (وخوش نصیبی کی نشانی) یہ ہے کہ حق تعالیٰ طویل عمر میں کسی کو رجوع الی اللہ کی توفیق دیں۔ (اپنی طاعات وعبادات کی توفیق نصیب فرمائیں۔)

(۴) ایک موقع پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا: لوگوں میں بہترین بندہ کون ہے؟ فرمایا: جس کی عمر بھی بڑی ہو اور عمل بھی بڑھیا (اچھا) ہو، اور بدترین بندہ وہ ہے جس کی عمر تو بڑی ہو لیکن عمل بُرا ہو۔

عَن أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: "يَا رَسُولَ اللهِ! أَيُّ النَّاسِ خيرٌ؟" قَالَ: "مَن طالَ عمرُهُ وَحسُنَ عَمَلُهُ،" قَالَ: "فَأَيُّ النَّاسِ شَرٌّ؟" قَالَ: "مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَسَاءَ عَمَلُهُ." (رواه أحمد والدارمي، مشكوٰة / ص۴۵۰ / باب استحباب المال والعمر للطاعة)

اس سے معلوم ہوا کہ نیک مسلمان کے لیے بڑھاپا سببِ سعادت ہے، علاوہ ازیں خود اس کے لیے اور اس کے اہل خانہ کے لیے بھی خیر و برکت کا ذریعہ ہے۔

صاحبو! کتاب وسنّت میں برکت رزق کے مختلف نسخے منقول ہیں، منجملہ ان میں کا ایک ترکِ معصیت (تقویٰ) بھی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق:۲-۳]

دوسرا یومِ عاشوراء کو اہل خانہ کے لیے وسعت، ارشادِ نبوی ہے:

"مَنْ وَسَّعَ عَلٰى عِيَالِهٖ فِي النَّفَقَةِ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ سَائِرَ سَنَتِهٖ كُلِّهَا." (رواه البيهقي، مشكوٰة: ص۱۷۰)

تیسرا بڑے بوڑھے کی معیت بھی ہے، حدیث پاک میں مروی ہے:

"اَلْبَرَكَةُ مَعَ أَكَابِرِكُمْ." (صحيح ابن حبان: ۲ / ص۳۱۹)

دوسری ایک روایت میں ہے:

"اَلْخَيْرُ مَعَ أَكَابِرِكُمْ." (مسند البزار: ۲ / ص۸۸)

معلوم ہوا کہ اپنے گھر میں بوڑھے مسلمان بالخصوص والدین کا وجود اور ان کی خدمت خیر و برکت کا سبب ہے، بلکہ ایک حدیث میں تو ان کی عزّت وعظمت کو اللہ تعالیٰ کی عزّت وعظمت قرار دیا گیا ہے:

"إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ، وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَيْرِ الْغَالِي فِيهِ، وَالْجَافِي عَنْهُ، وَإِكْرَامَ ذِي السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ." (رواه أبوداود، مشكوٰة المصابيح / ص۴۲۳ / باب الشفقة والرحمة على الخلق)

اس میں (نیک) بوڑھے مسلمان، صاحب قرآن (قرآنِ کریم کا وہ حافظ، قاری، عالم، عامل وخادم) جو تلاوت میں غلو سے کام لینے والا نہ ہو، (یا تفسیر بالرای اور

من مانی تاویلات کرنے والا نہ ہو، یا اس کے الفاظ و معانی اور احکام کے بارے میں شک وشُبہ میں مبتلا نہ ہو) نیز قرآنی احکامات وتعلیمات سے روگردانی کرنے والا نہ ہو اور انصاف کرنے والے سلطان (وحکمران) کی عزّت وتعظیم کو اللہ تعالیٰ کی عزّت وتعظیم قرار دیا گیا ہے۔

شرح السنہ میں تابعی حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت منقول ہے، جس میں تعظیم وتکریم کیے جانے والوں کی فہرست میں باپ کو بھی شامل کیا ہے۔ (مستفاد از: توضیحات: ۷/ ۱۵۸)

واقعہ یہ ہے کہ والدین اور قریبی رشتے داروں میں کوئی بوڑھا ہو جائے تو سماج کے دوسرے بوڑھوں کے بالمقابل تعظیم وتکریم کے وہی زیادہ حقدار ہیں۔ جو لوگ اپنے بڑوں کی عزّت نہیں کرتے وہ چھوٹے ہی رہ جاتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص اپنی جوانی میں کسی بوڑھے کی اس کے بڑھاپے کے سبب تعظیم وتکریم کرے گا حق تعالیٰ اس کے بڑھاپے میں اس کی تعظیم و تکریم کرنے والے متعین فرمادیں گے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا لِسِنِّهِ إِلَّا قَيَّضَ اللهُ لَهُ مَنْ يُكْرِمُهُ عِنْدَ سِنِّهِ." (رواه الترمذي، مشكوٰة: ص۴۲۳/ باب الشفقة والرحمة على الخلق)

علمائے محققین فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ہے کہ جوانی میں بوڑھوں کا اکرام کرنے والے کی عمر اور زندگی میں برکت ہوتی ہے۔ جس طرح نیکی وصلہ رحمی سے زندگی میں برکت ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک روایت میں ہے کہ بوڑھے نیک مسلمان متبع سنّت کی دعائیں

حق تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں، اُن کو رد کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حدیث پاک میں ارشادِ نبوی ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَسْتَحْيِيْ مِنْ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ إِذَا كَانَ مُسَدَّدًا لَزُومًا لِلسُّنَّةِ، أَنْ يَسْأَلَ اللهَ فَلَا يُعْطِيَهُ." (المعجم الأوسط للطبراني : ٥ / ص٢٧٠/ الرقم : ٥٢٨٦، مجمع الزوائد : ١٠ / ص١٥٠)

ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ستر سال کی عمر پانے والے (مسلمان) سے محبّت کرتے ہیں اور اسّی سال کی عمر پانے والے سے حیا کرتے ہیں (اسے عذاب دینے سے شرماتے ہیں)

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَبْنَاءَ السَّبْعِينَ، وَيَسْتَحْيِيْ مِنْ أَبْنَاءِ الثَّمَانِينَ." (التيسير بشرح الجامع الصغير : ١ / ص٢٧٢)

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلے میں ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے۔ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث گزرے ہیں، ساری عمر خدمت حدیث میں گزار دی، وفات کے بعد ان کے ایک ہم عصر محدث حضرت احمد بن سہیل رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں زیارت ہونے پر ان سے پوچھا: "مَا فَعَلَ بِكَ رَبُّكَ؟" اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ جواب دیا: میں نے حق تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

"حَدَّثَنِيْ عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ

عَنْ نَبِيِّكَ عَنْ جِبْرِيلَ عَنْكَ يَا عَظِيمُ! أَنَّكَ قُلْتَ: "مَا شَابَ لِي عَبْدٌ فِي الإِسْلَامِ شَيْبَةً إِلا اسْتَحْيَيْتُ مِنْهُ أَنْ أُعَذِّبَهُ بِالنَّارِ."

یا اللہ! میں نے اپنے استاذِ حدیث امام عبدالرزاق سے، انھوں نے اپنے استاذ امام معمر سے، انھوں نے امام زہری سے، انھوں نے صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل سے اور حضرت جبرئیل نے آپ سے یہ فرمانِ عظیم الشان سنا ہے کہ ''جو کوئی بندہ (بندی) بحالت اسلام بوڑھا ہوتا ہے اسے عذابِ جہنّم میں مبتلا کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔''

یہ سن کر رحمت الٰہیہ کو جوش آ گیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

"صَدَقَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَصَدَقَ مَعْمَرٌ، وَصَدَقَ الزُّهْرِيُّ، وَصَدَقَ أَنَسٌ، وَصَدَقَ نَبِيِّي، وَصَدَقَ جِبْرِيلُ، أَنَا قُلْتُ ذٰلِكَ، اِنْطَلِقُوا بِهِ إِلَى الجَنَّةِ." (تاريخ بغداد : ١٦ / ص٢٨٢/ الرقم : ٧٤٤١)

''تمھارے استاذ عبدالرزاق نے سچ کہا، ان کے استاذ معمر نے بھی سچ کہا، ان کے استاذ امام زہری نے بھی سچ کہا، ان کے استاذ انس نے بھی سچ کہا، میرے نبی نے بھی سچ کہا، جبرئیل نے بھی سچ کہا، میں نے بھی سچ کہا، لہٰذا اے فرشتو! اسے جنّت میں داخل کر دو۔''

جب بوڑھوں سے بندے شرماتے ہیں اور ان کی رعایت کرتے ہیں تو احکم الحاکمین ارحم الراحمین تو اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ خود بوڑھے بھی اپنے کریم رب سے غافل نہ رہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝﴾ بڑھاپے کو موت سے قبل رجوع الی اللہ، تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا بہترین موقع سمجھیں، حق تعالیٰ سبھی سے بالخصوص بوڑھوں سے یہی چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ من

جانب اللہ بڑھاپے میں ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں جن سے بوڑھوں کا دِل دنیا سے اُٹھ جاتا ہے، دنیا کی رغبت ختم ہو جاتی ہے، بس ذرا ہمت سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق طلب کریں۔ اسی کے ساتھ دعا بھی کریں:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمْرِيْ اٰخِرَهٗ، وَخَيْرَ عَمَلِيْ خَوَاتِمَهٗ، وَخَيْرَ أَيَّامِيْ يَوْمَ أَلْقَاكَ. (ابن السني في عمل اليوم والليلة)

ربِ کریم! اپنے فضل و کرم سے ہمیں سعادت والی زندگی اور شہادت والی موت نصیب فرما دیں۔

آمين يا أرحم الراحمين، وآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الحَمدُ للهِ رب العالمين.

تمّ الجزء السابع من دروس الحديث الشريف، ولله الحمد أَولًا وآخِرًا، وظاهرا وباطنا، وما كنا لنهتدي لولا أَن هدَانَا اللهُ.

وذٰلك في يوم عاشوراء / ١٤٤٥ھ / يوم الأحد.

الموافق : ٢٩ / ٧ / ٢٠٢٣ء

دارالارشاد، بزمِ صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ، وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ، وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ، وَتَرْفَعُنَا بِهَا أَعْلَى الدَّرَجَاتِ، وَتُبَلِّغُنَا بِهَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (القول البديع : ٢١٠)

مناجات بدرگاہِ مجیب الدعوات

گناہوں پہ ہوں شرمندہ، الٰہی! درگزر کر دے
بڑا مجرم ہوں میں تیرا، الٰہی! درگزر کر دے

خطا کوئی نہیں چھوڑی، کبھی عصیاں نہیں چھوڑا
بس اب کرتا ہوں میں توبہ، الٰہی! درگزر کر دے

کھلونا ہاتھ کا اپنے بنا رکھا ہے شیطاں نے
بنا لے اپنا تو بندہ، الٰہی! درگزر کر دے

ترے دینے سے اے مولیٰ! ترا تو کچھ نہ بگڑے گا
مگر بن جائے گا میرا، الٰہی! درگزر کر دے

اگر مجھ پر تری رحمت نہ ہو اِک پل خداوند
تو ہو جاؤں گا میں رُسوا، الٰہی! درگزر کر دے

خطائیں یاد کر کے آج میں آنسو بہاتا ہوں
تو رحمت کا بہا دریا، الٰہی! درگزر کر دے

بھکاری بن کے آیا ہوں، تو اپنے دَر سے اے داتا!
مجھے خالی نہیں لوٹا، الٰہی! درگزر کر دے

وہ جس پہ چل کے بندوں نے ترے انعام پایا ہے
دِکھا دے مجھ کو وہ رستہ، الٰہی! درگزر کر دے

سنور جائے مری دُنیا، سنور جائے مری عقبیٰ
جو ہو جائے کرم تیرا، الٰہی! درگزر کر دے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر صدا دیتا ہے یہ جوہرؔ
رضا کا دے دے پروانہ، الٰہی! درگزر کر دے

(نتیجۂ فکر: حضرت قاری جمشید جوہرؔ صاحب مدظلہ، جامتاڑا، جھارکھنڈ، انڈیا)